شیرازہ
جموں، کشمیر اور لداخ
قدیم تذکروں اور
سفرناموں کی روشنی میں (III)
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز

جلد ۴۴ | جموں-کشمیر-لداخ قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں III | شمارہ ۴-۸

نگراں:

ڈاکٹر رفیق مسعودی

مدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپوزنگ: سرینگر کمپیوٹرس، مہاراج بازار-سرینگر
مطبع : جے کے آفسیٹ پرنٹرس-دہلی۔

شیرازہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں
اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا اِدارے
کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔

قیمت:-۶۰ روپے (پیپر گوَر)
۷۵ روپے (مُجلّد)

سَرورق :- عمل: جی-احمد

☆......خط و کتابت کا پتہ:
محمد اشرف ٹاک
ایڈیٹر ''شیرازہ'' اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری
سری نگر/ جموں

فہرست

☆★☆

حرفِ آغاز

جموں، کشمیر اور لداخ کی شاندار تہذیبی، تمدّنی اور ثقافتی روایات کا مختلف زاویہ ہائے نِگاہ سے جائزہ لینے اور قدیم تذکروں، سفرناموں اور یاداشتوں پر تعارفی مقالات کی کسی قدر تشریح اور توجیہہ کے ساتھ شیرازہ بندی اور اِسے تواریخی تسلسل میں ترتیب دینے کا جو اُہم فریضہ وقت نے ہمارے ہاتھوں میں سونپا ہے، وہ کامیابی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اِس موضوع پر شیرازہ کے دو۲ خصوصی شمارے پہلے ہی منظرِعام پر آکر خواص وعوام سے دادو تحسین حاصل کر چکے ہیں اور سلسلے کی تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں سونپتے ہوئے یک گونہ شادمانی کا احساس ہو رہا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اُس اعتماد کے اہل پاتے ہیں جس کا اظہار ہمارے محترم قارئین نے ہم پہ کیا ہے۔

زیرِ نظر اشاعتِ خصوصی کا بُنیادی موضوع بادی النظر میں کسی قدر محدود دکھائی دیتا ہے لیکن جب اِس میں غوطہ زن ہونے کی ساعت آئی تو اَندازہ ہوا کہ اِس میں کتنی گہرائی اور گیرائی ہے۔ وقت نے اَپنے پیچھے کتنی اَنمٹ یادگاریں رقم کی ہیں جن کا بھرپور اَحاطہ ناممکن سی بات لگتی ہے۔ اِس سے قبل زیرِ بحث اشاعتِ خصوصی کی دو جِلدوں میں پچاس سے زائد مضامین شامل کئے جا چکے ہیں اور سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے زیرِ نظر جلد کے مضامین میں

کسی قدر وُسعت لانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ تینوں جلدوں میں تسلسل پیدا کیا جاسکے۔

دیکھ زِنداں سے پرے رنگِ چمن، رنگِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ہماری یہ سرزمین رنگ آمیزیوں اور جلوہ سامانیوں سے عبارت ہے۔ یہ وصف یہاں کے قدرتی نظاروں ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں پایا جاتا ہے۔ اپنی مخصوص جغرافیائی صورتِ حال کے باوجود ہزاروں برس تالیف کئے گئے صحیفوں، مخطوطات اور تذکروں میں اِس خطّے نے واضح طور کس طرح اپنے لئے جگہ بنالی ہے، اِس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ویدوں، مہابھارت اور پورانوں میں کشمیر، اس کے ملحق علاقہ جات اور بڑے دریاؤں کا بالواسطہ اور بلاواسطہ ذکر ملتا ہے۔ یہ حوالے اُپنے آپ میں انتہائی اہم ہیں اور اِس سے تحقیق و تجسّس کی نئی راہیں اُستوار ہو جاتی ہیں اور ہمارے تمدّنی جہات کے کتنے ہی دروازے کُھل جاتے ہیں۔

اِس سرِزمین کے قدیم چین اور یونان سے بہت ہی گہرے رَوابط رہے ہیں۔ اگر چہ اِن رَوابط کا سرسری حوالہ دیا جاتا ہے لیکن یہ رُوابط ہماری ثقافت کے کتنے ہی اہم سنگِ میل ہیں اور اِن رُوابط نے ہمارے احساسات (Sensibilities) فنِ تعمیر، جنگی فنون، اَدب، روزمرہ کے بول چال، ملبوسات اور علوم وفنون پر کتنے ہی گہرے اُثرات مرّتب کئے ہیں۔ اِس کے سرسری جائزے سے بھی نت نئی معلومات کے سمندر موجزن نظر آتے ہیں جن کا بھرپور جائزہ لینا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

اِس سرزمین پر ناگ مت، ہندومت، بُدھ مت اور اِس کے بعد اسلام
نے کون سی تبدیلیاں لائیں اور اِس کے نتیجے میں ہمارے تمدّن پر انمٹ اثرات
مرّتب ہوئے اور ایک ایسی ملی جُلی ثقافت کا ظہور وقوع پذیر ہُوا جو صرف اِسی
خطّے کے ساتھ مخصوص ہے۔ ناگ، پشاچ، یکھش، آسٹرک، دراوڑ، آریہ وغیرہ
سبھوں نے اس مِلی جُلی تہذیب کی پرداخت میں اُپنا حصّہ اُدا کیا اور ہم غیر
محسوس انداز میں اِن سبھوں کے پرَوردہ ہیں۔ دُنیا کا شاید ہی کوئی خطّہ اتنی
تہذیبی رنگارنگی کی آماجگاہ رہا ہو۔ اِس تہذیبی آماجگاہ کے اَجزائے ترکیبی کا
خلاصہ کرنے کے لئے عالموں، فاضلوں، محققّوں اور تاریخ نویسوں نے وقتاً
فوقتاً اَپنے قلم کو زحمت دی ہے لیکن ابھی اِسے پوری طرح کھول کے بیان نہیں
کیا گیا ہے۔ ہر ایک پہلو اُپنے اندر خزینے سمیٹے ہوئے ہے اور دعوتِ غور و فکر
دے رہا ہے۔

سادگی کہیئے یا اِسے ہوشیاری جانئے
ان سے کہہ دیتے ہیں ہم، جو کچھ ہمارے دِل میں ہے

غیر منصفانہ اور غیر حقیقت پسندانہ سوچ کے برعکس اِس سرزمین نے جنگی
فنون میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اُپنی قوّتِ بازو سے دُور دُور تک
اَپنا دبدبہ بنائے رکھا۔ تذکروں، سفرناموں اور یادداشتوں کے قابلِ اعتبار
ماخذوں کے جائزے سے یہ ناقابلِ تردید حقیقت سامنے آتی ہے کہ کسی
زمانے میں اس کی سرحدیں وسطِ ایشیاء، بنگال اور سری لنکا تک پھیلی ہوئی تھیں۔

ہزار بار کیا ہے بھنور نے ہمیں غرقاب
ہزار بار بھنور نے ہمیں اُچھالا ہے

مملکتِ کشتواڑ، مملکتِ لداخ، مملکتِ بلتستان، مملکتِ پونچھ، ابھیسارہ اور دیگر کئی خودمختار علاقے وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کی مثالیں پیش کررہے تھے اور جب وقت نے آواز دی تو ایک ہی پرچم تلے جمع ہوکر محمود غزنوی جیسے زبردست فاتح کو اُلٹے پاؤں اور خالی ہاتھ لوٹ جانے پر مجبور کیا گیا۔

اِس سرزمین میں صوفی، سنتوں اور مذہبی پیشواؤں کی تشریف آوری تواریخ کے اہم سنگ میل رہے ہیں۔ مہاتمابدھ، حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت، شرف الدین عبدالرحمٰن بُلبل، حضرت میر سید علی ہمدانیؒ، سکھ مذہب کے بانی گورونانک دیوجی، گورُوہرگوبند سنگھ جی، گوروہری رائے صاحب اور دیگر بُزرگوں نے یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی روایات میں نئے باب رقم کئے۔ اِن روایات کے ساتھ ہمارا وہی رشتہ بنا ہوا ہے جو رُوح کا جسم کے ساتھ ہوتا ہے۔

کتنی پُر نور کر گئی ہے منزلِ شوق
نقشِ پا اُن کے چمکتے ہیں ستاروں کی طرح

زیرِ نظر اشاعتِ خصوصی کا تانا بانا جارج فورسٹر کے سفرنامے سے شروع ہوتا ہے۔ مشہور شرق شناس جارج فورسٹر کا شمار اُن ابتدائی یورپی سیلانیوں میں ہوتا ہے جو کشمیر کی سیاحت پر آئے اور اپنے سفرنامے کی صورت میں ہمیں ایسی دستاویز فراہم کرگئے ہیں جس میں وہ چشم دید حالات اور واقعات رقم ہیں جو کسی ہمعصر تواریخ میں دستیاب نہیں ہوتے۔ یہی ماجرا ایف۔ ارنیسٹ، ایرنی، انڈریو وِلسن، ماریان ڈاوٹی اور دیگر یورپی مہم جوؤں کا ہے جو ناگفتہ بہہ

صعوبتوں، مصیبتوں اور اذیتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے اِس سرزمین پر وارد ہوئے اور اُپنے سفر ناموں میں شاہی محلات کی ریشہ دوانیوں سے لے کر نبادات، جمادات، نسلیات، بشَریات، حُسنِ فطرت، عام لوگوں کی عادلت، رسوم وَرواج، جبر و استبداد، ارضیات اور معیشت کے بارے میں گرانقدر معلومات فراہم کر گئے ہیں جن کا اختصار اِس شمارے میں نذرِ قارئین ہے۔ اگر چہ بعض اَوقات اُن کی آراء سے اختلاف کی گنجائش رہتی ہے لیکن اِس بات کے مشاہدے سے حیرت ہوتی ہے کہ اُن کا مطالعہ کِس قدر وسیع اور نظر کتنی بالغ تھی۔ اِن میں سے اکثر نے اِس سرزمین کے یخ بستہ فلک بوس پہاڑوں کو تنِ تنہا عبور کیا۔ کئی بار موت سے نبرد آزما بھی ہوئے لیکن اُن کی مہم جویانہ طبعیت ہر آزمائش پر غالب آ گئی اور ہمارے لئے جرأت، حوصلہ مندی، بالغ نظری، حقیقت پسندی اور خدمتِ خلق کی زندہ و جاوید مثالیں چھوڑ گئے۔

جنونِ عشق کی جورَہ گذر سے جو گذرے گا
وہی بلندئ فکر و نظر سے گذرے گا

اِس سرزمین کی زبان اور اَدب پاروں کو یورپ میں متعارف کرانے کا سہرا بھی ان ہی شرق شناسوں کے سر جاتا ہے۔ ہنٹن نوؤلز کو کشمیری لوک کہانیوں کا اَوّلین ترتیب کار تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اِس مٹی سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور نہ وہ یہاں کی زبان سے واقف تھا لیکن تمدّن شناسی اور ثقافت سازی کے صفات کی وجہ سے اس کے دستِ شوق سے کارنامہ انجام پذیر ہوا۔ اِن لوک کہانیوں کی بدولت کشمیر کے باہر کتنے ہی عالموں اور فاضلوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی اور یُوں ہمارے تہذیبی سفر کا جائزہ لینے کی ابتدا ہو گئی۔

یچھ، ڈریننٹھال، آگر پچھنی، کھوژ، ڈشی، نیاز، کھاندر، رانٹس، تہر، مسخر، پری، کوہِ قاف، مافوق الفطرت، پاتال، لین دین غرض ایسی بے شمار لوک روایات اور کردار ہیں جن کو ہنٹن نوؤلز اور دیگر یورپی تمدن شناسوں نے اپنی تصنیفات و تالیفات کے سفینے میں سوار کرا کے نیست و نابود ہونے سے بچا لیا۔

اِسی پسِ منظر میں مشہورِ عالم "لالہ رُخ" بھی معرضِ وجود میں آیا۔ آفاقی شہرت کا حامل یہ شاہکار صدیوں سے ہمارے ذوق کی تسکین کرتا آ رہا ہے۔ مِس گومری کشمیری کی اوّلین انگریزی شاعرہ تھیں۔ اِن اُہم سنگ میلوں پر مقالے لکھوانے اور زیرِ نظر اشاعتِ خصوصی میں اِن کی شیرازہ بندی یقیناً ہمارے قارئین کی پسند کا دَرجہ حاصل کر لیں گے۔

فطرتوں سے آشنا جان لیتے ہیں
پتھروں کی دُنیا میں آئینوں کی مجبوری

زیرِ نظر اِشاعتِ خصوصی ہمارے تہذیبی سفر کے بعض اہم پڑاؤ اور سنگِ میل اُجاگر کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے اور اِس میں ہم حسبِ سابق اُن ہی کرم فرماؤں کی عنایات سے سرفراز ہوئے ہیں جو ہمیں وقتاً فوقتاً اپنی نوازشات سے نوازتے رہتے ہیں اور جن کی سرپرستی اور راہنمائی کی بدولت ہمارا یہ پروجیکٹ کامیابی سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ خصوصاً جناب غلام نبی خیال، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب عبدالغنی شیخ، جناب غلام نبی آتش، سیّد رسول پونپر اور پروفیسر فدا محمد خان حسنین کے اَسمائے گرامی اس لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں کہ اُن کا دستِ شفقت ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کرتا رہا ہے۔ یہاں یہ بات قارئین محترم کے گوش گذار کرنا ضروری معلوم

ہوتی ہے کہ زیرِ نظر اشاعتِ خصوصی کی تیاری کے دَوران کشمیر یونیورسٹی کے ایک محترم پروفیسر نے شکایت کی کہ مضمون لکھوانے کے لئے بعض فاضل مضمون نگاروں پر ہی کیوں زیادہ انحصار کیا جاتا ہے جب کہ وہ اِس سے بہتر مقالے زیب ِقرطاس کر سکتے ہیں۔ کسی بحث میں اُلجھے بغیر ہم نے اُن سے عاجزانہ درخواست کی کہ وہ مقالے کی صورت میں ہمیں اَپنی عنایات سے نوازیں تو انہوں نے اِس شرط پر حامی بھرلی کہ انہیں مطلوبہ کتابیں دستیاب کرائی جائیں گی اور تین مہینے کا وقت دیا جائے۔ بات معقول تھی' چنانچہ کئی کتب خانے کھنگالنے کے بعد مطلوبہ کتابیں اُن کی خدمت میں پہنچادی گئیں۔ چھ مہینے سے زائد کا عرصہ گزر گیا، پیہم گذارشات کے باوجود ابھی تک ہم اُن کے اَلتفات سے محروم ہیں، بلکہ اَب ہم ان کوششوں میں لگے ہیں کہ اُن کو جو کتابیں دستیاب کرائی گئیں ہیں وہ کسی طور واپس حاصل کی جاسکیں۔

حوادثِ نو بہ نو درپیشِ ہیں تو غم نہیں ہم کو
محبت میں لٹنے کا اِرادہ کر لیا ہم نے

بہر حال، اِدارہ اُن تمام فاضل مضمون نگاروں کا انتہائی ممنون ومشکور ہے جنہوں نے ہماری استدعا پر گونا گوں مصروفیات کے باوجود ہمیں اپنے التفات سے نوازا اور ہم اپنے آپ کو اِس قابل پاتے ہیں کہ یہ گُلدستہ آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

اکیڈمی کے سربراہ ڈاکٹر رفیق مسعودی اور ایڈیشنل سکریٹری جناب ظفر اقبال کی شفقتیں ہمارے ولولوں کی آبیاری کرتی رہتی ہیں اور انہوں نے مشکل وقتوں میں ہماری حوصلہ افزائی کی۔ آرٹسٹ جناب جی، احمد اور اُستاد

محمد عباس صاحب کی عرق ریزی اور اُستادانہ بصیرت شامل حال رہی اور اس خواب کی تعبیر ممکن ہو سکی جس کا تعلق ہمارے ماضی کے نہاں خانوں سے ہے اور ماضی کی بنیاد پر ہی مستقبل کے خاکے ترتیب دیئے جاتے ہیں۔

قارئین محترم کی آراء اور اُن کے مخلصانہ مشورے ہمارا انمول سرمایہ ہیں اور اُن ہی مشوروں کی روشنی میں ہم اپنے آپ کو پیش قدمی کے اہل پاتے ہیں۔ اس بار بھی ہمیں اُن کی بیش قیمت آرا کا انتظار رہے گا۔

سُوئے جاناں، سُوئے منزل، سُوئے مقتل نکلے
تیرے دیوانے لئے عزمِ مُسلسل نکلے

محمد اُشرف ٹاک

☆☆☆

محمد یوسف ٹینگ

عُرسِ گُلاب اور رَقصِ بسمل

جارج فورسٹر کے سفرنامۂ کشمیر سے

میرے سامنے جارج فورسٹر کے انگریزی سَفرنامے کا دُوسرا حصّہ ہے۔ یہ سفرنامہ بنگال سے شروع ہوتا ہے اور اِنگلستان میں اَنجام کو پہنچتا ہے۔ لیکن دوسرا حصّہ بانہال سے بارہمولہ اور پھر کشمیر سے باہر کابل، ترکستان، رُوس وغیرہ کے حالات بیان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے مقاصد کے لئے اِس کا وہ حصّہ کافی ہے جس میں فورسٹر وادیٔ کشمیر سے گذرتا ہے اور یہاں کے حالات بیان کرتا ہے۔ یہ سفرنامہ پہلی بار ۱۸۰۸ء میں لندن میں شائع ہوا فورسٹر کا سفرنامہ کشمیر کے بارے میں۔ یورپی سیاحوں کے ضمن میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے اِس لئے کیونکہ یہ فرانسیسی سیاح حکیم برنیر کے بعد سب سے قدیم ہے۔ برنیر کی کشمیر میں آمد سے کوئی سَوا سو سال بعد یعنی ۱۷۸۳ء میں برنیر کا سفرنامہ اَپنی شان رکھتا ہے۔ اُس کے پاس گھومنے گھانے اور احوال وکوائف

جاننے کے بہت سے وسیلے اور ذرائع تھے، جیسا کہ شاہی کارواں کے کسی معزز مہمان کے ہو سکتے ہیں لیکن اُس کی وجہ سے اُسے اصل حقائق کو دیکھنے میں ایک کوتاہی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یعنی اُس کو وہی دیکھنا پڑتا تھا جو سرکار کے کارندے اُسے دکھانا چاہتے تھے اور وہی سُننا پڑا جس کے سُننے سے اُس کے میزبانوں کے کان کسی زحمت کا شکار نہ ہوں۔ اِس طرح کشمیر کو دیکھتے ہوئے بھی وہ صداقت کے بہت سے رنگوں اور زاویوں کو نہ دیکھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے یہاں زیادہ تر سُنی سُنائی باتوں کی جھنکار زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ فورسٹر ایک عام آدمی کی طرح آیا۔ عام آدمیوں کے ساتھ مِل جُل کر رہا اُن کی پریشانیوں میں خود بھی شامل رہا۔ اِس لئے اُس کے یہاں اُس وقت کے کشمیر کی گویا کوئی دستاویزی فلم کتاب کے صفحوں پر ڈوبتی اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اِس طرح سے یہ سفرنامہ اُن ماہر تواریخوں سے کہیں زیادہ عوام کے کوائف کا ماجرا دکھاتا ہے جو یا تو دربار کی دربانی کرتے ہوئے تحریر کئے گئے یا جن کو لکھتے وقت لکھنے والے کا قلم خوف اور دہشت سے تھرتھراتا ہوا نظر آتا ہے۔ برنیر جس وقت کشمیر آیا اُس وقت مغل سلطنت کا آفتاب اگر چہ ڈھلنے لگا تھا لیکن زمین پر اُس کے اُجالے کی ناچتی ہوئی کرنیں اصل بات کو چھپا رہی تھیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی شمشیر بے نیام تھی اور اُس کی آنکھوں میں فتوحات کی کہکشاں لشکے دے رہی تھی۔ اُسے کشمیر سے خاص طور اُنس تھا۔ اُس کے دادا جہانگیر پر بھی یہی بات صادق آتی ہے لیکن دونوں کے پیار کے تیور الگ تھے۔ جہانگیر کے لئے اُس کے ہی الفاظ میں یہ عاشق کا شبستان تھا۔ نرم، نازک، ناز نخرے اور ساز و آواز سے پُر جام کی روشنیوں سے ایک بڑے فانوس کی مانند اور وصل کی

لذّتوں سے نیم خوابی کی سی کیفیت پیدا کرنے والا جب لُطف ولذت کی نادیدہ مگر بجلی کی کرنٹ کی طرح احساس کے تار چھیڑنے والی کیفیتِ معشوق کی سُرمہ آلودہ آنکھوں کے دَریچوں کو اَپنی سرسراہٹوں سے نیم واہی رہنے دیتی ہے۔اَورنگ زیب نے اِس منظر کو اُلٹ کر یہاں ایک عابد کی خانقاہ دریافت کرلی تھی۔اُس نے جب حضرت بل میں مقیم موئے پاک نبی ﷺ کو کشمیر بھیجنے کا فیصلہ کیا تو اَس وقت اُس کا دوسرا اُمیدوار' ہندالنبی حضرت معین الدین چستیؒ' کے آستانے والے اجمیر کا شہر تھا۔اِس سے کشمیر کے متعلق اورنگ زیب کی لطیف لڑکھڑاہٹ کا ایک اندازہ کیا جاسکتا ہے اور وہ سارے برِصغیر میں کشمیر کو قُبہ اسلام مانتا تھا۔ یہ خود اُسی کا قول ہے ...... لہٰذا برنیر' جیسے شاہی عماری میں کشمیر سے گذرا...... کشمیر کے ظاہر میں جو نظارے اُبلتے ہیں، برنیر کے یہاں اُنہی کا بازار عکاظ سجا ہوا ہے ......فورسٹر کے زمانے میں جیسے یہاں ساری روشنیوں کو اس کے چاروں طرف چہرہ دینے والی چوٹیوں نے چھُپادیا تھا...... یہ کشمیر میں ظلمت کے پانیوں کے ٹھاٹھیں مارنے کا زمانہ تھا اور اس کی فوجیں پھر نسل در نسل گُرسی در گُرسی ظالم خان سے قہر سنگھ کا رُوپ دھارتی رہیں۔جارج فورسٹر انگلستان سے آیا تھا۔اُس کی قوم نے تجارت کی آڑ میں ہندوستان کے تاج وتخت کو اَپنی جائیداد بنانے کے اِرادے باندھے ہی نہیں بڑی حد تک پورے بھی کرلئے تھے۔اگرچہ کشمیر ابھی اُن کے بڑھتے ہوئے پنجوں کی گرفت سے باہر تھا لیکن اُن کے دل کی خلوتوں میں اِس خوبصورت جگہ اَپنے خیمے تاننے کی اُمنگ یہیں کروَٹ لے رہی تھی۔اُس کا سفرنامہ خطوط کی صورت میں لکھا گیا ہے...... یہ خطوط وہ دِن بھر کے مشاہدے کے بعد شاید شام کو دُوسروں کی نظریں

بچا کر چراغ کی روشنی میں لکھتا رہا ہوگا۔ بالکل بے تکلفی اور کمال رازداری سے۔ پہلے ہی خط میں جس پر ۱۸۸۳ء کی تاریخ درج ہے۔ وہ کشمیر کا پہلا تعارف اِن الفاظ میں کرتا ہے۔

"اَب میں آپ کا دھیان، جس پر پہلے ہی بوجھ پڑا ہوا ہے، کشمیر کی طرف دِلانا چاہتا ہوں اور یہ کوئی خوشگوار بات تو ہے نہیں میں اِس وادی کی قدرتی خوبصورتیوں کا ذکر کرونگا جو شاید اُپنی فضا، مٹی اور تصویر نما سرزمین کی طرح بے مثال ہے۔"

وہ بانہال سے نیچے اُترتے ہی کہتا ہے کہ اس کی چوٹیوں پر سال کے بیشتر مہینوں میں برف موجود رہتی ہے۔ اِسی لئے یہ کشمیر کی ہواؤں کو خنک بنا دیتا ہے۔ ورنہ طول بلد میں صرف دُو درجوں کے فرق سے اتنی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کا قافلہ سب سے پہلے ویری ناگ کے گاؤں میں لنگر انداز ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں ملاحظے کا ایک مرکز یعنی کسٹم ہاوس تھا اور ہماری زبردست تلاشی لی گئی۔

وہ ایک بڑے تعلق دار، ذوالفقار خان کے کارواں کے جلو میں آیا تھا۔ خان خود لنگڑا تھا اِس لئے اُسے چند کہار ایک عماری میں کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے چل رہے تھے جس کا نام فورسٹر ساماپان (یہ زاپنان کی بگڑی ہوئی صورت لگتی ہے کہ انگریز S، کو کئی بار Z کی آواز اور اس کے برعکس بھی کرتے ہیں) فورسٹر اس سواری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگرچہ یہ پہاڑی لوگ اُس کو ہر موسم میں ڈھوتے ہیں لیکن یہ انہیں موسم کی کسی غضبناکی سے کوئی پناہ نہیں دے سکتی۔ وہ کشمیری کے چلنے کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے وہ گھاس کے جوتے یعنی "پُلہ ہور" استعمال کرتے ہیں۔

"خود مجھے مشورہ دیا گیا تھا کہ تم بھی ایسا ہی کرنا مگر جب میں نے
یہ پہنے تو میرے پاؤں گھاس کی سخت رگڑ سے چھلنی ہو گئے۔ میں لنگڑاتے
ہوئے چلنے لگا اور مجھے یہ پھینک دینے پڑے"۔

ویری ناگ چشمے کا ذکر کرتے ہوئے وہ جہانگیر کے بنائے ہوئے حوض کی بات کرتا ہے لیکن اصل تعریف وہ اس جگہ لگائے گئے درختوں کی کرتا ہے جنہیں وہ اِس کے زیور قرار دیتا ہے۔ "یہ گرمیوں میں مسافروں کو فرحت اور سایہ بخشتے ہیں۔" ویری ناگ سے جاتے ہوئے وہ آگے اُن مناظر کی بات کرتا ہے "جنگل، پانی، وادی اور پہاڑ مل جل کر پیدا کرتے ہیں"...... یہ بہار کا موسم تھا اور سیب، ناشپاتی، آڑو خوبانی، چیری اور شہتوت کے پیڑ پھولوں سے لدے پھندے تھے۔ سُرخ اور سفید رنگ کے گُلاب بھی کِھلے ہوئے تھے اور فورسٹر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ پریوں کے دیس میں کھڑا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ توت کے بغیر کشمیر کا کوئی پھل اور ترکاری ہندوستان میں پیدا ہونے والے پھلوں اور ترکاریوں سے نہیں ملتے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات تعجب انگیز ہے کہ طول بلد میں صرف دُو ڈگری کی تبدیلی سے مٹی کی ساری خاصیت بدل جاتی ہے۔ وہ ۲۶ اپریل کو ڈُورو پہنچتا ہے (اِسے وہ لُورو کا نام بھی دیتا ہے) وہ کہتا ہے کہ یہ ایک گنجان آباد قصبہ ہے اور یہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ دوسرے دن اسلام آباد پہنچنے پر وہ اِسے ڈُورو سے سات کوس دُور بتاتا ہے۔ "جہلم اس کی شمال سمت میں بہتا ہے اور پہاڑوں سے نکل کر میدانوں میں بہنے لگتا ہے" یہاں سے دریا کا پانی آہستہ اور ہموار طریقے پر بہتا ہے۔ چنانچہ اُس کی پارٹی نے ایک کشتی کرایے پر لیکر سفر جاری رکھا۔ وہ ابھی پانچ میل نیچے چلے تھے کہ انہیں ایک

منحوس حکم ملا''وہ واپس اسلام آباد جا کر تب تک وہاں سے آگے نہ بڑھیں جب تک انہیں باضابطہ پاسپورٹ نہ ملے''۔فورسٹر کہتا ہے کہ ہماری کشتی کے اُوپر ایک چٹائی سایہ کرتی تھی لیکن بارش اور تیز ہَوا نے اِسے ایسے آلیا کہ ہم شرابُور ہوگئے اگرچہ میرا بچھونا تر ہوگیا لیکن مجھے کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچا۔ وہ اَپنے جسمانی ڈھانچے کی تنومندی کا شکریہ اَدا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے اگر بیماریوں سے حفاظت ملی ہے تو اُس کی اصل وجہ میری تمباکو نوشی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمباکو میں جسم کو ناصاف ہَوا سے محفوظ رکھنے کی طاقت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا پکا خیال ہے کہ اِن علاقوں میں میری صحت بحال رہنے کی اصل وجہ میری بے حد تمباکو نوشی کا شوق ہی ہے...... نہ جانے آج کے حکیم ڈاکٹر جنہوں نے تمباکو پر زَہر ہونے کا لیبل چسپاں کر دیا ہے، فورسٹر کے اس بیان کے متعلق کیا فتویٰ دینگے؟ وہ اُپنے قافلہ سردار ذوالفقار خان کی اِسلام آباد کے گورنر سے ناراضگی کی بات کرتا ہے کیونکہ خان صاحب نے گورنر کی ڈیوڑھی پر حاضری دینے میں کوتاہی کی تھی۔ اس کے بعد فورسٹر اُپنی فلسفیانہ ترنگ میں لکھتا ہے:

''زمین کے ہر علاقے میں اِقتدار چھوٹ جانے سے، یا کہیئے زندگی کی بے رُخی سے، ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں وہ لوگ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں جنہیں دُنیاوی اغراض نے دوستی کے محاورے کے استعمال کی ترغیب دی تھی۔ خاص طور ایشیا میں ایسا دفتری، جسے حاکم کی بیزاری کا سامنا ہوگیا ہو چشم زدن میں لوگوں کی توجہ سے ہٹ جاتا ہے اور وہ گویا اپنے جس کے اِشارے پر اُس کو الگ کرتے ہیں...... ''ایشیاء میں ایسے اقتدار زدہ لوگ عام طور پر اپنی زندگیاں یا تو کسی اصطبل جیسی جگہ میں گذارتے ہیں یا پھانسی کے تختے پر لٹکتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تو لوگوں کی

زندگی، جائیداد اور عزت شہزادے کی رضا مندی سے جُڑی رہتی ہے۔
فورسٹر کے وقت میں یہاں افغان صوبیدار 'ظالم اَظلم' آزاد خان راج کرتا
تھا۔ فارسٹر کہتا ہے کہ مجھے پتہ چلا کہ یہ شہزادہ ظالموں کی پہلی صف سے
تعلق رکھتا ہے۔ یہاں ہندوؤں کے سارے رِیت رُواج جلد ہی قصۂ
پارینہ بن جائیں گے اور اُس کی زیادتیوں کے چرچے باقی رہیں گے۔
اس کا ایک نشانہ لوگوں کی جائیدادیں اور دوسرا اُن کی زندگیاں'۔

فورسٹر کہتا ہے کہ اسلام آباد واپس آنے کے دو تین دن کے بعد ملک کا دیوان (وزیر اعظم) وہاں آیا اور ہماری ہمسائیگی میں خیمہ زن ہو گیا۔[1] چنانچہ اُس کی مہربانی سے ہمیں شہر جانے کا پَروانہ مِلا...... فورسٹر لکھتا ہے ''یہاں پر یہ ذکر کرنا بہت ضروری ہے کہ چوری چھُپے داخل ہونے کے مقابلے میں یہاں باقاعدہ طریقے سے اندر آنا بہت ہی دُشوار ہے اور پھر واپس نکلنا اور بھی کٹھن۔ اُسے اندر آنے کیلئے ایک ایسا حکم نامہ حاصل کرنا ہوتا ہے جس پر حکومت کی مُہر لگی ہوئی ہو۔ فورسٹر کے مطابق دیوان مجھ جیسے سفید فام آدمی کو دیکھ کر کچھ چونک گیا۔'' چنانچہ اُس نے میرے پیشے اور خیالات کے متعلق کچھ سوال کئے۔ فورسٹر نے اپنی سوچی سمجھی رَٹ لگائی کہ وہ ایک تُرک ہے اور وہ اُپنے وطن مالوف کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مقامی نوکر شاہی کے تعصّبات کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُس نے کہا کہ وہ سکھوں کے زیرِ نگین علاقے کو ٹال کر آگے جا رہا ہے اور اِسی لئے وہ حفاظت کے خیال سے کشمیر سے گذرتا ہوا جا رہا ہے۔ میری کہانی پسندیدگی سے سنی گئی اور مجھے بڑے اچھے الفاظ سے یقین دہانی کرائی گئی کہ مجھے

---

[1] اُن دِنوں کشمیر کا دیوان پنڈت کیلاش ناتھ در تھا۔ بعد میں یہ بھی صوبیدار کے غیض کا نشانہ بنا اور قتل کر دیا گیا۔

ہر قسم کی سہولیت دی جائیگی۔ وہ کشمیر میں ندی نالوں کی کثرت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ انہیں چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے پار کیا جاسکتا ہے اور یہ کشمیر میں باہمی رابطے کی سہولیات پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن کیا کریں کہ افغان حکومت کی اُبتر پالیسیوں نے لوگوں کی رُوح کو کچل دیا ہے۔

پانپور سے ہوتے ہوئے سرینگر پہنچنے پر وہ لکھتا ہے کہ اَب یہ اِس صوبے کے نام کے ساتھ ہی جاتا ہے یعنی اس کا نام کشمیر ہے لیکن پُرانے زمانوں میں اِسے سرینگر کہہ کر پُکارا جاتا تھا۔ یہ دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر تین تین میل کے فاصلے کو گھیرے ہوئے ہے جس پر لکڑی کے تین یا چار پُل بنائے گئے ہیں۔ اِس کی چوڑائی یہی دو میل کی ہے۔ مکانات دو یا تین طبقوں کے ہیں اور اینٹ گارے کے بَنے ہوئے ہیں۔ اِن میں لکڑی کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد اُس نے اِن مکانات کی چھتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خوبصورتی کا حال بیان کیا ہے۔ ''لکڑی سے کھڑا کی ہوئی چھت پر باریک مٹی کی تہہ چڑھائی گئی ہے۔ یہ مکینوں کو موسم سرما میں ہونے والی بارشوں اور برف سے بچاتی ہے۔ یہ سردیوں میں مکان کے اندرون کو گرم رکھتی ہے اور گرمیوں میں اُسے فرحت بخش طور پر ٹھنڈا۔ چھت کی مٹی میں قسم قسم کے پھول بوئے جاتے ہیں جو دُور سے ایک بہت خوش نما منظر دکھاتے ہیں۔ لیکن گلی کوچے تنگ ہیں اور کیچڑ میں لَت پَت ۔ اس کے علاوہ رہنے والے لوگ خود بھی بہت گندے ہیں۔''

''کشمیر میں عمارتیں اپنی ساخت میں، کوئی خوبی نہیں رکھتی ہیں البتہ وہ خود لکڑی سے بنی ہوئی مسجد کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے جو ہندوستان کے ایک

بادشاہ نے بنوائی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ سرینگر کی جامع مسجد کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر اپنے تبصرے میں کہتا ہے کہ ''اس کا امتیاز بس یوں ہی سا ہے۔...... وہ صوبیدار کے متعلق کہتا ہے کہ وہ شیر گڈھ نام کے ایک قلعے میں رہتا ہے یہ شہر کے جنوب مشرق (؟) میں واقع ہے اور اُسکے زیادہ تر افسر اور فوجیں بھی وہیں رہتی ہیں۔ دریا کے گھاٹوں پر چلتے پھرتے، غسل خانے واجبی سے ضبط کا پتہ دیتے ہیں یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اہم ضرورت پورا کرتے ہیں جنہیں بہت سے سجدے (نماز) کرنا پڑتے ہیں۔ اِن غسل خانوں کی وجہ سے اُن کی عورتیں بھی ننگے پن کے افلہارے سے بچ جاتی ہیں'' کشمیر کی جھیل' جسے مقامی زبان میں ڈَل کہتے ہیں' کی خوبصورتی مشہور ہے۔ اِس کی لمبائی پانچ یا چھ میل ہے اور جہلم کے ساتھ ایک تنگ نالے سے جڑتی ہے۔

فورسٹر نے شنکر اَچاریہ پہاڑی کیلئے یہ نام استعمال نہیں کیا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس وقت یہ نام موجود نہیں تھا۔ وہ کہتا ہے کہ شہر کے مشرق میں یہ پہاڑی واقع ہے۔ اس پر کسی بااعتقاد مسلمان نے ایک مندر کو بادشاہ سلیمان سے منسوب کیا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کشمیر میں بڑی عقیدت سے یاد کیا جاتا ہے۔

فورسٹر نے وادی کشمیر کے وجود کو حضرت سلیمان سے جوڑ کر کیشپ ریشی کے نظریے اور دوسرے ایسے ہی نظریات کے بعد ایک الگ قسم کی بات کی ہے۔ اُنہوں نے اِسے پانی کے نیچے دیکھا۔ البتہ کوہِ سلیمان اِس سے باہر تھا۔ وہ وادی کے عوامی عقیدے کا حوالہ دیکر لکھتا ہے کہ حضرت نے پہاڑوں کے درمیان ایک راستہ بنا کر پانی کو باہر بہنے دیا اور اس طرح کشمیر کو اُس کی میدانی سطح عطا کی۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمان اِس پہاڑی کو تختِ سلیمان کہہ کر پکارتے

ہیں۔ڈل کی دوسری سمت ایک پست پہاڑی موجود ہے۔ جسے 'ہندوی' میں
ہرنے پر بت (ہری پربت؟) کہا جاتا ہے۔اس کے بعد فورسٹر اس نام پر تبصرہ
کرتا ہے اور لکھتا ہے ''شاید یہ نام اسے اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ باغات وغیرہ
سے بھری ہوئی ہے'' اس طرح سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ یہ ہمیشہ اسی
طرح تنگ دھڑنگ نہیں تھا اور ''ہارِ پربت'' کی قیاسی شارکا کے علاوہ اس کے
اصل ہریالی کی بھی آئینہ داری کرتا ہے۔اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ
مغلوں نے اس کی ڈھلانوں کو اُپنے تہذیب یافتہ شہر ناگرنگر کے لئے کیوں چُنا
تھا۔ ''ہرَے پربت'' کے ذکر کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ کشمیریوں نے اِس پر مخدوم
صاحب اعزاز میں ایک مسجد بنائی ہے۔مخدوم صاحبؒ کشمیری داستانوں میں
اُسی طرح مشہور ہے جس طرح انگلستان میں کنٹربری کے ٹامس بیکٹ کا نام لیا
جاتا ہے۔ کشمیر میں مخدوم صاحب کے یہاں حاضری دینے کے بغیر کوئی کام
نہیں کرتے۔ کسی کشمیری عورت کو اچھے سے خاوند کی تمنا ہو یا اچھے بچے کی' وہ
اِس زیارت کے منسٹروں (متولیوں) کی طرف رُخ کرتی ہے اور روایت ہے
کہ وہ اس کی خواہش کو بجالانے میں کبھی ناکام نہیں ہوتے۔ وہ کہتا ہے کہ جھیل
ڈل کے کنارے پر دِلی کے ایک بادشاہ نے ایک عمدہ باغ لگوایا ہے۔ وہ
شالیمار کا نام ہے کہ اِسے شاہ جہاں سے منسوب کرتا ہے حالانکہ یہ جہانگیر کا بنایا
ہوا ہے۔فورسٹر کے مطابق باغ' میوے کے درختوں اور پھولوں سے لدی ہوئی
بیلوں سے بھرا ہوا ہے۔ باغ کے عقب سے یہاں ایک ندی داخل ہوتی ہے۔
خاص فواروں سے اس کا پانی اُچھلتا ہے اور یہی باغ کی اصل دلکشی ہے'' اس
جگہ کو آراستہ کر کے مغل بادشاہوں نے اُپنے ذوق کی لطافت کو نمایاں کیا ہے۔''

خاص طور جہانگیر نے دِلُر بانُورمحل کے ساتھ کشمیر کو گرمیاں گذارنے کی سیر گاہ بنالیا تھا اور اُسی نے زیادہ تر اِس کے گردوپیش کی زیبائی کے کام کیئے۔ اُس کے مطابق ڈل کے کنارے پر بنے ہوئے دُوسرے باغات اِتنے اچھے نہیں' حالانکہ ان میں سے دُو حکومت کی تحویل میں ہیں اور اپنی خوبصورتی اور بڑے رقبے کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں۔ باغِ نسیم' شمال مغرب میں اور باغِ نشاط شالیمار کے جنوب مشرق میں۔ جھیل سے اُبھرتے ہوئے کچھ جزیرے بھی نظر نواز ہیں۔ ایک مربع شکل کا چار چِنار کہلاتا ہے کیونکہ اس کے ہر کنارے پر ایک چِنار اُگا ہوا ہے۔ لیکن اِن میں سے ایک سُوکھ گیا ہے اور جزیرے میں جو چبوترہ مرکز میں بنایا گیا تھا وہ بھی خستہ ہوگیا ہے۔ صرف شالیمار ٹھیک صورت میں ہے اور صوبیدار یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔ میں نے بھی صوبیدار کو وہاں دیکھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے اَفسر تھے اور خاص شہری لوگ...... وہ باغات کی حالتِ زار پر آہ بھر کر لکھتا ہے "جب سے کشمیر ہندوستان کی سلطنت سے الگ ہوگیا ہے یہ افغانوں کے زیرِ نگین آگیا ہے (حاشئے میں وہ اِسے اُغلباً ۱۷۵۴ء کا واقعہ قرار دیتا ہے) جو نہ مغلوں کی سی تردِماغی کے مالک ہیں اور نہ اُن جیسی آزاد مشربی کے۔ یہی وجہ ہے اُس کی نفیس عمارتیں کھنڈر بن گئی ہیں اور اُن کی قومی بربریت کی شہادت بن کر سامنے آتی ہیں۔" آگے چل کر وہ امیر خان کو (جس کا نام امیرا کدل سے جُڑا ہوا ہے) کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ ایرانی نژاد تھا۔ وہ جب صوبیدار بن کر آیا تو اس نے جھیلِ ڈل کے مشرق میں ایک قلعہ بند محل تعمیر کیا لیکن اِس کا تعمیری سامان اس قدر خراب تھا کہ صرف آٹھ سال کے بعد یہ رہنے کے لئے محفوظ نہیں رہا۔ وہ اپنا اکثر وقت اِسی جگہ گذارتا

تھا جس میں مشرقی لوگوں کے پسند کی بہت سے تفریح تماشوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اُس کا نام لوگ اَب بھی پیار سے لیتے ہیں کیونکہ وہ بھی اِن ہی (مقامی لوگوں) کی طرح خوشی خوشی گذر کرتے، رنگ رَلیوں اور دستر خواں کی لذّتوں کا رَسیا تھا، جھیل میں ایک بھی ہانجی یا اُس کی بیوی ایسی نہیں ہے جو اُس کا نام لیتے ہوئے خوش نہیں ہوتے اور اُس کے زمانے میں اپنی خوشحالی کی حکایت بیان نہ کرتا ہو۔ یہ صوبیدار بھی اپنے صوبے کی قدرتی مضبوطی پر اعتماد اور کابل سے دُوری کا خیال کرتے ہوئے ُنے اپنے آقا (تیمور شاہ) کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی سرکوبی کیلئے ایک چھوٹا سا لشکر بھیجا گیا جسے دَرّوں میں تعینات چند ہی محافظ پسپا کر سکتے تھے لیکن اُس کے طرفدار عین موقعے پر اَپنی زَبوں ہمتی پر اُتر آئے اور اس کی تاویل یہ دی کہ اگر یہ ایرانی برسرِ اقتدار رہتا تو وہ انہیں شیعہ بننے پر مجبور کرتا، فورسٹر ستم ظریفانہ انداز سے کہتا ہے کہ معاملے کو مذہب سے جوڑتے ہوئے یہ کشمیری ضرور شرمندگی محسوس کر رہے ہونگے۔ وہ زمانے کے چلن کے مطابق ہندو، مسلمان اور عیسائی سب بن سکتے ہیں بشرطیکہ پروہت، پِیر یا پادری موجود ہو۔ فورسٹر نے کشمیر کے چنار کی جسامت اور گیرائی کا ذکر کرتے ہوئے اُس کے پتّے اور اِنسانی پنجے کی مشابہت کی بات کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اَپنی شادابی کے اَیّام میں یہ شان و شوکت اور خوبصورتی کا منظر پیش کرتا ہے اور گرَما کے دِنوں میں نہایت فرحت بخش سایہ دیتا ہے...... اس کے ساتھ ہی وہ کشمیر کے گُلاب کا بڑھ چڑھ کر تذکرہ چھیڑ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، ”یہ اُپنی چمک دمک اور خوشبو کی لطافت کے لحاظ سے مشرق میں بہت مشہور ہے۔ اس کا نِتھرا ہوا تیل یا عطر دُنیا بھر میں پسند کیا جاتا ہے۔ جب اس کے کِھلنے کا

موسم آتا ہے تو کشمیری اِس کو بڑے چاؤ اور چاہت سے مناتے ہیں۔ عُرس کے
سے منظر دیکھنے کو آتے ہیں۔ کشمیری جوق در جوق باغات کی راہ لیتے ہیں۔
وہاں وہ ناچتے گاتے اور دُھومیں مچاتے ہیں...... ایشیاء کی دُوسری اُقوام میں
ایسے نظارے بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دِکھاوے کی ساری سنجیدگی، جو
مسلمانوں کے چال چلن کا شاندار حصّہ ہے، اُکھاڑ کے پھینک دی جاتی ہے۔
تُرک، عرب اور ایرانی اَپنے ملکوں کی لادی ہوئی وضعداری کو رُخصت کر کے
اَپنے جذبات اور رُجحانات کو کُھل کھیلنے کی اجازت دیتے ہیں......فورسٹر نے
''جشنِ گلاب'' کا جو ذکر کیا ہے وہ اس لئے عجیب ہے کہ خال ہی کسی سیاح نے
اِس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خود مقامی تذکرے اور تواریخ اِس ذکر سے خالی
ہیں۔ کشمیری گلاب کی مشکین وجود سے متعلق اُس کا بیان ٹھیک ہے مگر اس
کے چٹکنے کی تقریب کا اہتمام کہاں کھو گیا ہے؟

نہ گُل کھلے، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اَب کے بہار گذری ہے

وہ چھوٹے یا سندھ صغیر کی بات بھی خاص پیرائے میں کرتا ہے۔ ایک
کشمیری پنڈت کا قول نقل کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ یہ تبّت سے (اُن دنوں
یہ لداخ کا بھی نام تھا) نکلتا ہے اور اُکلوتی ایسی ندی ہے جو کشمیر کے اندر سے
نہیں اُبھرتی...... دراصل یہ ایک معنی خیز اشارہ ہے کہ دریاؤں کے مقامی منبع
کسی ملک کی خود مختاری کے نشان ہوتے ہیں۔ سارے برِصغیر میں یہ شرف
صرف کشمیر کو حاصل ہے کہ اُس کا سب سے بڑا دریا جہلم اِسی کی فصیل کے اندر
اور اِسی کے آنگن کے سرے پر اُبلتا ہے اور کشمیر سے باہر جاتے ہوئے وُلر کی

بڑی جھیل کا پالن ہار بن جاتا ہے۔ اس طرح سے زندگی کے سب سے بڑے وسیلے یا آبِ حیات پر اُس کی اپنی فرمانبرداری ہے۔ ایسا نہ ہو تو وہی حال ہو جاتا ہے جو مشرقی پنجاب کا یا مہاراشٹر اور کرناٹک، کرناٹک اور تامل ناڈو کا، جو مشترکہ دریاؤں کی حصہ بٹائی پر اِس طرح پنجہ آزمائی کرتے رہتے ہیں کہ اب حکومتِ ہند سارے دریاؤں کو آپس میں ملانے اور پانی کا مشترکہ Grid قائم کرنے پر کھرب در کھرب خرچ کرنے کے منصوبے بنا رہی ہے...... کشمیر کی خود کفالت اور خود اختیاری کی یہ دلیل خود دستِ قدرت نے اِس کی مٹی پر تقدیر کی لکیر کی طرح تحریر کی ہوئی ہے...... فورسٹر کہتا ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلّط سے پہلے کشمیری برہمن اُپنے علم و فضل کی وجہ سے مشہور تھے اور اس کے شاندار مندروں کا شُہرہ تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اِس کی ماتحتی کا پورا ماجرا کسی ایسی تواریخ میں موجود نہیں جو میری نظر سے گذری ہیں لیکن ایک بات صاف ہے یعنی جس ملک کو قدرت نے اتنی خوبصورتی دی ہو اور جہاں تجارت کا ایسا توشہ ہو، اُس نے پہلے پہل نظریں اُپنی طرف مبذول کرائی ہونگی۔ اس پر تاتار شہزادوں نے لمبی مدت تک حکومت کی جو چغتائی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ (یہ بالکل غلط ہے م ی ٹ) ۱۵۸۶ء میں اکبر کے قبضے تک'' اس نے روایت کے مطابق تلوار کے زور سے زیادہ سازش کا داؤں کھیل کر کامیابی حاصل کی۔''

فورسٹر کے وقت بھی یہ بات سبھی کے علم میں تھی۔ کشمیر خانوادۂ تیمور (مغل) کے تسلّط میں ایک سوساٹھ سال تک رہا۔ پھر مغل گورنر نے دغا بازی سے کام لیکر اسے احمد شاہ دُرانی کے حوالے کیا جس نے اِسے افغانستان کا ایک

صوبہ بنا دیا۔

فارسٹر نے کشمیر کی خصوصی پیداوار اور حرفتوں کا بھی قابلِ حوالہ ذکر کیا ہے۔ وہ عفران کی بات کرتے ہوئے اس کی عمدگی کی تصدیق کرتا ہے لیکن اپنی تان کشمیر کی شناختی صنعت یعنی شالبافی پر توڑ دیتا ہے۔ اُس کے مطابق کشمیر کی دولت ہی نہیں اُس کی شہرت کا بھی بڑا سبب اُس کی یہی حرفت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہ اُس کا کوئی ثانی ہے اور نہ کوئی مقابل۔ اس میں کام آنے والا اُون تبت سے آتا ہے جو کشمیر کے شمال مشرق میں ایک مہینے کی مسافت کے بعد آتا ہے۔ یہ پہلے گہرے میٹالے رنگ میں ملتا ہے لیکن کشمیر میں اِسے چاول کے آٹے کی مدد سے مِلا مَسلا جاتا اور عمدہ بنایا جاتا ہے۔ اِس کو پھر ایسے رنگ دیئے جاتے ہیں جن کی خوب مانگ ہو۔ تیاری کے بعد ہر شال کو دھویا جاتا ہے۔ حاشیہ میں بہت سے نقوش اور رنگ اُبھارے جاتے ہیں لیکن اُسے الگ سے تیار کر کے بعد میں شال کے ساتھ پیوستہ کر دیا جاتا ہے۔ مگر اِتنی نفاست سے کہ اِس کا جوڑ ڈھونڈھے سے نظر نہیں آسکتا۔ شال کی بُنائی یورپ کے شالوں (Shaloon) سے ملتی ہے جس کا نام شاید اِسی کی اصل سے آیا ہے۔ ایک عام شال کی قیمت کھڈی سے نکلتے وقت آٹھ روپے کے قریب ہوتی ہے لیکن میں نے چالیس روپے کی پہلی قیمت کے شال بھی دیکھے ہیں۔ اس کی قیمت میں پُھلکاری سے اضافہ ہوسکتا ہے۔ اگر کسی شال کو ایک سو روپے میں فروخت کیا گیا ہو تو جان لیجئے کہ اس میں سے پچاس اِس کی زیبائش کے گُل بوٹوں کے لئے اَدا کیے گئے ہیں۔ افغان حکمراں کشمیر سے اپنی آمدنی کا بڑا حصّہ شالوں کی صورت میں وصول کرتے ہیں پھر یہ کابل روانہ کیے جاتے ہیں۔ میں نے ان کو خود وہاں بھیجتے

ہوئے دیکھا ہے...... یہ تین سائز کے ہوتے ہیں ایک بڑا اور دوسرا کسی قدر چھوٹا چوکور...... شاید آج کا سکارف اور پہلے کا رُومال...... ہندوستان میں بہت نظر آتا ہے...... تیسرا لمبا سا مگر تنگ چوڑائی کا ہوتا ہے۔ اِس میں سیاہ رنگت نمایاں ہوتی ہے اور اِسے شمالی ایشیاء کے باشندے اُپنی کمر میں باندھتے ہیں۔

"کشمیری مشرق میں بہترین کاغذ بناتے ہیں جو لکھائی میں کام آتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس کی بہت مانگ تھی۔ اِس کے علاوہ جو چیزیں کشمیری دستکار تیار کرتے ہیں وہ اس بات پر گواہ ہیں کہ اگر انہیں سمجھ دار اور آزاد خیال حکمرانوں کی سرپرستی ملتی تو ایسا کوئی فن نہیں جس میں یہ کمال نہ دکھا سکیں لیکن حکومت کے ظلم و جبر اور ہمسایہ صوبوں کے بے رحمانہ سلوک سے اُن کی حالت پتلی ہے۔ ہمسایہ صوبے اِن سوداگروں پر دست درازیاں کرتے رہتے ہیں اور اکثر ان کے سارے سامان کو لوٹتے ہیں۔ اِس وجہ سے کشمیر کی تجارت پر زوال آ گیا ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ بھی ہے کہ جہاں مغل زمانے میں کشمیر میں چالیس ہزار کرگھے چل رہے تھے وہاں اب ان کا شمار سولہ ہزار تک بھی نہیں پہنچتا۔

کشمیریوں کے چہرے بشرے، داڑھیاں اور پہناوا دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہودیوں کی کوئی بستی ہو۔ خود مجھے پہلی بار ایسا ہی لگا۔ یہی کچھ برنیر صاحب کو بھی محسوس ہوا۔ اگر چہ اُس کے ثبوت میں انہوں نے جو باتیں کی ہیں وہ زیادہ خیالی ہیں اور بہت کم قابل باور۔ چھوٹے طبقوں کی عورتیں تو اِدھر اُدھر نظر آتی ہیں لیکن اعلیٰ طبقے (شُرفا) کی خواتین کی جھلک بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ ویسے بھی مسلمانوں میں خاندان کی خواتین کے متعلق بات تک کرنا بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ فورسٹر کی آمد کے وقت کشمیر میں دُنیا کے سب سے پہلے پیشے

کا چلن موجود تھا اور وہ ایسی عورتوں کا کسی حد تک تفصیلی تذکرہ کرتا ہے۔ مگر اُس نے اُن کی دلکشی کے متعلق جو کچھ سُن رکھا تھا اُس کے مقابلے میں وہ ذرا کھُردرِی اور بے کشش نظر آئیں جس سے اُسے مایوسی بھی ہوئی۔ وہ ایسی ناچنے والی عورتوں کی بات بھی کرتا ہے جو بہت خوبصورت تھیں اور اَپنے پیشے کی باقی دلفریبیاں بھی رکھتی تھیں۔ اُن کے جسم بہت نزاکت نہیں رکھتے۔ اُن کے خدوخال موٹے موٹے ہیں اور ٹانگیں بھی کچھ زیادہ ہی فربہ۔ اگر چہ اُن کی رنگت بہت اچھی ہے لیکن مغربی ہندوستان کے کچھ علاقوں کی عورتیں اُن سے اَداؤں اور تن بدن کی رُعنائیوں میں بازی لے جاتی ہیں۔

کشمیر کا شہر ایک وقت طوائفوں سے بھرا ہُوا تھا جو بہت خوش مزاج بھی تھیں اور خوشحال بھی، مگر اُفغان دَور کی سختیوں نے اُن کی تعداد میں کمی لائی ہے۔ اگر کوئی اب بھی اِس پیشے سے وابستہ ہے اُسے غُربت اور افلاس کی زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ بہر حال مجھے ان میں چند ایک سے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے اُن کے ناچ میں شاندار فنّی خوبیاں دیکھیں۔ اُن کی آوازیں بھی بہت میٹھی تھیں اور ہاں اس سے پہلے کہ بھول جاؤں میں کشمیری عورتوں کے متعلق یہ حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بہت آدم خیز ہیں۔ میں اُن جسمانی وجوہات کی تہہ تک نہیں جاؤنگا جن کی وجہ سے یہاں کے عورت اور مرد اِس قدر ثمر بار رہتے ہیں لیکن ایک سامنے کی بات کی طرف اشارہ کرونگا۔ اس کے ندی نالے مچھلیوں سے اَٹے پڑے ہیں۔ یہ کشمیریوں کی خوراک کا ایک بڑا جُز ہیں اور اس سے اَولاد پیدا کرنے کی اُمنگ پیدا ہوتی رہتی ہے۔

کشمیری زبان بھی فورسٹر کے ذہن میں خیالات پیدا کرتی ہے اگر چہ

ان میں کوئی گہرائی یا تحقیقی بصارت کا پتہ نہیں چلتا۔ اُس کا بیان ہے کہ یہ سنسکرت سے نکلی ہے اور لب و لہجے میں مراٹھی سے ملتی ہے۔ اگر چہ اِس کا لہجہ اُس سے زیادہ کرخت ہے۔''شاید اِسی لئے وہ اُپنے گیت فارسی میں لکھتے ہیں یا فارسی شاعروں کے کلام کو اُپناتے رہتے ہیں''فورسٹر کے زمانے کے اِردگرد محمود گامی، سوچھ کرال، رحیم صاحب اور کچھ شیریں نواشاعر اُپنے کشمیری نغمے لکھ رہے تھے مگر اُسے اُن کا نغمہ بار کلام سُننے کو کہاں ملتا ہے۔ وہ شہر کے بازاروں میں اٹکا ہوا تھا اور کشمیری زبان سے نابلد۔ بچارے یہ کشمیری سازنواز تو عوامی زندگی کے بہت اندر اُپنے گیت بناتے اور سُناتے تھے۔

فورسٹر کشمیریوں کے مزاج کی بات کرتا ہے اور انہیں خوشی کے رسیا اور زندہ دِل قرار دیتا ہے۔ ان سے زیادہ دولت کا طالب اور کوئی نہیں اور ان سے زیادہ اِسے حاصل کرنے کی اختراعی صلاحتیں بھی کسی میں نہیں۔ وہ عیش عشرت کے لئے خرچ کرنے کے موقعے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی کم سواد کشمیری بھی اُپنے آپ کو بیس تیس روپیوں کا مالک پاتا ہے تو وہ پارٹی دینے میں دیر نہیں کرتا اور جھیل میں کھانے اور گانے کی مجلس سجاتا ہے' وہ تب تک واپس نہیں لوٹتا جب تک آخری کوڑی تک خرچ نہ کر ڈالے۔ اُفغان حکومت کی ستم رانیاں بھی اُن کے اِس شوق کو ٹھنڈا نہیں کرسکتیں۔ لیکن یہ بھی سننے میں آیا کہ ہندوستان سے ٹوٹ جانے کے بعد اُن کے رکھ رکھاؤ میں کافی فرق آیا ہے۔ مغلوں کی آزاد خیالی اور کُھلی چھُوٹ سے وہ خوب مزے کرنے میں لگن رہتے تھے اور اس بارے میں اپنی خاص جبلت کا لُطف اُٹھاتے رہتے تھے۔ وہ زرّق برّق پوشاکیں پہنتے تھے اور اُپنی عمارتوں پر کافی دھن خرچ کرتے تھے۔

اُن کے دستر خوان پر مزیدار پکوان سجتے تھے...... شاہی دَربار میں اِس صوبے کا اِتنا ہمدردانہ خیال رکھا جاتا تھا کہ اگر وہ گورنروں کے خلاف شکایت کرتے تو اُسے بہت ہی توجہ سے سُنا جاتا تھا۔ لوگوں کو تنگ کرنے یا ستانے کی ہر کوشش کا اِزالہ کیا جاتا اور سزائیں بھی دی جاتیں۔ اِس مرحلے پر اِن سطور کے لکھنے والے کو یہ عرض کرنے کی جسارت بھی ہوتی ہے کہ اُس نے اپنی بہت سی تحریروں میں مغل دَور کی اِن نرمیوں اور شیرینیوں کی طرف بار بار اِشارے کئے ہیں اور انہیں اُن کے غیر مقامی زاد بوم کے باوجود کشمیریوں میں ایک ترقی پسند خوشحال اور فارغ البال دَور برپا کرنے کے لئے سراہا ہے۔ حالانکہ کشمیر کی تواریخ کے غالب دُھارے سے مُنہ موڑنے والے کچھ لوگ اُن کی عیب جوئی میں مبالغہ آرائی کرتے رہتے ہیں...... مغلوں پر ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے شیعوں پر مظالم ڈھایئے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ وہ کشمیر میں برپا اِس نوعیت کی خانہ جنگی کو دَبانے کے لئے یہاں لائے گئے اور پہلے پہل انہوں نے ہر قابض حکمران کی طرح اس بارے میں دَست درازیاں کیں لیکن حالات سُدھرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی عدل پسندی اور نرم رُوئی واپس آئی۔ جہانگیر کے وقت میں ملک حیدر چاڈورہ کشمیر کا سب سے بڑا رئیس اور مقامی حاکم تسلیم ہوتا تھا...... وہ شیعہ مَسلک سے تعلق رکھتا تھا لیکن اُس سے اِس کے اثر واقتدار پر کوئی حرف نہیں آتا۔ حد یہ ہے کہ جب جہانگیر نے اَپنے عشق کی مستی میں غیاث بیگ کی فتنہ دَوران بیٹی نُور جہاں کے شوہر شیر اَفگن کو ایک کشمیری شیعہ ایبہ خان چک کے ہاتھوں قتل کرایا، تو اُسے بنگال سے منگوا کر کشمیر میں اَپنے معتمد ملک حیدر کے تحویل میں رکھا۔ روایت کے مطابق اَپنے پہلے مرد سفا کانہ

قتل سے یہ غارت گرِ دوران اِتنی بھری ہوئی تھی کہ کاٹنے کو دوڑتی تھی لیکن حیدر ملک کی خوش مزاجی اوردانائی نے اُسے ٹھنڈا کر دیا بلکہ اُسے اُپنے خاوند کے قاتل کی تلوار تھامنے والے جہانگیر سے شادی کرنے پر بھی آمادہ کرلیا۔ ایک روایت کے مطابق یہ شاہی وصل پہلے چاڈورہ میں ہی ہوااور جہانگیر نے اُسے وہیں نُورمحل کا خطاب بھی عطا کیا۔ یہ اِتنا مشہور ہوا کہ مغل وقتوں میں چاڈورہ کو نُورپورہ کے نام سے ہی پُکارا جاتا رہا۔ بعض وقائع نگار اِس قدر بہہ گئے کہ انہوں نے نورجہاں کو ملک حیدر کی بیٹی قرار دیا۔ اِس کے علاوہ تواریخ اِس بات میں بھی بالکل صاف ہے کہ مغل دَور میں اِن سے پہلے اور اُن کے بعد کے شیعہ سُنی فسادات تقریباً ختم ہوگئے تھے۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے ایسے بہت سے حاکم کشمیر بھیجے جو شیعہ مُسلک سے وابستہ تھے۔ اُفغانوں نے کشمیر میں جو تاخت وتاراج کیا اُس کی مثال بیان کرتے ہوئے فورسٹر کہتا ہے کہ جہاں مغلوں کے وقت میں کشمیر سے کل ساڑھے تین لاکھ روپے کی رقم مالیہ کے طور پر وصول کی جاتی تھی وہاں افغان صوبیدار اُن سے بیس لاکھ روپے نچوڑتا تھا۔ اُسے آزادی ہے کہ اگر رقم وصول کرنے میں کوئی دِقت پیش آئے تو وہ بدترین قسم کے تشدّد سے کام لے سکتا ہے۔ اِس غضب رانی نے کشمیریوں کی طبیعّت کا سارا ماجرا بدل دیا ہے۔ وہ اُفغانوں کے ظلم کا خیال آتے ہی لرزنے لگتے ہیں اور خوشی یا خوشحالی کا چھوٹا سا مظاہرہ کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتے۔ ''مجھے یہاں پر چند برسوں سے مقیم ایک جارجائی تاجر نے بہت کچھ بتایا۔ اُس نے کہا کہ اس کے یہاں آنے کے زمانے میں ایک خوش خلق صوبیدار یہاں کا حاکم تھا۔ اُس وقت لوگ عشرت پسند، دُھوم مچانے والے اور خرچیلے تھے۔ لیکن اُس کے بعد جو

صوبیدار آیا وہ بہت غصیلے مزاج کا تھا، چنانچہ کشمیری اُداس اور اَفسردہ بن گئے۔ اُن کے چال چلن میں کمینہ پن پیدا ہو گیا۔ اُن کا پہناوا بگڑ گیا اور بے تکلّف طبیعت رکھنے کے باوجود وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا جواب دینے میں احتیاط کرنے لگے......وہ کشمیریوں کے کردار کی کمزوری پر بھی خاموش نہیں رہتا اور یہاں تک کہتا ہے کہ اُن سے بُرا اور کوئی نہیں۔ ''کشمیری کی اصل خصلت اُس وقت کھُلتی ہے جب اُسے کچھ سرکاری اختیار ملے۔ وہ اِس کو اپنی جیبیں بھرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ وہ دوستی کرنے میں بھی اِتنا ہی بودا ہے جتنا دُشمنی کرنے میں خطرناک۔''

فورسٹر کشمیر میں تین مہینے تک ٹھہرا۔ اُس وقت آزاد خان یہاں کا گورنر تھا۔ آزاد خان ایک اور صوبیدار حاجی کریم داد کا بیٹا تھا۔ اُس نے امیر خان کی بغاوت کے لئے انعام کے طور اُپنا عہدہ پایا تھا۔ کشمیری کریم داد خان کی غضب ناکیوں کا دردناک بیان کرتے رہتے ہیں۔ وہ جب کسی پر ناراض ہوتا تھا تو دو کی جوڑی کو رسیوں میں باندھ کر ڈل میں چھوٹی بڑی عورتوں کی عصمتیں تار تار کرتا تھا۔ لیکن کشمیر پھر بھی کہتے ہیں کہ اُس کے مظالم میں ایک قاعدہ تھا اور وہ بندھے ٹکے اُصولوں پر ہی زیادتیاں کرتا رہتا تھا لیکن اُس کے بیٹے کا ذکر وہ کچھ اور انداز سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ 'ظالم خام'' ہے جس کے فارسی میں معنی یہ ہیں کہ اُس ظلم کرنے کی بھی تمیز نہیں اور اس کے متعلق جو کچھ بتایا جاتا ہے اگر صحیح ہے تو وہ اِس لقب کا حقدار ہے۔ وہ اٹھارہ برس کا ہے۔ جوانی کی دیوانگیوں میں نہیں ڈوبا ہے اور نہ حرم کے مزوں کا خیال رکھتا ہے شراب پینے کی بات نہیں وہ حُقّہ تک نہیں پیتا۔

مگر پھر بھی اُس کے ظُلم......توبہ توبہ

اِس سلسلے میں فورسٹر ایک واقعہ بیان کرتا ہے۔ اُپنی تخت نشینی کے فوراً بعد اُس نے اُپنی ماں پر اَپنے شوہر سے بے وفائی کا الزام لگایا۔ اُسے محل سے گھسیٹ کر نکالا گیا۔ اِسی طرح اور ایسے ہی الزام پر اُس نے اپنی ایک بیوی کو بھی قتل کر دیا۔ اُس کی آنکھ میں کوئی فتور ہُوا تو حکیم کو لایا گیا۔ اُسے چند دن کا وقت دیا گیا کہ اِس دَوران اس بیماری کا مداوا ہونا چاہئے جب ایسا نہ ہو سکا تو اس نے حکیم کا پیٹ چاک کروا کے اس کی انتڑیاں نکالیں ......'' آزاد خان کے متعلق میں نے مختلف لوگوں سے مختلف کہانیاں سنیں۔ جب اُس کی حکمرانی پر صرف تین ماہ گذرے تھے تو اس کا ایسا خوف طاری ہو گیا تھا کہ اُس کا نام سنتے ہی لوگ وَحشت زدہ ہو جاتے اور بے اختیار طور پر اَپنے حضور پیغمبرؐ کا نام وِرد کرنے لگتے ...... وہ طوائفوں اور ناچنے والی لڑکیوں سے بھی ٹیکس وصول کرتا۔ انہیں اُپنی کمائی کی پائی پائی کا حساب دینا پڑتا اور آمدنی کا بڑا حصّہ پولیس کے حوالے کرنا پڑتا۔ یہ طوائفیں کسی شادی بیاہ یا تفریحی مجلس میں بھی نہیں جاسکتیں، جب تک سرکار کا اجازت نامہ حاصل نہ کریں۔ اِن بچاری عورتوں پر جو سماج کی دل جوئی کا کام کرتی ہیں، کی زندگیاں تباہ کر دی گئیں ہیں۔ اگر چہ کشمیر طوائف برادری کے لئے مشہور ہے لیکن اَب خال ہی اِس کوچے میں آتی ہے۔ اَفغان کشمیریوں کو اُپنی فوج میں بھی جگہ نہیں دیتے اور اُن میں اس کا رُجحان بھی کم ہے۔ یہاں کے لوگ سرکار میں ایک مٹی کا آتشدان لے کر گھومتے ہیں جو اُن کی رانوں کے ساتھ رہتا ہے اور انہیں جلنے کے نشان پیدا کرتا ہے اِگر کوئی کشمیری چوری چھُپے فوج میں جانے کی کوشش کرے تو اُس کی

رانوں کے یہ داغ اُس کا پردہ فاش کرتے ہیں۔ (ظاہر ہے کہ یہ کانگڑی کی بات ہورہی ہے۔شاید اُن دنوں اس کا مٹی کا روپ ''منن'' زیادہ چلتا تھا اور اسی لئے رانوں کے داغ زیادہ تھے۔شاید کانگڑی کی موجودہ شکل جس میں اُس کے اُوپر لکڑی کی تیلیاں لگائی جاتی ہیں، بعد میں عام ہوا۔)

کشمیر میں رشوت ستانی کس قدر عام تھی اس کا ذکر فورسٹر بار بار اور دیکھی اور جھیلی ہوئی مثالیں دے کر کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ زَر کا زور ہر جگہ چلتا ہے اور بڑے بڑے قہرمانوں کو پگھلا کے رکھتا ہے۔اُن دِنوں کشمیر میں رُوپے کا چلن تھا۔اُس کے بیان کے مطابق اسے رُوہیل کھنڈ کے مُرادآباد شہر میں ڈھالا جاتا تھا۔اس کی چاندی میں ملاوٹ ہوتی ہے اور اس کا Discount کشمیر میں بھی رائج ہے۔اس کے علاوہ پیسے تانبے کے ہوتے ہیں اور کوڑی، سمندری جانور کا چھوٹا سا خول بھی کشمیر کی کرنسی کا نچلا حصہ ہے۔وہ جون کی ۱۴ تاریخ کو کشمیر سے چلا۔ پہلے اُوڑی اور پھر بامبوں کے علاقے میں۔وہ کہتا ہے کہ یہ افغان نسب کے ہیں اور کشمیریوں کے دشمن ۔ وہ کہتا ہے کہ اُن دنوں اِس علاقے میں کشمیر پر ایک اور چڑھائی کی باتیں بھی سننے میں آرہی تھیں۔

فورسٹر نے دریائے کشن گنگا کا ذکر کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ لوگ اِس کو عبور کرنے کے لئے بھیڑ یا کُتے کی کھال میں پھونک بھرتے ہیں۔ پھر اس اُبھری ہوئی کھال کو اُپنے سینے کے نیچے دباتے اور پیروں کو ہلا کر آگے تیرتے ہیں۔

فورسٹر کا سفرنامہ کشمیر کے پُرآشوب اور دُھندلے دُھندلے اُوقات کی عکاسی کرتا ہے۔اِس دَور کے متعلق ہمارے پاس اور کوئی ایسا سفرنامہ بھی نہیں۔ اُس کے نتائج سرسری ہیں لیکن مشاہدہ دُرست ۔اِس کے دَور کی کشمیر کی بعض

جھلکیاں اَب بھی یہاں نظر آتی ہیں مگر اس کی اہمیت اُن معلومات کے لئے دیئے جو اُس کے بعد آہستہ آہستہ ماند پڑ گئیں اور اَب عدم آشنا ہیں۔فورسٹر کو کشمیریوں سے ہمدردی نہیں تھی لیکن اِن پر مظالم کی قہر سامانیاں ایسی قیامت خیز تھیں کہ اس کے نیلی انگیریز آنکھوں میں بھی بے ساختہ آنسوؤں کے فوارے چھوٹتے نظر آتے ہیں...... مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا۔

فدا محمد حسنین☆

قدیم کشمیر اور لداخ
جاپانی مصنّف کی نظر میں

پروفیسر ڈاکٹر ٹوکان ڈی سُومی کی "The Budhist Culture in Kashmir and Ladadh"، سنٹر فار بُدھسٹ سٹیڈیز آف ہمالین سٹیٹس نے آج سے تقریباً تیس سال قبل چھاپی۔ یہ جاپانی زبان میں لکھی گئی ہے اور ۲۹۷ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس سنٹر کے مقاصد یہ ہیں۔

ا۔ ہمالیائی ممالک اور ریاستوں جیسے نیپال، سکیم، بھوٹان، لداخ، کشمیر اور تبت میں بُدھسٹ سٹیڈیز میں تحقیق کے لئے مختلف اِداروں اور افراد کو مالی امداد۔

۲۔ بدھسٹ سٹیڈیز کے لئے نئی جہات کی کھوج اور نظر انداز یا نئے

☆۔ پرے پورہ۔ صنعت نگر سرینگر

شعبوں میں مرحلہ وار طور نئے پروجیکٹ شروع کرنا۔

۳۔ ہمالیائی ریاستوں میں بُدھسٹ سٹیڈیز کے شعبوں میں تحقیق کے عمل کو مربوط کرنا اور ایسے پروگراموں کی مختلف اَنداز سے حوصلہ افزائی۔

پروفیسر ٹوکان ڈی سومی ۱۹۱۴ء میں جاپان میں پیدا ہوئے، ٹوکیو یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد اُنہوں نے انڈین فلاسفی میں سپیشلائزیشن کی۔ اُن کی عالمانہ خدمات کے اعتراف میں انہیں شاردا پیٹھ کشمیر کی طرف سے ڈاکٹر آف انڈالوجی کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا۔ دہلی کی اُنا ین سمسدھ کی طرف سے ڈاکٹر آف بُدھسٹ فلاسفی اور ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی۔ آپ ہمیشہ محوِ سفر رہتے ہیں اور بُدھ اِزم، ہمالین کلچر اور کشمیر کی قدیم تواریخ پر آپ کئی کتابیں پہلے ہی رقم کر چکے ہیں۔

آپ کلہن کی راج ترنگنی کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ آپ کی دیگر کتابیں Budhism in Ladakh, Himalyan Region اور Moonland Ladakh ہیں۔ اس کے علاوہ آپ چوتھی صدی عیسوی میں کنشک کی طرف سے کشمیر میں منعقد کروائی گئی چوتھی عالمی بُدھسٹ کانفرنس پر بہت سے مقالے بھی لکھ چکے ہیں۔ آپ ہندوستانی کلچر اور بدھسٹ فلاسفی کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں اور جاپان کی بڑی بڑی دانش گاہوں میں اِن شعبہ جات کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ آپ قدیم کشمیر کے شیومت، لداخ اور تبّت کے بودھ تانترک، اور جاپانی تصوّف کے اعلیٰ قدر عالم مانے جاتے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ Aichi unversity of Education میں پروفیسر

ایمریٹس ہیں۔

جاپانی زبان میں لکھی گئی. ''بُدھسٹ کلچر اِن کشمیر اینڈ لداخ'' میں درج ذیل موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

(ا) کشمیر اور اسکے لوگ۔

(ب) کشمیر میں بُدھسٹ کونسل۔

(ج) رانُتھن ، راجگیر اور پچھ گام میں بُدھ مذہب کے پیروکاروں کی باقیات۔

(د) لداخ میں بُدھسٹ کلچر۔

(ہ) کشمیر میں بُدھسٹ کلچر۔

کتاب کا مصنّف، کشمیر کا ذکر بہت ہی احترام سے کرتا ہے اور کہتا ہے۔

''جب ہم کشمیر کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہاں کئی تہذیبیں پھلی پھولیں۔ اَبھے دھرم شاستر ہمیں بتاتے ہیں کہ وہاں اَبھے دھرم کے عالموں کی دُو دھارائیں تھیں۔ ایک کشمیری اور دوسری گاندھارا اور دونوں ایک ساتھ آگے بڑھتی رہیں۔''

مصنف کے مطابق کشمیر ہندوستان کے شمال میں 32°.20 تا 34° عرض بلد اور 73° تا 75°.40 طولِ بلد کے درمیان واقع ہے۔ یہ اونچے پہاڑوں کے بیچ میں ایک پیالے کی مانند تھے۔ یہ ۸۴ میل لمبی اور ۲۰ تا ۲۵ میل چوڑی ہے۔ وادی کے اِردگرد پہاڑوں کی بلندی ۱۲ ہزار سے ۱۸ ہزار فٹ کے درمیان ہے جب کہ وادی اوسطاً ۵۰۰ فٹ سطح سمندر سے بلندی پر واقع ہے۔ مقامی روایات کے مطابق وادی ہزاروں برس قبل ایک بہت بڑی

جھیل (ستی سر) تھی اور دیوتاؤں نے یہاں سے پانی کی نکاسی عمل میں لائی اور تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دیوتا کوئی اور نہیں بلکہ مختلف قبائل کے سردار تھے۔

ہندوستان میں پہلے مغل شہنشاہ بابر کشمیر کو پہاڑی لوگوں کو مسکن ''کاس'' بتاتا ہے اور اِسے ہی ''کشمیر'' کی وجہ تسمیہ بتاتا ہے۔ اور ''میر'' کا مطلب پہاڑ ہے۔ لیکن ''کشمیر'' نام بہت ہی قدیم ہے اور اس کی مختلف تاویلیں دی گئی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کشمیری، کشمیر کو ''کشیر'' کہتے ہیں۔ کشمیر کو عظیم جھیل ''ستی سر'' قرار دینے کی ابتدا چھٹی صدی عیسوی میں تحریر ''نیل مت پُران'' سے ہوتی ہے۔ اِس میں درج روایت کے مطابق ستی سر راکھشوں کے سردار' جلودبھو کے قبضے میں تھا۔ وہ اَپنی ہمسائیگی میں رہنے والوں کو بھی تکلیفیں دینے سے باز نہیں آتا تھا۔ چنانچہ کشپ، جو ناگوں کا سردار اور پاکباز شخص تھا، نے دیگر لوگوں کی مدد سے ''جلودبھوَ'' کو زیر کر لیا اور ستی سر سے پانی کی نکاسی عمل میں لائی گئی اور وہاں پر ناگ بس گئے۔ اِن روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ناگوں سے قبل کشمیر میں ''جلودبھوَ'' قبائیل رہتے تھے۔

مصنفؔ بودھ سُوتروں میں کشمیر کے تذکرے کے بارے میں لکھتا ہے۔

> ''کشمیر کا نام بودھ سُوتروں اور شاستروں میں اکثر آیا ہے۔ دورِ قدیم ہی سے کشمیر بُدھ مت کے طالب علموں، پیَروکاروں اور مبلّغوں کے لئے ایک بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ اُپنی علمی روایات کی وجہ سے یہ بہت سے عالموں کی آماجگاہ رہا۔ ہندوستان میں داخل ہونے کے شمالی دروازے پر واقع ہونے کی وجہ سے کشمیر، بُدھ کلچر اور روایات کے وسطِ ایشیا' چین، کوریا اور جاپان پہنچنے کے لئے شاہراہ بن گیا۔ چین میں بُدھ مت کی ابتدائی تاریخ میں بیسیوں کشمیری عالموں اور مترجمین نے
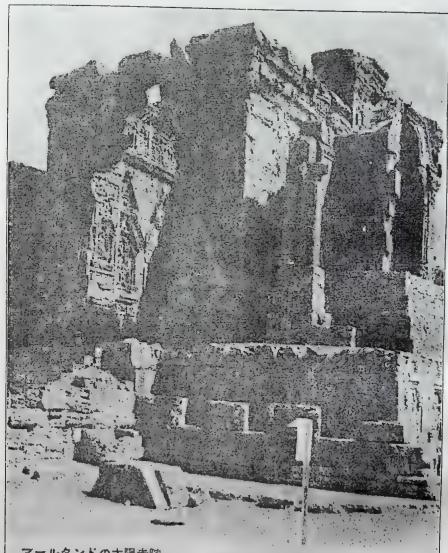
マールタンドの太陽寺院
世紀、ラリタリターディティヤ王により建立されたヒンドゥー教寺院の遺跡
王は、中国の「唐書」には"木頭筆"として知られた英雄であった。
シミールに栄えたヒンドゥー文化の在りし日を偲ばせる壮大なものである。

جاپان میں کشمیر کے آثار قدیمہ پر تحقیق

کتاب کا سرورق

قدیم مَنادر کی کھوج

قدیم شِومندر۔ مخصوص کشمیری طرزِ تعمیر
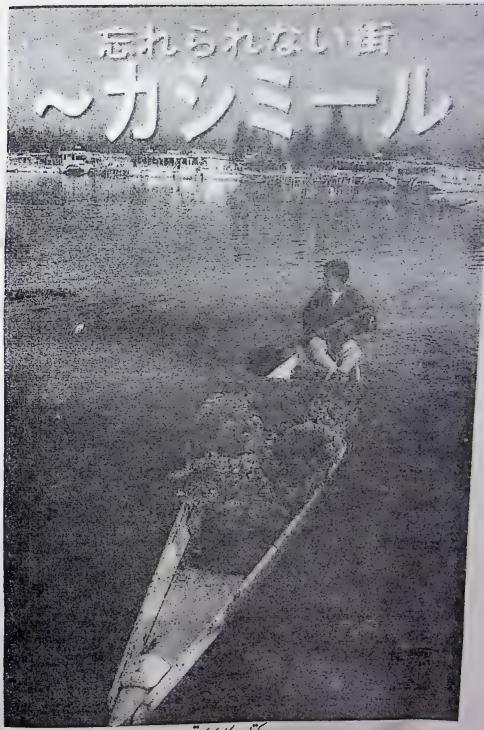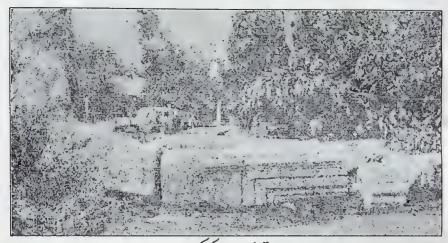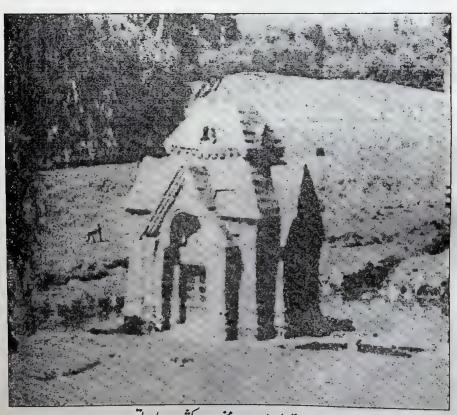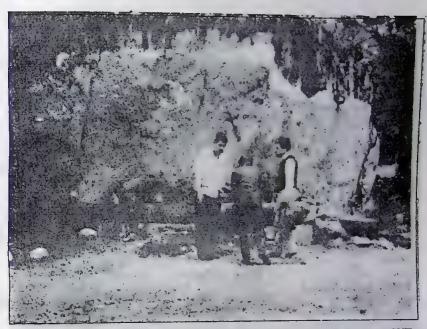
▲写真3-4 "赤銅板"の経典が埋められていたといわれるストゥーパ跡の巨石
―ライタンの村にて 玄奘が「大唐西域記」で報告した"赤銅板"は、
この石板の下に埋められているものと推定される―

کشمیر میں بدھ دور کی باقیات

ヒマラヤ文化

－カシミール・ラダックの仏教－

編集　鷲見東観

刊行　ヒマラヤ仏教研究センター

لداخ کے ہیمس گنپہ میں شاکھیہ منی

Yecchgam— the famous Buddha panel, Discovered by Professor Hassnain.

وہاں بدھ مت کی تعلیمات عام کرنے کے لئے ناقابلِ فراموش کردار ادا
کیا۔ اس کو ہم کشمیری بدھ ازم کا اہم وصف شمار کر سکتے ہیں۔"

کشمیری لوگوں کی اصل

کشمیری لوگوں کی اصل پر بحث کرتے ہوئے مصنّف رقمطراز ہے کہ
انہوں نے اَپنی تواریخ اور تمدّن کو اِنسانی تہذیب کے طلوع سے سنبھال کے رکھا
ہے۔ انہوں نے شاردا رسم الخط میں کشمیر اِس کے اَستھاپنوں، گاؤں، بادشاہوں
اور عام لوگوں کے بارے میں لکھا ہے۔ اُن کے پاس مذہب، فلسفہ، تواریخ اور
دیگر موضوعات پر بہت ہی قدیم تحریری روایات ہیں۔ نیل مت پُران، قدیم
کشمیر اور کشمیری لوگوں کی اصل کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم
کرتا ہے۔ یہ ہمیں اُن مختلف قبائل کے بارے میں بتاتا ہے جو کشمیر آئے اور
یہاں بس گئے۔

پروفیسر ٹوکن ڈی سوسی لکھتا ہے کہ کشمیر مختلف نسلوں کی آماجگاہ رہا ہے
جن کی زبانیں اور ثقافتی روایتیں ہمیں اِن کے تہذیب یافتہ ہونے کی دلالت
کرتی ہیں۔ یہاں ہند- یونانی آئے۔ کُشان آئے، شاکھا آئے اور ان کے
ساتھ ہُن بھی۔ بوٹ اور کراٹ بھی اِس وادی میں اُقامت گزیں ہوئے۔
ہند- آریائی نسل نے بھی یہاں اَپنا غلبہ جمایا۔ اِس سلسلے کی آخری یلغار پشاچوں
اور ہندوکش کے کافروں اور دَردوں کی تھی، جہاں سے کشمیری زبان معرضِ
وجود میں آئی۔ نیل مت پُران میں درج ہے کہ پشاچوں نے پُرانے وقت میں
کشمیر میں اَپنے قدم جمائے۔ یہ لوگ پامیر یا وسطِ ایشیاء سے آئے۔ انہوں نے
ناگوں پر اپنا غلبہ قائم کیا۔ پشاچ اور یکھش ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

کشمیر کے اصل قبائل

کشمیر کے اصل قبائل کی تصویر واضح کرتے ہوئے مصنّف لکھتا ہے کہ چوں کہ دَورِ قدیم کے قبائل کے بارے میں کوئی مصدّقہ اطلاعات بہم نہ ہونے کی وجہ سے ناگ، کشمیر کے ابتدائی باشندے گردانے جاتے ہیں البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ''جلودبھو'' کے قبیلے کے بعد پشاچ، ائسر، دانو اور یکھش یہاں رہتے تھے۔ لگتا ہے کہ ناگوں نے ہمالیائی پہاڑی سلسلے کو پہلے پہل اُپنا مسکن بنایا۔ پشاچ، آریوں کے سلسلے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ حوالوں سے عندیہ ملتا ہے کہ پشاچ اور یکھش آپس میں یگانگت سے رہتے تھے۔

کشپ اور اس کے برہمن پیروکاروں کے کشمیر آنے سے قبل وادی میں دُو بڑے قبیلے رہتے تھے۔ پشاچ اور یکھش۔ کشمیری پنڈتوں کے دُو بڑے گروہ ہیں، مل ماسی اور بھان ماسی، جن کا مطلب یہاں کے اصل باشندے اور باہر سے آنے والے باشندے ہیں۔ یہ دو گروہ چاند اور سورج کے ساتھ منسوب ہیں۔ابتداء میں کشمیری پنڈتوں کی چھ ذاتیں تھیں جو بعد میں بڑھ کر ۱۳۳ ہوگئیں۔ کشمیری پنڈت بہت سے گوتروں یا ذیلی طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں جو آگے چل کر بہت سی کراموں اور درجہ بندیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ شادی ایک ہی گوتر میں نہیں کی جاتی۔ یہ مانا جاتا ہے کہ مل ماسی یہاں کے اصل باشندے ہیں جبکہ بھان ماسی باہر سے آئے۔ کشمیری، وادیٔ کشمیر کی زبان ہے اور اِسے ''کأشُر'' کہا جاتا ہے۔ کشمیر کے لوگ خود یہ بتاتے ہیں کہ وادی پشاچوں کا مسکن تھی جن کو یہاں آنے والے مہاجروں نے زیر کرلیا۔

سیتھی ، ہندوستان اور ایران میں ساکا کے نام سے جانے جاتے تھے۔ چینی حوالہ جات کے مطابق وہ پہلی صدی ق-م میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ یو-چن قبیلوں کے دَباؤ کی وجہ سے ساکا ۱۰۰ ق-م میں کشمیر میں وارِد ہوئے اور آتے ہی یہاں اپنا غلبہ قائم کرلیا۔ یو-چن بہت سے قبائل میں بٹ گئے جن میں سے ایک کُشان ہے۔ کنشک نے اِس خطے میں اُپنی عظیم الشان سلطنت قائم کی۔

یکھش

مصنّف نے یکھشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قدیم ہندوستان کا مشہور شاعر کالیداس اُپنی مشہور سنسکرت تصنیف ''میگھ دوت'' میں یکھشوں کو مہربان، ہُنرمند اور مہذب گردانتا ہے لیکن اس دَور کی بعض دیگر تصنیفات میں اُن کو شیطانی طاقتوں سے آراستہ بھی قرار دیا گیا ہے۔

ہندو اَساطیر میں اُن کی مختلف تاویلیں کی گئیں ہیں اور انہیں خدائی طاقتوں سے مملو قرار دیا گیا ہے۔ یکھشوں نے کشمیر میں بہت سے اُتار چڑھاو دیکھے۔ ایک وقت میں اُن کو بھگوان اور ایک وقت میں شیطان قرار دیا گیا۔ اس وقت کشمیر میں ''یکھش'' کو منفی معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اُن کو خوفناک (بچھ) اور خونخوار تصوّر کیا جاتا ہے۔ ہر برس کشمیری پنڈت ''یکھش اَماوَس'' مناتے ہیں۔ اِس موقعے پر وبہترین کھانا پکایا جاتا ہے اور اِسے یکھشوں کو راضی کرنے کے لئے بطور خراج پیش کیا جاتا ہے۔ یہ رسم سردیوں میں ۱۵ اِویں اَماوَس کو منائی جاتی ہے۔ یکھشوں کا ذکر بُدھسٹ اور ہندو کتابوں میں مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔ بھگوت گیتا میں یکھشوں کو قابلِ پرستش بتایا گیا ہے۔

جب کہ بُدھ مت کی کتابوں میں انہیں اساطیری بتایا گیا ہے جو کہ ہَوا کی رفتار کے ساتھ اُڑ سکتے تھے اور مختلف شکلیں اختیار کر سکتے تھے۔ انہیں کسی کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ اس بات پر یقین کرنے کی وجوہات ہیں کہ کشمیر میں بُدھ مت کے دَور سے قبل اُن کی پوجا کی جاتی تھی۔ چنانچہ مصنّف رقمطراز ہے۔

''یکھشوں کو پشاچ بھی کہا جاتا تھا۔ کشمیری، دَردی اور کافر پشاچی بنیادوالی زبانیں بولتے ہیں، جن کو دورِ حاضر میں ہند-آریائی زبانیں بتایا گیا ہے۔ جب مہاتمابُدھ نے چار بڑے بادشاہوں کو اپنی تعلیمات کی دیکھ ریکھ کی تلقین کی، تو تین کو سرسری اُپدیش دیا لیکن جب وہ کُبیر سے مخاطب ہوئے تو اُسے خاص طور سے تلقین کی کہ اُن تعلیمات کی خاص نگہداشت کی جائے کیوں کہ شمال سے آنے والے بعض ظالم بادشاہ اس کے لئے خطرہ ہوں گے۔

کُبیرؔ ہندوستان کے شمال خطّے کا والی تھا اور وہ یکھشوں کا راجہ تھا۔ کُبیر، جو کہ یکھشوں کا راجہ تھا شمالی خطّے کا نگہبان تصور کیا جاتا تھا۔ وہ جنگلوں، جھیلوں، دریاؤں اور بچوں کا محافظ ہے۔ کُبیر کو پنچکا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یکھش، مندروں اور بچوں کی حفاظت کے لئے ہیں۔''

تواریخی شہادت

مصنّف کے مطابق قدیم تواریخی کُتب میں یکھشوں کے متعلق بہت ہی کم معلومات بہم ہیں۔ البتہ کلہن کی مشہور زمانہ راج ترنگنی اُن کے متعلق مفصل تفصیلات فراہم کرتی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ یکھشوں نے کشمیر کو صفحۂ ہستی سے نابُود ہونے کے بچانے کے لئے پتھروں کا ایک بہت بڑا پشتہ

بنایا۔ راجہ دامودر (ثانی) نے مختلف ڈیم قائم کرنے کے لئے اُن کی مدد لی۔
کشمیر میں یچھ نام سے کئی گاؤں ہیں جو کہ اصل میں یکھش ہیں لیکن کشمیری
زبان میں اس کے نام ہیت تبدیل ہوگئی ہے۔ اِس وقت بھی کشمیر میں یکھشوں
کو ''یچھ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ''یچھ'' دامودر گاؤں کے پاس واقع ہے
جو کہ سرینگر سے محض چند کلومیٹر کی دُوری پر واقع ہے۔ یچھوں سے وابستہ بعض
مقامات امتدادِ زمانہ کی کی وجہ سے عوامی حافظے سے اُتر گئے ہیں۔ یکھشوں اور
ناگوں کے درمیان بالادستی کی جدوجہد کی بعض شہادتیں اِس وقت بھی دستیاب
ہوجاتی ہے۔ ''دیکھش'' یکھنو کے نام سے جانے جاتے ہیں اور کشمیری
پنڈتوں کی بعض ذیلی ذاتیں یکھنو ہیں۔ یہ ۹۹ ذاتوں کی فہرست میں شمار ہیں
کشمیر کے کئی گاؤں، جن میں یکھش رہتے تھے، اُن کی تفصیل یُوں ہے۔

یچھ گام ، یچھ کوٹ ، یچھ ہامہ ، یچھ بل ، یچھ کنڈل ، یچھ ہورہ ، یچھ
نامبل، یچھن وغیرہ

بہت سے مقامات ''ی'' ''الف'' سے مبدّل ہوگئے ہیں جس کا نتیجہ یہ
ہے کہ ''یچھ گام'' ''اچھ گام'' بن گیا ہے۔ یکھشوں کے متعلق کتاب کا
مصنّف لکھتا ہے کہ وہ پُستہ قد تھے لیکن مضبوط جسمانی ساخت کے تھے اور یہ
تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ وادی کے اصل باشندے تھے۔ کشمیر کے برہمنوں نے
آج سے ہزاروں سال قبل یکھشوں کی پوجا کی روایت قائم کی ہے تاکہ وہ اُن
کے عتاب سے محفوظ رہیں۔ یہ رسم آج بھی کسی نہ کسی شکل میں قائم ودائم ہے۔
ہر برس سردیوں کے دوران کشمیری پنڈت خاص اہتمام سے پکائی گئی خوراک
مٹی کے برتنوں میں رکھ کر مکان، صحن وغیرہ میں رکھ دیتے ہیں جو کہ یکھشوں

کے تئیں اُن کے عقیدت واحترام کا مظہر ہے۔ کشمیر میں ویری ناگ، کوکرناگ اور سکھ ناگ وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن علاقوں میں ناگوں کی آبادیاں تھیں جن کی مناسبت سے ان علاقوں کے نام پڑ گئے۔

یکھشوں نے کنشک کے عہد میں کافی اہمیت حاصل کی جبکہ وہ اُن بودھ ستوپوں' جن میں بُدھ تعلیمات محفوظ رکھی گئیں تھیں، کے محافظ بنائے گئے لیکن ابھیمن یُن (اوّل) کے دَور میں اُن کا قافیہ حیات تنگ کیا گیا۔ یہ وہی راجہ ہے جس کا کلہن نے اندر دیوتا کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ اِسی دَور میں یکھشوں اور بُدھوں کو قریب قریب نیست و نابود کیا گیا۔ بقول کلہن ''یکھشوں کا عتاب الٰہی کے طور اِسی دَور میں خاتمہ کیا گیا۔ کشمیر میں اس وقت بھی ایک قبیلہ ہے جس کا نام ''پوٗنی یچھ'' ہے جس کا مطلب پانی کے یکھش ہیں۔ یہ شاید یکھشوں کی باقیات ہیں اور فی الوقت اس کے کچھ کنبے ہی کشمیر میں آباد ہیں جو کسی کے مرنے پر بعض خاص رُسوم اُدا کرتے ہیں۔ جب کشمیری پنڈتوں کے ہاں کسی کی موت ہوتی ہے تو دَسویں روز ''پوٗنی یچھ'' کو بعض رسومات اُدا کرنے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ رسم دریا کے کنارے ہوتی ہے جب کہ مرنے والے کا تمام سامان اُس کے حوالے کیا جاتا ہے۔ اس میں مرنے والے کی چھتری، کانگڑی اور چوبی چپلیں وغیرہ شامل ہیں۔ یہ عقیدہ ہے کہ ''پوٗنی یچھ'' کی وساطت سے یہ ضروری اشیاء مرنے والے کو مرنے کے بعد کی دُنیا میں پہنچائیں جائیں گی۔ مرنے والے کے رشتے دار کھیر وغیرہ بناتے ہیں اور اسے پوٗنی یچھ کو کھلاتے ہیں' اُسے دَکھشنا کے طور نقد رقومات بھی دی جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ پانی کو کشمیری پنڈت ''پوٗنی'' کہتے ہیں۔

کتاب کا مصنّف یکھشوں کا رِشتہ کُشانوں سے جوڑتا ہے جس کیلیۓ وہ کہتا ہے کہ کشمیر میں اس کی معتبر شہادتیں دستیاب ہیں۔ مصنّف بتاتا ہے کہ کشمیر پر ہشک، جسک اور کنشک نے حکومت کی۔ کنشک نے کشمیر میں چوتھی بُدھ کونسل کا انعقاد کرایا۔ کونسل میں لئے گئے فیصلوں کو تانبے کی تختیوں پر کندہ کرایا گیا اور انہیں ایک ستو پا میں رکھا گیا۔ اس کی اطلاع ہمیں چینی، تبّتی اور بعض قدیم ہندوستانی کتابیں دیتی ہیں۔ یہ بھی اطلاع ملتی ہے کہ اِس اثاثے کی حفاظت کا کام کنشک نے یکھشوں کو سونپا تھا۔

لفظ کشان کے اصلی مطلب Yueh-chil لوگوں کے قبیلے یا کنبے بتاۓ جاتے ہیں۔ دوّصدی قبل مسیح میں وَسط ایشیاء میں ان لوگوں نے طاقت حاصل کی اور بتدریج کشان سلطنت کی داغ بیل پڑ گئی۔ کُشان سلسلہ قائم کرنے میں تین قبیلوں نے بنیادی کِردار اُدا کیا۔

۱/ وسطِ ایشیاء سے yueh-chih اور Wu-Suns

۲/ وسطِ ایشیاء سے ہی Saka اور Kankiu

۳/ Caspia اور Aral کے سمراٹ

بیکٹریا میں کشان سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مصنّف بتاتا ہے کہ خانہ بدوش قبائل دوسری صدی قبل مسیح وسطِ ایشیاء، شمالی ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور مشرقی ایران میں اکٹھے ہوۓ اور ایک مملکت قائم کی۔ یہ اتحاد مختلف عوامل کی بنا پر عمل میں آیا جن میں نسلی یکسانیت اور اس علاقے کے لوگوں کی مشترکہ ثقافتی روایات شامل ہیں۔ کنشک نے پہلی صدی عیسوی میں اِس خطّے پر حکومت کی اور اس کے بعد اس کے وارث واسدیو نے۔ واسدیو، ناگ ارجن

کا پیروکار تھا اور دونوں کنشک کے ہم عصر تھے۔ ناگ ارجن، واسدیو اور اشوگھوش کشمیر کے مشہور ناگ بدھ تھے۔

مہاتمابُدھ کے انتقال کے بعد بدھ مت کئی مکتبۂ ہائے فکر میں بٹ گیا اور اِس سے اُن کی سالمیت بُری طرح متاثر ہوئی۔ مہاتمابُدھ کے تین سو سال بعد کا تیایانی پُتر نے گن پرستھان شاستر کی تدوین کی جو کہ سرواستوادن کا بنیادی محرّک ہے۔ اِسی صحیفے کی بنیاد پر واسومترا نے مہاوبھا شاستر کی تخلیق کی۔ یہ کام کنشک کے عہد میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اِسی عہد میں مہایان طبقے کی نشوونما ہوئی اور یہ وسطِ ایشیاء اور مشرق بعید میں پھیل گیا۔

متعدد اَساطیر نے کنشک کو بُدھ مت کا پیروکار بتایا ہے جس نے کشمیر میں چوتھی بُدھ کونسل کا انعقاد کیا۔ چینی اور تبتی ماخذ ہمیں اِس بات کی اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں کشمیر میں کنشک کے دَور کے سکے بھی ہمیں ناقابلِ تردید شہادت فراہم کرتے ہیں جن پر مہاتمابدھ کی شبیہہ ہے۔ کنشک نے تختِ نشین ہونے کے ایک سال کے اندر ہی اِس کونسل کا اہتمام کیا تھا۔ ساتھ ہی ترن انتھا ہمیں بتاتا ہے کہ کنشک کی ایماء پر ہی تیسری بودھ کونسل بھی ہوئی اور یہ کونسل کشمیر میں کنڈل وَن وِہاریا کو دانا گمپہ جالندھر میں ہوئی۔ اِسی دَور کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ پارسو نے کنشک مطلع کیا کہ کشمیر چاروں طرف سے مستحکم پہاڑوں سے گِھرا ہوا ہے جن کی حفاظت یکھش کرتے ہیں اور اِسی وجہ سے بودھ کونسل کشمیر ہی میں منعقد ہوئی۔ مشہور چینی سیاح ہیون سانگ تانبے کی تختیوں کے بارے میں بتاتا ہے۔

"اس کے بعد کنشک نے مشاورت کے اہم نکات کو سُرخ تانبے

کی تختیوں پر کندہ کرایا اس کے بعد انہیں پتھروں کے سر بمہر صندوق میں ایک ستوپ کے اندر رکھوایا اور حکم دیا کہ ان کی حفاظت کے لئے یکھشوں کو مامور کیا جائے تا کہ کوئی اور طبقۂ فکر اُن کو اُٹھا کے نہ لے جائے۔''

سُوریہ گربھ سُوتر کے مطابق یکھشوں نے اُس وقت ناگوں کو پیچھے چھوڑ دیا جب موخرالذکر ستوپوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ تانبے کی تختیوں پر کندہ بُدھ کونسل کے فیصلوں اور فتوؤں کی کھوج دَورِ حاضر کی آثار قدیمہ کی تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔ مختلف طبقہ ہائے فکر اِس بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ بعض ماہرین آثار قدیمہ نے ان کا پتہ لگانے کی کافی کوششیں کی لیکن ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ یکھشوں کی نسل کی کھوج بین اِس اہم کارنامے میں کلیدی رول اَدا کرسکتا ہے۔ اِس معاملے میں موجودہ دَور کے یچھ گام اور یچھ کوٹ مرکزی اہمیت کے حامل ہیں، یچھ گام کا مطلب یکھشوں کا گاؤں اور یچھ کوٹ کا یکھشوں کا قلعہ۔ اَب تک ان علاقوں سے یہ تبرّکات کھوج نکالے گئے ہیں۔

۱رراٹھن میں مہاتما بُدھ کا مجسمہ۔

۲ریچھ کوٹ میں ستوپا کی باقیات۔

۳رراجگیری میں بُدھ دَور سے تعلق رکھنے والی مٹی سے بنائی گئی اشیاء۔

۴رپرہاسپورہ میں بُدھ دَور کے قابلِ قدر آثار

۵رراٹھن میں خاص قسم کے پتھر، جو کہ معاملے کو آگے بڑھانے میں معاوٗن ثابت ہورہے ہیں۔

۶۔ رکنیل وَن کا گاؤں

مصنّف نے لداخ اور اس کی تواریخ کے بارے میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے مطابق تبت میں لداخ کو La-Dwag کہا جاتا ہے۔ اسے Mar-Yul یا زیریں علاقہ، Kha-chum-pa یا برفانی علاقہ بھی کہا گیا ہے۔

فاھیان اس کا نام Kia-Chha جب کہ ہیون سانگ Ma-Lo-oHo لکھتا ہے۔ لداخ بہت اُونچائی پر واقع ہے اور سطح سمندر سے اس کی بلندی ۹ ہزار سے ۱۸ ہزار فٹ ہے۔ یہ کئی متوازی پہاڑی سلسلوں سے گھِرا ہُوا ہے جس وجہ سے اِس میں کئی وادیاں پائی جاتی ہیں ان میں سب سے بڑی وادی سندھ کی وادی ہے۔

لداخ میں راجہ Gan-Btsan-po، ۵۰ برس قبل مسیح برسرِ اقتدار آیا۔ تواریخی حوالے ملتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کے دوران Sorna-btsan-sgmn کے زمانے میں ۱۶ طالب علموں کو کشمیر بھیجا گیا تاکہ وہ تبتی زبان کے لئے رسم الخط تیار کرنے کی خاطر بنیادی علوم حاصل کرسکیں۔ چنانچہ اُس زمانے میں کشمیر میں رائج شاردا لکھائی میں انہوں نے تربیّت حاصل کی جو کہ تبتی زبان کا بنیادی رسم الخط بن گیا۔ اِسی زماتے میں بعض بُدھ پرُچارک لداخ گئے اور وہاں بُدھ مت کو متعارف کرایا۔ اِسی دور میں تبت کی راجدھانی لہاسہ میں مہاتما بُدھ کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ بُدھ کتابوں کے ترجمے کا کام دَھرم کرتی اور دیگر پرچارکوں نے شروع کیا۔

۶۷۸ء میں چینیوں نے ترکستان فتح کرلیا لیکن تبت پر حملہ کرنے کی

اُن کی کوشش ناکام بنائی گئی۔ اِس پر للتادتیہ اور چینیوں نے تبتیوں کے خلاف مشترکہ محاذ کھڑا کرلیا اور یہ محاذ آرائی برسوں تک جاری رہی۔ اِسی اثناء میں چینیوں کے ہائیوں زیانگ نے (۷۵۵-۷۱۳ء) میں گلگت پر دُھاوا بول دیا۔ ۷۴۷-۷۳۶ء کے درمیان یہ لڑائیاں چلتی رہیں اور اِس دوران بُدھ مت کے مراکز مانے جانے والے گلگت اور چترال میں بُدھ مت کے اہم تبرکات اور ستوپ تباہ ہوگئے۔

پدم سمبھو کو لداخ اور تبت میں بُدھ مت کے اہم طبقے سرخ پوشوں کا ابتداء کار مانا جاتا ہے۔ اُس نے آتم گیان کے ذریعے نِروان حاصل کرنے کے فلسفے کا پرچار کیا اس سلسلے میں وہ چین اور منگولیا بھی گیا۔ اس نے کئی رسالے بھی مرتّب کیۓ جن میں منترا ئنا، ہیواجراتنترا وغیرہ اہم ہیں۔ اُس کی ایما پر تبّت کے راجہ نے لہاسہ اور دیگر مقامات پر کئی وہار بنوائے۔

بلتستان، وادئ سندھ کا ایک حصہ ہے جو شمال میں قراقرم سلسلہ ہائے کوہ، جنوب میں ہمالیہ، مشرق میں لداخ اور مغرب میں دَردستان سے گِھرا ہوا ہے۔ جب بُدھ مت کشمیر آیا تو اِس کا اَثر بلتستان پر بھی پڑا۔ چونکہ یہ علاقہ تبتیوں کے ماتحت بھی رہا اسلئے یہاں تانترک بُدھ اِزم کا بھی چلن رہا۔ چنانچہ راجہ Sad-Na-Legs کے احکامات کے تحت اسکردو میں ایک ستوپا بھی تعمیر کیا گیا۔

مصنّف لکھتا ہے کہ Ral-Pa-Can ۸۰۴ عیسوی میں تبت کا راجہ بنا۔ لداخ بلتستان، دردستان، چمبہ اور منڈی اِس کے زیرِ نگین تھے۔ تبت کی پہلی تواریخ اِسی عہد میں رقم کی گئی۔ Dar-Ma-dbying-Durbstan (۸۴۲-۸۱۶ء)

کے عہد میں تبت میں بدھ مت کے پیروکاروں کو کافی ستایا گیا۔ اُس نے ستوپا بند کروانے اور بُدھوں کی کتابیں وغیرہ ضائع کرا دیں۔ اِس سے لداخ میں انقلاب بر پا ہوا اور اِس کے کئی حصّے ہو گئے اور تبت کے ماتحت کئی علاقوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

بعد ازاں لداخ کے بھی تین حصّے ہو گئے۔ چنانچہ مصنّف رقمطراز ہے۔

''لداخ بہت عرصے تک قدیم تبت سلطنت کا ایک حصہ رہا اور یہ مغربی تبت کے نام سے جانا جاتا تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں یہ تبت سے الگ ہو گیا اور خود مختار حیثیت اختیار کر لی لیکن قدیم زمانے سے ہی اس کے مذہبی اور ثقافتی رشتے تبت کے ساتھ بہت ہی گہرے رہے ہیں اور اس وقت بھی رُوحانی راہنمائی کے لئے اِس کی نظریں تبت کی طرف اُٹھتی ہیں۔''

لداخ کی خود مختاری کے بعد اِس کی اپنی تواریخیں مرتّب کرنے کے بارے میں مصنّف لکھتا ہے۔ کہ Lha-Chen-Spal-Gyl-gon ۹۹۰ء عیسوی میں لداخ، زانسکار اور سپتی کا راجہ بنا۔ ۱۰۵۰ء میں بعض لداخیوں کو رسم الخط سیکھنے کے لئے کشمیر بھیجا گیا۔ اس دَور میں بنے ہوئے گنپے ابھی بھی لیہہ، باسگو اور پُرگ میں موجود ہیں۔

مرزا حیدر دوغلات نے ۱۵۵۶ء میں دردستان پر حملہ کر کے اُسے فتح کیا۔ ترکمان بادشاہ سلطان سعید خان نے مرزا حیدر دوغلات کو تبت فتح کرنے کیلئے بھیجا تھا، یہ ۱۵۳۱ء کا واقعہ ہے۔ اس نے نوبرا پر حملہ کر کے اس کے راجہ کو ہلاک کر ڈالا۔ اس کے بعد اُس نے لیہہ پر حملہ کیا لیکن کامیاب نہیں

ہوسکا۔اسی دوران اُسے کمک مل گئی اور اپنی تمام تر توجہ بلتستان پر مبذول کی اور اسکے راجہ بہرام چو کو زیر کرلیا۔وہاں ضروری انتظامات کے بعد اُس نے کشمیر کا رُخ کیا۔کشمیر کو زیر تسلّط لانے کے بعد وہ اپنی اُفواج سمیت لداخ آیا اور تبت کی طرف مراجعت کی لیکن وہ تبت میں داخل نہیں ہوسکا کیوں کہ شدید موسمی حالات اور تھکان کی وجہ سے اُس کی افواج آگے نہیں بڑھ سکیں۔وہ واپس لداخ آیا اور تبت کو فتح کرنے کی حسرت دِل میں لئے واپس بدخشاں چلا گیا۔

Tsai-Wang-Rnam-Rgual ۱۵۳۲ء میں لداخ کا راجہ بنا۔اُس نے لیہہ میں ایک بڑا محل بنایا۔اُس نے لا-کھانگ گمپہ بھی بنایا جس میں اُس نے مہاتمابُدھ کا عظیم مجسمہ نصب کروایا۔لا-کھانگ اِس وقت بھی قائم ہے۔یہ سجاسجایا گمپا دیواری تصاویر سے مزّین ہے۔وہ ایک بڑا فاتح بھی تھا۔اُس نے اپنی مملکت کا دائرہ ایک طرف لہاسہ کی سرحدوں تک بڑھایا اور دوسری طرف بلتستان تک۔اُس نے وسطِ ایشیاء میں ترکمانوں پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔Sen-Ge-RGual ۱۶۱۰ء میں لداخ کے تخت پر بیٹھا۔اُس نے اُپنی سرزمین پر مذہبی سرگرمیوں کو فروغ دیا اور Ste-Sang-Rasapal کو بُدھ مت کی تعلیمات پھیلانے کے لئے مدعو کیا۔راساپا ایک بہت بڑا بودھ عالم تھا جس نے ہندوستان اور کشمیر کی بودھ گمپاؤں میں تعلیم حاصل کی تھی۔راجہ رگیال نے ہمیس، چمیری، ہانلی اور تاشی کونگ میں گمپے بنوائے اور اُن کے رکھ رکھاؤ کے لئے زمینیں وقف کیں۔اُس کی رانی نے مہاتمابُدھ کا سونے کا مجسّمہ بنوایا۔اُس کے احکامات کی تعمیل میں چام، چوس، وِنایا کی پانچ جلدیں تیار کی گئیں۔لداخ سے علیٰحدہ

ہونے کے بعد بلتستان بدھ تعلیمات کو سینے سے لگائے رہا۔

رنچن ایک مہاجر کی حیثیت سے لداخ سے کشمیر آیا اور ۱۳۲۰ء میں یہاں کا بادشاہ بن گیا۔ اِس دوران تُرکوں نے لداخ پر چڑھائی کی۔ کشمیر پر مغلوں کے قبضے کے بعد انہوں نے لداخ فتح کرنا چاہا۔ جہانگیر نے اِس سلسلے میں سنجیدہ کوششیں کیں لیکن کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ شاہ جہاں کے عہد میں لداخ پر قبضہ کیا گیا اور لداخ مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ لداخی راجہ نے مغلوں کو خراج اَدا کرنا تسلیم کیا اور اپنے ایک بیٹے کو بطور یرغمال کشمیر میں مغل صدبیدار کے پاس رکھا۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں لداخ اور بلتستان کی آپس میں ٹھن گئی۔ ۱۸۴۹ء میں زور آور سنگھ نے لداخ پر چڑھائی کی اور لداخ ڈوگروں کے قبضے میں آ گیا۔ اِسی دَوران لداخیوں نے بغاوت کی لیکن ڈوگروں نے بغاوت کو قابو میں کر لیا۔ لداخی راجے کو بے دخل کیا گیا اور ڈوگروں نے لداخ کو اپنی ریاست میں ضم کر لیا۔

مقدّس تبرّکات کا ذکر کرتے ہوئے مصنّف لکھتا ہے کہ پورا لداخ گمپوں، ستوپوں، چُرتنوں اور دیواری تصاویر سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں ۱۶ بڑے گمپا ہیں اور ہر گاؤں میں چھوٹے بڑے ستوپ ہیں۔ ان میں سب سے اہم ہیمس، چمری، ماتھو، ساکتی، لِکر اور سنکار ہیں۔ لداخ میں ۱۵۰۰۰ سے زائد لاما ہیں۔

لِکر گمپا، لِکر گاؤں میں باسگو اور نرولا جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ اسے Lha-Chen-Rgyal-Pa (۱۰۵۰-۱۰۸۰ء) کے عہد میں تعمیر کیا گیا۔ اُس نے پاس کے سینکڑوں لاماؤں کو جمع کیا اور اس گمپے میں بسایا Lha-Chen-Grages-Ide (۱۴۰۰ء) نے

Rnam-Rgyal نامی پہاڑی پر گمپا بنوایا جس میں متیر یہ بُدھ ،
منجو گوشا اور وجرا پانی کے مجسمے ہیں۔ متیر یہ بُدھ کا مجسمہ گمپا کی ایک منزل کا
احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

ہیمس ایک خوبصورت گاؤں ہے جو لداخ تبت روڑ پر لیہہ سے ۲۲ کلو
میٹر کی دُوری پر ہے۔ ہر سال یہاں ایک بڑا میلہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں
شرکت کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔ یہاں ہیمس گمپا میں فن کے
نادر نایاب نمونے ہیں۔ نایاب تبّتی مخطوطات اور مجسمے یہاں محفوظ ہیں۔

شے میں شو گمپا ہے' جہاں راجہ RgyalDe-Idan-Rnam-
(۱۶۴۵-۱۶۶۶) نے مہاتما بُدھ کا عظیم مجسمہ نصب کرایا ہے۔ اگر چہ یہ پیتل کا
ہے لیکن اِس پر خالص سونے سے کام کیا گیا ہے اور اِس میں مہاتما بُدھ کو آرام
کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہاں سارا سال مقدس چراغ روشن رہتا ہے
جس میں گھی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

لامایورو ، لیہہ ، کرگل روڑ پر لیہہ سے ۶۰ میل کی دُوری پر واقع ہے۔
اِسے گیورو بھی کہا جاتا ہے اور اس میں متعدد گنپے ہیں۔ اس میں اولوکیشور کی
مورتی ہے جس کے گیارہ سر اور ہزار ہاتھ ہیں۔ یہ گنپے لداخ میں قدیم ترین
مقدس اَستھاپن ہیں ۔ یہ وہاں بُدھ مت آنے سے قبل بھی تھے اور بُدھ مت
کے وہاں متعارف ہوجانے کے بعد ان کو ۱۰۵۰ء میں بُدھ اَستھاپنوں
میں مبدّل کیا گیا۔ اِس کے علاوہ لداخ میں اور بھی قدیم اور مقدس بُدھ
زیارات ہیں۔ فاضل مصنّف نے کشمیر میں بُدھسٹ کلچر کی بعض بنیادی باتوں
کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

''راج ترنگنی کورو جنگ کے درمیان سے شروع ہوتی ہے۔ اس جنگ کا زمانہ بارہویں سے چودھویں صدی ق م مانا جاتا ہے۔ اُس وقت کشمیر کا گونند (اوّل) زندہ تھا اور جس کا زمانہ ۱۲۶۰ ق-م تسلیم کیا جاتا ہے۔ اِس بات کے شواہد ہیں کہ مہاراجہ اشوک (۲۲۷-۲۶۹) ق-م میں بعض بودھ پرچارک شاہی سرپرستی سے محرومی کی بناء پر کشمیر چلے آئے۔ بعض قدیم کتابوں میں درج ہے کہ اشوک نے بُدھ دھرم پھیلانے کے لئے مدھیانتک کو کشمیر اور گاندھار بھیجا۔ چینی ماخذوں کے مطابق مدھیانتک نے اپنی مافوق الفطرت طاقتوں سے کشمیر کے ناگ زیر کئے اور وہاں بدھ دھرم پھیلایا۔ کشمیر کے ماخذ بھی اِس بات کی توثیق کرتے ہیں۔''

مدھیانتک بہت سے بُدھ بھکشوؤں کے ہمراہ کشمیر آیا اور خود بیس سال تک یہاں رہا۔ اُس نے کشمیر میں زراعت کو بڑھاوا دیا اور پہلی بار زعفران کی کاشت کی ۔ یونانیوں نے سکندر اعظم کی قیادت میں چھٹی صدی ق-م میں ایران کو فتح کرلیا۔ جب وہاں سے اُس نے پیش قدمی کی تو اُبھیسارہ کے بادشاہ نے اس کا استقبال کیا۔ ابھیسارہ میں موجودہ کشمیر کے کئی علاقے شامل تھے۔ جب سکندر وہاں سے چلا گیا تو یونانیوں کی زیر سرپرستی کئی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا قیام عمل میں آیا۔ کشمیر میں یونانی سکوں کی دریافت اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یونانیوں کے یہاں آنے سے بُدھ مت کے لئے نئے دروازے کھل گئے۔ سوات ، ٹیکسلا اور لولاب میں کھروشٹی کتبوں کی موجودگی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اُس وقت بُدھ مت یہاں اپنے عروج پر تھا۔ ان بادشاہوں نے ستوپ اور وہار بنوائے اور شاکھیہ منی کی مورتیں نصب

کروائیں۔اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ مہاراجہ اشوک سے قبل ہی کشمیر میں بُدھ مت پہنچ چکا تھا۔

کشمیر کی قدیم کتابوں میں حوالے ہیں کہ شاکھیہ سمہا نے سب سے پہلے یہاں بُدھ مت کا پرچار کیا۔اُن کے فتوے شہباز گڑھی اور منشہرا میں دستیاب ہوتے ہیں جو کہ اُس وقت گاندھار کا حصہ تھے۔ان میں ایک فتوے کا خلاصہ یوں ہے۔

''میں تمام عقیدوں کا احترام کرتا ہوں، میں تمام مذاہب اور گروہوں کا بھی احترام کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمام مذاہب کے لوگ عزت سے میری سلطنت میں رہیں۔میری خواہش ہے کہ تمام عقائد کے لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔دوسرے کے عقائد کا احترام کرنا دراصل اپنا احترام کرنا ہے۔اِس سے اُپنے مذہب کی بھی خدمت ہو جاتی ہے۔دوسروں کو بے عزت کرنا دراصل اپنی بے عزتی ہوتی ہے۔''

یہ بات ضرور ہے کہ اشوک نے بُدھ مت پھیلانے کے لئے اَپنے پرچارک مختلف جگہوں، بشمول کشمیر روانہ کیے۔اُس کے ہی دورِ اقتدار میں مدھیانتک کشمیر آیا جو اس وقت ناگ راجہ آراول کے تحت تھا۔

مصنّف لکھتا ہے کہ کشمیر میں بُدھ مت کو نئی طرح ملنے کی بات تمام محققین نے تسلیم کی ہے۔تواریخی شواہد کہتے ہیں کہ اِس سرزمین پر بہت سے متبرک بودھ استھاپن تھے۔وہ بودھوں سے وابستہ بعض مقامات اور آثار کا صراحت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

مہارانی امرت پربھا نے بیرونی بھکشوؤں کے لئے امرت بھون کے

نام سے ایک بڑا وِہار بنوایا ۔ چینی سیاح اوکانگ اسے
Ngo-Mi-to-Wan کا نام دیتا ہے۔ امرت بھون کی وونتہ بھون
کے نام سے نشاندہی کی گئی ہے جو کہ سرینگر سے شمال میں قریب ۶ کلومیٹر کی
دوری پر ہے۔ اِس جگہ ایک وہار کے آثار بھی ملے ہیں۔ ایک لداخی گرو نے
میگھو اہن کے زمانے میں سرینگر میں ستوپا بنوایا جس کا نام لو-ستوب تھا۔
اس کی نشاندہی ابھی تک نہیں کی جا سکی ہے۔ مہارانی یوکا دیوی نے نادون
میں ایک وہار بنوایا۔ اس جگہ کی نشاندہی نرورہ، سرینگر کے طور کی گئی ہے۔
فی الوقت اس وہار کے آثار کہیں نظر نہیں آتے مہارانی اندرادیوی نے بھی اندرا
دیوی بھون وہار کی تعمیر کرائی البتہ اس کی بھی نشاندہی نہیں کی جا سکی ہے۔

جنک نے جلورا میں ایک وہار بنوایا جس کی نشاندہی زالورہ کے طور پر کی
گئی ہے۔ کشمیر میں مہاراج اشوک کے وہاروں کا ذکر تواریخ کتب میں رقم ہے
جو کہ بہت ہی شاندار تھے۔ اُس نے وبتھ ووتر اور ہوکھ لیتر میں بھی وہار
بنوائے جن کی نشاندہی ویری ناگ اور بڈگام کے طور کی گئی ہے۔ چشمہ ویری
ناگ میں بُدھ دَور سے وابستہ کئی اشیاء دستیاب ہوئی ہیں اور ہوکھ لیتر
میں مہاتمابُدھ کے کئی مجسمے ملے ہیں۔

جلوک نے کیرتی وہار بنوایا جس کے نسبت سے اس جگہ کا نام کنز ہوم
پڑگیا جو کہ بارہمولہ کے قریب ہے ۔اوکانگ نے اس کا نام
Ki-Tche لکھا ہے۔ مہاراج پرورسین (ثانی) کے ماموں جیندر نے جے
اندروہار بنوایا اور اس میں مہاتمابُدھ کا عظیم مجسمہ نصیب کروایا۔ ہیون سانگ
نے اس کا ذکر Che-Ye-In-To-Lo کے طور کیا ہے۔ اور جب وہ

۶۳۱ء میں کشمیر آیا تو دو برس اِسی وہار میں مقیم رہا۔ اِس وہار کو کھیم گپت نے نذرِ آتش کیا اور اس میں رکھے گئے مجسمے کو پگھلا کر اس سے بھگوان شوِ کی مورتی بنوائی۔ یہ وہار یا تو چھتہ بل سرینگر میں تھا یا اوشکر بارہمولہ میں۔

سکندواہین وہار، یُدھشٹر کے وزیر سکند گپتا نے بنوایا جس کے بارے میں تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہ خندہ بھون سرینگر میں تھا۔ اس وہار کے آثار آج کہیں دستیاب نہیں ہوتے للتادتیہ (۷۵۳-۷۲۵ء) نے پرہاسپورہ میں راج وہار بنوایا جس میں مہاتما بُدھ کا ایک طویل القامت مجسمہ اور سونے اور چاندی کی دیگر مورتیاں تھیں۔ پرہاسپورہ کو اُس نے دَریائے جہلم اور دریائے سندھ کے سنگم پر دوِر لیکھمن پور کے پاس بسایا تھا۔ یہ کریوہ ۲ میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔ آج بھی اس جگہ پر مختلف آثار قدیمہ برآمد ہو رہے ہیں اگر چہ اس جگہ کی تعمیرات گرِا کر مہاراج شنکر ورمن نے شِو مندر بنوائے تھے۔ وہ یہاں سے مہاتما بُدھ کے مجسمے اور مورتیاں بھی اُٹھا کے لے گیا۔ للتادتیہ کے عہد میں چنکن نے کئی وہار بنوائے جن میں بُدھ کی سونے کی مورتیاں تھیں۔ یہ وہار اُس نے سرینگر میں بنوائے تھے۔ چنکن للتادتیہ کا ایک وزیر تھا۔ چوں کہ وہ ایک تُرک تھا اور سنکیانگ سے آیا تھا اور چینی خطاب Taing-Kiun رکھتا تھا اِسی مناسبت سے کلہن نے اس کا سنسکرت ترجمہ ''چنکن'' کیا۔

جسنک نے ہشک پورہ میں ایک وِہار بنوایا جس کا تذکرہ ہیون سانگ نے Hu-Se-Kia-Lo کہا ہے۔ اِسے فی الوقت اوشکر کہا جاتا ہے اور بارہمولہ کے قریب واقع ہے۔ للتادتیہ نے بھی اوشکر میں کئی ستوپ اور وہار بنوائے، جے پیڈ (۷۸۴-۷۵۴ء) نے جیہ پورہ میں ایک بہت بڑا وہار

بنوایا جس میں اُس نے مہاتما بدھ کے تین عظیم الجثہ مجسمے نصب کرائے۔ جیہ
پورہ کی اندر کوٹ کے طور نشاندہی کی گئی ہے جو کہ سمبل صفا پورہ کشمیر میں واقع
ہے۔ جے سمہار (۱۱۴۹-۱۱۲۸ء) کی رانی رتنا دیوی نے رتن پورہ (رتنی پورہ
پلوامہ) میں ایک وِہار بنوایا۔ ہارون سرینگر میں ۱۹۲۵ء میں رامچند رکاک نے
ایک بہت ہی اہم بُدھسٹ سائٹ کا پتہ لگایا جہاں پر ایک ستوپ اور دیگر
عمارتیں تھیں۔ اس کے ضمن میں عجوبہ رُوزگار ٹائلیں ہیں جن پر کھروشٹی
عبادت درج ہے، اس کے علاوہ ان پر مختلف شکلیں بھی بنائی گئیں ہیں جِن
سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کشان دَور سے تعلق رکھتی ہیں۔

سمبل کے قریب آہن سر نامی جھیل کے کنارے آہن نامی مقام پر
۱۹۶۲ء میں فدا محمد حسنین نے ایک اور Budhist Site کا پتہ لگایا۔
یہاں بھی ہارون کی طرز پر ٹائلیں وغیرہ دستیاب ہوئی ہیں۔ بدقسمتی سے اِس جگہ
مزید کھدائی نہیں کی جا سکی۔ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اِسے کنشک کے وقت
چوتھی عالمی بودھ کونسل کے Venue کی خاطر خصوصی طور تعمیر کیا گیا
تھا۔ یہاں بھی بعض تبرکات دستیاب ہوتے ہیں جن میں فدا حسنین کا دریافت
کردہ Budhist Panel خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جس کی تصویر
زیرِ نظر مضمون میں شامل ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

☆★☆

غلام نبی آتش ☆

الیف۔ اَرنیسٹ کا سَفرنامۂ کشمیر

فادر اَرنیسٹ ۔نیو نامی انگریز نے ڈوگرہ دَور میں اُپنی زندگی کے بہترین سال کشمیر میں گذارے ہیں۔ اصل میں وہ خدمتِ خلق کے واسطے آیا تھا۔ یہاں مناظِر فطرت اور آب وہوا نے اُسے مہم جوئی کے لئے آمادہ کرلیا۔ کوہ پیمائی اور وادیوں کی سیر کے دوران جو کچھ اس نے دیکھا، سُنا اور محسوس کیا، وہ بیرونی ممالک سے آنے والے سیلانیوں کے لئے قلمبند کیا۔ اُس کا مقصد ایک مورّخ کی طرح سیاسی اور سماجی تواریخ مرتب کرنا نہیں تھا۔ بہ ایں ہمہ اُس کی تحریر کردہ کتابوں میں معتبر اور غیر معتبر سیاسی اور سماجی حالات و واقعات جگہ پاگئے ہیں۔ اُس کی پہلی کتاب کا نام "Beyond The Pirpanjal" ہے، جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوچکی ہے۔ اِس کتاب کی اشاعت کے اٹھارہ سال بعد ارنیسٹ نیو کی دوسری کتاب "Things Seen in Kashmir" "تھنگس سین اِن کشمیر" کے نام سے شائع ہوگئی۔ معلوم نہیں اِس کتاب کے کتنے ایڈیشن آج تک چھپ چکے ہیں جبکہ اِس کا

☆ ناتل-اننت ناگ-کشمیر

پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا تھا۔ اِس وقت راقم الحروف کے زیرِ نظر اِس کتاب کا ۱۹۹۳ء کا ایڈیشن ہے، جو ''جے۔ کے بک ہاس، جموں توی'' کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ سترہ اَبواب پر مشتمل یہ جلی حروف میں شائع شدہ خوبصورت کتاب ۱۶۰ صفحات پر محیط ہے۔ مصنّف موصوف نے اعتراف کیا ہے کہ اِس کتاب کی ترتیب وتدوین کے وقت اُس نے اپنی پہلی کتاب سے کافی استفادہ حاصل کیا ہے۔ سر والٹر لارنس کی ''دی ویلی آف کشمیر'' بھی اُس کے زیرِ نظر رہی ہے۔ فادر اَرنیسٹ نیو کی اِس کتاب کے نام سے صاف ظاہر ہے کہ اُس نے کشمیر میں جو کچھ دیکھا وُہی قلمبند کیا ہے لیکن اُس کے مشاہدے میں آئی ہوئی باتوں کے علاوہ وہ دیو مالا، اَسطور اور سُنی سنائی غیر معتبر باتیں بھی ضبطِ تحریر میں لاتا گیا۔ اِس کتاب میں ۳۱ نادر تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ فادر ارنیسٹ نیو نے یہ کتاب اپنی اہلیہ کے نام معنون کی ہے۔

وادیٔ کشمیر:۔

وادیٔ کشمیر میں وارِد ہونے کے لئے ایف اَرنیسٹ نیو نے راولپنڈی سے سفر شروع کیا تھا۔ کوہالہ، اُوڑی اور رام پور سے ہوتے ہوئے جہلم ویلی روڑ پر پہنچ جانے کے بعد اُس نے ٹانگے پر بیٹھ کر سرینگر کی راہ لی تھی۔ وادی کشمیر کے بارے میں رقمطراز ہے کہ نوّے میل لمبی اور پندرہ میل چوڑی بیضوی شکل کی یہ وادی ایک حیران کُن تماشا گاہ جیسی ہے۔ میدانی علاقوں میں دُور دُور تک دھان کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ کریوہ ہائے بے ترتیب، لمبی پہاڑیاں اور زمین کے نشیب وفراز حُسنِ فطرت کے غمّاز ہیں۔ جنوب سے جہلم، جنوب مغرب سے ویشو اور دُودھ گنگا جب ایک ساتھ مِل جاتے ہیں تو جہلم پیچ در پیچ

شمال کی اور بہتا چلا جاتا ہے۔ وادی ہر طرف سے پہاڑوں اور گھنے جنگلوں سے گھِری ہوئی ہے۔ بہار دلکشی، شادابی اور تراوت کا موسم ہوتا ہے۔ نشیبی علاقوں کے کھیتوں میں تاحدِ نظر سرسوں کے پھول آنکھوں کو خیرہ کردیتے ہیں۔ پہاڑیوں کے دامن بادام کے پھولوں سے سجتے ہیں۔ خوبانی اور آڑو کے درختوں پر پُھول کِھلتے ہیں۔ وادی بے شمار پھولوں سے دُلہن کی طرح آراستہ ہوجاتی ہے۔ دُور دُور تک پھیلے بیدزار آنکھوں کو تراوت بخشتے ہیں۔ میدانوں میں مخملی گھاس اُگتی ہے۔ شمالی ڈھلواں عام طور پر برہنہ ہی رہتے ہیں۔ کوہِ پیر پنچال کشمیر کو ہندوستان سے الگ کرتا ہے۔ اسکی چوٹیوں اور ڈھلوانوں پر برف ہمیشہ جمی رہتی ہے۔ کوہِ پیر پنچال کے دامن میں سطح سمندر سے ساڑھے گیاراں ہزار فٹ کی بلندی پر نیلگوں پانی والی مشہور کونسر ناگ جھیل ہے۔ یہی جھیل دریائے ویشو کا منبع ہے۔ جھیل کی جانب شوپیان سے راستہ جاتا ہے۔ اِسی راستے میں اَہرہ بل نامی آبشار بھی ہے۔ برہما چوٹی کے مشرق میں درۂ بانہال ہے، اِسی درّے سے جموں کی طرف راستہ جاتا ہے۔ مغرب کی طرف اہرامی شکل کی ایک حسین پہاڑی چوٹی ہے، جس کو ٹٹ کوٹی کہتے ہیں۔ اِن پہاڑی سلسلوں میں گھاس سے بھری پُری شاداب چراگاہیں ہیں۔ گلمرگ فرنگیوں کے لئے گرمیوں کے دَوران ایک پیاری سی سیرگاہ ہے۔ یہاں چرچ، ہوٹل، بازار، کلب، پولو گراؤنڈ، لکڑی سے تعمیر کی گئی چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں، گالف کھیلنے کا میدان اور آرام و آسائش کے لئے تمام چیزیں دستیاب ہیں۔ وادی کی نسبت یہ جگہ تین ہزار فٹ کی اُونچائی پر واقع ہے۔ آب و ہوا خوشگوار ہے۔ سرینگر سے گلمرگ تک صرف تیس ۳۰ میل کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔

شمال میں واقع مہادیو ، کوتوال اور ہرمکھ کی برف پوش پہاڑیاں گلمرگ کی طرف گویا نظرِ کرم ڈال رہی ہوں۔ نانگا پربت اور دیگر چوٹیاں غروبِ آفتاب کے وقت گلمرگ کے قرب میں واقع فیروز پور نالہ میں گویا نہاتی ہوئی دِکھتی ہیں۔ موسمِ خزاں میں فصلیں پکتی ہیں۔ راتوں کو قدرے سردی ہوتی ہے اور دن سرد نہیں ہوتے۔ چنار کے زرد پتوں کا منظر دِلکش ہوتا ہے۔ کشمیر، زمستان میں بھی حسین لگتا ہے اور پوری تمام وادی نظروں کو چکا چوند کرنے والی برف سے ڈھک جاتی ہے۔

عظیم آبی گذرگاہ:۔

بارہمولہ سے جہلم روڑ کے ذریعے سرینگر تک ۳۴ میل کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔ یہ روڑ اکثر جگہوں پر سفیدے کے درختوں کی گھنی قطاروں کے درمیان سے گذرتا ہے۔ بارہمولہ پہنچ کر موٹر کار کے بجائے کشتی میں بیٹھ کر سفر کرنا زیادہ دِلچسپ اور خوش کُن لگتا ہے۔ کشتی بان سامی طرز کے لوگ لگتے ہیں۔ قصبوں میں رہنے والوں کے مقابلے میں اُن کے بدن سیاہ رنگت والے ہیں۔ یہ لوگ بامُروّت، چالاک اور ذہین ہیں۔ بڑی روانی کے ساتھ بولتے رہتے ہیں۔ قابلِ ہونے کے ساتھ ساتھ اگر وہ ایماندار اور سچ بولنے والے بھی ہوتے تو واقعی قابلِ ستائش ہوتے۔ سیلانی جب اُن لوگوں سے ممکنہ حد سے زائد کام اور خدمت حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں تو وہ اپنے لئے حد سے زیادہ فائدہ وصول کرنے میں خاصے ماہر ثابت ہوتے ہیں۔ کشمیری ہانجی اپنے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی دُھن میں غلط اور صحیح کاموں یا کام کرنے کے طریقوں میں فرق نہیں کرتا۔ وہ کمال کے فقرہ باز اور من گھڑت

کہانیاں بنانے اور سُنانے والے لوگ ہیں۔ بارہمولہ کے پاس دریائے جہلم تقریباً ایک سوگز چوڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نوّیں صدی عیسوی میں راجا اونتی ورمن کے زمانے میں سُیا نام کے ایک کشمیری انجینئر نے جہلم کی کھدائی کرواکر اوراس کے کناروں پر باندھ تعمیر کرواکر اُس کی گہرائی میں اضافہ کروادیا تھا۔ سُیا کے نام پر سوپور بسایا گیا تھا۔ دریائے جہلم اگرچہ کشمیر میں زمین کو سیراب کرتا ہے، ماحول کو صاف اور خوبصورت بنائے رکھتا ہے ، لوگوں کی کئی ضرورتیں پوری کرتا ہے تاہم یہ ہمیشہ سے پریشانی کا باعث بھی رہا ہے۔ اس دریا میں ہرسال چھوٹے بڑے سیلاب آتے رہتے ہیں۔ صرف تین روز کی مسلسل باراں باری تباہ کُن سیلاب کا باعث بن جاتی ہے۔ کچّی اینٹوں کے مکان شکر کی طرح پگھل کر غائب ہوجاتے ہیں، فصلیں تباہ ہوجاتی ہیں۔ درخت اُکھڑ جاتے ہیں اور دوسری چیزوں کو اُپنے ساتھ بہالے جاتے ہیں۔ پُل ،گر کر بہہ جاتے ہیں۔ زبردست جانی اور مالی نقصان ہوجاتا ہے۔ لوگ گندہ پانی پی کر بیمار ہوجاتے ہیں۔ ہر جگہ ہیضہ پھُوٹ پڑتا ہے۔ وادی کا بہت سا حصہ جھیل میں بدل جاتا ہے۔ کشتیاں بچاؤ کاروائیوں کے لئے حرکت میں آجاتی ہیں۔ دریائے جہلم 'ویری ناگ سے نکلتا ہے، ویری ناگ سے بارہمولہ تک یہ دریا ۱۲۲میل لمبا ہے، جبکہ خشکی کے راستے ویری ناگ سے بارہمولہ تک صرف ۸۰میل کا فاصلہ ہے۔ بارہمولہ ایک ہزار مکانات پر مشتمل ایک خوش منظر قصبہ ہے۔ دریائے جہلم میں صرف بارہمولہ سے کھنہ بل تک کشتی رانی کی گنجائش ہے۔ تاہم یہ ایک عظیم آبی راستہ ہے، روز و شب مصروف رہنے والی اِس آبی گذرگاہ پر ہمہ وقت طرح طرح کی کشتیاں تیرتی رہتی ہیں۔

سرینگر، دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ شہر میں اِس دریا پر کم سے کم سات پُل بنائے گئے ہیں۔ بڑے پتھروں کی بنیاد پر لکڑی سے بنائے گئے یہ پُل مخصوص مہارت اور طرزِ تعمیر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ سرینگر میں ایک لاکھ چالیس ہزار لوگ رہتے ہیں۔ صفائی کا خاص انتظام نہیں ہے اور ہوا بھی معطر نہیں ہے۔ دریائے جہلم، سرینگر واسیوں کے لئے نہایت اہم ہے، اس نے ماحول کو خوبصورت بنایا ہے، یہ گشادہ اور ہوادار آبی شاہراہ ہے۔ صحت کے نکتۂ نظر سے بھی یہ دریا شہر باشوں کے لئے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ محلِ وقوع، ماحول اور دریا کے دونوں کناروں پر قطار در قطار چھوٹے بڑے مکانات، جن میں سے اکثر مکانوں کی بالکونیاں، ڈیوڑھیاں اور چھتیں سجائی ہوئی ہیں، کے لحاظ سے اکثر فرنگی سرینگر کو ''مشرق کا وِینس '' بھی کہتے ہیں۔ ایف ارنیسٹ نیو نے لکھا ہے کہ جُوں جُوں ہم اس آبی شاہراہ سے شہر کی اور جانے لگتے ہیں تو بائیں جانب ایک چمکدار مندر کی مخروطی چھت اور اُس کا شاندار کلش نظر آتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مندر کے قرب میں کچھ مزدور شور وشرابہ کرتے ہوئے ایک بڑی کشتی سے مال اُتارنے میں مصروف تھے۔ کچھ مکانوں کی کھڑکیوں پر جُڑاؤ نقاشی کی گئی ہے۔ اِدھر اُدھر مکانوں کے درمیان گلیارے ہیں۔ اِن گلیاروں کو کھُردرے آبڑ کھابڑ پتھروں سیڑھی نما راستوں کے ذریعے نیچے دریا کے ساتھ ملایا گیا ہے۔ یہاں عورتیں پیتل اور تانبے کے برتن مانجھتی ہوئی، مٹی کے سُرخ گھڑوں میں پانی بھرتی ہوئی یا پانی سے بھرے گھڑوں کو سروں پر اُٹھا کر گھروں کی طرف لے جاتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہیں۔ پنڈتانیاں شوخ رنگ کے لباس میں ملبوس زیادہ جاذبِ نظر ہیں۔ گھاٹ پر ہر

طرح سے زندگی حرکت میں نظر آتی ہے، چہل پہل ہے، ہر ایک اپنے کام میں مصروف ہے۔ دھوبی کپڑوں کے بقچے سروں پر اُٹھائے چلے آتے ہیں۔ دھوتے وقت کپڑوں کو بار بار زوزور سے بڑے پتھروں پر پٹکتے رہتے ہیں۔ گھاٹوں کے قریب دریا کے کنارے پر آرہ کش لکڑی چیرنے کے صبر آزما کام میں مگن ہیں۔ اُن کے پاس روایتی آری ہے اور زیادہ محنت کر کے پسینے میں شرابور ہو کر بھی کم کام کر سکتے ہیں۔ دریا کے کناروں پر کہیں کہیں سامان اور ضروریاتِ زندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ ہر طرف غُل غُپاڑہ اور شور شرابہ ہے۔ کان پھٹ جاتے ہیں۔ کشمیری شور مچائے بغیر کام نہیں کر پاتے ہیں۔ کچھ لوگ جھگڑالو بھی۔ کشتی بانوں کی عورتیں، جبکہ اُنکو مشتعل کیا جائے، حد سے زیادہ گالی گلوچ اور دشنام طرازی کرتی ہیں۔ اُونچی تیکھی آوازیں نکالنے اور گالی گلوچ میں یہ عورتیں ماہر ہیں۔ وہ گالی گلوچ اور شور وغُل سے باز نہیں آتی ہیں، جب تک اُن کے گلے پُوری طرح بیٹھ نہ جائیں۔ کبھی کبھی جان بوجھ کر جھگڑا دوسری صبح تک ملتوی کر دیا جاتا ہے، جس کا علامتی طریقہ یہ ہے کہ ایک ٹوکری کو اُلٹا کر کے رکھ دیا جاتا ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ جھگڑا اِسی ٹوکری کے نیچے دوسری صبح تک محفوظ کر دیا گیا، اگلی صبح کو ٹوکری اُٹھا کر جھگڑا دُوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔

سرینگر میں سڑک کے دونوں طرف نالے ہیں، اِدھر اُدھر متوازی کوچے بھی ہیں۔ اِن کوچوں میں دن بھر لوگوں کی بِھیڑ لگی رہتی ہے۔ پانچ فٹ کی بلندی پر دکانوں کی کھڑکیاں کُھلی نظر آتی ہیں۔ شہر باشوں کی نصف آبادی پرچون فروش ہے۔ صرف اُون اور اُونی مصنوعات کے کاروبار میں ۲۵۰۰۰ لوگ مصروف ہیں۔ نانبائی، گندم اور مکئی کے آٹے کی روٹیاں بناتے اور فروخت کرتے ہیں۔ کئی

دکانوں پر پیتل کے برتن فروخت کیے جاتے ہیں۔ تانبے کے برتن بنانے والوں کی دکانوں میں برتن بنانے کی ٹھنٹھناہٹ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کچھ دُکانوں پر سوتی کپڑوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے بَنے بنائے کپڑوں کا جو بائیکاٹ کرر کھا ہے، اُس کا کوئی اثر کشمیر میں نظر نہیں آتا۔ اِن ہی دکانوں میں گھی، کوہستانی نمک، مکئی، چاول، آٹا، اَخروٹ اور مرچ کی خرید وخروخت کی جاتی ہے۔ دوسری دُکانوں میں مٹی کے سُرخ برتن، مقامی جُوتے، زِین اور اس سے متعلق سامان، سوزن کاری کیے ہوئے کپڑے، لوہے کے چھوٹے بڑے دیگچے، تانبے کے خوبصورت برتن اور نبات کی ڈھلیاں بکتی ہیں۔ فرہنگیوں کے لئے جاذبِ توجہ وہ دُکانیں ہیں جہاں اَخروٹ کی لکڑی سے بنی منقش میز، ڈبے، طشتریاں، پیپر ماشی کا سامان، پردے، ٹیبل کلاتھ اور عالمی شہرت یافتہ قالین، خاص کشمیری ڈیزائن والی چاندی کی پلیٹیں، جیولری اور چینی مٹی کے کپ بیچے جاتے ہیں۔ یہاں چیزوں کے دام بھی مناسب ہیں۔

فادر اَرنیسٹ نیو نے شاید سُنی سنائی باتوں پر یقین کر کے یہ مفروضہ دُہرایا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں اکثر ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا گیا۔ اُس نے لکھا ہے کہ اِس عمل میں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ نے فعال حصہ لیا، وہ سلاطینِ کشمیر کی حکومت کے دَوران چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر آئے تھے۔ فادر اَرنیسٹ نیو نے لکھا ہے کہ میر سیّد علی ہمدانیؒ کا جانشین محمد خان ہمدانیؒ، سلطان سکندر بُت شِکن کے زیادہ قریب تھا۔ وہ تبدیلیٔ مذہب کے عمل میں زیادہ پیش پیش تھا۔ اُس زمانے میں ہندوازم کا تقریباً خاتمہ ہوگیا۔ اُن دنوں کی یادگار اور

خاص متاثر کن عمارت شاہِ ہمدان مسجد ہے، جو درگاہِ حضرت بل کے بعد بہت مقدّس مانی جاتی ہے۔ قابلِ غور بات ہے فادر ارنیسٹ نیو نے میر سیّد محمد ہمدانیؒ کے بدلے محمد خان ہمدانی لکھا ہے۔ اُن کو صرف میر سید علی ہمدانیؒ کا جانشین قرار دیا ہے اور یہ تواریخی صداقت بھول گیا ہے کہ حضرت میر سیّد محمد ہمدانی، حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے فرزند تھے۔ آگے ارنیسٹ نیو نے لکھا ہے کہ پتھر مسجد دلچسپ اور قابلِ دید ہے۔ یہ مسجد پتھّروں سے تعمیر کی گئی ہے، اسے ملکۂ نور محل نے تعمیر کروایا تھا۔ اِس مسجد کوئی برسوں پہلے اناج کو گودام میں بدل دیا گیا تھا۔ سرینگر میں جگہ جگہ مسلمانوں کی مسجدیں اور اُن کے ولیوں کی زیارت گاہیں ہیں۔ زیارت حضرت دستگیرؒ صاحب سے تھوڑی دُوری پر ایک قدیم مقبرہ ہے، جس میں کشمیریوں کے خیال میں یوز آصف دفن ہے، جو پندرھویں صدی عیسوی میں فوت ہو گیا تھا۔ قادیانیوں کے خیال میں یہ یوز آصف نہیں بلکہ مرقدِ مسیح ہے، وہ کہتے ہیں کہ صلیب پر چڑھ کر وہ مقدس سرزمین کشمیر میں پہنچ گئے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ فادر ارنیسٹ نیو نے ایک مورّخ کی نظر سے اِن باتوں کو نہیں دیکھا ہے بلکہ جو کچھ کسی نے سُنایا وہی لکھ دیا۔

بازار میں ہم نے بہت ہندو دیکھے، جن کے ماتھوں پر خوبصورت قشقے کھینچے ہوئے تھے، انھوں نے کانوں کی لَوئیں سُرخ و زرد رنگ سے سجائی تھیں، اصل میں یہ اُن کی ایک دھارمک رسم ہے۔ ہندو، سروں پر چُست پگڑیاں باندھنے کے عادی ہیں، پگڑی کی نوک دائیں طرف ہوتی ہے۔ مخصوص طرز کا پہناوا استعمال کرنے میں وہ لوگ فرہنگی پبلک سکول کی طرح سختی برتتے ہیں۔ وہ تنگ پاجامہ اور ڈھیلا پھیرن پہنتے ہیں۔ تنگ آستینیں اُن کو پسند ہیں۔ کشمیر میں

پردے کی پابندی نہیں کی جاتی ہے۔ہم نے بے شمار ہندو اور مسلمان عورتوں کو دیکھا جو پردے کا اہتمام نہیں کرتیں ہیں۔ پنڈتانیاں شوخ رنگوں کے کپڑے اور زیورات پسند کرتی ہیں۔اُن کے سر کا پہناوا سفید ہوتا ہے، وہ پاؤں میں پُلہ ہور یعنی گھاس سے بنائی ہوئی مقامی جُوتی پہنتی ہیں۔ پنڈتانیاں، مسلمان عورتوں کے مقابلے میں زیادہ حسین ہیں۔ حسین چہروں والی یہ عورتیں نرم، نیک اور شریف عادات بھی رکھتی ہیں۔ یہاں کثرت ازواج کا رواج نہیں ہے۔مَردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد کم ہے۔دَس مردوں کے لئے صرف آٹھ عورتیں ہیں۔لڑکیوں کی پرورش پر کم دِھیان دیا جاتا ہے اور چھوٹی عمر میں اُن کی شادِیاں کردی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ہندو لڑکیاں صرف دس سال کی عمر میں بیوہ ہوجاتی ہیں۔اُن کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ جوان ہندو بیوائیں چال وچلن کے خطرے سے دُوچار ہوجاتی ہیں، اُداس زندگی سِسک سِسک کر گذارتی ہیں۔رنڈوے دُوبارہ شادی کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔

پیدائش سے موت تک ہر ایک ہندو بے شمار دھارمک رسم ورواج اُدا کرتا ہے۔سِکھوں کی آبادی بہت کم ہے۔ پٹھانوں کے دَور میں سِکھوں کی آبادی میں کچھ اضافہ ہوچکا تھا۔رنجیت سنگھ کے حملے کے وقت بھی سِکھوں کے حوصلے بُلند ہوچکے تھے۔ مسلمان تعلیم کی طرف راغب نہیں۔وہ ناخواندہ ہیں، ہانجی، نجار، گلکار، قصاب، دکاندار، کمہار، نوکر، کِسان، قُلی اور دَستکار صرف مسلمان ہیں۔ ہندو بڑے بڑے تاجر ہیں، خواندہ ہیں اور اُپنے بچوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھتے ہیں۔اکثر کشمیری ہندو برہمن ہیں اور پنڈت کہلاتے ہیں۔اِن پنڈتوں کو تمام لوگوں پر دانشورانہ فوقیت حاصل ہے۔وہ سمجھدار، ذہین اور غیر معمولی حافظہ

رکھنے والے لوگ ہیں۔ بہت سے پنڈت، سرکاری ملازم ہیں۔ بعض ایماندار، محنتی اور قابلِ اعتبار ہیں تاہم ایسے بھی ہیں جو رشوت ستانی کے روادار ہیں۔

سرینگر میں شیر گڈھی ایک قابلِ دید شاہی محل ہے۔ گذشتہ زمانے میں دریا کے ایک کنارے سے دُوسرے کنارے تک رَسیاں بندھی رہتی تھیں۔ فریاد کرنے والے اَپنی عرضیاں رسیوں کے ساتھ باندھ لیتے اور دربار کے ملازم اُن کو مہاراجہ تک پہنچا دیتے تھے۔ فسٹ برج کے قریب دریا کے بائیں کنارے سٹیٹ اسپتال ہے۔ اُس کی مخالف سمت میں عدالت بھی ہے۔ شال بافی اور اُس کی خرید وفروخت تقریباً ختم ہو چکی ہے کیونکہ اُس کی زیادہ مانگ فرانس میں تھی۔ ۱۸۷۰ء کی فرانس، جرمن جنگ نے اِس صنعت پر ناکارہ اثر ڈالا۔ اب قالین بافی اور اُس کا کاروبار عروج پر ہے۔ سرینگر میں قائم ریشم خانہ، شاید دُنیا بھر میں ریشم تار بنانے کی سب سے بڑی فیکٹری ہے اور وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ یہاں کافی پیداوار ہوتی ہے جو یورپ میں فروخت کی جاتی ہے۔ تاہم Synthetic ریشم کی پیداوار نے کشمیر کی ریشم صنعت پر ناکارہ اثر ڈالنا شروع کیا ہے۔ سرینگر کے شمال میں ہاری پربت پہاڑی ہے، جہاں عطا محمد خان کے تعمیر کردہ قلعے کے آثار موجود ہیں۔ ذرا بلندی پر حضرت مخدومؒ صاحب کی مقدس اور خوبصورت زیارت گاہ ہے جس کے دامن میں دُور دُور تک بادام کے درخت ہیں۔ بہار میں اِن دَرختوں کے پھُول عجیب سماں پیدا کرتے ہیں۔ اِسی پہاڑی کے دامن میں تین میلوں تک پھیلی اُونچی، مضبوط اور شاندار دیوار ہے، جو کشمیر کے اَوّلین مغل شہنشاہ اکبر نے، مشرقی طرز کے قلعے کے اِرد گرد تعمیر کروائی تھی۔ جنوب کی طرف والی دیوار میں قلعے کی تعمیر کی تاریخ درج

ہے۔ جو ۱۰۰۶ھ ہے۔ ہاری پربت اور چوتھے پُل کے درمیان ایک خوبصورت جگہ پر عالیشان جامع مسجد ہے جس میں بیک وقت ہزاروں لوگ نماز اُدا کرتے ہیں۔ سرینگر کے مشرق میں اہرامی شکل کی تختِ سلیمان نامی پہاڑی ہے، جسکی چوٹی پر ایک مندر ہے۔ اِس چوٹی پر چڑھ کر تا حدِ نظر سرینگر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ دُور دُور تک مسجدوں اور مندروں کے کلش، سبزیوں کے کھیت، میوہ باغات، گلزار، بیدزار اور حرکت کرتی ہوئی کشتیاں دِکھائی دیتی ہیں۔ اِسی پہاڑی کے جنوبی دامن میں یورپی بستی ہے۔ یہاں مہاراجہ کے مہمانانِ گرامی کے ٹھہرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ فرنگیوں کے لئے یہاں کوٹھیاں ہیں۔ چرچ، گالف میدان، پولو گراونڈ اور ریذیڈنسی اِسی جگہ موجود ہے۔ مشن اسپتال بھی ہے جس میں ۱۵۰ بستر ہیں اور روزانہ ۳۰۰ بیمار دیکھے جاتے ہیں۔ یہاں ہر سال ۵۰۰۰ آپریشن کئے جاتے ہیں۔ سرینگر اگر چہ فنکاروں، سیاحوں اور مناظرِ فطرت کے دِلدادہ لوگوں کے لئے بہت دِلکش ہے مگر دارالشفاء نہیں۔ نالۂ مار اور اُس کے کناروں پر مخصوص طرز کے مکانات اور نالے پر تعمیر شدہ پُرانی طرز کے پُل دیکھ کر ایک اور بار وینس یاد آجاتا ہے۔

دِہاتی زندگی:-

چاول کشمیریوں کی اہم خوراک ہے۔ یہاں ایک ملین سے زائد کسان رہتے ہیں۔ کشمیر کی خوشحالی کا پورا دارومدار زمین و زراعت کی ترقی پر ہے۔ گنجان آباد سرینگر کے لوگ ہمیشہ سستے داموں چاول چاہتے ہیں۔ زمینداری کا کام سال بھر جاری رہتا ہے اور حد سے زیادہ صبر آزما اور محنت طلب ہے۔ دَھان کے کھیتوں میں چار بار نلائی کرنا پڑتی ہے۔ تپتی دُھوپ میں کمر جُھکائے، پسینے میں

شرابور کسان دونوں ہاتھوں سے زمین کھود کر خود رَو اور فضول گھاس پھوس نکال دیتے ہیں۔ دھان کی فصل سات ہزار فٹ کی بلندی پر بھی پکتی ہے لیکن اِس سے زیادہ اُونچائی پر ساری وادی میں مکئی، گندم اور جَو اُگتی ہے۔ کشمیر میں سَرسُوں بھی اُگائی جاتی ہے۔ کشمیر کے دیہات جاذبِ نظر ہیں۔ گھاس پھوس کی چھتوں والی جھونپڑیاں، مٹی اور خام اینٹوں سے بنے کچھ گھر، جن کے قریب تُوت کے کچھ درخت بھی ہوں، چند چناروں کی اَوٹ میں، جہاں سفیدے کے دو تین لمبے درخت بھی ہوں اور سیب، ناشپاتی اور خوبانی کے باغ بھی، گھروں کے ایک طرف ایک چھوٹی ندی بھی بہتی ہو، یہی جگہ کشمیر کا گاؤں ہے۔ دُور دُور تک دَھان کے کھیت پھیلے نظر آتے ہیں۔ گاؤں کے ایک طرف، تھوڑی دُوری پر وسیع وعریض ٹیلا، جس پر گلِ لالہ اور سوسن کھِلے ہوئے ہیں، گاؤں والوں کا قبرستان ہے۔ گاؤں کی جھونپڑیاں اور ایک یا دومنزلہ مکانات اُس وقت خوب سجے ہوتے ہیں جب کہ گرمیوں کے موسم میں سُرخ مرچوں کی مالائیں، سنہری رنگت والے مکئی کے چھِلّے، چھیدے ہوئے شلجم اور سیب، خوبانیاں وغیرہ دیواروں کے باہری طرف سکھانے کیلئے لٹکائے ہوئے نظر آتی ہیں۔ یہ سبزیاں اور میوے سردیوں کے اَیّام میں کام آتی ہیں۔

گاؤں کا نمبردار یعنی مکھیا ایک بارُعب اور اہم سرکاری کارندہ ہوتا ہے۔ ایک گاؤں میں وہاں کا نمبردار ہم سے ملنے آیا۔ وہ دَراز قد، اَدھیڑ عمر کا شخص سر پر میلی پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ پاؤں میں چمڑے کا مقامی نوکدار پیزار تھا۔ آنگن میں دو عورتیں پتھر کی اُوکھلی میں لکڑی کے پانچ پانچ فٹ لمبے موسلوں سے شالی کوٹ رہی تھیں۔ یہ دلچسپ اور محنت طلب کام ایک کھیل سے کم نہیں

مگر دونوں عورتوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ موسلی دونوں ہاتھوں میں زور سے پکڑ کر ایک عورت بدن کو اُوپر کی اور سیدھا کر کے اَچانک جُھک کر اُوکھلی میں موسلی کو زور سے ڈال دیتی تھی، دوسری عورت بھی یہی عمل دہراتی جاتی تھی۔ دھان کوٹنے کا یہ نظارہ کشمیر میں عام ہے۔ یہاں سے تھوڑی دُوری پر ایک شخص عجیب طرح سے اُوپر نیچے چلتا دِکھائی دیا۔ اُس نے زمین پر دو دو فٹ لمبی نوکدار چھڑیاں بچھائی تھیں۔ تکلی کی مدد سے جلدی جلدی سوتی دھاگا اُن چھڑیوں کے اندر باہر باندھ رہا ہے۔ کپڑے بُننے کا یہ قدیم ترین طریقہ ہے۔ قریب ہی ایک ڈالان پر ایک بُڑھیا، برف جیسی سفید اُون کے ڈھیر کے سامنے بیٹھی، ایک عجیب وغریب روایتی اور قدیم چرخے پر اُون کات کات کر شاندار دھاگا بنا رہی تھی۔ دوسری جھونپڑی کی کھڑکی سے اندر جھانکنے پر ایک کرگھا نظر آیا، جس پر اونی چادر بُنی جا رہی تھی۔ یہ ایک خاص دیہی صنعت ہے۔ مقامی دُکاندار اِس وعدے پر ضرورت کی چیزیں پیشگی دیتے رہتے ہیں کہ لوگ دھان، میوؤں اور چادروں کی صورت میں اُن کی رقم واپس کر دیں گے۔

اِدھر اُدھر بچے نظر آتے ہیں۔ وہ خوبصورت ہیں لیکن صفائی سے نابلد اور ربط وضبط کے فقدان کی وجہ سے بگڑے ہوئے اور خراب ہیں، تاہم یہ بہت ہشیار ہیں۔ پھرتی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ مویشیوں کو چراگاہوں تک پہنچانا اور شام کو واپس لے آنا یا دن بھر وہاں اُن کی رکھوالی کرنا اِن بچوں کا کام ہے۔ پانچ سال کی عمر کا بچہ ایک بھاری بھرکم مہیب بھینس کو چھڑی سے ہانک سکتا ہے۔ کھیتوں میں بھی یہ بچے بڑوں کا ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں۔ لڑکیاں دریاؤں اور ندیوں سے پانی لاتی رہتی ہیں۔ اُن پر کام کا زیادہ بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔

سخت محنت کی وجہ سے بچپن کی شوخی اور جوانی کی خوبصورتی بہت جلد کھو دیتی ہیں۔ کم عمری میں یہ لڑکیاں سروں پر ٹوپیاں پہنتی ہیں۔ بعد میں گندھے ہوئے بالوں کو چُٹیا کر دیتی ہیں اور سر کے پیچھے پشت پر لٹکا دیتی ہیں۔ شادی کے بعد، جو صرف دس سال کی عمر میں کر دی جاتی ہے، سر پر کَسابہ پہنایا جاتا ہے۔ یہ گول ٹوپی کی طرح کا پہناوا ہے اور اس پر سر والی سوئیاں چبھو دی جاتی ہیں۔ اُس کے اوپر سے ایک سفید کپڑا پشت پر لٹکایا جاتا ہے۔ دُلہنوں کو مدہم سبز رنگ کا پھیرن پہنایا جاتا ہے، کچھ ننگے پیر ہوتی ہیں۔ کچھ چمڑے کے جوتے پہنتی ہیں اور کئی گھاس کی بنی ہوئی جوتی۔ دیہات میں مکانات اور جھونپڑیاں چمنی یعنی دُود کش کے بغیر ہیں، اِس لئے اکثر لوگ دُھویں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کئی دیہات میں دُو منزلہ مکانات ہیں۔ لکڑی کے فریم ورک میں خام اینٹوں کا استعمال ہوتا ہے۔ قدرے بہتر مکانات میں پختہ اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔ دوسری منزل میں گھاس پھوس کی چھت کے نیچے گھاس اور بالن کے سٹور ہیں۔ اِسی منزل میں ریشم کے کیڑے بھی پالے جاتے ہیں۔ ہزاروں دیہاتی اِس کام کو منفعت بخش مانتے ہیں۔ کچھ مکانوں کی دُوسری منزل پر ایک کُھلا، آرام دہ اور ہوادار ورنڈا ہوتا ہے۔ اس میں سال کا زیادہ وقت گذارا جاتا ہے۔ اِسی دوسری منزل کے ایک کونے میں مٹی سے بنائے ہوئے چولہے پر کھانا پکایا جاتا ہے۔ گاؤں کو جانے والا راستہ کسی ندی کے کنارے یا پہاڑی ڈھلوان پر سے جاتا ہے۔ اخروٹ کے بڑے درختوں کا سایہ ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اخروٹ کے کچھ درختوں کا گھیرا ۱۸ فٹ سے بھی زیادہ ہے۔ سردیوں میں لوگ جن کمروں میں رہتے ہیں وہ تقریباً تاریک اور روشندانوں کے بغیر

ہوتے ہیں۔ اکثر مکانوں کی نچلی منزل مویشی خانہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اِس طرح مکان میں سردیوں کے دوران گرمی پیدا ہوتی رہتی ہے لیکن یہ عمل کئی نقصانات کا حامل بھی ہے۔ کشمیر میں چوہے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اناج کو لکڑی کے کوٹھاروں میں رکھا جاتا ہے۔ یہ چکور چوبی عمارت زمین سے کچھ فٹ اوپر بنائی جاتی ہے۔ ہر ایک گاؤں میں ایک مسجد ہے۔ کئی مساجد اپنی قدامت اور منقش چوبکاری کی وجہ سے اہم اور خوش کن ہیں۔ پُو پھوٹتے وقت اور غروبِ آفتاب کے موقعے پر اذان سنائی دیتی ہے۔ دیہاتی ماہِ رمضان میں سختی کے ساتھ روزے رکھتے ہیں۔ اِس مہینے میں مسجدیں نمازیوں سے کچھا کھچ بھری ہوتی ہیں۔ مسجد کی چھت کے نیچے یا مسجد کے ورنڈا پر ایک چوبی تابوت ضرور دیکھنے کو ملتا ہے۔

ایک عام دیہاتی حیرت انگیز آدمی ہے۔ وہ نہ خوش پوش ہے اور نہ زیبائش کا دِلدادہ۔ وہ گندہ رہتا ہے۔ اُس کے سر پر پُرانی گول ٹوپی، جو پہلے بھورے یا سُرخ و سنگتری رنگ کی ہوتی ہے، اَب چکنی ہوگئی ہے۔ کُھلی آستینوں والا اُس کا سوتی پھیرن نایٹ گاون Night Gown جیسا ہے۔ اُس کے پہناوے میں ایک بڑا ڈھیلا مگر نصف ٹانگوں تک ہی پہنے جانے والا پاجامہ اور گھاس کی جوتی پاؤں میں اور کاندھوں پر لمبی بھوری یا کالی اُونی چادر شامل ہے۔ بہر حال وہ ایک کھلاڑی کی طرح پھُرتیلا بھی ہے۔ وہ سو پونڈ وزنی سامان پانچ میل تک لے جا سکتا ہے، کبھی کبھی ۶۰ پونڈ وزنی سامان بارہ میل تک پہنچا سکتا ہے۔ وہ مُنہ اندھیرے سفر پر نکلتے ہیں۔ چھوٹے بچّے اپنے قد اور وزن کے مطابق بوجھ اُٹھا لیتے ہیں۔ دیہاتی گھاس اور زرعی پیداوار سر پر، پشت پر یا بوریوں میں اِدھر

اُدھر لے جانے میں ماہر ہیں۔ پہلی بار دیکھنے پر اُن کا جسم کچھ مضبوط اور متاثر کُن نہیں لگتا ہے۔ اُن کے پٹھوں کی مضبوطی ظاہراً واضح نہیں ہے مگر وہ حیران کُن کام انجام دیتے ہیں۔ معمولی کسان بھی ہُنر مند ہے۔ چابک بنانے کیلئے وہ نونہال پودوں کو مروڑ لیتا ہے۔ گھاس کی رسیاں بناتا ہے، چٹائی بُنتا ہے۔ گھاس کی آرام دہ جوتیاں بنالیتا ہے۔ وہ اُفتادِ طبع کا مالک ہے۔ وہ قُلی کا کام کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ دیہاتیوں میں ضیافت کا حس بھی موجود ہے۔ وہ لطائف سے لُطف اُندوز ہوتے رہتے ہیں۔

اکثر دیہات میں کسی نہ کسی مسلمان ولی کی زیارت گاہ ہوتی ہے۔ عام طور پر زیارت گاہیں درختوں کے جُھنڈوں کے بیچ ہوتی ہیں۔ ساری زیارت گاہیں طرزِ تعمیر کے لحاظ سے امتیازی حیثیت نہیں رکھتیں ہیں۔ ایک سادہ سی دیوار سے گھری ہوئی عمارت، جس پر چوبکاری اور چوبی جڑاو کا کام نمایاں ہوتا ہے، چھت پر گُل لالہ کھلے ہوئے ہوتے ہیں، سُرخ مٹی سے بنایا کلش چھت سے ذرا اُوپر ہوتا ہے، زیارت گاہ ہے۔ اِسی عمارت میں کسی ولی، ریشی یا سیّد کا مرقد ہوتا ہے۔ فادر ارنیسٹ نیو نے مزید لکھا ہے کہ کئی زیارت گاہیں ہندوؤں کے قدیم مقدس چشموں کے کناروں پر تعمیر کی گئی ہیں۔ کشمیری کسان کی مذہبی زندگی میں کسی بھی مقدس شے سے بھی زیادہ رول یہی زیارت گاہیں اَدا کرتی رہتی ہیں، کیونکہ وہ اُن کے ساتھ شدید اُلفت، بے حد عزت واحترام رکھتا ہے، اُن پر اُسے پختہ یقین ہے۔ بیماریوں سے بچاؤ کے لئے، مصیبتوں کا اَزالہ کروانے کے لئے اور ہر خاص موقعے پر کشمیری کسان ان زیارت گاہوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان زیارت گاہوں پر جانور، چاول، گھی اور کبھی

کبھی پیسے نذر کیئے جاتے ہیں۔اِن مقبروں اور زیارت گاہوں جانور، چاول، گھی اور کبھی کبھی پیسے نذر کیئے جاتے ہیں۔اُن کو پیر یا پیرزادہ کہا جاتا ہے، وہ بڑا اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ وہ باری باری گاؤں کی مسجد میں امامت کرتے رہتے ہیں۔وہ عام طور پر خواندہ لوگ ہیں اور اپنے آپ کو سفید پوش بتاتے ہیں۔ یہاں ارنیسٹ نیو نے سفید پوش کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سفید پوش سے مراد ہے۔ ''سفید رنگ کے کپڑے پہننے والا'' یہ لوگ جسمانی محنت ومشقّت کے کام نہیں کرتے ہیں اور مُریدوں سے نذر و نیاز حاصل کر کے اُن کو تعویز اور ٹونے ٹونکے دیتے ہیں۔گاؤں کے اکثر لوگ تعویز اپنے بازو پر باندھ لیتے ہیں یا چاندی کے نہایت چھوٹے ڈبے میں رکھ کر گردن میں آویزاں رکھتے ہیں۔ کشمیریوں کو پیر پرست کہا جاتا ہے۔کوئی بھی شخص کسی مرقد یا زیارت گاہ کے پاس سے گھوڑے پر سوار ہو کر گذرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میں نے بہ چشمِ خود اِس کی مثال دیکھی ہے۔

پت جڑ کے موسم میں اونٹوں کی قطاریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ اونٹ ہندوستان سے لائے جاتے ہیں، اخروٹ اور میوے اُن پر لاد کر واپس کیئے جاتے ہیں۔

مذاہب اور رسمیں:-

کشمیر کے دیہی علاقوں میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے، ہندوں کی تعداد بہت کم ہے، جن میں سے کچھ مقامی انتظامیہ، محکمہ بندو بست اراضی اور محکمہ جنگلات میں چھوٹے درجے کے ملازم ہیں۔ سرینگر میں تیس فیصد ہندو رہتے ہیں۔ وہاں اکثر برہمن ہیں۔ وہ مقابلتاً خوب رُو ہیں اور آریائی نسل

سے ہیں۔ اُن میں ہندوستان میں رہنے والے ہندوؤں کی نسبت چھُوت چھات اور ذات پات پر زیادہ اَڑے رہنے کا رواج نہیں ہے۔ وہ مسلمان کے ہاتھ سے لایا ہوا پانی اور دُودھ پیتے ہیں، وہ خوراک کھاتے ہیں جو کسی مسلمان کی کشتی میں پکایا گیا ہو۔ بیشمار مسلمان عورتیں اُن کے بچوں کی رضائی مائیں ہیں۔ ہندوستان کے مقابلے میں کشمیر میں مذہبی منافرت اور متعصّبانہ کشیدگی نہیں۔ مسلمان متعصب نہیں ہیں۔ ہندوازم اور اِسلام میں یہاں کچھ رسمیں مشترکہ ہیں۔ کئی خاص مقدس مقامات دونوں فریقوں کے لئے اہم ہیں۔ دونوں اُن مقامات کے معتقد ہیں۔ مسلمان اور ہندو دونوں گول ٹوپیوں پر پگڑیاں باندھتے ہیں۔ دونوں فرقوں کے لوگ پھیرن پہنتے ہیں۔ دونوں ننگے پاؤں اور ننگے پیر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی پاؤں میں گھاس کی جُوتیاں پہنتے ہیں بعض لوگ نوکدار چمڑے کے جوتے بھی پہنتے ہیں۔ تاہم ہندو کی پگڑی کی نوک دائیں اور مسلمان کی پگڑی کو نوک بائیں طرف ہوتی ہے۔ ہِندو ماتھے پر قشقہ کھینچ لیتے ہیں۔ ہندو اَپنا پھیرن بائیں جانب باندھتا ہے۔ پھیرن کی آستینیں لمبی اور تنگ ہوتی ہیں اور مسلمانوں کے پھیرن کی آستینیں کھلی ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کے سر عام طور پر منڈے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہندو سر منڈھوا کر بھی سر کی چوٹی پر بالوں کا گچھا موجود رکھتے ہیں۔ عورتوں کے پہناوے اور طرزِ زندگی میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ پنڈتانی سفید چادر سے سر ڈھانپتی ہے۔ وہ پھیرن پہنتی ہے مگر اُس پھیرن پر سوائے کالر اور آستینوں کے سوزن کاری نہیں ہوتی ہے۔ پاؤں میں گھاس کی جوتی پہنتی ہے اور کمر بند کا استعمال کرتی ہے۔ کچھ پنڈتانیاں قابل اور بہترین گھر والیاں ہیں۔ انہیں شوہروں کے

ساتھ شدید اُلفت ہوتی ہے۔ اُن کی احکام کی تعمیل اور ناز برداری میں سعادت محسوس کرتی ہیں۔ یہ عورتیں شوہروں کا نام لینے سے بھی کتراتی ہیں۔ مسلمان عورت سر پر کَسابہ پہنتی ہے۔ پھیرن ایک بَدوضع اور بھونڈا پہناوا ہے۔ شاید یہ مدتوں سے اس لئے عام استعمال میں رہا ہے کہ اس کے اندر کانگڑی کا استعمال آسان اور مفید بن جاتا ہے۔ کانگڑی ایک عجیب سامان ہے، مٹی سے بنائی ہوئی ایک چھوٹی سی ہانڈی، جس کو کونڈل کہتے ہیں، کے اِرد گرد بید یا دوسرے درختوں ٹہنیوں کا فریم بنا جاتا ہے اور ہینڈل بھی بنایا جاتا ہے۔ کونڈل کے اندر آگ ڈالدی جاتی ہے یا کوئلے رکھے جاتے ہیں۔ شدید سردیوں میں لوگ اس کو پھیرن کے نیچے رکھتے ہیں اور اِدھر اُدھر بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور یہ گرمی دیتی رہتی ہے۔ تاہم اِس کے لگاتار استعمال سے بعض اوقات جِلد کا کینسر ہو جاتا ہے۔ کانگڑی بلالحاظ مذہب، جنس اور عمر ہر ایک کشمیری استعمال کرتا رہتا ہے۔ شالی کوٹنے کا طریقہ مسلمانوں اور ہندوں میں یکسان ہے۔ ہر مکان کے آنگن میں لکڑی یا پتّھر کی بڑی اوکھلی نظر آتی ہے، جس میں چار یا پانچ فٹ لمبی موسلی سے اَناج کوٹا جاتا ہے۔ ایک چھاج کے ذریعے کوٹے ہوئے اناج کا چُورہ الگ کیا جاتا ہے۔

سرینگر کے ہندو دکاندار، تاجر یا کسی سرکاری محکمے میں کلرک ہوتے ہیں۔ ذہانت کے اعتبار سے کشمیری ہندو کو ہندوستانی ہندو پر واقعی تفوّق حاصل ہے۔ تعلیم حاصل کرنے پر وہ زیادہ دھیان دیتا ہے، کشمیری ہندوؤں کے بچّے سکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ہندوستان میں کچھ کشمیری ہندو قومی آزادی کی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ اُردو اور

انگریزی بولتے ہیں۔ کشمیری جو عوام کی زبان ہے، مشکل ہے اِس زبان میں صحیح، بامقصد اور موثر محاورات اور ضرب الامثال بکثرت موجود ہیں۔

کشمیر کے لوگ گھر میں بیٹھے رہنے کو خوب پسند کرتے ہیں، بیوی، بچوں کے رسیا اور دلدادہ ہیں۔ دوسرے ملکوں سے آنے والوں کے تئیں اُن کا روّیہ غیر ہمدردانہ ہے۔ اُن کی زبان میں انسانوں، حیوانوں اور چیزوں کے بارے میں روّیہ کی غمازی محاورات اور ضرب الامثال کے ایک لمبے سلسلے سے ہو جاتی ہے۔ وہ اُپنی زبان کے لئے دُو رسم الخط رکھتے ہیں، ہندو شاردا یا ناگری اور مسلمان فارسی رسم الخط کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ کتابیں رومن رسم الخط میں لِکھ کر شائع کی گئی ہیں۔ ہندو مت ایک سماجی سِسٹم ہے، جس میں چھوٹے بڑے مذہبی تہوار اور بے شمار رسوم ورواج ہر شخص کو پابندی کے ساتھ منانے اور اَدا کرنا پڑتے ہیں۔ یہ سلسلہ پیدائش سے مرنے تک چلتا رہتا ہے۔ گذشتہ زمانے میں ستی کی رسم عام تھی، شوہروں کی چتاؤں میں اُپنے آپ کو زندہ جلا کر عورتیں اُن کے تئیں شدید اُلفت اور عقیدت کا ثبوت دیتی تھیں۔ ہر گھر میں زندگی رُسموں کی بنیاد پر چلائی جاتی ہے۔ گرو جی کو زبردست اہمیت واحترام حاصل ہے، اس کے بغیر کوئی ہندو دَھارمک رسم اَدا نہیں کرسکتا۔ ہندو کے گھر میں بچہّ پیدا ہونے پرُ دھوم دَھام سے تقریب منائی جاتی ہے۔ تین سال کی عمر میں بچے کا سر منڈھوا دیا جاتا ہے اور گرُو جی حاضر رہتا ہے۔ سات سے تیراں سال کی عمر کے درمیان بچے کے گلے میں مقدس دھاگا ڈال دِیا جاتا ہے، اسی عمل سے وہ سچّا برہمن بن جاتا ہے۔ یہ سب سے بڑی اور اہم دَھارمک تقریب ہوتی ہے۔ پھر شادی کا وقت آجاتا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں

دُلہے کو مہاراز اور دُلہن کو مَہر ینز کہتے ہیں۔ مسلمانوں کی شادی کی تقاریب میں شمشیر بازی کرنے والی پارٹیاں حاضر رہتی ہے، خوب رقص اور گانا بجانا ہوتا ہے۔ کشمیر میں چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا رواج عام ہے۔ آج کل شادی کے لئے قانونی طور پر چودہ سال کی عمر جایز قرار دی گئی ہے۔ کشمیر کے ہندو بھگوان شوِ کی پُوجا کرتے ہیں۔ وہ پانی کے چشموں جیسے رنبیر سنگھ پورہ اور تُلہ مولہ کے چشمے، سُرخ چمکیلے پتھروں والی فخروطی پہاڑی چوٹیوں اور دیگر عجیب وغریب چیزوں کی پوجا کرتے ہیں۔ پرَدہ عام نہیں ہے۔ امیر گھروں کی مسلمان عورتیں جب سرینگر میں چلتی ہیں تو اکثر بُرقعہ پہنتی ہیں۔ کشمیر، فوک لور سے مالا مال ہے، پیروں، ریشیوں، قدیم بادشاہوں کے کارناموں کے بارے میں بے شمار کہانیاں سُنائی جاتی ہیں۔ ہندسہ نمبر ۱۳ کو منحوس اور نمبر ۱۱ کو مفید خیال کیا جاتا ہے۔ کھیل کود کے سلسلے میں کشمیر میں زیادہ سرگرمیاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ مقامی روایتی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ مگر اب کرکٹ اور فٹ بال مقبولیت حاصل کرنے کی اور گامزن ہیں۔

مختلف لوگ:۔

اگرچہ مہاراجہ کشمیر کی حکومت ملک مصر کی سرزمین سے سات گناہ وسیع وعریض علاقے پر پھیلی ہوئی ہے اور تقریباً یہ علاقہ انگلینڈ، ویلز اور سکاٹ لینڈ کے برابر ہے، تاہم یہاں صرف ڈیڑھ ملین لوگ رہتے ہیں۔ یہاں اَن گنت قطعۂ ہائے اراضی ابھی خالی پڑے ہیں۔ گرمیوں میں اُونچے پہاڑوں کی چراگاہوں میں چوپان اور بکروال مال مویشی چرَوانے کے لئے گذر بسر کرتے ہیں۔ کشمیر کے اکثر علاقے سال کی نو مہینوں تک برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔

لداخ اور گلگت کی سڑکوں پر ڈاکئے ہمیشہ سفر کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ٹیلی گراف تاروں کی مرمت کرنے کے واسطے ریلیف پارٹیاں بھی جاتی ہیں۔ ایسے لوگ ہٹے کٹے، قومی ہیکل، گرم کپڑوں میں ملبوس اور برفانی چوٹیوں پر چلنے میں ماہر ہیں۔ کبھی کبھی پسیوں اور جنگلی حیوانوں یا برفانی طوفانوں کی زد میں آکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

کشمیری چوپان ایک منفرد طبقے سے تعلّق رکھتا ہے۔ یہ لوگ بے شمار ریوڈ لیکر پہاڑوں پر جاتے ہیں۔ گرمیوں میں کسان اپنی بھیڑوں اور دیگر مویشیوں کو چوپانوں کے سپُرد کر کے چراگاہوں میں بھیج دیتے ہیں۔ چوپان گھر کے تمام اُفراد لیکر وہاں خیموں یا معمولی کوٹھوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر گنوار اور ناشائستہ ہیں۔ مسافروں کے لئے زیادہ مددگار نہیں ہیں۔ اُونچے پہاڑوں پر جہاں خوراک کی کمی ہوتی ہے یہ لوگ کسانوں کی بھیڑیں فروخت کرتے ہیں یا ذبح کر کے کھا جاتے ہیں بعد میں کسانوں کے پاس جب اُن کی جواب دہی کا موقعہ آجاتا ہے تو وہ فرضی چوروں اور جنگلی درندوں کی بے اندازہ غارت گری کا رونا رو کر بھیڑوں کی کھالیں کسانوں کو واپس کر کے جرمانے سے بچ جاتے ہیں۔

گوجر اصلی کشمیری نہیں ہیں، تاہم گوجر بڑی تعداد میں ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی والے علاقوں میں بس گئے ہیں جہاں وہ مکئی وغیرہ کاشت کر کے، گائیں، بکریاں اور چند بھینیس پال کر زندگی گذارتے ہیں۔ یہ سامی نسل کے دراز قد لوگ خاص طرز کے کپڑے پہنتے ہیں۔ چوپانوں کی طرح وہ بھی مسلمان ہیں۔ کچھ گوجر خاصے دولت مند ہیں۔ گوجروں کے بچے خوبصورت اور پیارے ہوتے ہیں لیکن اُن کی

تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے اس لئے وہ دن بھر مویشی چَراتے رہتے ہیں۔

شمالی کشمیر میں سرحد کے قریب کچھ خانہ بدوش لوگ دیہاتیوں اور چوپانوں کے لئے ہمیشہ پریشانی کا باعث بنے رہتے ہیں، وہ ان کو مارتے پیٹتے، لُوٹتے اور کبھی کبھی قتل بھی کرتے ہیں۔ پہاڑوں سے تعلّق رکھنے والا ایک اور طبقہ شکاریوں کا ہے۔ کشمیر' واقعی شکاریوں کے لئے جنّت ہے۔ شکاری اصل میں ایسا دیہاتی ہے، جو حیوانوں کو جنگل میں ڈھونڈھنے کی مہارت رکھتا ہے، وہ نڈر اور تجربہ کار آدمی ہے۔ وہ صحت مند، پھرتیلا، سخت موسم کا مقابلہ کرنے والا، جفاکش کوہ پیا شخص سر پر اُونی پگڑی پہنتا ہے، پاؤں میں چمڑے یا گھاس کی جوتی پہنتا ہے، اُس کی نظر بہت تیز ہے۔ عام طور پر اَپنے تجربوں اور کارناموں کی کہانیاں سُناتا رہتا ہے۔

گلوان پُرانے زمانے میں گھوڑوں کو چُرانے میں ماہر مانے جاتے تھے، وہ ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے کبھی کبھی گاؤں پر دَھاوا بول دیتے تھے، نہ فقط یہ کہ گھوڑے چُرالے جاتے بلکہ زبردست لوٹ مار بھی کرتے تھے۔ ان لوگوں کی آج بھی کوئی عزت نہیں، اگرچہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں بہت سے گلوان قید کر لئے گئے، کئی گلوانوں سے تاوان حاصل کیا گیا، اُن کے بُرے کاموں پر قدغن لگائی گئی تاہم وہ آج بھی موقعہ ملنے پر چوری سے باز نہیں آتے۔ ڈومب گاؤں میں چوکیداری کرتے ہیں اور پولیس میں بھرتی ہو جاتے ہیں، ان کی جِلد کالی ہوتی ہے۔ کسان واقعی کشمیر کے لئے ریڈھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ تمام غیر کسان لوگوں کا دار مدار اُس کی کمائی پر ہے، اُن لوگوں کو طائفہ در کہتے ہیں مثال کے طور پر چوپان، گلوان، گوجر اور طرح طرح کے

دستکار۔ کسان، کشتی بانوں، چمڑے کا کام کرنے والوں، بانڈوں اور گانے
والوں کے ساتھ شادیاں نہیں کرتے۔ کشمیری دیہہ باش ایکدوسرے کے
وفادار ہیں۔ وہ باتیں بنانے میں ماہر ہیں۔ غیر ملکی سیلانیوں، خاص کر جب
یورپی افسر ہوں، سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا وہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔
کشمیری کسان کی اِخلاقی پستی اور جرم کرنے کے رجحان کی وجہ جاننے کے لئے
یادرکھنا چاہئے کہ وہ صدیوں سے استبداد کا شکار رہا ہے۔ سب سے اعلیٰ مقامی
آفیسر سے دیہی چوکیدار تک سب حکام اُس کو نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ آج
بھی کسان اُچھے میوے اُگانے اور اچھے کپڑے پہننے سے اِس لئے کتراتے
ہیں کہ کہیں حکام کی نظر اُن پر پڑے تو وہ دو دو ہاتھوں لوٹ لیں۔ چھوٹے
سرکاری ملازم اُن کے لئے زیادہ مصائب پیدا کرتے ہیں۔

قدیم زمانے کی کہانیاں:۔

قدیم زمانے میں کشمیر میٹھے پانی کی بڑی جھیل تھی۔ ہندو دِیو مالا کے
مطابق دیوی پاروتی اِس وسیع جھیل پر سفر کرتی تھی اور ہرمُکھ پہاڑ پر ٹھہرتی
تھی۔ ہرمُکھ ایک ایسی مقدس جگہ ہے جہاں دُور دُور تک سانپ اور بچھو
نہیں ہیں۔ دیوی پاروتی ہرمُکھ سے جنوب میں واقع کونسرناگ تک سیر کیا
کرتی تھی۔ اس دیوی کے اعزاز میں اس بڑی جھیل کو ستی سر کہا جاتا ہے۔
جل بودیو ایک دیو تھا جو جھیل کی گہرائیوں سے نکل کر اُونچے پہاڑی ٹیلوں پر
لوگوں کو چٹ کر جاتا تھا۔ نتیجتاً سارا ملک لوگوں سے خالی ہوگیا۔ برہما جی کے
فرزند کشپ نے کشمیر کا سفر کیا۔ یہاں مکمل تباہی و بربادی دیکھی۔ اس نے ایک
ہزار سال تک عبادت کی اور برہما، وشنو اور شوجی سے مدد مانگی۔ دیو پانی میں

چھپ گیا۔ اننت نے پہاڑ میں بہت بڑا شگاف کر دیا، پانی بہہ گیا، دیو نے اتنا دھواں پیدا کیا کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ وشنو نے روشنی پیدا کرنے کے لئے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند رکھا، پھر بھی دیو ایک تالاب میں رُوپوش ہو گیا۔ کشپ نے دیوی پاروتی سے التجا کی تو اس نے سمیرا پہاڑ کا ایک حصہ دیو کے سر پر مار کر اُسے قتل کر دیا۔ ہندوں کے خیال میں ہاری پربت پہاڑی کے نیچے دیو مارا گیا تھا، اس پہاڑی کو وہ لوگ مقدّس مانتے ہیں۔ اس بڑی مہم میں دیو کے مارنے جانے پر چھوٹے چھوٹے دیو ہمت ہار گئے۔ آہستہ آہستہ وادی میں لوگوں کی بُود و باش بڑھتی گئی۔ لیکن یہاں سردیاں اِتنی شدید ہوتی تھیں کہ لوگ وادی چھوڑ کر کشتواڑ چلے جاتے تھے اور وادی کو دیوؤں کی تحویل میں دیا جاتا۔ گرمیوں میں لوگ واپس آجاتے تھے۔ ایک بار سردیوں میں ایک بوڑھا برہمن وادی میں ایک غار میں بیٹھ گیا۔ دیو اُسے پکڑ کر لے گئے اور نیلگوں پانی کی جھیل، نیل ناگ میں جو جلد بودیو کے مستقر سے بیس میل دور ہے، پھینک دیا۔ برہمن پانی کے اَندر سے چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں ایک محل تھا، ناگوں کا بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، بادشاہ نے آنے کی وجہ پوچھی۔ برہمن نے دیوؤں کے ظالمانہ روّیئے کی شکایت کی۔ بادشاہ نے برہمن کو ایک کتاب کا مسودہ عنایت کیا، جس کا نام نیل مت پُوران ہے، جس میں درج عبادت کے طریقوں اور تہواروں کو اپنانے اور عملانے کی تاکید کی تاکہ دیوؤں کے استبداد سے بچا جاسکے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ تب سے لوگ سردیوں میں بھی وادی میں رہنے لگے اور دیوؤں نے اُن کو ستانا چھوڑ دیا۔

کشمیر اَڑھائی سو سال قبل مسیح میں شمالی ہندوستان کے اشوک اعظم کے

زیرِ نگین تھا۔ ساری وادی میں بودھ ستوپ اور خانقاہیں تعمیر کی گئی تھیں۔ زَبرَون پہاڑی کے ڈھلوانوں سے پاندریٹھن کے قدیم مندر سے ہوتے ہوئے اہاٹینگ تک کشمیر کے قدیم دار الخلافے کے آثار ملتے ہیں، اس کی بنیاد اُشوک نے ڈالی ہوگی۔ زُہد شکن ناگ دوشیزاؤں نے اُشوک کے بیٹے جلوک کو مذہب بدلنے پر آمادہ کردیا اور وہ بھگوان شِو کی پوجا کرنے لگا۔ بعد میں ۴۰ ق، م میں بودھ اِزم کا احیائے نو ہوگیا۔ کنشک کے دَور میں عظیم عالمی بودھ کانفرنس کشمیر کے مقام اُشکر میں، جو بارہمولہ علاقے میں واقع ہے، کانفرنس کا حال پتھروں پر کندہ کرواکر، اُن پتھروں کو اُشکر میں زمین کے اَندر چُھپایا گیا؟

چودھویں صدی عیسوی تک کشمیر میں ہندو بادشاہوں کی حکومت تھی۔ لَلتادت اور اَونتی ورمن کامیاب اور طاقتور بادشاہ تھے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کشمیر میں دہشت گری کا زمانہ تھا۔ کچھ قبیلے مثلاً تانترے، کھش، ڈامر اور ٹھاکر گروہ بنا کر لوگوں کو قتل کرتے اور بستیوں کو آگ لگاتے تھے۔ ایک وقت جب شرابیوں، جواریوں اور زانیوں کا دَورہ دَورہ تھا، ذوالچو نے حملہ کردیا۔ اس نے سرینگر کو آگ لگادی، اکثر آبادی کو قتل کردیا، بے شمار لوگوں کو قیدی بنالیا۔ آخر واپس جاتے ہوئے وہ مال و جائیداد، قیدی اور فوج سمیت بَرفانی طوفان میں مر گیا۔

سلاطین کے دَور میں زین العابدین شاندار حکمران کے طور پر رفاہِ عامہ کے کاموں میں جُٹ گیا تھا، اُس نے ۵۲ سال تک حکومت کی۔ مغلوں کے زمانے میں کشمیر میں خوشحالی آگئی تاہم ظالم گورنروں نے کشمیر میں استبداد جاری رکھا۔ افغانوں کے زمانے میں بھی عام کشمیری ظلم و جبر کا شکار رہا۔ ہندوؤں کو تبدیلی مذہب کے لئے مجبور کیا گیا۔ رنجیت سنگھ کے کشمیر پر قبضے کے بعد

مسلمانوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندوستانی سیاستدان کشمیر کی موجودہ گورنمنٹ کو گرانے کیلئے کوشاں رہتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ قدیم تواریخ کو زیرِ نظر رکھ کر دیکھ لیا جائے کہ کس طرح موجودہ انصاف پرور اور مفید سرکار نے ہندوستانیوں کو بے اندازہ فوائد اور آسائشیں پہنچائی ہیں۔ کشمیر ۱۸۴۶ء میں موجودہ سرکار کے تحت آ گیا، جب انگریزوں نے اسے ایک لڑائی میں سکھوں کی شکست کے بعد حاصل کیا، ایک ہفتے کے بعد انگریزوں نے کشمیر گلاب سنگھ کو منتقل کر دیا، انگریزوں نے کشمیر کے عوض گلاب سنگھ سے پچھتر (۷۵) لاکھ روپے حاصل کیئے۔ اِس زمانے سے کشمیر ڈوگروں کے زیرِ نگیں اور انگریزوں کے زیرِ اثر ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے جوں ہی حکومت سنبھالی تو یہاں اَمن اور انتظامیہ کا تسلسل شروع ہو گیا۔ کشمیر کو انگریزوں نے انتظامی اور سماجی سطح پر بے شمار فوائد پہنچائے۔ انہوں نے کشمیریوں کی بہت خدمت کی ہے۔ عظیم زمینی اصلاحات انڈریو ونگیٹ اور سر والٹر لارنس نے پایہ تکمیل کو پہنچائے۔ موجودہ مہاراجہ کی تخت نشینی کے بعد کشمیر میں ترّقی کے نئے دَور کا آغاز ہو گیا۔

وسائل اور ترقی:۔

کشمیر میں پُرانے زمانے سے دیہاتیوں سے جبراً اور بلا معاوضہ کام لیا جاتا تھا، اِس کو بیگار کہتے تھے۔ دُور دراز اور دشوار گذار پہاڑی علاقوں تک رسد پہنچانے کے لئے لوگوں کو بیگار پر بھیجا جاتا تھا اور اُن میں سے اکثر موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ سرینگر کے لوگ سستے داموں چاول چاہتے تھے اور دیہاتیوں سے دھان کی

جبری وصولی کی جاتی تھی لیکن کشمیریوں کے دَر و دیوار پر ترّقی اور خوشحالی دستک دے رہی ہے۔ بہت حد تک بیگار ختم کر دی گئی ہے۔ نئے مکان بنے ہیں اور مزید تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ پختہ سڑکیں اور جدید طرز کے پُل بن رہے ہیں۔ بجلی متعارف ہو رہی ہے، سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کے چلنے کا رواج ہو گیا ہے۔ اسٹیٹ کونسل کی تشکیل، عظیم زمینی اصلاحات، فائنانشل محکمے، پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ، پوسٹل اور ٹیلیگراف اور محکمہ جنگلات کی تنظیمِ نو نے عام لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے راہیں ہموار کی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ زمین زیرِ کاشت لائی جا رہی ہے۔ اَب آبادی میں اضافہ متوّقع ہے۔ اَب دُوبارہ قحط نہیں پڑیں گے۔ سرینگر کو پینے کا صاف پانی نلکوں کے ذریعے مہیا کرنے سے بڑی حد تک ہیضہ پر قابو پالیا گیا ہے۔ کشمیر میں اَب شاندار میڈیکل سروس ہے۔ چرچ مشنری سوسایٹی کا اسپتال، جو کشمیر میں پہلا اسپتال ہے، سال بھر کئی ہزار مریضوں کو رجسٹر کرتا ہے، وہاں آپریشن بھی کئے جاتے ہیں۔ کشمیر کے اُپنے طبیّ ادارے بھی قابلِ قدر کام کر رہے ہیں۔ عورتوں کی آبادی میں کمی کی طرف دھیان دینا ہوگا۔ چیچک کے خلاف جنگ جاری رکھنا ہوگی، خوشی کی بات ہے کہ چیچک کے خلاف ویکسنیشن کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ کشمیر مشن اسپتال کے کارندوں نے بہت سال پہلے کوڑھ کے مریضوں کے علاج کے لئے ایک اسپتال قائم کیا تھا، جو کہ اَب حکومت نے اُپنی تحویل میں لیا ہے۔ سرینگر میں تپِ دق کے مریضوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اس کی روک تھام اور خاتمے کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

تعلیم بھی عام ہو رہی ہے۔ پہلے پہل چرچ مشنری سوسائٹی نے سکول

کھولے۔سی۔ای۔ٹینڈل بسکو نے کشمیر کے لئے ایسا کام کیا جو کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔اُس نے بوائے سکاوٹ تحریک کے طرز پر لوگوں کو بہترین تعلیم فراہم کی۔اَب حکومت نے بھی اسکول اور کالج کھولے ہیں۔

کشمیر میں شالی بکثرت پیدا ہوتی ہے۔گندم، جَو اور دیگر اجناس کی پیداوار بھی خوُب ہوتی ہے۔ ہندوستان کے میدانی علاقوں کو میوہ جات بھیجے جاتے ہیں۔پت جڑ کے موسم میں خچروں اور گھوڑوں کی قطاریں ہندوستان کی طرف جاتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہیں، اِن جانوروں پر اُخروٹ، سیب اور دیگر میوے لدے ہوتے ہیں۔

یہاں سے آلو بھی باہر بھیجے جاتے ہیں۔گوجر اور بکروال مکھن، گھی، پنیر اور دُودھ سے بنی دیگر اشیا تیار کرتے ہیں، جنگلات سے کشمیر کو خاصی آمدن ملتی ہے۔جنگلی حیوانوں کے چمڑے، جڑی بُوٹیاں اور عمارتی لکڑی برآمد کی جاتی ہے۔ یہاں سے ریشم اور زعفران بھی برآمد ہوتا ہے۔سوتی کپڑے، نمک، چائے، کھانڈ، لوہا، تانبا اور دیگر دھاتیں، مٹی کا تیل اور تمام قسم کی مشینری، مثال کے طور پر موٹر وغیرہ کشمیر کو درآمد کرنا پڑتے ہیں۔

پانی کی فراوانی کے سبب کشمیر میں حد سے زیادہ بجلی پیدا کرنے کے اِمکانات موجود ہیں۔اِس وقت سرینگر اور کچھ بڑے قصبوں میں صرف روشنی کے لئے بجلی کا استعمال ہوتا ہے۔اگر یہاں ٹرانسپورٹ کو ترقی دی جائے تو برآمد کرنے کے لئے لاتعداد خام مال پیدا کیا جاسکتا ہے۔کاش یہاں ریل گاڑی چلانے کا انتظام ہو جاتا تو تجارت کو خوب ترقی ملتی۔یہاں بے شمار صنعتیں لگانے کے امکانات ہیں۔موجودہ صنعتیں جن میں کپڑے بُننے کا کام، سُوت

اور اُون کی صنعت، برتن سازی، پیپر ماشی، کاغذ سازی، گُلکاری، وُوڈ کارونگ، لکڑی کی صنعت، قالین بافی، شال بافی، ریشم سازی، دِیا سلائیاں بنانے کا کام اور سنگتراشی وغیرہ ہیں، مزید ترقی پاسکتی ہیں اگر وَرک شاپوں کا اہتمام کیا جائے اور صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے' یہاں نئ صنعتیں قائم کرنے کے لئے کافی وسائل ہیں۔

کشمیر کو چرچ مشن سوسائٹی کا مرہونِ منّت ہونا چاہئے، کیونکہ گذشتہ نصف صدی سے اِس سوسائٹی نے کشمیریوں کو اسپتالوں کے ذریعے بے حد سہولت پہنچائی ہے اور تعلیم کو فروغ دیا ہے۔

متفرقہ:۔

فادر اَرنیسٹ نیو نے زیرِ نظر کتاب میں قدیم مندروں اور زیارت گاہوں، مغل باغات، چشموں، جھیلوں، گلیشر وں اور پہاڑی چوٹیوں کے بارے میں بھی اَپنے مشاہدات بیان کئے ہیں۔ تاہم اُس نے کشمیر، کشمیر کی تاریخ اور کشمیریوں کے بارے میں جو کچھ قلمبند کیا ہے، وہ بحث طلب اور غور طلب ہے، کئی بیانوں کے ساتھ اِتفاق نہیں کیا جاسکتا، خاص کر ہندوؤں، مسلمانوں یا دیگر لوگوں کو مذہب اور اعتقادات کے بارے میں اُس نے سطحی اور سُنی سنائی باتیں درج کی ہیں۔ اِس سب کے باوجود اُس نے کشمیر سے متعلق خاص معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

فادر ارنیسٹ نیو نے زیرِ نظر کتاب میں تبت سے متعلق ایک مختصر باب شامل کیا ہے، جس میں بودھ مذہب، رسوم ورواج اور وہاں کی طرز زندگی کے بارے میں کچھ معلومات دَرج ہیں۔

☆☆☆

عبدالغنی شیخ☆

رُسول گلوان کی خودنوشت سوانح حیات

رسول گلوان کی خودنوشت سوانح حیات Servant of the Sahibs ایک معلوماتی اور قابلِ قدر تصنیف ہے، جو رسول کی مہم جویانہ اور متنوع زندگی پر ہی روشنی نہیں ڈالتی بلکہ اِس سے اَنیسویں صدی کے آخری ربع اور بیسویں صدی کے پہلے ربع کے لداخ کی سماجی زندگی، تعلیمی اور معاشی حالات، تمدّنی سرگرمیوں اور سیاسی کوائف کا علم ہوتا ہے۔

غالباً رسول گلوان ریاست کا پہلا باشندہ ہے جس نے اُس زمانے میں انگریزی میں اَپنی زندگی کی سرگذشت لکھی۔ وہ روایتی طور پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔ اَپنی زندگی کا آغاز بطور ایک معمولی قلی کیا۔ یورپیوں کے ہمراہ کشمیر اور سنٹرل ایشیا تک کا سفر کیا۔ اَپنی محنت اور تجربہ سے کام چلانے کے لئے انگریزی میں شُد بُد حاصل کی اور ترقی کرتا ہوا اقسقال عہدے تک جا پہنچا۔ وسط ایشیا سے لداخ آنے والے تاجروں کا افسر ہوتا تھا اور لیہہ میں برٹش

☆معرفت، یاسمین گیسٹ ہاؤس۔لیہہ لداخ

جوائنٹ کشمیر کے تحت کام کرتا تھا۔ اقسقال تُرکی لفظ ہے جس کا مطلب سفید ریش والا بزرگ ہے۔ رسول کو شہرت اِس کی کتاب سے ملی تھی اور یہی اُس کے اقسقال بننے کا پیش خیمہ تھا۔

اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف کے دوران برطانوی ہند اور زارِ روس کے درمیان افغانستان، ایران، سنٹرل ایشیا، پامیر اور تبت کے ریگستانوں، برفانی درّوں، ننگے پہاڑوں اور لق ودق میدانوں میں ایک خاموش جنگ لڑی گئی۔ جسے تاریخ میں Great Game کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ برطانوی ہند کو رُوس کی توسیع پسندی اور پیش قدمی پر گہری تشویش تھی اور سنٹرل ایشیا اور تبت، جاسوس، محقّق اور خفیہ اور اعلانیہ طور سائنسی، تجارتی اور سیاسی مشن روانہ کیے۔ لیہہ اِس مقصد کے لئے ایک اہم مرکز تھا۔ لیہہ نے اِس ضمن میں جفاکش، من چلے اور باہمت کوہ پیما، رہبر، مترّجم، قلی اور کارواں لیڈر دیئے۔ رسول اِن میں ایک تھا۔ وہ تُرکی، تبتّی، اُردو اور کشمیری زبانیں بھی جانتا تھا اور بعد میں اُپنے تجربات اور علمیت کی وجہ سے وہ کارواں لیڈر بنایا گیا۔

رسول کا پورا نام غلام رَسُول گلوان تھا لیکن وہ رسول گلوان کے نام سے مشہور ہوا۔ رسول نے اَپنی کتاب ایک امریکی سیاح اور محقّق رابرٹ براٹ کی تحریک پر لکھی تھی۔ رسول نے بطورِ کارواں لیڈر اُس کے ہمراہ سنٹرل ایشیاء اور چین کا سفر کیا اور وہ رسول کی کارکردگی سے بڑا متاثر ہوا۔ رابرٹ براٹ کی ہدایت پر رَسول گلوان نے اَپنی خودنوشت سوانح کے مسوّدے صاحب کو مختلف پتوں پر مختلف مقامات پر بھیجا۔ پہلی کوشش کو رابرٹ براٹ نے کئی مرتبہ ناقابلِ فہم اَبواب دوبارہ لکھنے کے لئے واپس کیے۔ آخرکار بقول

براٹ، رسول نے لکھنے کی ایک طرز پالیا اور اِسی کو اپنایا۔ رابرٹ نے بہت ساری جزئیات اور تفصیلات کو جن میں موسم اور سفر کی مشکلات کا ذکر تھا، حذف کیا۔ آخر کار کیمبرج میں رسول کی تصویر کے ساتھ کتاب شائع کی۔ زبان اور گرائمر کی غلطیوں کی تصیح کی ضرورت سمجھی نہیں گئی۔

رابرٹ براٹ، غریب صاحب کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ اس میں دوسرے انگریز افسروں کی طرح دَبدبہ نہیں تھا جو ہندوستانیوں کو اُپنا غلام سمجھتے تھے۔ رابرٹ براٹ سادہ لباس پہنتا تھا اور لداخی قلیوں اور گھوڑے والوں کے ساتھ گھل مِل جاتا تھا۔

رسول گلوان متعدد یورپی محققوں اور مہم جُو سیاحوں کے ہمراہ تبت، سنٹرل ایشیا، پامیر، اکسائی چن وغیرہ گھوما تھا لیکن اس کی خودنوشت سوانح عمری میں رسول کی سیاحت اور صحرانورَدی کی طویل زندگی کا ایک اجمالی خاکہ ملتا ہے۔ ان میں سے بعض اِنفرادی محققوں اور سیاحوں کے سفر نامے اور رپورٹ رسول گلوان کی کتاب کے مقابلے میں زیادہ ضخیم اور جامع ہیں۔ حالانکہ رسول نے انفرادی طور اُن سب کے مقابلے میں بہت زیادہ سفر کیا تھا۔ تاہم اپنی جگہ اس کتاب کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ یہ رسول گلوان کی شخصیّت کے مخفی اور دلچسپ گوشوں کو بے نقاب کرتی ہے اور اس دَور کی کئی اہم باتیں منظرِ عام پر آتی ہیں۔

رسول گلوان کا دادا خیرا گلوان تھا جو دلچسپ روایتوں کا جنم داتا ہے اور جس کے کارنامے الف لیلیٰ داستان کے کسی اہم کِردار کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ جہاں ایک بدنام رہزن اور ڈکیتی مارتھا، وہاں خیرا گلوان نے سِکھ گورنر کرنل

میاں سنگھ (۱۸۴۱-۱۸۳۴ء) اور اِس سے پہلے کے گورنر کی حکومت کی ناک میں دَم کر رکھا تھا۔

خیرا کو گلوان قبیلے میں خاص مقام حاصل تھا۔ مورّخ محمد الدین فوق نے گلوان کو گلہ بان بتایا ہے۔ سر والٹر لارنس اپنی کتاب (Imperial Gazetter of India) میں ان کے بارے میں رقمطراز ہے:

"گلوان، چک خاندان کی اولاد ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک قاہرانہ بے چینی پائی جاتی ہے۔ پہلے وہ گھوڑے پال کر گذارہ کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے گھوڑے چُرانے کا پیشہ اختیار کیا کیونکہ ان کے لئے یہ کام زیادہ آسان تھا۔ سِکھوں کے دورِ حکومت میں انہوں نے بڑی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ بہت ساری روایتوں کے ہیرو خیرا گلوان کو سکھ گورنر میاں سنگھ نے تختۂ دار پر لٹکایا۔ گلاب سنگھ نے گلوان کیخلاف اپنی مہم جاری رکھی اور ان کو بُونجی جلاوطن کیا"۔

رسول کا باپ محمد گلوان بھاگ کر بلتستان آیا۔ ان کے بھائی کا نام غفور گلوان تھا۔ غالباً اس زمانے میں محمد گلوان کو کشمیر سے جلاوطن کیا گیا تھا یا وہ خود سِکھوں کی دستبرد سے بچنے کے لئے بھاگ گیا تھا۔ رسول گلوان کی ماں بلتستان سے لیہہ آئی تھی جہاں اُن کی شادی اُپنے قبیلے کے ایک آدمی سے ہوئی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن دنوں لیہہ میں گلوان پہنچا تھا۔

رسول کی پیدائش لیہہ میں ہوئی۔ بتایا گیا ہے کہ کتاب کی تصنیف کے وقت رسول گلوان کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ اس حساب سے وہ لگ بھگ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ اگر اِس سِن کو مصدقہ قرار دیا جائے تو رسول گلوان بارہ سال کی عمر میں بطورِ قلی ینگ ہسبنڈ کے ہمراہ سنٹرل ایشیا کی مشہور مہم پر

روانہ ہوا تھا۔ اِس سے پہلے ایک ڈاکٹر Trall کے ساتھ کشمیر سفر کیا تھا۔ رسول نے خود بھی لکھا ہے کہ اس نے کمسنی میں سفر کیا تھا۔

اُس زمانے میں ہی تبت اور سنٹرل ایشیا کے بے آب و گیاہ علاقوں اور لق ودق خطوں کی مسافت انتہائی صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام تھا۔ گھوڑے اور انسان سردی اور برفانی طوفان سے مرجاتے تھے۔ راستے میں رَہزنوں کا خطرہ تھا۔ کئی دفعہ دل گردہ والے مہم جو بھی ہمت ہار جاتے تھے۔ چنانچہ صحرائے گوبی میں اَپنے سفر کا ذکر کرتا ہوا ینگ ہسبنڈ، رسول کی کتاب کے پیشِ لفظ میں لکھتا ہے:

''ایک رات میں نے اَپنے آپ سے کہا کہ میں کتنا احمق ہوں کہ جو یہ سفر کر رہا ہوں اور میں نے قسم کھائی کہ آئندہ میں رُوئے زمین کے ایسے ویران علاقوں میں پھر کبھی سفر نہیں کروں گا''۔

ایک قلی کا کام زیادہ مشکل تھا۔ اُسے کپڑے دھونا، کھانا پکانا، ایندھن جمع کرنا، جانوروں پر سامان لادنا حتیٰ کہ کبھی سامان بھی اُٹھانا پڑتا تھا۔ وہ عموماً پاپیادہ سفر کرتا تھا۔ کئی یورپی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر اُن کو سزائیں دیتے تھے۔ چنانچہ ینگ ہسبنڈ نے قدرے حیرت کے ساتھ لکھا ہے کہ ہمالیائی لوگ کسی Stray مسافر کے لئے کیوں اِتنے مصائب اُٹھاتے ہیں اور اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں؟ ان کو اس کے لئے بہت کم محنتانہ ملتا ہے جبکہ انہیں روزانہ آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ حادثات کی صورت میں ان کی زندگی کا کوئی بیمہ نہیں ہے۔ پھر بھی یہ لمبے اور مشکل دن میں کام کرتے ہیں۔ یہ دانستہ اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں اور سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہ
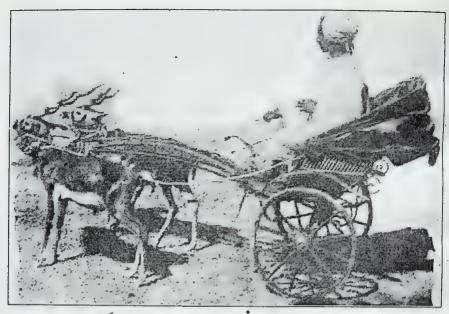
راجکماروں کی سواری کے لئے نایاب نسل کے کالے ہرنوں سے کھینچے جانے والا رتھ

SERVANT OF SAHIBS

رسول گلوان کی کتاب "The Sevent of Sahibs" کا سَرورق

قلعۂ لداخ ۔ ایک قدیم تصویر

لداخی بازار ۔ ایک جھلک

ہیمس گنپہ میں مہاتمابدھ کی دیواری تصاویر
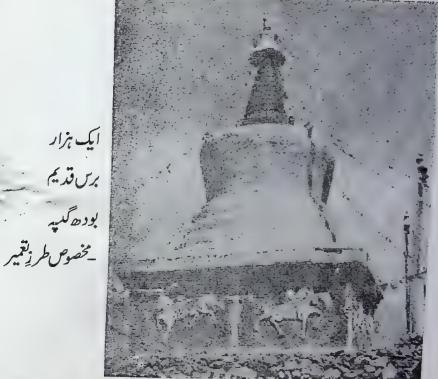
ایک ہزار
برس قدیم
بودھ گمپہ
۔مخصوص طرزِ تعمیر

لداخ۔
دیواری
تصاویر۔
وسطِ ایشیائی
اثرات

اُپنے مالکوں کے بہت شکر گذار ہوتے ہیں۔

پھر وہ لکھتا ہے: اِس کتاب سے ہمیں اِس مشکل سوال کا جواب ملتا ہے۔ ینگ ہسبنڈ کو صبر آزما سفر کے دَوران جن تجربات سے گذرنا پڑا، قلیوں کو بھی ایسے ہی تجربات سے گذرنا پڑتا تھا ایک روز رسول روتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیوں لیہہ میں قلی بن کر نہیں رہا؟

تاہم قلی اور گھوڑے والے عموماً ہنسی خوشی سے رہتے ہیں۔ اِس ضمن میں ینگ ہسبنڈ رقمطراز ہے:

''اُس راز کا جواب یہ ہے کہ اِن لوگوں کو مُہم جوئی سے اُتنا ہی لگاؤ ہے جتنا ان کو ملازمت میں لینے والے لوگوں کو لگاؤ ہے''۔

، ینگ ہسبنڈ کشمیر میں برٹش ریذیڈنٹ بھی رہا، کے سفر کی تاریخوں اور دوسری جزئیات کی تمام کڑیوں کو ملانا بہت مشکل ہے کیونکہ جن سیاحوں کے ساتھ رسول نے سفر کیا تھا ان میں سے اکثروں کے سفر کے ریکارڈ دستیاب نہیں ہیں۔

رسول نے ۱۸۹۰ء میں ینگ ہسبنڈ کے ساتھ سفر کیا۔ ۱۸۹۲ء میں لارڈ ڈینمور کے ہمراہ دنیا کے بلندترین مقام پامیر گیا۔ ۱۸۹۵ء میں جارج آر لٹیل ڈیل کے ساتھ دشوار گذار علاقوں سے ہوتا ہوا وہ تبت کی راجدھانی لہاسہ کے نزدیک پہنچا۔ اِس سال آرتھر نیو کے ہمراہ قراقرم اور بلتستان کے بالتورو اور سیاچن کے گلیشروں کے سفر پر رَوانہ ہوا۔ اِس دوران سا سیر کی ۲۵ ہزار بلند چوٹی سر کی گئی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں وہ فلپس اور چرچ کے ساتھ شکار کی ایک مہم پر سنٹرل ایشیا گیا۔ مہم سے واپس آکر فلپس اور چرچ نے لیہہ میں رسول کی

ایک تقریب میں دستار بندی کی۔

اِس کے بعد یکے بعد دیگرے وہ کئی مہمات میں شامل ہوا۔ اِن میں مارٹائن، ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر رونالڈ ڈِکسن ، رابرٹ براٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں اُطالوی محقق ڈاکٹر ڈی فلیپو فلیپی کی مہم قراقرم میں وہ میرِ کارواں تھا۔ کئی مہمات میں اُس کو اپنی ذہانت، دیانت اور تجربہ کاری کی وجہ سے کارواں لیڈر بنایا گیا تھا جن کی تفصیلات نہیں ملتی ہے۔

رسول گلوان سے متعلق ینگ ہسبنڈ کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

''رسول گلوان ایک محنتی، جفاکش اور تنومند اِنسان ہے۔ اِس پر بڑے بڑے کوہ پیماؤں کو ناز ہوسکتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک دانشمند اور نہایت ہی وفا شعار اِنساں ہے۔ میں نے اس جیسا شکر گذار آدمی اپنی زندگی میں شاید ہی کوئی اور دیکھا ہے۔''

لارڈ ڈینمور کی مہم پامیر اہم سیاسی نوعیت کی تھی۔ اُن دنوں لداخ کی سرحد رُوس، چین، افغانستان اور برطانوی ہند کی سیاسی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی آماج گاہ بنی تھی۔ لداخ کی طرف رُوسی فوج کی پیش قدمی کا چرچا تھا چنانچہ برطانوی ہند کو بڑی تشویش ہوئی اور ینگ ہسبنڈ اور ڈینمور کو رُوسی فوج کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لئے یکے بعد دیگرے پامیر روانہ کیا گیا۔

پامیر میں ایک روز رسول گلوان کا سامنا اچانک چند رُوسی فوجیوں سے ہوا۔ انہوں نے رسول سے باز پرس کی۔ رسول نے اپنی حاضر جوابی سے روسیوں کو قائل کیا اور انہوں نے اِسے سگریٹ پیش کیا۔ رسول نے اِس مقام پر افغان فوج کی چند لاشیں دیکھیں۔ یہ فوجی رُوسیوں کے ساتھ مڈھ بھیڑ میں

مارے گئے تھے۔ واپس آ کر رسول نے ڈینمور کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ڈینمور بہت خوش ہوا اور رسول کو انعام دیا۔

اِس سفر کے دَوران چین اور ہند کی سرحد پر واقع ایک وادی کا نام رسول گلوان کے نام پر گلوان وادی رکھا گیا۔ یہ وہی گلوان نالہ ہے جس کا اخبارات اور ریڈیو میں ۱۹۶۲ء کی ہند اور چین کی جنگ کے دوران بہت چرچا ہوا۔ گلوان وادی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک دفعہ پامیر جاتے ہوئے خراب موسم اور دھند کی وجہ سے ڈینمور کا قافلہ راستے سے بھٹک گیا اور ایک دشوار گذار علاقے میں پہنچا۔ قافلے کے ہر فرد کی آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ رسول گلوان جیسے نوعمر مُہم جو کے لئے یہ امتحان کی گھڑی تھی جس میں وہ پورا اُترا۔ وہ راستے کی تلاش میں نِکلا اور ایک نئی وادی میں وارد ہوا جہاں سے ایک راستے کا سراغ ملا۔ چنانچہ وہ سارے قافلے کو وہاں لے آیا۔ ڈینمور اس دریافت پر بہت خوش ہوا اور اس نے اس وادی کا نام گلوان وادی رکھا جس کو آج کل گلوان نالہ بھی کہا جاتا ہے۔

ڈینمور نے رسول کو اپنی کتاب میں Old Francatelli کا خطاب دیا ہے۔ اس کا مطلب معلوم نہیں ہو سکا۔

ڈینمور نے اپنی کتاب The Pamir میں قافلے کے لداخیوں کی بڑی تعریف کی ہے۔

رسول کی سرگذشت کے مطابق لارڈ ڈینمور کی مہم کے الگ الگ اڑھائی سال بعد ۱۸۹۵ء میں جارج ۔ آر لیٹل ڈیل کے ہمراہ وہ تبت کی مہم پر روانہ ہوتا ہے اور پہلی دفعہ ایک مہم میں کارواں لیڈر منتخب کیا جاتا ہے۔ تب

رسول کی شادی ہوئے صرف جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے تھے۔ لیہہ کے وزیر (منتظمِ اعلیٰ) نے رسول کو بلایا اور مُہم میں شامل ہونے کی پیشکش کی۔ رسول کی لٹیل ڈیل سے ملنے فوری طور کاشغر روانہ ہونا تھا۔ وزیر کو اِس ضمن میں برٹش جوئنٹ کمشنر کا خط آیا تھا۔ رسول اتنی جلدی اپنی نو بیاہتا چہیتی بیوی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن غریبی کی وجہ سے وہ جانے کے لئے مجبور تھا۔ ذیل کے مکالے حقائق کو پیش کرتے ہیں۔

ماں:- ابھی تمہاری شادی ہوئے دس روز بھی نہیں ہوئے ہیں۔ تم کیسے جاسکتے ہو! تم کیا چاہتے ہو؟

رسول:- میں بہت پریشاں ہوں ماں۔ آپ کو اور مریم کو چھوڑ کر جانا بھاری لگتا ہے۔ مجھے ایک بہت اچھی بیوی نصیب ہوئی ہے...... لیکن بیکاری بھی ایک بوجھ ہے۔ شادی پر کافی خرچ آیا۔ گھر میں ایک اجنبی لڑکی ہے۔ ہمیں سردیوں میں گزر بسر کے لئے پیسہ چاہئے......۔

پھر وہ مریم سے ملتا ہے۔ مریم کہتی ہے۔ میں آپ کو اِتنی جلدی جانے نہیں دوں گی۔

رسول:- یہ بات تو ٹھیک ہے مریم، میرے لئے بھی جُدائی تکلیف دہ ہے۔ لیکن...... تم جانتی ہو۔ ہم بہت غریب ہیں...... ایک دُو دفعہ ایسا سفر کرلوں تو کچھ رقم جمع کرلوں گا اور کوئی کاروبار کروں گا۔

مریم:- میں نے سنا یہ سفر بہت بُرا ہوتا ہے اور انسان کی جان کو خطرہ رہتا ہے، اگر آپ......

رسول:- موت تو کہیں بھی آسکتی ہے مریم۔ یہاں بیٹھ کر بھی آسکتی ہے۔

رسول:- (روانگی کی صبح ماں سے) ماں! میں مریم کو بہت چاہتا ہوں۔ اس کی جدائی کا مجھے بہت غم ہے ماں۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس پر

مہرباں رہنا............

ماں:- تم بالکل فکر نہیں کرو رسول......میں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔

رسول:- (الگ سے اپنی بیوی کو) مریم، ماں ذرا گرم مزاج کی ہے۔ خدارا اماں کو نبھا لینا۔

مریم:- میں ماں کا غصّہ برداشت کروں گی..........آپ سفر میں اپنی صحت کا خیال رکھنا۔

رسول:- اپنا چال چلن ٹھیک رکھنا۔ میں ہمیشہ تمہارا وفادار رہوں گا۔

مریم:- میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گی۔ آپ بالکل فکر نہ کرنا۔

رسول:- (مریم کو روتے دیکھ کر) تم پھر رو رہی......اگر ہمارے پاس کچھ روپیہ پیسہ ہوتا تو میں نہیں جاتا۔

مریم:- (اپنے آنسو پونچھتی ہوئی) سفر میں اپنی صحت کا خیال رکھنا۔

رسول:- (مریم کو پانچ روپے کا ایک نوٹ دیتا ہوا) یہ اپنے پاس رکھ لینا۔ ماں کو اِس کا علم نہیں ہے۔ کچھ کام آسکتا ہے۔ میں تمہارے لئے کیا تحفہ لاؤں؟

مریم:- آپ صحیح وسلامت واپس آجائے تو یہ میرے لئے بڑا تحفہ ہے۔"

رسول گلوان نے اپنی کتاب میں جارج لیٹل ڈیل کے ہمراہ تبت کے سفر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اُن دنوں یورپیوں کو تبت میں داخلہ کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ لیٹل ڈیل ـــــ کے قافلے نے اصلی راستہ چھوڑ کر شمال کی جانب سے سفر کیا اور اکا دُکا تبتیوں کی مزاحمتوں کا سامنا کرتا ہوا وہ تبت کی راجدھانی لہاسہ کے قریب پہنچا۔ اِس دَوران کئی جگہوں پر تبتیوں سے جھڑپ ہوتے ہوئے رہ گئی۔

جب لہاسہ ۴۳ میل دُور رَہا تو تبتیوں نے قافلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ قلم رسول اور رسول گلوان گھوڑے پر سوار قافلے سے آگے آگے جا رہے تھے کہ تقریباً ایک ہزار گھوڑ سوار مسلح تبتیوں نے ان دونوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر قافلے کو کمپ تک واپس پہنچایا۔ یہاں سے قافلے کو واپس لداخ کی طرف لوٹنا پڑا۔ اس دفعہ انہوں نے عام راستہ اختیار کیا لیکن بار برداری کے لئے جانور اور اشیائے خوردنی فراہم کرنے میں گاؤں والوں اور خانہ بدوش چنگپاؤں نے اُن کے ساتھ ٹھیک تعاون نہیں کیا تب قلم رسول نے ایک چینی لاما کا روپ دھارا اور رسول گلوان نے تبتی لاما کا بھیس بدلا اور جگہ جگہ اُنہوں نے تبتیوں سے کہا کہ وہ دِلائی لاما کے نمائندے ہیں اور قافلے کی حفاظت کے لئے لداخ تک جا رہے ہیں۔
قلم رسول بڑا چرب زبان اور چالاک تھا۔ وہ لیٹل ڈیل کی بیوی کو دکھا کر، جو اُس سفر میں اَپنے شوہر کے ساتھ تھی، نمبرداروں سے کہتا۔ ہمارے ساتھ انگریز سرکار کی مہارانی وِکٹوریہ کی چھوٹی بہن ہیں۔ لہاسہ میں یہ دلائی لاما کی خصوصی مہمان تھیں۔ ہم دونوں کو چین کی حکومت نے صاحب اور بڑی میم کی حفاظت کے لئے اِن کے ساتھ بھیجا ہے۔ انگلینڈ اور تبت میں دوستی ہوئی ہے اور تحفے تحائف کا تبادلہ ہوا ہے۔

سیدھے سادے تبتی اُن کے جھانسے میں آجاتے اور یاک اور راشن مفت فراہم کرتے۔

قلم رسول جعلی تصویریں اور نقلی ٹکیاں تقسیم کرتا ہوا کہتا۔ یہ تصویریں اور پوتر ٹکیاں ہمیں دلائی لاما نے دی ہیں۔ آپ بھی کچھ تبرک اَپنے لئے رکھیں۔

تبتی ''لہا سو! لہا سو! تو جے چھے!'' جی ہاں جی ہاں شکریہ کہتے ہوئے اور اَپنی زبان نکالے اور ہاتھ جوڑے نقلی تصویریں اور ٹکیاں حاصل کرتے۔

اس طرح رسول اوران کے ساتھی سیدھے سادے تبتیوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے میں کامیاب ہوئے۔

یاک کے تبتی مالکان گلوان اور قلم رسول سے اِتنے مرعوب ہوئے کہ سفر کے اختتام پر رسول قلم اور رزاق آخون کو ریشمی رومال پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ بڑے آدمی ہیں اور ایک بڑی چَراگاہ دکھاتے ہوئے استدعا کی کہ اِسے اِن کے نام انتقال کریں۔

تینوں ایک دوسرے کے مُنہ تاکنے لگے اور قلم رسول نے تُرکی زبان میں رسول سے کہا کہ کچھ لِکھ کر دے دیں۔ رزاق آخون بھی تُرکی میں بولا کہ کچھ بھی لکھ دے نے چل جائیگا۔

رسول گلوان نے ایک کاغذ پر ٹوٹی پھوٹی بودھی میں چراگاہ کے انتقال کا حکم نامہ لکھ کر کرایہ کشوں کو حوالہ کیا اور کرایہ کشوں نے رَسم کے مطابق زبان نکالے شکریہ بجالاتے ہوئے حکم نامہ حاصل کیا۔

مغربی تبت کے صدَر مقام اُودق سے کچھ آگے لیبل ڈل اور اس کے آدمیوں کو چند اہل کاروں اور مسلح سپاہیوں نے روک دیا اور ایک آدمی نے اپنے آپ کو ہیڈ مین بتاتے ہوئے شکایت کی کہ انہوں نے دیوا جونگ (حاکم اعلیٰ) کے حکم کے بغیر تبتیوں سے یاک، گھوڑے اور کھانے پینے کی چیزیں حاصل کی ہیں اور تبتیوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے۔

قلم رسول بولا اگر ہم یہ ڈرامہ نہیں کرتے تو آج ہم یہاں نہیں پہنچتے

اور راستے میں کہیں بھوکے مر جاتے۔

انہیں رود وق میں داخل ہونے نہیں دیا۔ البتہ آگے جانے کی اجازت دی اور ان کی درخواست پر انہیں لداخی تاجروں سے ملنے دیا۔

ایک سال تین ماہ اور تیرہ روز بعد یہ لیہہ پہنچے، جو رسول کی ماں اور مریم نے ایک ایک دن گن کر گزارے تھے۔ ایک رات گھر پر گزارنے کے بعد دوسری صبح رسول کو لیٹل ڈل اور سنو ڈل کے ساتھ سرینگر جانا پڑا۔ موسم سرما تھا اور راستہ کسی بھی لمحہ بند ہو سکتا تھا۔ مریم نے احتجاج کیا۔ رسول بھی اپنی چہیتی بیوی سے اتنی جلدی جُدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''بھاری دل کے ساتھ میں دوسری صبح کشمیر روانہ ہوا۔''

۱۸۹۶ء میں رسول گلوان ایک انگریز آرتھر نیو کے ہمراہ قراقرم، سیاچن اور بالتورُ گلیشر جاتا ہے۔ سفر اور مہم جوئی کا شوق مریم سے کئے گئے وعدے پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ اِس کے بعد وہ چائے کپڑے کی ایک دکان چلاتا ہے۔ ڈیڑھ سال بعد پھر وہ سفر شروع کرتا ہے۔ یہ رابرٹ براٹ ہوتا ہے، امریکی سیاح جن کی ایما پر رسول نے اپنی کتاب لکھی ، غریب صاحب، رسول گلوان اور دوسرے لداخی ملازمین کے لئے سابق یورپیوں سے زیادہ فراخ دل ثابت ہوتا ہے۔

رسول گلوان پیدائشی مہم جُو تھا۔ سیاحت کا شوق اُس کی گھٹی میں تھا۔ مہم جوئی کا عشق اور سفر کا جنون اُسے صحرا صحرا گلشن گلشن لے جاتا تھا۔ وہ رقمطراز ہے:

''چین ترُکستان میں میرے ایک رشتہ دار نے مجھے دولت کی

پیشکش کرتے ہوئے کہا کہ سفر کے مصائب کیوں جھیلتے ہو۔ یہ مال ودولت لے جوتمہاری ضروریات کے لئے کافی ہیں۔لیکن میں نے مال دولت ٹھکراتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے حقیقی سکون بادہ پیمائی اور سیاحت میں ملتا ہے۔''

رسول گلوان اور اس کے ساتھیوں کو نئے نئے مقامات دیکھنے، اجنبی لوگوں سے ملنے اور اُن کے رُہن سہن، رسم ورواج وغیرہ جاننے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے مشاہدات اور تجربات کو وہ لیہہ آکر دوستوں کو بڑے چاؤ سے سناتے تھے۔

بچپن میں لیہہ میں میں نے کئی آدمی دیکھے ہیں جو قلم رسول ،گلوان رسول، صابر ملک اور محمد عیسیٰ وغیرہ کے سفر کی آپ بیتی اور احوال سناتے تھے جو انہوں نے اِن مہم جوؤں سے سُنے ہوتے تھے۔ ان دنوں لوگوں کو بڑی فراغت تھی۔ سفر کے اَحوال سُنانے کے لئے مہم جوُوں کو دعوتیں دیتے اور دوستوں کی محفلیں جماتے تھے۔

رسول گلوان میں کسی چیز کو دیکھنے اور جاننے کا بڑا تجسّس تھا۔ پامیر کے سفر کے دوران اس نے ایک مرتبہ اُپنے کئی ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود محض اس لئے ایک جنگل کو آگ لگادی کہ وہ لپکتے شعلوں کا منظر دیکھنا چاہتا تھا۔ جب لارڈ ڈینمور نے خفگی سے پوچھا کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی تو رسول صاف صاف بولا۔''میں تماشادیکھنا چاہتا تھا''

رسول گلوان خداپرست، سادہ لوح اور نیک انسان تھا۔ کتاب کے پیش لفظ میں ینگ ہسبنڈ بھی مذہبی ہوگیا تھا۔لیکن رسول زاہدِ خشک نہیں تھا۔ وہ اچھا

گویّا تھا اور بڑے چاؤ سے بنجو بجاتا تھا۔ سفر حضر دونوں میں وہ اور اس کے ساتھی اپنے ناچ گانوں سے لوگوں کا دل بہلاتے تھے۔ لیہہ کے بعد چینی ترکستان کے شہر کاشغر اور یارقند اُن کے تفریحی مشاغل کے مراکز تھے۔

رسول نے کتاب میں اپنا ایک گیت دیا ہے۔اس کا اُردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے
یہ خدا کی عنایت ہے
چاروں طرف یہ روشنی بکھیرتا ہے
یہ بڑا طاقت ور ہے۔
غریب لڑکے رسول پر یہ ہمیشہ مہربان ہے
رسول کے پاس کام اور روپیہ نہیں
خدا اپنی رضا سے چھوٹا موٹا کام دیتا ہے

رسول گلوان کی خودنوشت سوانح عمری میں جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ رسول کی سادگی، سچائی اور صاف گوئی ہے۔ وہ اس زمانے کے ایک مثالی لداخی کی طرح لگی لپٹی کے بغیر ہر بات صاف صاف کہتا ہے اور اپنی کمزوریوں کا ذکر کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ کمسنی میں اُپنی غریبی کا نقشہ وہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:

"میں بکری کی کھال پہنتا تھا اور چند بچوں کے ساتھ گوبر اور بُرژے (ایک جھاڑی Artemisia) چُننے جایا کرتا تھا۔ ان میں ایک قلم رسول تھا۔ اُپنے پھٹے ہوئے پاپوش سلانے کے لئے ہم سُوا اور دھاگا ساتھ رکھتے تھے۔ جب پیاس لگتی تو پتھر پر برف پگھلا کر اُسے کھال پر

ڈال کر پی لیتے اور اَپنی پیاس بجھا لیتے تھے۔"

رسول کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اُن دنوں لیہہ میں کوئی سکول نہیں تھا۔"

جب مِشن سکول کُھلا تو وہ عارضی طور وہاں پڑھنے گیا۔ وہ سرکاری سکول میں بھی پڑھنے گیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ "بعد میں مہاراجہ نے لیہہ میں ایک مدرسہ کھولا۔ میں اَپنا شوق پُورا کرنے کے لئے مدرسہ گیا۔"

رسول نے کتنے دَرجے تک پڑھا، اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ باقاعدگی سے وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا۔ ماں نے کمسنی میں اس کو ایک دَرزی کے پاس کام سیکھنے کے لئے رکھا۔ درزی سخت گیر تھا۔ رسول تنگ آ کر بھاگ گیا۔

پھر ایک کوٹھیالہ کے پاس ترازو بردار کا کام کرنے لگا، اور تھوڑا بہت کمانے لگا۔

کتاب میں جا بجا دلچسپ واقعات کا تذکرہ ہے۔ ایک جگہ ہے:

"بچپن میں جب کسی بات پر ماں مجھ سے خفا ہو جاتی تو وہ میرے بدن کی زور سے چٹکی لیتی تھی۔ وہ کبھی سر یا بدن پر ہاتھ نہیں اُٹھاتی تھی کیونکہ ماں کا خیال تھا کہ چٹکی لینے سے بچے کو کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچتا۔

ماں نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ ایک روز ماہِ رمضان میں رسول کی لاپرواہی سے بکری نے افطار کے لئے پکائی ہوئی روٹیاں کھالیں۔ ماں نے باہر جانے سے پہلے رسول کو تاکید کی تھی کہ کہیں بکری روٹیاں نہ کھالیں۔ غصے میں آ کر ماں نے رسول کو گھر سے نکال دیا۔ وہ رات اس نے کسی دُوسرے کے گھر

میں گذاری۔

رسول گلوان میں کہانی گوئی کا اچھا فن ہے۔ ینگ ہسبنڈ نے اس کو جنم جنم کا (پیدائش) کہانی گو قرار دیا ہے جو اپنے اندازِ بیان سے معمولی واقعات کو ادب پارے بنا دیتا ہے۔

رسول کو تُر کی زبان میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اپنی محنت سے انگریزی میں شُد بُد حاصل کی تھی۔ شکور علی نے ینگ ہسبنڈ کو جب وہ سرینگر میں ریڈیڈنٹ تھا، ایک خط میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے: ''مجھے خط لکھنے کے لئے کوئی منشی نہیں ملا۔ اس کی انگریزی تحریر پر ناراض نہ ہونا اور مجھے معاف کرنا......غریب رسول کا بہت بہت سلام!

مسز رابرٹ براٹ رسول گلوان سے بڑی متاثر تھی۔ وہ رقمطراز ہے:

''رسول بڑے خوش اخلاق ہیں...... ایک شریف ترین انسان بھی اس کا ثانی نہیں ہو سکتا وہ بڑے بھلے مانس ہیں اور اس کے ساتھیوں سے بہتر ہیں۔

رسول کی شخصیت سے متعلق اُس کے تاثرات:

رسول کا رنگ بہت سیاہ ہے اور بڑا وجیہہ ہے۔ اس کی حرکات و سکنات پُر وقار اور اس کی مسکراہٹ نہایت ہی دلکش ہے۔ اس کی آواز بڑی شیریں ہے۔ میں نے ایسی میٹھی آواز آج تک نہیں سنی ہے۔ اس کو دیکھ کر ہر عورت پہلی نظر میں فریفتہ ہو سکتی ہے لیکن اس کا کردار بہت بلند ہے۔ عورتیں اس کو ایک ولی سمجھ کر ڈرتی ہیں۔''

مذکورہ الفاظ ۱۸۹۵ء کے رسول کی شبیہ اور شخصیت کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے ستائیس اٹھائیس سال بعد ۱۹۲۳ء کے رسول گلوان کی ایک اور تصویر

ہمارے سامنے ہے جب وہ لیہہ کا اقسقال تھا۔

اس کے سر پر ململ کی سفید پگڑی اور بدن پر ڈھیلا ڈھالا چوغہ ہے۔ اس کے کتابی چہرے پر داڑھی ہے اور ان آنکھوں سے یہ گماں ہوتا ہے کہ اس انسان نے زندگی میں بڑے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔

لداخ کا یہ مہم جُو اِنسان ۱۳ مارچ ۱۹۲۵ء کے روز خدا کو پیارا ہوا۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۷۲ سال تھی۔ حکومتِ وقت نے اس کے دو کمسن بیٹوں کی کفالت کے لئے لیہہ میں زمین دی۔ ان کے یہ دو بیٹے محمد غلام رسول اور حبیب اللہ بھی اَب اِس دُنیا میں نہیں ہیں۔ اُن کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں لیہہ میں آباد ہیں۔

ـــــ لالہ رُخ ـــــ

کشمیر کے پسِ منظر کی رنگین داستانِ حرم

لالہ رُخ سرزمینِ کشمیر کے منظر میں لکھی گئی مشرقی کی ایک ایسی رُومانوی داستانِ حرم ہے جسے غالباً الف لیلہ کے بعد مشرق و مغرب میں بے حد مقبولیت کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔

لالہ رُخ نام کی یہ منظوم و منشور تصنیف آیرلینڈ کے شاعر اور اَدیب ٹامس مُور (1779-1852) کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جس نے اِس افسانوی کہانی کو اِس طرح قلم بند کر لیا کہ اس میں طلسماتی دُنیا کی ساری رنگینوں اور عجائبات کو مجتمع کیا گیا۔ مُور کی یہ تصنیف سب سے پہلے 1817ء میں شائع ہوئی تو مغرب میں اِسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لالہ رُخ قلم بند کرنے کا آغاز مور نے 1812ء میں کیا اور 1814ء میں جب یہ داستان مکمل ہوئی تو اِسے لانگ مینس نام کے ناشروں نے تین ہزار پونڈ معاوضہ کے طور پر مصنّف کو اَدا کر کے

اِس کی اشاعت کے حقوق حاصل کیئے اور اس طرح سے ''لالہ رُخ'' مئی 1817ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اِس کتاب کی مانگ اِس طرح بڑھ گئی کہ صرف تین دن کے اندر اندر ہی ناشر کو اس کا طبعِ ثانی شائع کرنا پڑا اور سال کے اختتام تک اس کے چھ ایڈیشن اشاعت پذیر ہو چکے تھے۔

لالہ رُخ کے قبل ٹاس مور کے نغمات کا مجموعہ Irish Melodies کے نام سے 1807ء میں شائع ہوا تھا جس نے اُسے پہلے ہی شہرت بخشی تھی۔ 1807ء اور 1835ء کے درمیان یہ نغمات دس جلدوں میں شائع ہو کر خاص وعام سے دادو تحسین حاصل کر چکے تھے۔

لالہ رُخ کی انگریزی میں اشاعت کے ساتھ ہی اس کا ترجمہ کئی اور زبانوں میں شائع ہوا جن میں فرانسیسی، جرمن، پولش، فنش، اطالوی، ہسپانوی، رُوسی اور فارسی بھی شامل ہیں۔ اُردو زبان میں لالہ رُخ کا ترجمہ لطیف احمد اکبر آبادی نے کیا جو پہلے نیاز فتح پوری کے مشہور رِسالے ''نِگار'' میں باقساط 1944ء میں شائع ہوا اور بعد میں اُسے نِگار بُک ایجنسی نے ہی ایک کتابی شکل میں شائع کیا۔

ٹامس مُور انگریزی کے ممتاز شعراء لارڈ بائرن اور پی بی شیلے کا دوست تھا جس نے اپنی زندگی میں تخلیقی اَدب کے مختلف شعبوں میں طبع آزمائی کی جن میں نغمات سے لے کر طنز، رومان، تاریخ اور سوانح بھی شامل ہیں۔

مُور، ڈبلن میں ایک پنساری کا بیٹا تھا۔ وہ ایک مفلوک الحال گھر سے تعلّق رکھتا تھا۔ اُس نے ٹرنٹی کالج ڈبلن اور لندن میں تعلیم حاصل کر لی اور 1803ء میں اُسے برمیودا (Bremuda) میں ایک سِول اُفسر مقرر کیا گیا

جہاں وہ ایک سال تک مقیم رہا۔ پھر وہ امریکہ اور کینڈا کا دورہ کرنے کے بعد واپس انگلستان لوٹ آیا۔ 1810ء میں بائرن اور سر والٹر سکاٹ نے مور کو ایک اہم اَدیب کی حیثیت میں تسلیم کر لیا۔

نو سال بعد بدقسمتی سے مور کو جیل بھی جانا پڑا کیونکہ برمیودا میں اس کے ایک مددگار نے چھ ہزار پونڈ خُرد بُرد کر لئے تھے جس کی سزا اُسے بھگتنا پڑی۔

ٹامس مور نے ۲۵ فروری 1852ء کو ولٹ شایر (wiltshire) کے شہر میں انتقال کیا۔ اُسے آج تک آیر لینڈ کا قومی شاعر مانا جاتا ہے۔ مُور نے اَپنی زندگی میں نظم و نثر کی لگ بھگ تیس تصانیف تخلیق کیں۔

لالہ رُخ کی کہانیوں کے دو کردار فرامرزُ اور لالہ رُخ الف لیلہ کی شہزاد اور شہریار کی یاد دِلاتے ہیں جس میں شہزاد عورتوں سے دل برداشتہ اپنے شوہر شہریار کے ساتھ ایک ہزار ایک راتیں گذارنے کے دوران اُسے اُتنی ہی تعداد میں دلچسپ کہانیاں سُنا کر اَپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔

لالہ رُخ کی دل نشین داستان سلطنتِ دہلی کی شہزادی لالہ رُخ اور بخارا کے ولی عہد کے عشق کی کہانی ہے جو اُن دونوں کے دہلی سے کشمیر تک کے سفر کے دَوران پَروان چڑھتا ہے۔ سفر کا آغاز ہونے سے پہلے یہ طے پایا گیا تھا کہ دونوں کی منگنی کے بعد اُن کی شادی کی رسم کشمیر کی وادی میں سرِ انجام دی جائے گی۔

دورانِ سفر لالہ رُخ کو ایک خوش الحان سخن گو اور داستان گو ملتا ہے۔ یہ ہے فرامُرز جو اُس حسین و جمیل دوشیزہ کی سفر کی تکان دُور کرنے کی غرض سے

Lalla Rookh

an Oriental Romance

THOMAS MOORE

KASHMIRI FOLK TALES
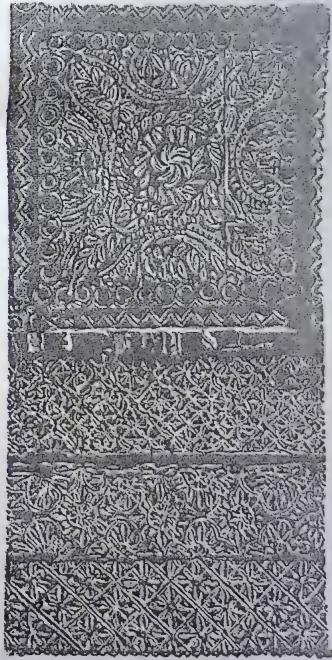
Thomas Moore of Lalla Rookh

"'His blood!' she faintly screamed."
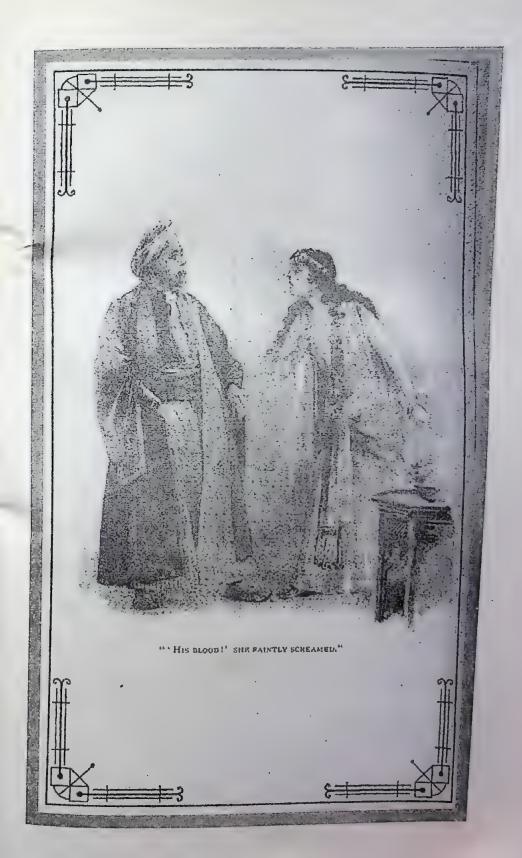
اُسے دُنیائے مشرق سے متعلق ایسی طلسماتی کہانیاں سُنا تا ہے جس سے لالہ رُخ نہ صرف اپنے آپ کو ہر دَم تازہ دم محسوس کرتی ہے بلکہ وہ دل ہی دل میں اس خوب رُو۔ خوش بیان مگر نامانوس داستان گو کی محبّت میں گرفتار بھی ہو جاتی ہے جس کے بارے میں بعد میں اُس پر یہ انکشاف ہو جا تا ہے کہ اصل میں یہی نوجوان اُس کا منگیتر شہزادہ ولی عہد فرامُرز ہے۔

لالہ رُخ کو سنائی گئی ان چار داستانوں کا خلاصہ یوں ہے:

''خراسان کا نقاب پوش پیغمبر'' ایک ایسے شیطان صفت اور کریہہ المنظر شخص کی داستان ہے جو دھوکہ دہی اور فریب کاری سے اُپنے پیَرو کاروں کو اپنا چہرہ دکھانے سے یہ کہہ کر باز رکھتا ہے کہ اُس کا چہرہ اتنا تابناک ہے کہ دوسرے اُس پر نظر میں ڈالنے کی تاب نہیں لاسکتے۔ زلیخا جو ایک غلط فہمی کی بنا پر اِس بات پر یقین کر لیتی ہے کہ اس کا عاشق عازؔم مر چکا ہے اِس شیطان کے حرم میں شامل ہو کر وہاں ایک مقدس فرض اُدا کرنے میں مشغول ہے اور جب اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا مالک نہایت بَدشکل اور شیطانی کرتوتوں کا مالک ہے تو یہ شخص اپنا وہ سب کچھ چھُپانے کی کوشش کرتا ہے جو کچھ زلیخا نے دیکھا ہے۔ زلیخا پر جب اس شخص کی غیر انسانی حرکات کا پول کھلتا ہے تو وہ اُسے زہر دے کر ہلاک کر دیتی ہے اور بعد میں خود بھی اپنے محبوب عازم کی آغوش میں اُسی کی تلوار اَپنے سینے میں گھونپ کر دَم توڑ دیتی ہے۔

''پری اور جنّت'' ایک ایسے درماندہ فرشتے سے تعلق رکھتی ہے جسے صرف اُسی صورت میں واپس جنّت میں داخلہ مل سکتا ہے جب وہ عملی طور پر ایسی عملی مثالیں تلاش کرے جن میں حبُّ الوطنی، بے لوث اضافی محبت اور

عشقِ خدا شامل ہوں۔ ان مثالوں کے عملی پیکر اس فرشتے پر اُس وقت آشکارا ہو جاتے ہیں جب وہ وطن کی حفاظت کرتے ہوئے ایک سپاہی کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ایک ایسی عورت کی حقیقی کہانی کا بذاتِ خود مشاہدہ کرتا ہے جو اُپنے عاشق کو چھوڑ کر اَپنی جان بچانے کے برعکس عشقِ یار میں اَپنی جان کی بازی لگانے کو ترجیح دیتی ہے اور ایک ایسے شخص کو دیکھتا ہے جو ایک بچے کو عبادت میں مشغول دیکھ کر اپنا کھویا ہوا مذہبی عقیدہ دُوبارہ بحال کر لیتا ہے۔

''آتش پرستان'' الف لیلہ میں بھی مختصر طور پر امجد اور اسد کے کرداروں کے نام سے شامل ہو چکی ہے۔ اُن کا ہیرو حافظ اور ہندہ جو امیر الحسن کی بیٹی ہے، ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔ ہندہ کو یہ علم نہیں کہ الحسن ایک ایسے قبیلے کا فرد ہے جسے اُس کے باپ نے صفحہ ہستی سے مٹانے کا عہد کر لیا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک زبردست سمندری لڑائی کے دوران ہندہ کو اُس کے عاشق کے احباب بھگا کر لے جاتے ہیں۔ حافظ سامنے کی پہاڑی پر آگ کے وہ شعلے دیکھتا ہے جو آتش پرستوں نے دہکائے تھے اور وہ اَپنے دشمن کے انتقام سے بچنے کی خاطر ایسی جلتی آگ میں کُود کر جان دے دیتا ہے۔ ہندہ جب یہ دیکھتی ہے تو وہ بھی اُسی کشتی سے چھلانگ لگا کر اَپنی جان کی قربانی دیتی ہے جس میں اُسے قید کر لیا گیا تھا۔

کتاب کی چوتھی اور آخری کہانی ''نُورِ حرم'' ہے جس میں نور محل سُلیم کے ساتھ جھگڑا کرنے کے بعد ایک ایسے جادوئی کرتب کی بدولت اُس کے ساتھ دوبارہ وصل پاتی ہے جسے ایک جادوگرنی نعمونہ نے محل میں لایا تھا۔ یہی وہ داستان ہے جس کے بیان کے دوران مصنّف نے سرزمینِ کشمیر کی دل کھول کر

تعریفیں کی ہیں اور اِسی کہانی کے اختتام کے ساتھ لالہ رُخ اور فرامُرز واردِ کشمیر ہوتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے شریکِ حیات بن جاتے ہیں۔

کشمیر تک اِس سفر کے خوشگوار اور حیات بخش انجام کے بارے میں لالہ رُخ خود کہتی ہے۔

یہ جنتِ ارضی بے رنگ ہوتی
اور اِس میں کوئی خوشی موجود نہیں ہوتی
اگر یہاں پر مجھے
اپنے محبوب کا وصال نصیب نہیں ہوتا!

فرامرز کی بیان کردہ اس حکایت میں کشمیر کے قدرتی نظاروں اور حُسن وخوبی کا اس شاعرانہ اسلوب اور طرزِ بیان میں تفصیلی ذکر کیا گیا ہے:

''وادیٔ کشمیر، اُس کے عدیم المثال گلاب کے وسیع تختوں اور اُن کی شادابی کا ذکر کس نے نہیں سُنا؟ وہاں کے دل کش کنجوں اور شفاف چشموں کی لطافت کے فسانے کون نہیں جانتا۔ وہ چشمہ ہائے شفاف، جو محبّت کا مسکن بننے والی آنکھوں کی طرح ہر وقت منّور نظر آتے ہیں، کیسے یاد نہیں آتے ہیں؟

اِس وادیٔ حسین کا منظر، جب آفتاب غروب ہو رہا ہو صرف آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے کیونکہ اس کی سحر زائیاں الفاظ میں محدود نہیں ہو سکتیں، گرمیوں کی شام کو آفتاب کی آخری درخشاں شعاع جھیل پر اِس طرح منعکس ہوتی ہے جس طرح کوئی نئی دلہن وقتِ شب اَپنے حجلۂ عروس میں جاتے ہوئے آئینہ پر ایک آخری نگاہ ڈالتی ہے اور کسی بات کا خیال اُس کے چہرہ کو رنگِ انفعال سے

رنگ دیتا ہے۔ برگ زاروں کے اَندر نیم مستور سَر بلند معابد کا اِس فضا کے تقدّس میں اضافہ کرنا، موٴذن کی مقدّس موسیقی کا بلند ہو کر فضا پرمُحیط ہُو جانا۔ مجوسی معابد سے بخور کا بلند ہو کر ہوا کو معطّر کرنا۔ اور مندروں کے سامنے رقص کا اپنے ماحول کو مرتعش رکھنا یہ وُہ معمولی مناظر میں جن سے وہاں کی سرزمین ہر وقت معمور نظر آتی ہے۔

اِس نزہت گاہ کا منظرِ لطیف، جب ماہتاب ایک سیلِ نُور جاری کر دیتا اور اپنی لطافت بار روشنی سے باغات و معابد کو حسین تر بناتے ہوئے آبشاروں کے اندر شہابِ ثاقب پیدا کرتا ہے وُہ حالت و کیفیت ہے کہ حواسِ انسانی تاویل کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔

غروبِ آفتاب اور نورِ ماہ کے علاوہ اِس جلوہ گاہِ فطرت کے مطالعے کا وقت نمودِ صبح کی ساعت بھی ہے جب کہ اس کے تدریجی طلوع کے ساتھ دن کی روشنیاں ہر لمحہ میں ایک نیا جادُو جگاتی ہیں اور رنگین پہاڑیاں سفید گنبد کو گو ہر بار خوار سے، سیال چشمے، غرض ہر شے تاریکی کے غلاف سے اِس طرح باہر نکل آتی ہے گویا وہ آفتاب کے اَندر سے پیدا ہوئی ہے۔

جب نکہتِ صبح کے ساتھ ہی پھولوں کے اَندر سے انگڑائیاں لیتی ہوئی نکلتی ہے اور ستِ معطر نسیم رندانہ وضع کے ساتھ بید مجنوں کی شاخوں سے کھیلنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ سرتاپا لرزش بن جاتی ہے تو وہ عالم ہوتا ہے جسے دیکھ کر جینا دشوار ہو جاتا ہے لیکن آج تک پرشگال کی شبنمی راتوں اور تابستان کی نوَرانی صبحوں نے اِس وادیٔ اِرم پرَور کو لطافت و نزہت، بہجت و مسّرت سے اِس قدر لبریز نہیں کیا تھا جتنی کہ وہ اس وقت ہے۔ اس کی فضا یکسر معمورِ حُسن

اور تمام تر لبریزِ محبّت ہے۔ وہ دن کے وقت خیال بندیٔ طلسم ہے اور رات میں سحر کاریٔ خیال سے ہر پیشانی مَسرور نظر آتی ہے اور ہر غنچۂ دل نسیم جب سے شگفتہ ہوتا جا رہا ہے۔

غرض ہر سمت لذّت و انبساط جلوہ فگن ہے۔ اِس لئے کہ کشمیر کی مخلوق آج ''جشنِ شگوفہ'' منا رہی ہے۔ یہ وہ تقریبِ عیش و طرب ہے جس کے طغیانِ ابتہاج اور طوفانِ لذّات میں باشندگانِ کشمیر ڈوب جاتے ہیں۔ پر وہ وقت ہے جب بار ہمولہ کے بلند و شاداب درختوں کی آڑ میں دن اپنی گرم شعاعوں کو تہہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ شام کی سکون پَرور ساعتوں میں جھیل کا پانی ایک خنک لذّت پیش کرنے لگتا ہے۔ کشمیر کی دُوشیزہ لڑکیاں ریشمی تکیوں سے فرقِ ناز کو جُدا کر کے چاندنی کے اَندر زعفران زاروں پر اَپنے طرزِ خرام سے وہ جادُو جگاتی پھرتی ہیں جو صرف حُسن و فطرت کے متفق و ہم آہنگ ہو جانے کے بعد ہی نظر آ سکتا ہے۔

وادی کے ہر کنج میں صدہا مشعلیں متحرّک ہیں۔ مناروں اور گنبدوں پر ہزار ہا چراغ روشن ہیں اور دُور و نزدیک پھولوں کے تختے اور باغوں کی رَوشیں کثرتِ چراغاں سے ایسا سماں پیدا کر رہی ہیں گویا انفاسِ زمین نورانی شعاعوں کی موجیں ہیں جن کا پَرتَو ہر ذرّے کو ایک دُنیائے نوُر بنائے دے رہا ہے اور فضائے بسیط کا پیالہ نوُر اور روشنی سے لبریز کر دیا گیا ہے۔ پھولوں کی پنکھڑیاں شاخوں سے جُدا ہو کر گِرتی اور روشنی کی موجیں بنتی جا رہی ہیں۔ اس شامِ تماشا اور تقریبِ مسرّت کے موقع پر نازنینانِ کشمیر اُپنے نقابوں کو جدا کر دیتی ہیں اور اَپنے رنگین رخساروں کو دکھا کر ایک دفعہ بُلبل کو بھی بے نیازِ بہار

بنا دیتی ہیں۔''[1]

ٹامس مُور کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ کیا وہ بذاتِ خود کشمیر آیا تھا یا نہیں لیکن جس طرح سے اس نے کشمیر کے باغات، زعفران زاروں، بارہمولہ کے بلند و بالا درختوں، قصبوں اور پھلوں اور پھولوں کی تصویر کشی کی ہے اُس سے یہ گمان اغلب ہے کہ اُس نے ضرور کشمیر کی سیر کر لی ہوگی، اگرچہ اُس کی سوانح میں اُس کے دَورۂ کشمیر کا کوئی سرسری ذکر تک نہیں ملتا۔

اُردو دُنیا کے مقتدر نقاد اور صحافی نیازؔ فتح پوری نے لالہ رُخ کی حکایت کی مزید توسیع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''لالہ رُخ'' بالکل فرضی داستان ہے اور اِس داستان کو تاریخ سے مطلقاً کوئی لگاؤ نہیں لیکن جس وقت کشمیر کی ایک عمیق و ساکن جھیل کے کنارے ایک سنسان باغ اور اس کے ویران کھنڈر سے نکل کر ایک خستہ حال دَرویش ہم کو یہ بتا رہا ہے کہ اس کو لالہ رُخ کا باغ کہتے ہیں تو ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ فرامُرز کے نغمے شاید اَب بھی یہاں گونج رہے ہیں اور لالہ رُخ نقاب ڈالے ہوئے یہیں کسی گوشے میں اِن نغموں کو سُن سُن کر بے تاب ہوتی جا رہی ہے۔''[2]

لالہ رُخ کی رشک آور مقبولیت کی وجوہات مختصراً بیان کرتے ہوئے نیازؔ صاحب ہی کا کہنا ہے کہ ''اس مثنوی کی مقبولیت کے دُو سبب تھے۔ ایک

---

[1] منقولہ از ترجمہ ل - احمد اکبر آبادی - خواجہ برقی پریس دہلی 1972ء - ص 195-197

[2] منقولہ از ترجمہ ل - احمد اکبر آبادی - خواجہ برقی پریس دہلی 1972ء - ص 4

تو یہ کہ فسانہ کا پسِ منظر ایشیاء کی وہ سرزمین کشمیر ہے جو اہلِ مغرب کی کشش کے لئے اپنے اَندر بہت کچھ عجائب وغرائب رکھتی ہے اور دوسرے یہ کہ مُور نے اس میں جس تخیّل سے کام لیا ہے وہ اتنی اَچھوتی ' اس قدر نازک اور اس درجہ حیرت میں ڈال دینے والی ہے کہ مغرب اِس کا تصوّر بھی نہ کرسکتا تھا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ چونکہ اِس کے پلاٹ میں افسانہ رُومان اور طِلسم سب ہی کچھ شامل ہے اِس لئے ان تمام باتوں نے مل کر اِس کے اندر ایک شاعرانہ کیفیت پیدا کردی ہے اور اس کے پڑھنے کے بعد انسان ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ حُسن ومحبت کی اُس تمثال دُنیا میں پہنچ گیا ہے جس سے قطع نظر کرنے کے بعد عشق وشباب کے کوئی صحیح مفہوم متعین نہیں کرسکتا۔" [1]

---

[1] منقولہ از ترجمۂ ل - احمد اکبر آبادی - خواجہ برقی پریس دہلی 1972ء - ص 195-197

جیوتیشور پتھک ☆

جمّوں کی پہاڑی تہذیب

—— اور ——

یُونانی بودھ اَثرات

ڈوگرہ پہاڑی علاقے کا تہذیبی ورثہ تاریخ کے دُھندلکوں میں کھو کر رہ گیا ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہاں پر اِنسانی زندگی کا وجود نہیں تھا یا یہاں کے رہنے والے اِس قابل نہیں تھے کہ اُن کے بارے میں کچھ لکھا جائے مگر تاریخ دانوں نے اِس بارے میں کچھ کہنے اور لکھنے کے معاملے میں یقینی طور پر بخل سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جب ایک محقّق کو اِس سنگلاخ سرزمین کے ماضی کی تلاش کرنا پڑتی ہے تو وہ گہرے دُھندلکوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ بعض اَوقات تو لوک کتھاؤں اور مقامی لوک داستانوں سے یہ اندھیرا اور بھی مہیب ہو جاتا ہے۔ مگر حالیہ چند برسوں کے دَوران اِس علاقے کے تاریخی اور تہذیبی ورثہ

☆ جموں (توی)

کے بارے میں بہت ہی اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر تحقیق کا عمل پیش رفت کرنے لگا ہے اور اِس سنگلاخ دھرتی کی خاموش چٹانوں کو زمین ملنے لگی ہے۔ اِس موضوع پر سکندر کے ساتھ آنے والے مؤرخین ڈایوڈرس اور سٹریبو نے اپنے سفرناموں میں لکھا ہے۔ بعدازاں ہیون سانگ کے سفرنامے میں بھی راجوری، پونچھ اور چناب کے مغربی کنارے کے علاقوں کی زندگی کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے اِسی طرح ایک محقق اِس موضوع پر ملنے والے مواد سے تاریخ کی کڑیاں کچھ حد تک جوڑ سکتا ہے۔ مگر ڈایوڈرس اور سٹریبو نے اپنے سفرناموں میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے اِس بارے میں سن یا حکمران کا ذکر نہیں ملتا بلکہ اُس نے اِس سرزمین اور عوام کے بارے میں چند اہم اشارے ضرور دیئے ہیں جو کہ ایک محقق کیلئے کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اِسی طرح ہیون سانگ نے راجوری کی مملکت کے بارے میں جو کچھ لکھا اِس میں یہاں کے لوگوں کے رہن سہن، سلوک، نظریات، نسل اور دیگر باتوں کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے۔ یونانی اثرات کے بارے میں مکرنڈل کی کتاب ''اِنویژن آف انڈیا بائی الیگزینڈر دِی گریٹ'' میں یہاں کی پہاڑی مملکتوں کے بارے میں واضح طور پر تذکرہ ملتا ہے بعدازاں جارج کنگھم نے ''اینشنٹ جیوگرافی آف انڈیا'' میں اِن علاقوں کے حالات سے محل وقوع اور دیگر تفصیلات کی وضاحت کی ہے۔ اِسی طرح تاریخی اور جغرافیائی پسِ منظر کے اِس علاقے کے حالات سے پردہ اُٹھانے میں کسی قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

یونانی مؤرخوں نے سکندر کے عہد میں پنجاب کے گرد و پیش کے رقبہ میں صرف دو[2] سلطنتوں کا ذکر کیا ہے...... ایک ابھیسیار اور دوسری پورس کی

مملکت۔ جہلم اور چناب کے درمیان کے علاقہ کو انہوں نے گلاسائی کا نام دیا ہے۔ ارجن داس ملک نے اپنی کتاب ''الیگزینڈر دی گریٹ'' میں ابھیسار مملکت کا احاطہ جموں اور ہزارہ کے درمیان کیا ہے مگر بہت سے محقق اِس بات سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ اکثر موئرخ ابھیسار کو پونچھ کا علاقہ قرار دیتے ہیں۔

یونانی مورخوں نے ہندوستانی دریاؤں کے نام الگ رکھے تھے۔ جہلم کو انہوں نے ہائیڈسپز (Hydespes) اور چناب کو آسکنی (Askini) سے موسوم کیا ہے۔ اِسی طرح راوی اور ستلج کے نام بھی انہوں نے الگ الگ رکھے تھے۔ اِن سفرناموں میں دی گئیں تفصیلات کے مطابق سکندر نے دریائے جہلم، جلال آباد کے قریب عبور کیا جہاں اُس کا پیارا گھوڑا راہیٔ ملکِ عدم ہوگیا اور سکندر نے اُس کی یادگار بنوائی۔ پورس کی مملکت جہلم اور چناب کے علاقوں کے درمیان تھی اور جہلم اور چناب کے درمیان کا علاقہ پونچھ کا علاقہ ہے۔ میرپور، کوٹلی تحصیلوں کا علاقہ ہے اور اِس بات سے تو سبھی لوگ اتفاق کرتے ہیں کہ جموں و کشمیر کا کچھ حصہ پورس کی مملکت میں شامل تھا۔

مکرنڈل اور ارجن داس ملک کی کتابوں میں دیئے گئے تذکرے کے مطابق سکندر کے ساتھ جنگ کے وقت ابھیسار کے راجہ نے (افسوس کہ اس کا نام ان تذکروں میں نہیں ملتا) سکندر کے پاس اپنا سفیر بھیجا اور اس کی اطاعت قبول کرنے کا اشارہ دیا مگر ساتھ ہی وہ پورس کی حمایت کے لئے بھی کوشش کرتا رہا۔ تاہم پورس کی حمایت ابھیسار کے راجہ کو بروقت حاصل نہ ہوسکی اور پورس نے جواب دیا تھا کہ ہماری ملاقات میدانِ جنگ میں ہوگی۔ جنگ کا وہ میدان جہاں سکندر اور پورس نے جواب دیا تھا کہ ہماری ملاقات میدانِ جنگ

میں ہوگی۔ جنگ کا وہ میدان جہاں سکندر اور پورس کا مقابلہ ہوا کوئی وسیع میدان نہیں تھا بلکہ ایک چھوٹا سا میدان تھا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علاقہ تحصیل مینڈھر کا علاقہ ہے اور عین ممکن ہے کہ سنی میدان میں یہ تاریخی جنگ ہوئی ہو، مگر بعض لوگ اِس علاقہ کو بھمبھر کا علاقہ بھی قرار دیتے ہیں۔ بھمبھر کا علاقہ اِس قدر پہاڑی اور دُشوار گذار نہیں جہاں جنگ کرنا مشکل ہو اور دوسرے سکندر نے دریائے جہلم میدانی علاقوں سے تقریباً ۱۸ میل اُوپر جا کر عبور کیا تھا۔ لہٰذا اِس بات پر اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ یہ جنگ اِن ہی علاقوں مین ہوئی ہے۔ دوسرے جب سکندر واپس ہوا تو اُس نے دریائے جہلم کے کنارے کشتیاں تعمیر کیں اور ان کیلئے چیڑ اور شیشم کے درختوں کی لکڑی استعمال میں لائی گئی ہے۔ یہ لکڑی بھمبھر اور کالی دھار کے علاقے کے بجائے ضلع پونچھ کے جنگلات میں پائی جاتی ہے جبکہ بھمبھر اور اسکے نواحی علاقوں میں بیر، کیکر اور دوسری اَقسام کی لکڑی پائی جاتی ہے جو کہ تعمیرات کے لئے موزوں نہیں۔ یونانی مؤرخوں نے جہلم اور چناب کے درمیان جس علاقے کو گلاسائی کا نام دیا ہے وہ غالباً یہی سرزمین ہے جسے موجودہ زمانے میں ڈوگرہ دیش کا نام دیا جاتا ہے۔ مکر نڈل کی کتاب ''اِنویژن آف انڈیا بائی الیگزینڈر دی گریٹ'' میں دستیاب تفصیلات کے مطابق گلاسائی مملکت ایک خوش حال مملکت تھی، اس میں چھوٹے بڑے ۳۷ قصبے آباد تھے جن میں چھوٹے سے چھوٹے قصبے کی آبادی ۵ ہزار تھی اور بڑے حصّوں کی آبادی دس ہزار یا اِس سے زیادہ نفوس پر مشتمل تھی۔

دریائے چناب کو عبور کرنے کے بعد سکندر راوی کے کنارے جا پہنچا

جہاں سانگل (سیالکوٹ) ایک بہت بڑا شہر تھا۔ سانگل کا ذکر بعدازاں بودھ مت پر تحقیق کرنے والوں نے کیا ہے۔ قدیم زمانے میں اِس شہر کو شیلہ کوٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ بعدازاں جن کتب میں اِس کا ذکر ملتا ہے اِن کے مطابق سکندرِ اعظم کے بعد سیالکوٹ اور گردونواح کے علاقے پر کچھ یونانی راجہ حکومت کرتے تھے۔ یہ لوگ کچھ عرصہ یونانی رہے، بعدازاں اُنہوں نے بُدھ مت اختیار کیا اور بُدھ مت کے زوال کے بعد یہ راجے ہندو بن گئے۔ تقریباً ۲۰، ۲۵ برس قبل بُدھ مت سے متعلق ایک کتاب بُدھ مت کے ۲۵۰۰ سال انگریزی زبان میں مرکزی محکمہ اطلاعات ونشریات کی طرف سے شائع کی گئی تھی جس کا دیباچہ آنجہانی صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن نے تحریر کیا ہے۔ بُدھ مت کے ۲۵۰۰ سال کے ایک مضمون میں ایک ایسے ہی یونانی راجہ میندر کا ذکر سکتا ہے۔ یہ راجہ یونانی تھا اور اس کو بُدھ مت سے متعلق معلومات کا بھاری تجسّس تھا مگر کوئی بھی عالم اِس کو دلیل اور دعویٰ سے قائل نہیں کرپارہا تھا۔ آخر اُس کی ملاقات ایک بُدھ بھکشو ناگ سین سے ہوئی جس کے ساتھ اُس کا تبادلہ خیال ہوا اِس بحث ومباحثے کی بدولت راجہ میندر نے بُدھ مت اختیار کیا۔ ناگ سین کشتواڑ کا رہنے والا تھا۔ پروفیسر محی الدین حاجنیؔ، عشرتؔ کاشمیری اور دوسرے چند لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی بحث وتمحیص کے بارے میں جو کتاب ملیندر پنہا لکھی گئی ہے وہ قدیم کشتواڑی زبان میں ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب پالی یا سنسکرت میں ہے۔ اِن حالات میں یہ بات عین ممکن ہے کہ ضلع پونچھ میں مینڈھر کے قصبہ کا نام میندر کے نام پر پڑا ہوا اور یہ وہی علاقہ ہے جہاں پر ناگ سین اور میندر کے درمیان تبادلہ

خیالات ہوا ہے۔ اِن علاقوں میں بودھ اور یُونانی اَثرات کے بارے میں ماخذ اَب نایاب ہیں۔ البتہ مقامی لوگوں کے مطابق پونچھ کے قریب اجوٹ کے کھیتوں میں کسانوں کو کچھ پرانے کھنڈرات دستیاب ہوئے ہیں۔ یہاں پر تحقیق کی بھاری گنجائش موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ڈایوڈرس، کاسٹریبو نے جن شہروں کا اُپنے سفرناموں میں ذکر کیا ہے ان کے بارے میں کچھ واقفیت حاصل ہوسکے تاہم اَکھنور کے قریب اتیاراں کے مقام پر ۱۹۴۷ء کے آس پاس آثار قدیمہ کے چند نمونے حاصل ہوئے ہیں۔ ان نمونوں (ٹراکوٹاز) کی اَساس پر اخبار سٹیٹسمین کے چارلس فیری نے رسالہ "مارگ" (مارچ ۱۹۵۵ء) میں ایک مضمون سپردِ قلم کیا جس میں اِن نمونوں یعنی Teracotas کی تاریخی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر فیری کے مطابق یہ نمونے ۴۰۰ سے لیکر ۷۳۰ عیسوی کے عرصہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے لکھا ہے کہ دریائے چناب کے کنارے شہر اَکھنور اور امتیاراں آباد ہیں۔ یہ لازمی طور پر تاریخی افادیت کے مقامات ہوں گے جہاں پر یونانی اَثرات کی گہری چھاپ ہے۔ آرتھر ینگ ہسبنڈ کی کتاب "کشمیر" کے مطابق بھی پنجاب اور اِس کے نواحی علاقوں میں یُونانی اور بُدھ فن کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سانگ جب جموں و کشمیر کے دَورے پر آیا تو وہ دو سال یہاں پر رہا۔ چوتھی دہائی کے اِس عرصہ میں اُس نے جن علاقوں کا سفر کیا ان میں پونچھ اور راجوری کا واضح طور پر ذکر ملتا ہے۔ اس تذکرے کی جغرافیائی تفصیلات جارج کننگھم نے "اینشنٹ جیوگرافی آف انڈیا" میں دی ہیں۔ اِس کتاب کے مطابق "پار-تا-شو" کا جو علاقہ درج ہے،

وہ پونچھ ہے ۔اِس کتاب کے مطابق یہ علاقہ زرخیز ہے۔ یہاں پر گندم اور پھلوں کی کاشت ہوتی ہے، اوگنّے کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہ علاقہ اِنتظامی اُمور میں کشمیر کی سلطنت کے ماتحت ہے۔علاقہ میں دس یا بارہ بودھ مٹھ ہیں۔

بودھ کی تفصیلات کے تحت درج ہے کہ یہ علاقہ پار-تا-لشو کا نواحی علاقہ ہے اور آب وہوا کے لحاظ سے گرم ہے۔لوگوں کا رنگ سیاہ مائل ہے۔ یہ لوگ لب ولہجہ کے سخت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہندوستانی نہیں بلکہ غیر ہیں، تاہم یہ علاقہ کشمیر کے ماتحت ہے۔ یہاں پر بُدھ مت کے پیَرو نہیں ملتے، یہ لوگ ہندودھرم کے پیَروکار ہیں۔ جارج کننگھم نے اِس علاقے کو راجوری کا علاقہ قرار دیا ہے۔ ویسے بھی آب وہوا کے لحاظ سے یہ علاقہ زیادہ تر کنڈی علاقوں میں شمار ہوتا ہے جہاں شدّت کی گرمی پڑتی ہے۔زمین پتھریلی ہے اور زہریلے سانپوں کی بہتات ہے۔تاریخ جدید ڈوگرہ دیش کے دیباچہ میں دیا کرشن گردش نے ہیروڈوٹس کا حوالہ رقم کیا ہے۔ ہیروڈوٹس کی ایک رُوداد کے مطابق جمہوریت کا مقصد بھی جموں کی سنگلاخ دھرتی سے یونان تک پہنچا اور یونان سے دنیا کے دوسرے گوشوں نے حاصل کیا۔ ولادتِ مسیح سے ۵۱۷ برس قبل دارا اوّل نے ایک یونانی جرنیل سکائی لیکس کی قیادت میں ایک مہم ہندوستان بھیجی تا کہ وہ فارس کیلئے سمندری راستے کا سُراغ لگائے اور تجارتی امکانات کا جائزہ لے۔ سکائی لیکس اور اس کے ساتھی شمال کی طرف بڑھتے بڑھتے اِس جگہ پہنچے جہاں چندر بھاگا پہاڑوں سے میدانوں میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں سانپ بہت ہیں اور خوفناک قسم کے بچھّو بھی ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک لاش جلائی جارہی تھی اور ایک بُڑھیا زاروقطار رو

رہی تھی۔ سکائی لیکس نے اُس سے پوچھا تم کیوں رو رہی ہو دیوی'' بڑھیا ''میرے اکلوتے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گیا۔ اَب میرا اِس دُنیا میں کوئی نہیں۔''

سکائی لیکس :- اکلوتے بیٹے کو سانپ نے ڈس لیا۔ ہمارے یونان میں تو کبھی کوئی آدمی سانپ کے ڈسنے سے نہیں مرتا۔ ہم نے فارس میں بھی پچھلے آٹھ برسوں میں کوئی ایسی بات سنی نہیں۔

عورت :- مگر ہمارے گاؤں میں سانپ بہت ہیں اور بڑے زہریلے ہیں۔ پہلے میرے سُسر کو سانپ نے ڈس لیا تھا وہ مر گیا۔ پھر میرے شوہر کو اور اَب میرے جوان اکلوتا بیٹا۔

سکائی لیکس :- تب تو بہت خطرناک ہے یہ ملک۔ یہاں زیادہ تر لوگ سانپ کے ڈسنے سے مرتے ہیں تم نے تو اس ملک کو چھوڑ کیوں نہیں دیا۔ بہت وسیع ہے ہمارا ملک۔ تمہارے ملک کی طرح کوئی چھوٹا نہیں۔

عورت :- اس لئے چھوڑا نہیں کہ یہاں جنتا کا اپنا راج ہے۔ یہاں گڈریئے کی طِرح دوُسروں کو نہیں ہانکا جاتا ہے۔ یہاں سب لوگ مل جل کر قانون تیار کرتے ہیں اور خود اُس پر عمل کرتے ہیں۔

سکائی :- مگر یہ موت؟ قدم قدم پر رینگنے والی کالی موت! کیا تمہیں اس سے ڈر نہیں لگتا۔ ہم نے خود راز دار تو میں کتنے ہی سانپ دیکھے ہیں۔

عورت :- ایک نہ ایک دن سب نے مرنا ہے۔ جسے سانپ نہیں ڈسے گا وہ کسی روگ سے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ موت سے ڈر کر زندگی بھر کیلئے اپنی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں دے دیتا اور خود بھیڑ بکریاں بن جانا عمر بھر کا

روگ مول لینے کے مترادف ہے۔ دنیا میں کہیں راجے ہیں، کہیں گنتنتر ہیں، کہیں دوراجاتی یعنی دوعملی ہے۔ ہمیں اپنا گن تنتر ہی پسند ہے۔ جہاں کوئی کسی کا محکوم نہیں، جہاں سب برابر ہیں۔

سکائی لیکس:۔ سُن رہے ہو زیوٹرس (Xiotrus) یہ دیوی کہتی ہے کہ فردِواحد کی حکومت زہریلے سانپ کے ڈنک سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ کاش! یونان کے لوگوں کو بھی یہ راز معلوم ہوتا۔ ہم بھی تو ایسے حکمران کے ڈنک سے بچنے کیلیئے ہی اَپنے ملک سے بھاگ کر نِکلے تھے اور دارا اوّل کے دَربار میں پناہ لی تھی۔

زیوٹرس:۔ اِس دیوی نے ہمیں زندگی کا ایک نیا راستہ دکھایا سکائی لیکس!

سکائی لیکس:۔ بے شک ایک نیا راستہ ہے، یہ بالکل نیا راستہ، سُنو دیوی! آج سے سکائی لیکس تمہارا مُنہ بولا بیٹا ہُوا۔ تم ہمارے ساتھ یُونان چلو اور بھی راز یونانی بیٹوں کو بتاؤ جمہوریت کا راز! ایک نئی زندگی کا راز!!!

سکندر کے حملے کے وقت سٹربیو نے جو سفر نامہ لکھا ہے اُس میں جن علاقوں کی جمہوریت کا ذکر آیا ہے یہ علاقہ آجکے کھٹوعہ اور بسوہلی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اِن تذکروں کے مطابق جو لوگ بعد اَزاں جنگ میں شہید ہو گئے تھے اُن کے عورتوں نے مجموعی طور پر پالتی کوئی (یعنی بسوہلی ہیں) جوہر کی رسم سرانجام دی تھی۔

سی-سی باپت کی کتاب 'بُدھ مت کے ۲۵۰۰ برس' میں میندر وِہار کا ذکر آیا ہے. مگر اس وِہار کا محل وقوع درج نہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ میندر وِہار

مینڈھر میں ہی واقع ہوا۔ کیونکہ ہیون سانگ کی کتاب "ٹریولز آف یانگ سو" میں لکھا ہے کہ پونچھ کے علاقہ میں ایک درجن کے قریب بُدھ وہار ہیں۔ چنانچہ یہ بات قابلِ اعتبار ہوسکتی ہے کہ میندروہار اِسی علاقے میں موجود ہو۔

علاوہ ازیں علاقہ سنی میدان میں پتھروں کی قطاریں اِس طرح ترتیب شدہ ملتی ہیں گویا یہ کوئی قدیم میدان ہوا۔ رام کنڈ، لکشمن کنڈ اور سیتا کنڈ کی باولیاں قدیم ہندو فنِ تعمیر کا ایک نمونہ ہیں۔ حالانکہ مقامی لوگ ان کا رابطہ پانڈوؤں سے جوڑتے ہیں۔ سنی میدان کے علاقہ میں قدیم شہر کے کھنڈرات دستیاب ہوئے ہیں مگر سن اور سال کے یقین کیلئے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اِس کے علاوہ پانچ سروں کی جو مُورتیاں یہاں برآمد ہوئی ہیں اُن کے بارے میں خیال ہے کہ یہ ہندو دَور کی ہیں مگر اِن کے جائزے سے اِن پر یونانی فن کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

..................★..................

معاون کُتب

۱/ اِنویژن آف انڈیا بائی الیگزینڈر دی گریٹ۔ مکرنڈل

۲/ ٹریولز آف یانگ سو

۳/ الیگزینڈر دی گریٹ۔ ارجن داس ملک

۴/ بدھ مت کے ۲۵۰۰ سال (انگریزی) مدیری۔ وی باپت

۵/ رِسالہ مارگ۔ چارلیس فیری کا مقالہ

۶/ تاریخ ڈوگرہ دیس۔ نرسنگھ داس نرگس۔

☆★☆

محمد فاروق بخاری

محمُود غزنوی اور تسخیرِ کشمیر

عربوں نے کشمیر کو اپنی تسخیر میں لانے کیلئے کئی بار کوششیں کیں مگر اُن کے پیہم حملوں کا یہ سلسلہ کوئی خاص کامیابی حاصل کرنے کے بناء ہی ۱۴۲ھ میں اختتام کو پہنچ گیا۔ عربوں کے بعد وسطِ ایشیاء کے مسلمان فاتحین نے اِس میدان میں قدم رکھا۔ اِن میں مشہور و ممتاز فاتح سُلطان محمود غزنوی کا نام سرفہرست ہے۔

سُلطان محمود نے کشمیر کو اپنے قبضے میں لانے کیلئے تین بار قسمت آزمائی کی۔ کشمیر کی تاریخیں محمود کے حملوں سے متعلق صحیح معلومات بہم نہیں پہنچاتی ہیں۔ سنسکرت میں لکھی گئی تواریخ بھی معمولی اِشاروں پر اکتفا کرتی ہیں جبکہ فارسی تذکرے مبالغہ آمیزی سے پُر ہیں جس کی بنا پر وہ بھی قطعاً ناقابلِ اعتبار ہیں۔ مستند ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کشمیر کی وادی میں کبھی داخل نہ ہوسکا مگر مولوی غلام حسن مرحوم لکھتے ہیں کہ محمود نے بجبہاڑہ کے ایک مندر کے اسبابِ زر و طلاء بھی ضبط کئے بلکہ کشمیر کے راجہ سنگرام نے محمود کو تحفے و تحائف

پیش کیئے۔ مؤرخ مذکورہ مُلاّ احمد علامہ کے حوالے سے لکھتا ہے:۔

''سنگرام راج تقابُل درخود ندیدہ باتحائف ونفائس بسیار خودرا بملازمت رسانید۔ سلطان فرمود چرا خود راز بوں کردی۔ راجہ در جواست گفت کہ........

اہلِ اکرام خدمت وتواضعِ مہمان موجب افتخار وترقی اعتبار خود پندارند[1]''

یعنی سنگرام راجہ نے جب اَپنے اندر سلطان محمود کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ پائی تو کافی رقم اور قیمتی چیزیں لیکر بادشاہ کے پاس آیا۔ سلطان محمود نے کہا! یہ تکلیف کیوں کی۔ اُس نے اُس کے جواب میں کہا: کہ اہلِ اکرام مہمان کی خدمت اور خاطر داری کرنا اَپنے لئے موجبِ فخر و ترّقی خیال کرتے ہیں۔'' سلطان محمود، بادشاہِ کشمیر کی حُسنِ تقریر سے محظوظ ہوااور کشمیر کی سلطنت اُسی کے حوالے کر کے واپس لوٹا...... مگر یہ سارا بیان ایک اَفسانے سے زیادہ وُقعت نہیں رکھتا ہے۔

بِلا شُبہ محمود غزنوی کے کشمیر پر حملے ہندوستان کی تاریخوں میں زَبردست اہمیت کے حامل ہیں۔ نہ صرف تواریخِ ہند بلکہ مؤرخینِ ایران نے بھی اِن حملوں کا بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ محمود کی ایک مہم کا تذکرہ مشہور فارسی شعراء کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ فرخّی سیستاتی کے یہ اَشعار قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

مجلس بلبِ جوئے برائے شمۂ خوباں
کز گل چو بنا گوش تو گشتہ است لب جوئے

---

1 تاریخ حسن ج ۲ ص ۱۱۵

از مجلسِ مامردم دوروی بروکن
پیشِ آدمیٔ سرخ و فروکن گلِ دوروی
تارزو بشادی بگزاریم که فردا
وقتِ رہِ غزو آمدو ہنگام تکاپوی
گاہ است کہ یکبار بکشمیر خرامیم
از دستِ بُتاں پہنہ کنیم از سربت گوی
بس شہر کہ مردانش باما پچیدند
کامروز نبینند در او جز زنِ بے شوی[1]

عصرِ حاضر کے محققین لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کشمیر پر اپنا قبضہ جمانے کا اِرادہ شروع سے رکھتا تھا۔ اُس کی ہند کے تمام مشہور مندروں پر نظر تھی اور وہ چاہتا تھا کہ خدا اُس کو بُت گر کے بجائے بُت شکن کہہ کر پکارے۔ اِس لئے تمام بُت خانے اُس کے سامنے ایک ایک کر کے آتے گئے جن سے کشمیر کے مندر اور وِہار علیحدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ کشمیر اُس زمانے میں ہزاروں مندروں سے معمور تھا۔ عباس پرویز لکھتے ہیں:-

سلطان محمود کے تصرفات میں دن بدن اضافہ ہونے لگا اور ہندوستان کے تمام علاقے اس کے مقبوضہ ممالک کے ساتھ شاملِ ہوئے اور دین اِسلام کشمیر کو چھوڑ کر (جہاں کے لوگوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) تمام اطراف واکناف میں پھیلا۔ کشمیر کے لوگ بُت پرستی میں وقت گزارتے تھے۔ اِس لئے سلطان محمود اِن کی سرکوبی اور یہاں کے مندروں کو منہدم کرنے کا منتظر تھا[2]

---

[1] تاریخ دیالمہ وغزنویاں: عباس پرویز، مطبوعاتی علی اکبر علمی، ایران: ص ۲۵۵
[2] تاریخ دیالمہ وغزنویاں: ص ۲۵۵

سُلطان محمود کو کشمیر کے اندرونی حالات سے باخبر کرنے کیلئے یوں تو بہت سے ہندو فوجیوں کی مدد شاملِ حال تھی مگر صحیح معلومات بہم پہنچانے کیلئے ایک خاص شخص دربار میں موجود تھا۔ اس شخص کا نام تِلک تھا، جو ایک کشمیری حجام زادہ تھا۔ ابوالفضل دبیر بیہقی، جس نے ملک کی تعریف میں کئی صفحات سیاہ کئے ہیں، لکھتا ہے:-

این تلک پسرِ حجامی بود ولیکن لقائی وشاہدتی وزبانِ فصیح داشت وخطی نیکو بہ ہندوی وفارسی، مدتی دراز بکشمیر رفتہ بود وشاگردی کردہ......
واز آنجا قاضی شیراز ابوالحسن آمد وبگردید۔[1]

یعنی یہ تلک حجام کا بیٹا تھا لیکن خوبصورت اور فصیح البیان تھا۔ ہندی اور فارسی میں اس کا خط عمدہ تھا۔ کافی وقت تک کشمیر میں رہا اور یہیں تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر یہاں سے شیراز کے قاضی ابوالحسن کے پاس آیا اور اُسی کا ہو کر رہا۔

تِلک نے محمود کو کشمیر کے حالات وواقعات سے ضرور باخبر کیا ہوگا۔ وہ اس کے خاص مصاحبین میں سے تھا۔ تفصیل کیلئے تاریخِ بیہقی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

سلطان محمود نے ۱۰۰۲ء میں ہند کے راجہ جے پال کو شکست دی۔ جے پال نے اَپنے آپ کو زندہ جلا دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اَنند پال تخت نشین ہوا۔ اُس نے محمود کے خلاف اپنی کوششیں برابر جاری رکھی۔ مگر ۱۰۰۹ء میں اس نے محمود کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اَنند پال بھاگا اور کشمیر کے پہاڑوں میں پناہ لی۔[2] اَنند پال کی اِس شکست کے چند سال بعد اُس کا بیٹا تِرلوچن پال اپنی

---

[1] تاریخ بیہقی: ابوالفضل محمد بن حسین دبیر: تصحیح، دکتر غنی ودکتر فیاض، چاپخانہ ملی طہران: ص ۶-۴

[2] زین الاخبار: ص ۱۷۸ نیز Dynastic History of Northern India, H.C Ray P-113

بچی کچی سلطنت، جو اَب کوہستانِ نمک تک محدود رہ گئی تھی، کی حفاظت کیلئے میدان میں اُترا۔ ترلوچن نے محمود کا مقابلہ کرنے کیلئے کشمیر کے معاصر راجہ سمگرام راجہ (۱۰۰۳ء-۱۰۲۸ء) سے مدد کی درخواست کی۔ سمگرام راجہ نے درخواست قبول کی اور ترلوچن کی مدد کیلئے فوج کی ایک بڑی تعداد "تُنگ" کی کمانداری میں بھیج دی۔ سلطان محمود کو پہلے ترلوچن کی فوج کے ساتھ ایک وادی میں، جو جہلم کے راستے سے کشمیر سے ملتی تھی، مقابلہ کرنا پڑا۔ کشمیری کمانڈر "تُنگ" نے پہلی بار محمود کی فوج کو پیچھے پر مجبور کیا مگر اُس نے اپنی کامیابی سے دھوکہ کھا کر مزید آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اَب محمود بذاتِ خود اپنی فوج کے ساتھ دُشمن کی طرف بڑھا۔ ترلوچن نے تنگ کو ایک چٹان کے نیچے چھپنے کا مشورہ دیا مگر وہ ترلوچن کے مشورہ کو درخود اعتناء نہ سمجھتے ہوئے محمود کا مقابلہ کرنے کیلئے آگے بڑھا۔ محمود نے اُسے شکست دیدی اور فرار ہونے پر مجبور کیا۔ ترلوچن نے حالات قابو میں لانے کوشش کی مگر محمود نے اُسے ہرا دیا۔ یہ ۱۰۰۴ء کا واقعہ ہے۔ ترلوچن نے شکست کھائی اور اَب محمود نے یہاں کی اطراف و مضافات مکمل طور پر اپنی تسخیر میں لے لئے۔ ابوسعید گردیزی کے یہ الفاظ قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت پر روشنی پڑتی ہے۔

وامیر محمود فرماں داد تا آں قلعہا کہ اندراں درۂ کشمیر بود بگرفتند وغارت کردند۔ ولشکراز اں قلعہا بسیار غنائم بردہ یافت و بسیار کافراں باسلام آمدند۔ واندریں سال فرمودند ہر جائے کہ کشادہ

سلطان محمود نے حکم دیا کہ درۂ کشمیر کے وہ تمام قلعے برباد کردیئے جائیں جو تحویل میں لائے گئے ہیں۔ فوج نے اِن قلعوں سے کافی مالِ غنیمت حاصل کیا اور بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان بنادیا۔ اِسی سال سلطان نے

بودار زیادِ کفار مسجد ہائے جامع ساختند و اُستاداں رافرمود تا بہر جائے بغرستادند، تامر ہندواں راشرائط اِسلام موختند وخود باظفر وفیروزی سوی غزنین آمد۔ دایں فتحِ نندنہ اندرسنہ خمس وربع عائد بود۔[1]

یہ بھی کہا کہ جو جو جگہ غیر مسلموں سے خالی ہوجائے وہاں جامع مسجدیں تعمیر کی جائیں اور علماء و مبلغین کو حکم دیا کہ وہ ہر جگہ جائیں اور ہندوؤں کو اِسلامی شرائط سکھائیں۔خود سلطان کامیابی کیساتھ غزنین لوٹا۔نندنہ کی یہ فتح ۴۰۵ھ میں واقع ہوئی۔

☆☆☆

محمود نے ترلوچن کوشکست دی اور اسکے بعداُس دشمن کی طرف رخ کیا جس نے محمود کیخلاف ترلوچن کو کُمک بہم پہنچائی تھی اور ایک باہمت کمانڈر بھیج دیا تھا۔محمود کا یہ دشمن کشمیر کا حکمران سمگرام یا سنگرامہ راجہ تھا جواُس وقت سلطنت کشمیر کا مقتدرِ اعلیٰ تھا۔اُب محمود نے ۴۰۶ھ (۱۰۱۵ء) میں کشمیر کا اِرادہ کیا۔وہ دریائے جہلم کے راستے آگے بڑھا اور توسہ میدان کی راہ سے قلبِ وادی میں گھُسنے کی کوشش کی۔مگر یہاں اُس کا راستہ ایک مضبوط اور مستحکم قلعہ نے روک لیا اور محمود کو ایک قدم آگے بڑھنے کا موقعہ نہ دیا۔محمود نے اُپنی طرف سے یہ قلعہ پار کرنے کیلئے اپنی ساری ہمت صرف کی مگر اِس کے باوجود وہ ناکام ہوا۔پورے ایک ماہ تک اُس نے قلعے کا محاصرہ کیا۔اِسی دَوران موسم بدل گیا۔برف باری اور جاڑے کی شدت نے محمود اور اس کی فوج کو سخت پریشان کیا۔ مورخ ابوسعید لکھتے ہیں:۔

---

[1] زین الاخبار: ابوسعید عبدالحی بن الضحاک گردیزی، ترتیب وتعلیق، عبدالحی۔ جیبی انتشارات بنیاد فرہنگ، ایران: ص۱۸۱۔

'' اس مہم کے پورے پانچ سال بعد محمود نے ۱۰۲۱ء میں ستمبر اور اکتوبر کے

سرمائے سخت اندر
آمدو برف آمدن گرفت
وجہاں یخ بند شُد واز راہِ کوہ
ہائے کشمیر مرآں اہل حصار
مددرسید از کشمیر و قوف
یافتند۔ چوں امیر محمود رحمہ
اللہ برآں حملہ بدید اندیشہ
کہ دکہ نباید کہ برسپاہِ وَے
حیلتی رودوازاں قلعہ
بازگشت وبصحراء بیرون
آمدازان کوہ ودرہ ہا چوں
وقتِ بہار آمد بغزنین باز
آمد۔[1]

......سخت سرما شروع ہوا برف باری سے
دُنیا یخ بستہ ہوئی......اور اہلِ کشمیر کی طرف سے
پہاڑوں کی جانب سے قلعہ بند لوگوں کو خوراک
اور دیگر قسم کی مدد ملتی تھی۔ جب سُلطان محمود نے
یہ سب کچھ مشاہدہ کیا تو اُسے اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ
ہو کہ اسکی فوج کوئی تدبیر کرنے پر آمادہ
ہو جائے۔ وہ فوراً قلعہ سے واپس لوٹا
اور پہاڑوں اور دَرّوں نے نکل کر میدان کی
طرف آیا جب موسم بدل گیا تو غزنین کی طرف
مراجعت کی۔ اِس طرح محمود کو محاصرہ سے
دستبردار ہونا پڑا۔ ابو القاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ
واپسی پر محمود اور اُس کی فوج نے راستہ کھویا۔
بہت سے فوجی ہلاک ہوئے۔ کہتے ہیں کہ محمود کو
جُملہ ہندوستانی مہموں میں سے جس مہم سے
سب سے زیادہ شدائد و حوادث سے دوچار ہونا
پڑا وہ یہی تسخیرِ کشمیر کی مہم ہے۔[2]

---

[1] زین الاخبار: ابوسعید عبدالحی بن الضحاک گردیزی، ترتیب و تعلیق، عبدالحی حبیبی
انتشارات بنیاد فرہنگ، ایران: ص ۱۸۱-۱۸۲

[2] تاریخ فرشتہ (اُردو ترجمہ) حیدرآباد ۱۹۳۶ء ج ا ص ۸۰۷

وَسط میں کشمیر کو اَپنے تصرّف میں لانے کا پھر اِرادہ کیا۔ اِس دَوران بھی وہی راستہ اختیار کیا جو پہلی بار اُس کی ناکامی کا باعث بن چُکا تھا۔ چنانچہ اَب کی بار بھی ناکام ہوا۔ پُورے ایک مہینے تک قلعے سے ٹکراتا رہا مگر موسمِ سرما پھر شُروع ہوا۔ برف باری سے تنگ آ کر محمود نے محاصرہ چھوڑ دیا اور غزنین کا رُخ کیا۔ اِس کے بعد اس نے کشمیر کا پھر کبھی اِرادہ نہ کیا۔

اِن حملوں کے دوران محمود کو وادی میں داخل ہونے کا موقعہ نہ ملا۔ مگر یہاں ہمیں اِس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ محمود کے ساتھ ساتھ حملوں اور یورشوں کے دَوران مُبلغینِ اِسلام کی کثیر تعداد بھی ہوتی تھی جو مفتوحہ ممالک میں دعوتِ اِسلام دیتے اور مساجد و مدارس کی تعمیر کا کام انجام دیتے تھے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی دِقّت لاحق نہیں ہوگی کہ اگر سُلطان محمود نے سیاسی اعتبار سے کشمیر کے دشوار گزار پہاڑوں کی صعوبتوں کا شکار ہو کر اس پر قبضہ جمانے میں مکمل شکست کھائی مگر اسلام کے نقوش واَثرات چھوڑ دئے ہوں گے۔

ایچ سی رائے نے محمود کے حملہ کشمیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمود اگر وادی میں داخل ہونے میں ناکام ہوا مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے جنوب کی طرف سے کشمیر کے بلند پہاڑوں کا ایک حصہ اُپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ پروفیسر رائے نے اَپنی تائید میں ایک معاصر مورخ عتبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ۱۰۱۸ء میں محمود نے قنوج پر حملہ کرنے کا اِرادہ کیا تو کشمیر کے ایک درّہ کے حاکم نے اس کی ہمرکابی اور رہنمائی کی۔[1] اس حکمران کا نام جن کی بن شاہی تھا۔ علامہ ابن خلدون نے بھی بعینہٖ ایسا ہی نقل کیا ہے۔ علامہؒ موصوف ''فتح کشمیر و قنوج'' کی سُرخی کے تحت لکھتے ہیں:۔

---

1 Dynastic History of Northerm India H.C.Ray P.137

ثمّ اغزمَ عليٰ غزوِ الهند
سنة تسع وار بع مائة . وقد
كان رَوَّخ بلار ها كلّها ولمد
يبق عليهِ الّا كشمير و مِن
دُونِها الفَيافِي والمصاعب.
واستفر الناس مِن جميع
الجهات مِن المر تزقهِ
المتطوعةوَبَثَّ عساكر هٗ في
اَور يةِ لا يعبرعن شِدَّةِ جه يَها
وبُعدِ اعماقها وانتهيٰ اليٰ
كشمير وَكان ملوك الهند
في تلك الممالك تبعث
اليهِ بالخدمةِ والطاعةِ وجاءهٗ
صاحب ناردب كشمير و هو
جن كي بن شاهي (اوساهي)
فا َقرَّ بالطاعة وضمن دلا لة
الطريق وسارا امام العسكر
اليٰ حصن المامون لعشرين
مِن رجب۔[1]

پھر سُلطان محمود کو ۴۰۹ء
میں ہند پر حملہ کرنے کا شوق لاحق ہو
جبکہ اُس نے ہند کے تمام مما لک کو
رونڈ ڈالا تھا اور کشمیر کے بغیر کوئی مُلک
باقی نہ رَہا تھا۔ کشمیر کے درمیان
جنگلات اور شدائد حائل تھے۔ اُس
نے تمام علاقوں کے لوگوں سے کمک
حاصل کی۔ محموذ نے وادیوں میں فوج
بچھادی جو سخت رُوانی اور گہرائی کی وجہ
سے نا قابلِ عبور تھیں۔ اُس زمانے
میں یہاں کے حکمران اِطاعت نامے
محمود کے پاس بھیج رہے تھے۔ کشمیر کا
حاکم جن کی بن شاہی (یاساہی) بھی
آیا۔ اس نے بھی اطاعت کی۔
مزید برآں سلطان اور اس کی فوج کی
رہنمائی کا کام بھی اپنے ذمے لے
لیا۔ انہیں محفوظ قلعے کی جانب پہنچایا۔
یہ ۲۰/رجب کا واقعہ ہے۔

[1] كِتابُ العِبَرَ و ديوانُ المُبتدَاء وَ لخبر، بيروت ١٩٥٨ء: القِسمُ الاوّل .
المجلّدُ الرّابِعُ ص: ٧٩٦

مورخ عتبی اور علامہ ابن خلدون دونوں نے درۂ کشمیر کے راجے کا نام جن کی بن شاہی (یا ساہی) لکھا ہے جبکہ رینالڈ (Rynold) نے عتبی کے تذکرہ ہیں ''سبلی بن شابی بن بمھی'' اور پروفیسر محمد حبیب نے ''سالی'' لکھا ہے۔[1] غرض یہ بات تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی تردّد باقی نہیں رہتا ہے کہ کشمیر میں اِسلام کی محمود غزنوی کے ہاتھوں ضرور بُنیاد پڑی ہے جو کہ آس پاس کے حدود میں اچھی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اِن حالات میں وادی کا بالکل بے اثر رہنا ناقابلِ یقین ہے۔ عباس پرویز لکھتے ہیں کہ کشمیر کی آس پاس کی گھاٹیوں اور درّوں کے حکمرانوں اور والیوں نے سلطان محمود کی بڑی آؤ بھگت بھی کی، اس کی خدمت میں تحفے پیش کیے اور اپنی اِطاعت کا اظہار کیا۔[2]

محمود کے بعد اُسکے حکمران وارثوں نے بھی کئی بار قسمت آزمائی کی۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم نے کشمیر میں اِسلام کی اشاعت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرشتہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ سُلطان محمود کی وفات کے تین سال بعد ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا اور اہلِ کشمیر قلعہ بند ہوگئے۔[3] عباس پرویز بھی قریب قریب ایسا ہی لکھتے ہیں:-

''سلطان مسعود در سال ۴۲۴ھ باسپاہیانی عظیم بکشمیر رفت وقلعہ سرستی راتسخیر کرد وغنائم بسیار بدست آور بہ غزنین مراجعت کرد''[4]

سلطان مسعود نے ۴۲۴ھ میں ایک عظیم لشکر کے ساتھ کشمیر کی طرف رخ کیا اور قلعہ سرستی مسخر کیا۔ اسکے بعد بے شمار مالِ غنیمت کے ساتھ غزنین کی طرف مراجعت کی۔

---

[1] Mahmood of Ghaznin=P,36 [2] تا [4] تاریخ دیالمہ و غزنویاں۔ ص ۱-۲۵۶، ۳۳۵

سطان مسعود کے بعد سلطان مودود کی نظر بھی کشمیر پر تھی۔ اس نے ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ھ میں اپنے لڑکے ابوالقاسم محمود کو لاہو کا حاکم اور ابو علی کو ہند کا سپاہ سالار بنا کر بھیجا جس نے پشاور، کشمیر اور ملتان کی بغاوتیں فرو کیں۔[۲]

[۲] تاریخ دیالمہ و غزنویاں۔ ص ۱-۲۵۶، ۳۳۵

ظفر حیدری☆

قدیم رسائل اور اخبارات میں کشمیر

کشمیر کے متعلق خامہ فرسائی کرنا اہلِ علم، اہلِ ذوق اور اہلِ اصحابِ نظر کا دوَر قدیم ہی سے مرغوب مشغلہ رہا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں اُنیسویں صدی کے وَسط سے ہی رسائل اور اَخبارات میں کشمیر کے بارے میں اکثر و بیشتر مضامین، اور نظمیں شامل ہوتی تھیں۔ یوں تو ایسے قدیم رسائل کی فہرست کافی طویل ہے لیکن بعض ایسے رسائل ہیں جن میں اکثر و بیشتر کشمیر کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ ان میں ''مخزن'' لاہور، ''زمانہ'' کانپور، ''صوفی''، ''ہمایوں'' لاہور'' اور ''چمنستان'' قابل ذکر ہیں۔

۱۔مخزن، لاہور:

یہ رسالہ پہلی مرتبہ اپریل ۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر کی اِدارت میں لاہور سے شائع ہوا۔ مخزن کی جلدیں ہر چھ ماہ کے بعد بدلتی تھیں۔ مثال کے طور پر جلد اوّل کا پہلا شمارہ اَپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ پھر چھ ماہ کے بعد دُوسری جلد

☆......کاشانہ ظفر، ہمدانیہ کالونی بمنہ--۱۹۰۰۱۰

کا شمارہ اکتوبر ۱۹۰۱ء سے قرار دیا گیا۔ تیسری جلد اپریل ۱۹۰۲ء سے شروع ہوئی۔ اِسی طرح سے سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ شماروں کے نمبر ہر مہینے میں بدل دیئے جاتے تھے۔ اِس رسالے کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر کا اُردو ادب پر گرانبار احسان یہ ہے کہ انہوں نے مخزن کے ذریعے بے شمار شاعروں اور ادیبوں کو آسمانِ ادب پر آفتابِ عالم تاب کی طرح چمکایا۔ اِن میں ڈاکٹر علامہ اقبال سرِفہرست ہیں۔ دراصل اقبال کا ادبی سفر مخزن سے ہی شروع ہوا۔

مخزن کے سبھی شمارے کہیں یکجا دستیاب نہیں ہیں۔ زیادہ تر شمارے جناب عبدالصمد خان کے نجی کتب خانے اور ریسرچ سینٹر نورُ خان بازار حیدر آباد میں موجود ہیں۔ غالباً پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری پہلے کشمیری ہیں جن کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے مخزن کے کم و بیش سبھی شمارے مختلف کتب خانوں سے ڈھونڈ نکالے۔ راقم الحروف نے کشمیر یونیورسٹی کی اقبال لائبریری سے بھی استفادہ کر کے مخزن کے کئی شماروں کا مطالعہ کیا لیکن اِس کے بعض شمارے بہت ہی کسمپرسی کی حالت میں ہیں۔ مخزن کے ابتدائی لکھنے والوں میں اقبال، نیرنگ، ناظر، شاد عظیم آبادی اور سرور جہاں آبادی، لالہ سری رام، دیا نرائن نگم وغیرہ کے علاوہ سید علمدار حسینی متخلص علمدار بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اِس رسالے میں مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ خود مخزن کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر اپنے کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ انہیں کشمیر کی سیر کا موقع ملا۔ اِس کی تفصیلات مخزن نومبر ۱۹۰۲ء، جلد ۴ ص ۵۹ تا ص ۵۲ پر یوں درج ہے:

"اگست و ستمبر گزشتہ میں ایڈیٹر مخزن کو خوش قسمتی سے سیرِ کشمیر کا اتفاق ہوا۔ مولوی محمد شاہ دین صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا اور میاں محمد شفیع صاحب

بیرسٹرایٹ لا جیسے ذی علم اور طبع دوست رفیقِ راہ اور شریکِ سفر تھے۔ دن رات گل وگلزار اور باغ وراگ کے نظاروں کے ساتھ دُو بامذاق حضرات کے علمی مباحثوں کا تماشا پیشِ نظر رہا اور علمی چرچے رہے، وہیں کچھ شعر وشاعری کی بھی باری آئی۔ مولوی محمد شاہ دین صاحب نے دو تین نتیجہ خیز غزلیں اُن دِنوں میں لکھیں جو اُبھی صاف نہیں ہوئیں۔ سرِ دست میاں محمد شفیع صاحب کی طبع آزمائی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو اُنہوں نے عمر میں ہمیں پہلی دفعہ کہی ہیں۔ موصوف انگریزی میں کبھی کبھی نظم لکھتے رہے ہیں جو اخباروں میں چھپ کر مقبول ہوتی رہی ہیں۔ اُردو میں آج تک انہیں کبھی لکھنے کا موقع نہیں ہُوا تھا۔ مگر چونکہ قدرتاً طبیعت موزوں پائی تھی، کشمیر کی آب وہوا نے گدگدا کر یہ چند اشعار نکلوائے''۔

وادیٔ لدر

یہ کشمیر دِل کشا مرغزار — یہ پانی، یہ شمشاد سَرو و چنار
یہ سرسبز دشت اور یہ کوہسار — سَدا جن میں رہتی ہے گل کی بہار
ہیں بے شبہ جاں بخش و فرحت فزا
یہ سب ہیچ تجھ بن ہیں اَے مہ لقا

یہ دِلکش لدر کی ہے وادی جہاں — سُہانا ہے قدرت نے باندھا سماں
زمین ایسی ہائے مسافر کہاں — کہے صفت حق کی جو داستاں
گھری ہے پہاڑوں سے چاروں طرف
ہیں اشجار سرسبزیاں گل بکف

سَدا راگ گاتے ہیں یہاں آبشار — ہیں عاشق کے دل کی طرح بیقرار
ہمیشہ اگرچہ ہیں خود دل فگار — یہ ہے رونقِ گل کا اِن پر مدار
چمن گر کھلے ہیں تو ان کے طفیل
جو میداں ہرے ہیں تو اِن کے طفیل

کناروں پہ ان کے درخت چنار ہے جنگل کا شاہنشہ با وقار
مسافر کا دوست لیل و نہار اِسے دیکھ کر میری جانِ قرار
مسرّت کے جوش سے ہے شادماں
کہ سایہ ہے اِس کا فرح بخش جاں

یہ گھیرے ہے وادی کو کوہِ بلند نہ رُستم کی بھی جن پہ پہنچے کمند
ہیں نیچر کے عاشق کے دِل پسند عجب طرز قدرت کے ہیں اِن میں بند
لئے تاج سر پر ہیں اشجار کے
ہیں تختِ رَواں رکھتے انہار کے

یہ وادی کی جاں بخش تازہ ہوا ہے جس سے دلِ ناشگفتہ کھلا
میرے پاس لاتی ہے تجھ سے سَدا پیامِ محبت سلامِ وفا
محبّت کی بُو اِس میں پاتا ہوں میں
تو بھُولا نہیں، پھر سُناتا ہوں میں

سَتَر سے چلے جب سُوئے پہلگام ہُوا دِل میرا اور بھی شاد کام
دلآویز و دلکش تھا ہر اِک مقام صداقت کو نہیں کسی کا کلام
کہ فردوس دُنیا میں ہے گر کہیں
ہمیں ہے، ہمیں ہے، ہمیں ہے ہمیں

یہی نظم ''ہمایوں'' مارچ ۱۹۳۲ء میں ''میاں سر محمد شفیع کی شاعری'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

مخزن، جون ۱۹۰۳ء میں ایک نظم ''شالا مارِ کشمیر'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم مولوی محمد شاہ دین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا، متخلص ہمایوں نے سیرِ کشمیر کے زمانے میں لکھی تھی۔ اِس نظم کے کچھ اَشعار پیش کیئے جاتے ہیں اور پوری نظم شاملِ مضمون ہے:

اے باغ لوگ کہتے ہیں تم شالامار ہو   اور عظمتِ گذشتہ کی اِک یادگار ہو
کیا تم ہی زندہ ناموں کے باعث ہو نامور؟   کیا تم ہی مُردہ سلطنتوں کا مزار ہو؟
کہتے ہیں تم سے کھلتے ہیں رازِ دروں کے پیچ   تم اِک کلید قفل درِ روزگار ہو
ہاں کچھ بتاؤ اُگلے زمانہ کی کیفیت   تم واقعاتِ دہر کے نامہ نگار ہو
خاموش کیوں ہو کچھ تو کہو اپنی داستاں   کس سرّ سر بہ مہر کے تم رازدار ہو
فوارہ کی زباں سے کہو کچھ تو اپنا حال   کیوں روتے زار زار تم اے آبشار ہو
اور تم بتاؤ پانی کی لہرو کہ کس لئے   مضطر ہو، پیچ کھاتی ہو اور بے قرار ہو
کب سے جلا رہا ہے یہ سوزِ دروں تمہیں   دِل دادہ کس کی یاد میں تم اے چنار ہو
ہاں اے مسافر ایسے سوالوں سے فائدہ   زخموں پہ کیوں چھڑکتے نمک بار بار ہو
واقف ہو حالِ زار سے پھر پوچھتے ہو حال   تم بھی عجب طرح کے تجاہل شعار ہو
کیا کہیئے آہ! اپنی جو حالت ہے پوچھ لے   پیر فلک سے گر نہ تجھے اعتبار ہو
وہ دِن بھی تھے کہ تازہ ہی رہتے تھے یہ چمن   کشمیر میں خزاں ہو کہ فصلِ بہار ہو
نورِ جہاں جو حُسن میں پُتلی تھی نور کی   اور قد میں جیسے سرو لبِ جوئبار ہو
آکر یہاں جماتی تھی وہ دلفریب رنگ   قربان جس پہ جان سے سو لالہ زار ہو
اور آنا اُس کے ساتھ شہِ مے پرست کا   جس کی نگاہ سے چشمِ طرب میں خمار ہو
سامانِ عیش اور وہ عشرت کی محفلیں   وہ راتیں جن پہ روزِ درخشاں نثار ہو
کہہ دو تمہیں کہ جس نے گزارے ہوں ایسے دن   اَب کیوں نہ اُن کی یاد میں وہ دلفگار ہو
یہ گُل جو دیکھتے ہو وہ سینے کے داغ ہیں   دِل کی بتائیں ہم جو کوئی غمگسار ہو
اِس انقلابِ دہر نے پامال کردیا   خاک اپنی اَب تو کاش فنا کا غبار ہو
اِن اشکباریوں کا تمہاری اثر ہو خاک   سچ تو یہ ہے اگرچہ تمہیں ناگوار ہو
ظالم ہے، سنگدل ہے، یہ تہذیب جسکو آج   تم سمجھے خاص رحمتِ پروردگار ہو
کانوں پہ اِس کی آنکھ فلزات پر نظر   دُھن ہے یہی کہ بھاپ پہ بجلی ہو تار ہو
لیکن کہیں جو قسمتِ بد سے رہی سہی   اگلے زمانہ کی کوئی اک یادگار ہو
ہوتی نہیں ہے بھول کے بھی اِس طرف نگاہ   پھر جائے گر مفاد کا کچھ اعتبار ہو

پھولوں سے دل ہمارا نہ کیونکر ہو داغ داغ　　بد تر خزاں سے کیوں نہ ہماری بہار ہو
تہذیب اور زمانہ کی ہو جبکہ یہ رَوش　　چشمِ کرم کا کیا کوئی اُمیدوار ہو
بیتاب کیوں ہے سُن کے ہمایوں یہ داستاں　　جنّت میں آ کے کیوں کوئی یوں اَشکبار ہو
محوِ خیال کیوں ہے ذرا آنکھ تو اُٹھا　　دیکھ اور محوِ صنعتِ پروردگار ہو
منظر نہیں یہ شانِ خدا کا ظہور ہے　　پانی کو چوم کوہ سے لے ہمکنار ہو
لہروں میں، بادلوں میں، ہوا میں، پہاڑ میں　　وہ رُوح ہے کہ جاں تیری اُس پر نثار ہو
دِل چاہتا ہے اپنا ہو مسکن نسیم باغ　　مرجایئے تو ڈل کے کنارے مزار ہو
سوجائیں ایک پتے کا سینے پہ رکھ کے ہاتھ　　مدفن دِلِ تپاں کا جو زیرِ چنار ہو

ناظر[1] بڑا مزا ہو جو اقبال ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ ہو[2] اور شالامار ہو

م-ش

زمانہ کانپور

یہ رِسالہ فروری ۱۹۰۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر منشی دَیا نرائن نگم تھے جو فنِ صحافت میں صاحبِ کمال تھے۔ انہیں اُردو اَدب سے دِلی لگاوَ تھا۔ 'زمانہ' کے متعدد اسپیشل نمبر شائع ہوئے۔ منشی صاحب کے انتقال (۱۹۲۲ء) کے بعد اُن کے وارثین نے اِسے جاری رکھا۔ بقول پروفیسر اکبر حیدری ''آج سے کچھ سال پہلے زمانہ کے تقریباً سبھی شمارے لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیگور لائبیریری میں محفوظ تھے۔ لیکن اَب بہت سے رسالے وہاں سے غائب کردیئے گئے ہیں۔ اُردو ریسرچ سینٹر حیدر آباد کے بے مثال کتب خانے میں 'زمانہ' کے تمام شمارے موجود ہیں''۔

---

1. خوشی محمد ناظر
2. شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن، لاہور۔

زمانہ کو یہ شرف بھی حاصل رہا کہ اس نے علامہ اقبالؔ کی متعدد نظمیں پہلی مرتبہ شائع کیں۔ اقبالؔ کی مشہور اور بین الاقوامی نظم ''ہمارا دیس'' (ترانہ ہندی) سب سے پہلے زمانہ بابت ستمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

کشمیر سے متعلق ''زمانہ'' میں اکثر و بیشتر مضامین اور نظمیں وغیرہ شائع ہوا کرتی تھیں۔ راقم الحروف نے ''زمانہ'' کی فائلوں سے بعض بیش بہاء مضامین شاملِ مقالہ کئے ہیں۔

''زمانہ'' بابت نومبر ۱۹۱۶ء جلد ۲۷ نمبر ۱۶۴ میں ''کشمیری موسیقی'' کے عنوان سے شمیم لاہور کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار نے مضمون کی تیاری میں شرؔر صاحب کے تذکرہ سے اِستفادہ کیا ہے اور راگنیوں کی ایک فہرست بھی شامل کی ہے۔ مثلاً تکہ، کلیان، نٹ کلیان، راست، کشمیر راست، خماچہ، بھاگ، عراق، بلاول، مہائی، شاہ نواز، پوربی وغیرہ۔ یہ مضمون کافی معلوماتی ہے خصوصاً اُن لوگوں کے لئے جنہیں موسیقی سے کافی دلچسپی ہے۔

''کشمیر اور سویز رلینڈ'' کے عنوان سے ایک اور مضمون ''زمانہ'' بابت جون ۱۹۲۸ء سے ڈھونڈ کر راقم نے اَپنے اِس مضمون میں شامل کیا ہے۔ یہ مضمون رائے بہادر پنڈت، شیونرائن شمیم، ایڈوکیٹ پنجاب ہائیکورٹ نے لکھا ہے اور اس میں مصّنف نے کشمیر کا موازنہ سوئیز رلینڈ سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

ایک اور مضمون ''کشمیر کے بَرقی کارخانے'' ''زمانہ'' بابت جون ۱۹۱۰ء لکھا ہے۔ مضمون نگار نے کشمیر میں بجلی کی صورتِ حال سے آگاہ کیا ہے اور اس ضمن میں بعض بیرونی کمپنیوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہیں سرکار نے اس کام کے

لئے ٹھیکہ دیا تھا۔ اِن میں امریکہ کی کمپنی جنرل الیکٹرک قابل فکر ہے۔

کشمیری موسیقی: ''زمانہ، نومبر ۱۹۱۶ء''

'' ۱۹۰۲ء میں ہمارا اتفاق کشمیر جانے کا ہوا تھا تو ہم کو ایک دوست نے کشمیر راگ سنایا تھا۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ ہم اُس کو برداشت نہ کر سکے اور محفل کو ترک کرنا پڑا۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ فی الوقت جیسا کہ مشہور ہے راگ کشمیر پہنچ کر یا تو مر گیا یا کم از کم بڈھا ضرور ہو گیا۔

حال میں ہم نے پھر سفرِ کشمیر کی اور چلنے سے پہلے ہم پڑھ چکے تھے کہ بطور مسٹر کلیمنٹس، جنہوں نے ہندو میوزک پر ایک کتاب لکھی ہے سارنگ دیو مصنفِ رتناگر (جو سنسکرت میں مستند سنگیت کی کتاب ہے) کا وطن کشمیر بیان کیا جاتا ہے۔ اِس کی تائید ہم نے کپتان ڈے صاحب کی کتاب میں بھی پائی تھی۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالحلیم شرر نے جو مضمون بڑودہ کے جلسۂ موسیقی کے موقعہ پر پڑھا تھا اُس سے ہم کو معلوم ہوا تھا کہ ہندی موسیقی میں بعض ایرانی راگنیاں داخل ہیں۔ کشمیر پہنچ کر ہم کو اِشتیاق پیدا ہوا کہ کشمیری موسیقی پھر سُنیں اور اس اَمر کی تصدیق کریں کہ آیا کوئی راگنیاں ایران کی ہندی موسیقی میں شامل ہوئی ہیں یا نہیں اور کشمیر سے بہتر کوئی ملک معلوم نہ ہوتا تھا۔ جہاں اتنا اِیرانی اثر رہا ہو۔ یہ بھی تحقیق طلب تھا کہ آیا کشمیری مغنّی ہندوستانی راگ راگنیوں اور تالوں سے واقف ہیں یا نہیں۔ چنانچہ ہم نے چند مشہور مغنّی بلُائے اور اُن سے کہا کہ وہ بجائے گانے کے محض ساز پر بجائیں۔ قبل اُزیں کہ وہ سجاتے ہم نے اُن سے ان راگنیوں کی فہرست لی جن کو وہ بجا سکتے تھے۔ جب ہم نے فہرست لکھی تو ہم کو تعجب ہوا کہ اِن میں سے اکثر ہندوستانی راگنیوں کے نام پائے گئے اور

بعض ایرانی راگنیوں یا دُھنوں کے نام سے تھے جو ہم نے شرر صاحب کے تذکرہ میں پڑھے تھے۔ فہرست حسب ذیل ہے:

۱/ سگہ	۲/ کلیان	۳/ نٹ کلیان
۴/ راست	۵/ کشمیر راست	۶/ خماچہ ×
۷/ بہاگ	۸/ جھنجوٹی	۹/ پرج
۱۰/ چارگاہ ×	۱۱/ عراق ×	۱۲/ بلاول ×
۱۳/ حسینی (شُبہ ہے کہ یہ کیا چیز ہے) ×		۱۴/ ٹووی
۱۵/ ساوری	۱۶/ نوا ×	۱۷/ تلنگ
۱۸/ رہائی	۱۹/ شاہ نواز ×	۲۰/ ادواسی (ہم نے یہ نام نہیں سنا)
۲۱/ پوربی	۲۲/ سوہنی	۲۳/ نوروز ×
۲۴/ ناریز	۲۵/ سورنڈ	۲۶/ کانگرا
۲۷/ زیلف	۲۸/ زنگولہ	۲۹/ دُھناشری
۳۰/ بہاگڑا	۳۱/ کلیان	

جہاں تک ہماری واقفیت ہے جن راگنیوں پر ہم نے نشان × لگا دیا ہے ہندوستانی راگنیاں نہیں ہیں بلکہ ایرانی راگنیاں ہیں۔ ہم نے مغنیوں کو فرمائش کی کہ ان میں سے بعض ایرانی ہندوستانی راگنیاں بجائیں تو معلوم ہوا کہ ایرانی راگنیوں میں سے عراق نمبر (۱۱) آدھی تو سورٹھ تھی آدھی پیلو، سوائے زنگولہ نمبر (۲۸) کے کہ وہ مشابہ جنگلے کا تھا۔ دیگر ایرانی راگنیاں اپنے طرز کی تھیں جن کے قابلِ ذکر مشابہت ہندوستانی راگنیوں سے نہ تھے۔ غرض یہ اُمر روشن ہوا کہ ایرانی راگنیاں کشمیر کے موسیقی میں داخل ہوئیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب

کبھی کسی ہندوستانی صاحب نے کشمیر میں ایرانی راگنیاں گاتے یا بجاتے سنا تو چونکہ پہلے سُنی ہوئی نہ تھیں۔ ایرانی راگنیاں غیر آشنا معلوم ہوئی ہوں گی۔ یہ اَمر بھی ثابت ہوا کہ ہندوستانی راگنیاں کشمیر میں کثرت سے رائج ہیں۔ پس کیا تعجب ہے کہ سارنگ دیو جو رتنا کر کا مصنّف تھا کشمیر کا باشندہ ہو۔ میسور کے کتب خانہ میں جو نسخہ رتنا گر کا مِلا ہے اُس پر سارنگ دیو کی سکونت کشمیر لکھی ہے (دیکھو کتاب ڈے صاحب Days Hindu Music) بعد اُزاں ہم نے تال کی جانب توجہ کی تو معلوم ہوا کہ کشمیری مغنّی ہندوستانی پیچدار اور بکھڑی تالوں سے واقف نہیں وہ صرف ذیل کی تالیں جانتے تھے۔ غالباً یہ نام ایرانی ہیں:

(۱) یکہ......ہندوستانی تال ہے۔

(۲) دو یکہ......دوگن۔

(۳) دوروی......سہ تالہ کے مطابق ہے۔

(۴) نیم دور......چوتالہ کے مطابق ہے۔

تان کی مشق سے کشمیری تقریباً بے بہرہ ہیں۔ ہر ایک راگنی سیدھی سیدھی بجاتے ہیں۔ اُسی کو جب گاتے ہیں تو لُطف اور امتیاز اور بھی کم رہا جاتا ہے۔ اِس میں یا تو تعلیم یا اُن کی طرز یا حلق کی ساخت اور عادت کا نقش معلوم ہوتا ہے۔

اِس کے بعد ہم نے سازوں کی جانب توجہ کی۔ اُن کے پاس تین قسم کے ساز تھے۔ اوّل گیچک جو سارنگی کے مانند ہے اور گز سے بجتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ سارنگی کے ڈاٹ سے اُس کی ڈاٹ بڑی ہے اور بجائے ناخن سے بجانے کے دو پوٹے سے بجاتے ہیں۔ چونکہ تان کا استعمال تقریباً معدوم

ہے پانچ چھ شخص جب ایک ہی وقت ایک ہی چیز بجاتے ہیں تو ایسے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ایک ساز بجتا ہوا سُنائی دیتا ہے۔ بجنے کے دَوران میں اکثر مقامات پر وہ یک لخت وقفہ دیتے ہیں گویا فُل سٹاپ آجاتا ہے گو کہ راگنی ہنوز ختم نہیں ہوئی۔ ہندوستانی سُننے والوں کو یہ ناموزون معلوم ہوتا ہے۔

۲/ دوسرا ساز ستار ہے۔ شُبہ ہوتا ہے کہ غالباً اِبتدائی ستار ایسا ہی ہوگا اس پر صرف گَت بجتی ہے۔ طرّہ یہ ہے اس میں سُر کے سات تار ہوتے ہیں ایک بجتا ہے باقی محض اِمداد دیتے ہیں علاوہ ان کے آخر پر ایک پنچم کا تار ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کا رائج الوقت ستار جسے مَدھم بولتے ہیں' امیر خسرؔو کا ایجاد تھا۔ ممکن ہے کہ اُسے فالتو سُر کے تاروں کو تب کی صورت دے کر ڈاٹ کے نیچے رکھدیا اور ایک تار مدھم کا پڑاؤ کردیا جس کی وجہ سے اُس کا نام مدھم پڑ گیا۔ کشمیری ستار کی ڈاٹ تین اِنچ سے زیادہ نہیں۔ دُوسری شکل اِس میں یہ ہے کہ جن راگنیوں میں بعض سُر اُترے اور چڑھے دونوں ایک وقت استعمال ہوتے ہیں وہ کشمیر ستار میں کامل محنت سے نہیں نکلتے۔ شکل تو راگنی کی نِکل آتی ہے لیکن وہ خوبصورتی جو چڑھے اور اُترے دونوں سُروں کے ایک وقت نکالنے سے پیدا ہوتی ہے، کشمیری ستار پیدا نہیں کرسکتا۔ اِتنی چھوٹی ڈاٹ میں مینڈ کا پیدا کرنا محال ہے۔

(۳) تیسرا ساز نہایت دلچسپ تھا۔ ہمارے لئے وہ بالکل نئی چیز تھی جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اُن کا نام صدتارا ہے یعنی سوتار۔ اِس پر چھیانوے تار ہیں۔ دونوں جانب کیلیاں ہیں۔ ایک طرف کی کیلی کے تار جو تعداد میں چار ہیں، بم کہلاتے ہیں۔ اُس کے دوسرے طرف کی کیلی زیر کہلاتی

ہے۔ساز کے اندر سے راستہ رکھا گیا ہے جہاں سے بذریعہ ایک کلید یعنی کنجی کے سر کو اُتار اچڑھایا جاتا ہے، ایک لوہے کے چمٹے جس آواز سے مغنی تاروں کو چھیڑتا ہے اور راگنی پیدا کرتا ہے۔آواز نہایت خوبصورت ہے۔اگر دُور سے کوئی سُنے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹا پاینو (Piono) بج رہا ہے۔ قیمت یک صد بیان کی گئی ہے۔ سازندہ نے یہ بھی کہا کہ اَب اس کا رواج روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ ساز ایرانی ہے۔ ہماری ......فرمائش پر سازندہ نے شام کلیان اِس پر خاصا بجایا۔ گَت بہت اچھی نکلتی ہے۔مشکل راگ اور راگنیاں جن میں بینڈ کے بدون پوری شکل پیدا نہیں ہوسکتی اِس ساز سے توّقع نہیں کی جاسکتی۔بہر کیف یہ ساز دلچسپ تھا۔

پھر ہم نے کشمیری راگ سُنا وہ نسبتاً اچھا تھا اور اگر دس بیس مَرتبہ اور سُنتے تو ممکن تھا کہ طبیعت مانوس ہو جاتی۔ چونکہ اُن کا وہ قومی اور مقامی راگ تھا اُس کو یہ لوگ نہایت اشتیاق سے گاتے تھے۔ بہر کیف ہم کہہ سکتے ہیں کہ طرز نرالا اور خوش آئند نہ تھا۔ ہر ملک میں گانے کا طرز جُدا ہوتا ہے۔ یورپین راگ کو جو ہندوستانی کہ اُس کے ترتیب سے واقف نہیں ہیں محض چیخنا رونا سمجھتے ہیں۔ آپ ہر چند اُن کو سمجھایئے کہ یورپین راگ اِسی اُصول پر قائم کیا گیا ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔عادت کا دخل ایسے اُمور میں زیادہ ہوتا ہے۔

ایک اَمر خاص ذکر طلب یہ ہے کہ مغنّی سب مسلمان ہیں۔ کشمیری پنڈتوں میں راگ کا نام ونشان نہیں ہے۔البتہ وہ وید منتر یا شلوک یا پوجا پاٹ ایک خاص الحان میں پڑھتے ہیں جو کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔سُنا تھا کہ کشمیر اور بنارس میں شام وید کے پڑھنے والے کوئی کوئی صاحب موجود ہیں لیکن ہم کو

کبھی سُننے کا اِتفاق نہیں ہوا۔

ہماری مختصر تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندی موسیقی سے کشمیر خالی نہیں۔ یا تو وہ ابتدائی حالت کا نمونہ یا جن اُستادوں نے سکھایا، نامکمل تعلیم دی۔ یا رفتہ رفتہ زَوال پا گیا۔ اس وقت نہایت سادگی کی حالت میں ہے۔

(۲) بعض ایرانی راگنیاں مسلمانوں کے زمانہ میں ہندی موسیقی میں داخل ہو گئیں۔

(۳) ساز خاصے ہیں لیکن گانے کی طرز ایسی ہے کہ ہندوستانیوں کو حظ حاصل ہونا یا لُطف آنا مشکل ہے۔" "شمیم لاہور"

کشمیر اور سویزر لینڈ

﴿از رائے بہادر پنڈت شیو نرائن ایڈوکیٹ پنجاب ہائیکورٹ﴾

" نیچر کے مناظر کہیں خوشنما کہیں بدنما، کہیں فرحت بخش اور کہیں وحشت انگیز ہیں، دریا، جھیل، مرغزار، گلزار، سبزہ زار فرحت بخش اور خوشنما ہوتے ہیں بے آب و گیاہ لوق ودق صحرا ریتلے میدان، بھیانک اور بَدنُما ہوتے ہیں۔ کشمیر کا ملک خوشنما اور فرحت بخش ہے لیکن وہاں نیچر کی خوبیوں پر اِنسانی ہاتھوں کی ملمع کاری نے بعض جگہ دُھبّے لگا دیئے ہیں۔ یہ صورت سوئزر لینڈ کی نہیں ہے۔ وہاں انسانوں نے ہنر و فن سے نیچر کے حُسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ یوں تو درحقیقت سوئزر لینڈ کشمیر کے مقابلے میں دوسرے درجے پر ہے۔ کشمیر وسیع ملک ہے جہاں دنیا کے سب سے اُونچے پہاڑوں کی چوٹیاں بکثرت نظر آتی

ہیں اور اگر ہنر کا دستِ شفقت کشمیر پر پھر جائے تو پھر دیکھئے کیا سے کیا ہو جائے۔

وادی کشمیر ۲۵×۸۴ میل ہے۔ اِس میں ایک بڑی جھیل اور کئی چھوٹی چھوٹی جھیلیں موجود ہیں۔ دریائے سندھ برفانی ملک سے اُترتا ہوا وتستا میں شامل ہو جاتا ہے۔ وادی کے بیچ میں دریائے جہلم جس کا مقامی نام وتستا ہے، پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر کشتی رانی کے قابل ہے۔ گذشتہ موسم سرما میں ہم نے سوئزرلینڈ کی سیر کی وہاں کے سین سینری دیکھ کر ہر وقت کشمیر کے مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔ میرے بزرگ ۱۶۵ سال ہوئے کشمیر چھوڑ آئے۔ سوئزرلینڈ میں قدم قدم پر اپنا قدیمی وطنِ مالوف کشمیر یاد آتا تھا۔ دل میں اُمنگ اُٹھی تھی کاش کوئی کشمیر کو سوئزرلینڈ جیسا بنا دے۔ سوچتا تھا کہ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ ہنر کدھر سے میتسر ہوگا۔ اگر بفرضِ محال اِس میں سوئزرلینڈ کی مانند ترقی ہو بھی گئی تو کس کس کی رال ٹپکے گی اور اِسکا کیا حشر ہوگا۔ سوئزرلینڈ جنّت نگاہ ضرور تھا لیکن واپسی کے وقت ہمارا دِل سرد تھا۔ ولایت سے آکر ہم نے ہکلی صاحب کتاب جیسٹنگ پلیٹ، نامی پڑھی جس میں کشمیریوں کی غلیظ عادتوں کا ذکر تھا۔ تیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ ڈاکٹر ماترا صاحب نے اپنی رپورٹوں میں لکھا تھا کہ دنیا کے تختے پر کوئی قسم کشمیریوں کی سی غلیظ عادتوں کی موجود نہیں۔

ہم نے پہلی مرتبہ کشمیر ۱۹۰۲ء میں دیکھا تھا جسے اَب پچیس سال ہوئے اُن دنوں غلاظت کی انتہا نہ تھی بعد اُس کے ہم کو چار پانچ مرتبہ کشمیر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ بھنگی باہر سے بلوائے گئے، محلوں میں مَردانہ اور زمانہ ٹٹیاں بن گئیں۔ کمیٹی کے پریسیڈنٹ موردِ عتاب تو ہوتے رہے مگر انہوں نے صفائی میں بہت سعی کی۔

باشندگان کے طبائع میں ابھی صفائی کی خوبیاں ذہن نشین نہیں ہوئی ہیں۔

اَب جموں کا راستہ بھی کھُل گیا ہے۔ موٹریں، لاریاں بکثرت جاری ہوگئیں ہیں۔ سیاحوں کی تعداد ہر سال روز اُفزوں ہے۔ ڈوگرستان سے کشمیر مل گیا ہے۔ راج ترنگنی کا زمانہ یاد آنے لگا ہے۔ قدامت پسند مہاراج سرگباش ہوگئے۔ والیٔ حال شائستہ فہمیدہ اور ہوشمند ہیں۔ اُن کی توجہ ہر ایک صیغے کی جانب ہے۔ جہاں جہاں ترقی کی گنجائش ہے وہ اصلاح وتوسیع کے دَر پے ہیں۔ ہمارا اِس بارے میں کچھ کہنا ''حکمت بہ لقمان آموختن'' کے مصداق ہے تاہم کچھ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ''گر قبول اُفتد زہے عزّ وشرف''۔

..................(﴿ا﴾ صفائی)..................

بھنگی زیادہ تعداد میں درکار ہیں۔ ہرِ ایک ہاؤس بوٹ کے لئے بھنگی کی ضرورت ہے۔ مقامی واتل کافی تعداد میں موجود نہیں۔ باہر سے بھنگی بُلوانا چاہئے۔

میلے کے جلانے کی تجویز ہونی چاہئے۔ اِس کے لئے چار کلین مقامات مناسب پر نصب کردی جائیں۔ آس پاس کے کھیتوں میں میلا پڑنے سے ندیوں نالوں چشموں میں آلودگی کا ڈر رہتا ہے۔

کسی نئے مکان بننے کی اجازت میونسپل کمیٹی سے اس وقت تک نہ ملنی چاہئے تاوقتیکہ کہ اس میں جائے ضروریہ کے واسطے کمرہ علیٰحدہ نہ بنایا جائے۔

گلیوں کو گندا کرنا ہرگز رَوانہ رکھا جائے۔

صابن کی ایک فیکٹری بھی کھُلنی چاہئے۔ صابن کے اُجزا باہر سے لانے ضرورت نہیں۔ اِسی ملک میں سب میسّر آسکتے ہیں۔ غرباء کو اَرزاں صابن ملنا.

چاہئے تا کہ کپڑے دھونے میں آسانی ہو۔ جہاں پانی کی اتنی افراط ہو وہاں کے لوگ کیوں صاف نہیں رہتے۔ وجہ یہ ہے کہ اوّل طبیعت میں صفائی کا خیال نہیں دوسرے صابن ارزاں نہیں ہے۔

..................(ب) صفائی)..................

ہم نے سویزرلینڈ میں دیکھا کہ برقی ریلوے ہم کو ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کوہ آلپس پر لے گئی اسے رِگی Riggy ریلوے کہتے ہیں۔ شکمِ کوہ چیرتی ہوئی جیسے سانپ بل میں گھستا ہے۔ یہ برقی ریلوے بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔ فنِ انجینئرنگ کا یہ ایک معجزہ ہے۔ ایسی ریلوے تو بھلا کشمیر میں کہاں بنے گی۔ البتہ متوسط ارتفاع کے پہاڑوں اور پہاڑیوں کے لئے فیونیکلر (funicular) نہایت عمدہ کام دیتے ہیں اُن پر صرف تو ضرور ہوتا ہے لیکن کشمیر کی آمدنی اِس کی متحمل ہوسکتی ہے۔ گُل مرگ کے لئے فیونیکلر آسانی سے بن سکتا ہے۔ سون مرگ کے قریب کے پاس کے لئے رگی ریلوے پر البتہ صرف بہت کثیر آئے گا۔ کشمیر میں برقی طاقت کافی ہے جس سے گل مرگ کی چڑھائی کے لئے فیونیکلر بن سکتا ہے۔ امید ہے کہ یہاں ایک فیونیکلر اپنا خرچ سیاحوں سے نکال لے گا۔ سرینگر سے اننت ناگ تک مسافروں کی آمدورفت بہت زیادہ ہے۔ برقی ٹریم سرکاری خرچ سے بن سکتی ہے اِس سے غالباً دَربار کو خاصی مالی آمدنی ہوجائے گی۔ ویری ناگ، اچھابل، مٹن صاحب کو اننت ناگ اسلام آباد سے راستہ جاتا ہے اگر ٹریم بن گئی تو سڑک لاریوں کی کثرت سے نہ ٹوٹے گی۔ نہ اتنی گرد اُڑے گی۔

..................(ج) صفائی)..................

شہر سرینگر میں آبادی اتنی گنجان ہے لوگ کبوتروں کے مانند بستے ہیں۔ سرکارِ والا اگر کثرت سے زمین رعایا کو عطا کرے تو شہر کا پھیلاؤ ہو سکتا ہے۔ بارہ مولا اور اننت ناگ کی جانب جدید مکانات بن سکتے ہیں۔ کوٹھیاں کرایے کے لئے بہت کم ہیں۔ ہوٹل بھی کم ہیں۔ سیاحوں کے لئے زیادہ سہولتیں ہونا چاہئیں۔ یہاں پر یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سوئیزرلینڈ سیاحوں ہی کی جیبوں سے مالا مال ہو گیا ہے۔ اگر کشمیر میں آمد و رفت قیام اور سیر کی سہولتیں بڑھ جاویں تو لاکھوں روپیہ اِس ملک میں آنے لگے۔

..................(۵) صفائی)..................

ریاست کشمیر میں ۹۴ فیصدی مُسلم آبادی ہے۔ جموں کی ہندو آبادی جُدا ہے۔ اگر سرکارِ والا تارکُ الوطن کشمیریوں کو صلائے عام دیں تو بہت سے ہندو پھر اَپنے وطن میں آپس آسکتے ہیں اور اگر ہندو کاشتکاروں کو ویران رقبے کاشت کے لئے دے دیئے جائیں تو یقیناً آس پاس کے ہمسایہ علاقوں سے کئی ہزار نفوس آباد ہو سکتے ہیں۔ موجودہ باشندگان کا اِس میں کوئی نقصان نہیں' تجارت کی ترقی ہوگی آخر میں ملک ہی کو نفع رہے گا۔ ''

''صوفی''...... یہ پہلی مرتبہ پنڈی بہاؤالدین گجرات (پنجاب) سے جنوری ۱۹۰۹ء میں جاری ہوا۔ اِس کے شمارے بہت کم دستیاب ہیں۔ ''صوفی'' کے ایڈیٹر ملک محمدالدین اعوان تھے۔ اُن کے حالات زندگی بھی دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن ماہنامہ ''چاند'' بابت نومبر دسمبر ۱۹۲۰ء میں اعوان اپنے رسالے ''صوفی'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''میں (ملک محمدالدین اعوان) گجرات کے ایک گاؤں کلان میں جُون

۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا۔ جنوری ۱۹۰۹ء میں ''صوفی'' جاری کیا۔ ۱۹۱۴ء میں ''صوفی'' کی اشاعت دس ہزار ہوگئی۔ ۱۹۲۷ء میں ''صوفی'' پرنٹنگ کمپنی کی ایک شاخ لاہور میں قائم ہوئی''۔

ماہنامہ ''چاند'' کنہیالال ایڈوکیٹ کی اِدارت میں الہٰ آباد سے ۱۹۳۰ء میں جاری ہوا۔ کنہیالال ''صوفی'' کے ایڈیٹر ملک محمد الدین اعوان کے دوستوں میں تھے۔

''صوفی'' اَپنے دَور میں بہت ہی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اِس میں نظم کے علاوہ نثر کے مضامین بھی اعلیٰ پیمانے پر چھپتے تھے۔ اُردو کے مشہور و معروف اَدیب اور شعراء اِس میں لکھتے تھے۔ نیاز فتحپوری، سیماب اکبر آبادی، سالک بٹالوی اکبر الہٰ آبادی اور خواجہ حسن نظامی ''صوفی'' کے مستقل لکھنے والے اہلِ قلم حضرات میں تھے۔ ان شعراء کے علاوہ جوش ملیح آبادی، نیرنگ انبالوی، نوح ناروی، آغا شاعر قزلباش دہلوی، اوج گیاوی، صمد یار خان (ساغر نظامی)، کوثر خیر آبادی، قیصر بھوپالی بھی ''صوفی'' کے لکھنے والوں میں تھے۔

رسالہ ''صوفی'' جلد ۴۶ نمبر ۴ بابت اکتوبر ۱۹۳۱ میں ''شذرات'' کے تحت کشمیر میں رُونما ہونے والے جولائی ۱۹۳۱ء کے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسالہ ضیاء الملک، مُلا رموزی کے حوالہ سے لکھتا ہے۔

> ''اس مرتبہ کے شذرات کا ایک حصہ ''حوادثِ کشمیر'' بھی ہونا چاہئے۔ جہاں پچھلے چند ماہ سے اِنتہائی درجہ تکلیف دہ واقعات صورت پذیر ہو رہے ہیں۔ بعض اخباری اطلاعات ہیں کہ ریاست کشمیر میں وہاں کے مسلمان باشندوں کو مختلف قسم کے صدمات و شدائد کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ ان کے دینی شعائر اور قومی

و؟؟؟ زندگی نہایت افسوسناک حد تک مجروح اور متاثر کی جارہی ہے اور ان زیادتیوں کو ''قومی تعصب'' بیان کیا جاتا ہے اور جہاں تک اطلاعات کا تعلق ہے کچھ شک نہیں کہ اِن کے لحاظ سے مسلمانوں کشمیر نہایت درجہ ہمدردی اور انصاف کے مستحق ہیں۔ پنجاب اور دوسرے صوبوں کے اخبارات میں کشمیری مسلمانوں پر جن لاتعداد مظالم کا اظہار کیا گیا ہے وہ ایک مُردہ سے مُردہ مسلمان اور ہمدرد بنی نوع انسان کے دل کو بے چین کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُدھر مسلمان اخباروں کے مقابل ہندو اخبارات کشمیری مسلمانوں کو غدار، سازشی اور باغی لکھ رہے ہیں اور ہر طرح کا مجرم مسلمانوں ہی کو قرار دے رہے ہیں وغیرہ۔ مگر چند اخبارات تو کیا وہ یورپ کی مشہور ''ہوائیاں اُڑانے والی کمپنی'' یعنی ریوٹر ایجنسی بھی انکار نہیں کرسکتی۔ مثلاً جیل خانے کے قریب والے فساد میں تقریباً پینتیس مسلمانوں کا جان سے مارا جانا بتاتا ہے اور غلبہ بہرحال اوروں کو ہے۔ پھر حکمران جماعت میں اوروں کا غالب ہونا وغیرہ۔ بہرکیف حالات سے ہر طرح ثابت ہے کہ کشمیر کے بے بس مسلمان قابلِ رحم ہیں''۔

اِن شذرات (ایڈیٹوریل) میں مسلمانوں کی طرفداری اِس لحاظ سے کی گئی ہے کہ کیونکہ بعض اخبارات جن کا رجحان حکومت کی طرف تھا مسلمانوں کے خلاف آگ اُبل رہے تھے اور انہیں غدار، سازشی، باغی وغیرہ کا لیبل لگا کر اُن پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ رسالہ ''صوفی'' کشمیریوں کے حق میں برابر لکھتا گیا اور یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ مثلاً ''صوفی'' جلد ۴۷، نمبر ۱، بابت جنوری ۱۹۲۲ء اور ''صوفی'' بابت فروری ۱۹۳۲ء قابلِ ذکر ہیں۔''

۴۔ رہمایوں لاہور:

شاہ دین نام ''ہمایوں'' تخلص کرتے۔ وہ ایک بہت بڑے قانون دان اور مسلمانوں ایک سرکردہ قومی راہنما ہونے کے علاوہ اُردو کے ایک ممتاز شاعر بھی

تھے۔ انہوں نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے میں ایک اہم کردار اُدا کیا اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے رُوحِ رَواں بھی تھے۔ اُنکا انتقال ۱۹۱۸ء میں لاہور میں ہوا۔ اِس موقع پر علامہ اقبالؔ نے تاریخِ وفات بھی لکھی اور ''بانگِ درا'' میں ہمایوں کے نام ایک نظم بھی درج کی۔ ہمایوں، کشمیر بھی آتے تھے اور کشمیر کی خوبصورتی اور مناظر کی تصویر کشی بھی اُپنے کلام میں کی۔ ذیل میں اُن کی ایک نظم ''شالامارِ کشمیر'' جو مخزنؔ لاہور بابت جون ۱۹۰۳ء میں بھی شائع ہوئی، کے چند اُشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

اے باغ لوگ کہتے ہیں تم شالامار ہو — اور عظمتِ گذشتہ کی اِک یادگار ہو

کیا تم ہی زندہ ناموں کے باعث ہو نامور؟ — کیا تم ہی مُردہ سلطنتوں کا مزار ہو؟

سو جائیں یک پتے کا سینے پہ رکھ کے ہاتھ — مدفن دِلِ تپاں کا جو زیرِ چنار ہو

ناظر بڑا مزا ہو جو اقبال ساتھ دے — ہر سال ہم وہاں شیخ ہو اور شالامار ہو

ہمایوں کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند ارجمند جناب بشیر احمد (کنٹب ؟؟؟) نے اپنے والدِ گرامی شاہ دین ہمایوں کے نام ایک ماہنامہ ''ہمایوں'' جنوری ۱۹۲۲ء میں جاری کیا۔ اِس میں اور لوگوں کے علاوہ علامّہ اقبال، مولانا گرامیؔ، مولانا ظفر علی خان، جوشؔ ملیح آبادی، وغیرہ ممتاز شعراء اور نثر نگار کے بلند پایہ مضامین اور نمائندہ اُشعار شائع ہوتے تھے۔ ''ہمایوں'' اُردو کے معتبر اور ممتاز رسالوں میں شمار ہوتا تھا۔ اِس رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہمایوں کے صاحبزادے بشیر احمد کی اِدارت میں خوب پھلتا پھولتا رہا۔

''ہمایوں'' میں کشمیر کے متعلق اکثر و بیشتر مضامین نثر اور نظم کی صورت

میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ''ہمایوں'' بابت اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ایک نظم ''پہلگام کشمیر'' کے عنوان سے بشیر احمد ایڈیٹر ''ہمایوں'' کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔

پہلگام کشمیر

حُسن کے جلوے ہیں تیری وادیوں میں پہلگام
عشق کی سطوت ہے تیری چوٹیوں میں پہلگام
یاد آتی ہے کوئی زندگی بھُولی ہوئی
کیسی موسیقی ہے تیرے پانیوں میں پہلگام
بھاگ کر ہنگامۂ دُنیا سے رُوحِ عافیت
ہوگئی مدہوش تیری گھاٹیوں میں پہلگام
گلشنِ فردوس کے نغمہ سرا رنگین طور
ہیں نوا پرداز تیری ڈالیوں میں پہلگام
برف زرّیں، جوئے سیمیں، قوسِ رنگیں، حورِ عین
لُطفِ جنت ہے تیری رعنائیوں میں پہلگام
اِس چمن میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو جابجا
چھُپ رہا ہے کون تیری بستیوں میں پہلگام
خفتگانِ خاک دیتی ہے پیغامِ حیات
نعرہ زن ہے برق تیری وادیوں میں پہلگام
رہ گیا تھا ایک بشیر خستہ تن، آشفتہ جاں
وہ بھی شامل ہے تیرے شیدائیوں میں پہلگام

ایڈیٹر ''ہمایوں'' بشیر احمد نے اُپنے رسالے بابت جنوری ۱۹۴۰ء میں

مہجور کاشمیری کی ایک مشہور کشمیری نظم ''وَلو ہا باغوانو نو بہارُک شان پیدا کر'' کا اُردو ترجمہ کر کے پیش کیا ہے۔ اِس سلسلے میں بشیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

''مہجور کاشمیری اپنے وطن کی جنّتِ ارضی کو انسانی ہاتھوں سے پائمال دیکھ کر انسانی ہاتھوں ہی سے پھر اِسے حقیقی جنّت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں''۔

اِسی شمارے میں محمد اکبر منیر کی ایک نظم سرودِ ''نشاط'' کشمیر کے عنوان سے بھی شائع ہوئی ہے۔ منیر لکھتے ہیں:

''۱۹۲۷ء میں مجھے پہلی دفعہ خطۂ کشمیر کی وادیٔ جنت نظیر کے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُس کا یہ اثر ہوا کہ تقریباً ہر سال موسم گرما میں ایک دُو مہینے اس خاکِ شعر و سخن میں گزرتے ہیں۔''

نظم پیشِ خدمت ہے:

سرودِ نشاط[1] کشمیر

یا

ترانۂ مستانہ بطرزِ ساقی نامہ

(۱)

مرے دوست ساقی صراحیٔ مے لا — پیالوں میں بھر بھر کے مَے پَے بہ پَے لا

مۓ پاک شیراز و تبریز و رَے لا — بکوری جمشیدہ کاؤس کے لا

ببانگ نشاط اَور چنگ و نَے لا — کہ تازہ ہوا سر میں سودائے لیلا

مرے دوست ساقی صراحیٔ مے لا

پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

[1] نشاط باغ۔ کشمیر

﴿۲﴾

دلاویز کشمیر کی سرزمیں ہے بساطِ گل و لالہ و یاسمیں ہے
یہ الماس خاتم زمرد نگیں ہے بہار آشنا ہے، بہار آفریں ہے
سزاوارِ غلماں و حورانِ عین ہے بہشتِ بریں ہے، بہشت بریں ہے

مرے دوست ساقی صراحئ مے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پے لا

﴿۳﴾

اُٹھیں کوہساروں سے کالی گھٹائیں ہوئیں مست و مخمور ڈل کی فضائیں
فلک جُھک کے لیتا ہے کس کی بلائیں اِدھر آبشاروں کی دِلکش صدائیں
اُدھر گلعذاروں کی شیریں اُدائیں ہے خوب انجمن آ! پئیں اور پلائیں

مرے دوست ساقی صراحئ مے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پے لا

﴿۴﴾

اُتر آئے گردوں سے ڈل کے کنارے بہشتی بہاریں، بہشتی نظارے
انہیں دیکھ کر جھومتے ہیں ستارے. لگی آگ سینے میں اُٹھے شرارے
بیا تا تسنیم زیرِ چنارے بجا مے و سازے، بزیبا نگارے

مرے دوست ساقی صراحئ مے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پے لا

﴿۵﴾

چھلکتے ہیں ڈل میں کنول کے پیالے نرالے چمن ہیں نرالے ہیں تھالے
کنول نین خورشید رُو بھولے بھالے شکاروں میں آئے ہیں ڈیرے ہیں ڈالے
میں بے مے ہوا ست کوئی سنبھالے مجھے ایسے فتنوں سے ساقی بچالے.

مرے دوست ساقی صراحئ مے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پے لا

﴿۶﴾

خراماں خراماں حسیں آرہے ہیں　حسیں نازنیں، مہ جبیں آرہے ہیں
گل و لالہ و یاسمیں آرہے ہیں　ہے غوغا غزالانِ چیں آرہے ہیں
حریفانِ حورانِ عیں آرہے ہیں　حسینانِ خلدِ بریں آرہے ہیں

مرے دوست ساقی صراحیٔ مَے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

﴿۷﴾

حسیں صحنِ گلشن میں ہیں محوِ بازی　ہے تیغِ دوام ان کی عشوہ طرازی
غمِ عشق کی دل پہ ہے تُرکتازی　غضب ہے ترا شیوۂ بے نیازی
پلادے بہ آہنگ سازِ حجازی　شراب حقیقی بہ جامِ مجازی

مرے دوست ساقی صراحیٔ مَے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

﴿۸﴾

حسینان کشمیر آئینہ رُو ہیں　بہار آفرینِ گلِ آرزو ہیں
نہ پیکار خُو ہیں، نہ پیکار جُو ہیں　دلاویز رُو ہیں، دلاویز خُو ہیں
ہمہ مست میخانۂ رنگ و بو ہیں　ہمہ چشم بر راہِ جام و سبو ہیں

مرے دوست ساقی صراحیٔ مَے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

﴿۹﴾

گلستاں کی رنگینیوں کا فسوں ہے　کہ پانی کی ہر موج اِک ارغنوں ہے
یہاں گنبدِ نیلگوں سرنگوں ہے　جنوں بہاراں، بہارِ جنوں ہے
دلِ عشق پرور محبت سے خوں ہے　کدھر تیرا پیمانۂ لعل گوں ہے

مرے دوست ساقی صراحیٔ مَے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

﴿۱۰﴾

شباب آفریں ہیں چمن کی بہاریں ہیں ہنگامۂ رنگ و بو مُرغزاریں
چناروں کی کیا خوشنما ہیں قطاریں ترانوں سے لبریز ہیں آبشاریں
ترنم سے لہراتی ہیں جوئباریں یہ ہیں دورِ اسلام کی یادگاریں
مرے دوست ساقی صراحیٔ مَے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

﴿۱۱﴾

کیا آئے اسلامیوں نے اشارا چمک اُٹھا اس سر زمیں کا سارا
ہوا باغ خلدِ بریں آشکارا ہوئے جاتے ہیں رُوح و جاں پارا پارا
دلِ ناتواں ڈھونڈتا ہے سہارا پلا ساغرِ ارغوانی خدارا
مرے دوست ساقی صراحیٔ مَے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

﴿۱۲﴾

پلا ساغرِ بادۂ اُرغوانی بڑھے جس کی تابش سے سوزِ نہانی
وہ بادہ جو ہے قدسی و آسمانی جو فانی کو دے زندگی جاودانی
مٹا دیتی ہے جس کی شعلہ فشانی قیودِ زمانی، قیودِ مکانی
مرے دوست ساقی صراحیٔ مَے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

﴿۱۳﴾

ترانہ مرا دلکش و داستاں ہے چمن زارِ کشمیر کا ارمغاں ہے
گل و لالہ و سبزہ کا کارواں ہے چناروں کے سائے میں جُوئے رَواں ہے
شرارِ جنوں ہے، بہارِ جناں ہے ترا جامِ گُلرنگ آتش فشاں ہے
مرے دوست ساقی صراحیٔ مَے لا
پیالوں میں بھر بھر کے مے پے بہ پَے لا

محمد اکبر منیر

کشمیر کے برقی کارخانے

(از پروفیسر شیونراین صاحب ایم اے)

قدرت نے انسان کی جسمانی طاقت کو مدد پہنچانے اور اس کی مشکلات سہل کرنے کے لئے کئی وسائل مہیا کئے ہیں۔ ہوا، پانی، آگ کی امداد سے کئی کام بہ آسانی ہو سکتے ہیں جہاز و کشتی پہلے ہوا ہی کے طاقت سے چلائے جاتے تھے۔ پوَن چکی تو اَب بھی کئی جگہ (خاص کر دیہاتی قصبوں میں) استعمال ہوتی ہے۔ امریکہ میں کنوؤں سے ہَوا کے زور سے پمپ چلا کر کھیتوں کو پانی دیتے ہیں۔ لیکن ہَوا اور دھوپ اُپنے بس میں نہیں۔ پانی اور آگ پر زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اَب زیادہ تر کارخانے انہیں کو استعمال کرتے ہیں۔ کوئلہ سے آگ اور پانی سے بھاپ بنا کر اِنجنوں کو خوب تیزی سے چلا سکتے ہیں۔ یہ انجن کارخانوں میں مشینیں چلاتے ہیں جن کی بدولت سخت مشقت کے کام بہ آسانی اور جلدی ہو جاتے ہیں۔ جہاز بھی اَب تو بھاپ کے انجن (یا ٹربائن جو کہ پہیئے کی شکل کی ہوتی ہے) ہی سے سمندر پار کرتے ہیں۔ بھاپ کے زور سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اِس کے علاوہ تیل اور گیس سے بھی اِنجن چلائے جاسکتے ہیں۔ موٹر کار اور بائیسکل اکثر انہیں سے تیز رفتار چلائی جاتی ہیں۔ طاقت کے علاوہ اِن اشیاء سے روشنی اور حرارت پیدا کر سکتے ہیں۔ محض پانی کے زور سے پن چکی چلتی ہیں اور جہاں کہیں کوئلے یا لکڑی کی کمی اور پانی کی کثرت ہو وہاں پانی ہی کے زور سے ٹربائن چلا کر طاقت پیدا کر سکتے ہیں۔ کشمیر میں ہر طرف جنگلات ہی جنگلات ہیں۔ لکڑی اور پانی کی بھی کمی نہیں

اِس لئے یہاں کے مشہور ریشم کے کارخانے میں ان دونوں ہی کا استعمال تھا۔
ان سے کافی حرارت پہنچ سکتی ہے اور بھاپ پیدا کر کے انجن بھی چلا سکتے ہیں،
لیکن لکڑی کم ہوتی جاتی ہے اور بعض جگہ لکڑی کا پہنچنا دشوار ہوتا ہے۔ برقی رَو
میں یہ خاصیّت ہے کہ ایک مقام پر ذخیرہ پیدا کر کے تانبے کے تاروں کے
ذریعہ دُور دُور تک طاقت، روشنی اور حرارت بہم پہنچا سکتے ہیں۔ چنانچہ سرینگر میں
مہاراجہ صاحب کے محلات میں بھاپ کے اِنجنوں سے برقی مشینوں کو چلا کر بجلی
کی روشنی ہوتی تھی۔ برقی رَو سے دو تین سال سے پیشتر صرف ہی کام لیا جاتا تھا۔
ریاست میں ایک دریا کافی ہجوم کا گذرتا ہے۔ امریکہ کے برقی
کارخانوں کا حال سن کر میسور کے دریائے کاویری سے برقی طاقت تیار ہوتے
دیکھ کر کشمیر والوں کو بھی خیال آیا کہ دریائے جہلم کے پانی ایک نہر بنا کر اور اس
کو کافی اونچائی سے گرا کر ایک بڑا بجلی گھر بنایا جائے۔ جہاں سے سرینگر کے
ریشمی کارخانے چلانے، بارہمولہ سے سرینگر تک دریائے جہلم کو زیادہ گہرا
کرنے اور دیگر کمپنیوں کے مختلف کاروبار کے لئے برقی قوّت تقسیم کرنے کی
کوشش کی جائے۔ شروع میں ریل اور ٹریم گاڑی چلانے کی بھی تجویز تھی، مگر وہ
ملتوی ہوگئی۔ اَب اِس سے سرینگر شہر اور مہاراجہ صاحب کے محل میں روشنی کی
جائے گی۔ تجویز دَربار نے منظور کی اور ریاستِ میسور سے میجر لوبینر بلائے
گئے تا کہ وہ بتلائیں کہ کس طرح سے یہ خیال پورا ہوسکتا ہے۔ انہوں نے
امتحان و ملاحظہ کر کے مکمل تجویز پیش کی۔ کئی لاکھ کا تخمینہ بنایا اور دَربار نے
۷۵ لاکھ روپیہ منظور کئے۔
امریکہ کی جنرل الیکٹرک کمپنی کو برقی آلات اور مشینوں کا اورڈ دبل

کمپنی کو پانی کی ٹربائن، پایپ، گیٹ وغیرہ کا ٹھیکہ دیا گیا۔ انہیں کمپنیوں کے ملازم ریاست میں کام کرنے کے لئے بُلائے گئے۔ تین سال تک خوب زور و شور سے کام رہا۔ سال بھر سے کارخانے چل رہے ہیں۔ ریاست میں کئی تغیر و تبدّل ہوئے جن سے اس سکیم پر بھی اثر پڑا۔ چونے اور ہَوا سے ایک قسم کی کھاد تیار کرنے کے لئے ایک فیکٹری بھی بنانے کی خبر تھی وہ بھی ریلوے کی طرح ملتوی کی گئی۔ لیکن تجربات ہو رہے ہیں شاید اس طاقت کو 'جو ریاست کی ملکیت ہے کسی طرح کام میں لایا جائے۔ نئی قسم کی ایک ریل پر چلنے والی گاڑی آدمیوں کے سفر کے لئے اور کیبل ولوہے کی موٹی رسی پر اَسباب لانے، لے جانے کے لئے مشین مروّج کرنے کی تجویز ہے۔ دیکھئے یہ کب شروع ہوتے ہیں۔

راولپنڈی سے ۶۴ میل پر کوہالہ کا پل ریاست کی حد ہے۔ اس سے ۸۴ میل آگے رامپور سے ذرا آگے بُنیار نام مقام پر دریائے جہلم میں ایک قدرتی موڑ ہے۔ وہاں دَروازے لگائے گئے ہیں۔ اِن کو کھولنے سے پانی ایک نہر میں پہنچتا ہے۔ یہ نہر سات میل لمبی ہے۔ پانی کہیں تو چُونے، اینٹ یا پہاڑی پتھّروں میں سے، کہیں پہاڑ کے پہلو پر لکڑی کے تختوں کی بنائی ہوئی مصنوعی نہر (فلوم) اور کہیں خندق میں سے ہو کر مہورا پہنچایا جاتا ہے۔ وہاں چار سو فٹ کی اُونچائی سے ایک دَم چار آہنی پائپ میں ۱۷۵ پونڈ پریشر (یعنی پانی دباؤ) سے ٹربائن پر آکر پڑتا ہے اور انہیں ۵۰۰ دفعہ فی منٹ کی رفتار سے گردش دیتا ہے۔ ہر ٹربائن کے ساتھ ایک ہی سفٹ (دہرے) پر ایک برقی مشین ہے جس سے بجلی تیار ہو کر بارامولا اور سرینگر بھیجی جاتی ہے۔ بارہمولہ مہورا سے ۲۰ مِیل اور سرینگر ۵۰ مِیل ہے۔ برقی قوت کی یہ عجیب خاصیت ہے

کہ اگر مشین کو بیرونی طاقت سے گردش دی جائے تو مشین سے برقی رَو نکلتی ہے
اور اگر برَقی رَو مشین کو بہم پہنچائی جائے تو خود گردش کرنے لگتی ہیں اور اِس گردش
سے پمپ وغیرہ کارخانے چلائے جاسکتے ہیں۔ بارہمولہ میں برقی موٹر مہورا
سے بجلی آکر چلاتی ہے ان کے ساتھ ڈریج اور کرین ہیں جن کے ذریعہ دریا کی
تہہ میں سے ریت مٹی ڈال کر باہر کناروں پر پھینکتے رہتے ہیں۔ اس طرح
تھوڑی تھوڑی گہرائی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ سری نگر میں بھی ٹربائن جو برقی رَو
سے چل کر ریشم کاتنے کی مشین چلاتے ہیں۔ برقی رَو ریشم کے کپڑوں کو جن کو
انگریزی اصطلاح میں کوکون کہتے ہیں اور جو کبوتر کے انڈے جیسے ہوتے ہیں
حرارت پہنچانے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ بجلی کے لیمپ
ہر کارخانہ میں ہیں اور اَب محلوں اور شہر سرینگر میں بھی عام روشنی اُسی برقی رَو
کے ذریعے کی جائے گی۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ ہر طرح کے کام بجلی سے
لے سکتے ہیں۔ گرمی میں پنکھے چلتے ہیں اور سردی میں انگیٹھی (ہیٹر) گرم
کرسکتے ہیں رات کو روشنی ہوتی ہے اور دن میں کارخانہ اِسی سے چلتے ہیں۔ ''

کلامِ فوق:

'' منشی محمد الدین صاحب فوقؔ اُیڈیٹر کشمیری میگزین لاہور کی مختلف غزلوں
اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ عشقیہ غزلیں اور قومی وملکی نظمیں یکجائی ترتیب دے کر
قدیم اور جدید شاعری کو ہم آغوش کردیا ہے۔ حضرت فوقؔ نے اُپنی غزلوں میں
قدیم شعرائے فارسی اُردو کی تقلید ترتیب کے لحاظ سے نہیں کی بلکہ ہر نظم وغزل
سے پہلے اس کی وجہ تصنیف اور اندازہ طبیعت بتایا ہے اور اِس لحاظ سے کلام فوقؔ
کی ترتیب نئی ہے کیونکہ عموماً اساتذہ سابق وحال کے دیوان ردیف وار طبع

ہوئے ہیں اور اس بات کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے کہ فلاں فلاں غزل شاعر نے کس وقت لکھی۔ حضرت فوقؔ کے طباع اور ذہین ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ غزلوں میں رنگِ تغزّل موجود ہے۔ سلاست اور شوخیٔ بیان کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ فصیح الملک داغؔ مرحوم سے آپ کو تلمّذ ہے۔ ابتدائی نظم قدیم ہی سے کی ہے، غزل گوئی میں تخیّلِ قدیم کی پابندی کی گئی ہے لیکن دیگر کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے غزل گوئی میں یک فنّی کی حیثیت سے دستگاہ نہیں حاصل کی ہے بلکہ نیچرل شاعری میں بھی آپ کو پوری مہارت ہے۔ الغرض کلامِ فوقؔ اہلِ سخن کی دلاویزی کا عمدہ ذریعہ ہے۔ ہر رنگ کا کلام موجود ہے۔ شعرا نے کلامِ فوقؔ کی تاریخیں بھی کہیں ہیں۔ آخر میں ایک فہرست اساتذہ داغؔ کی بھی ہے یہ دلچسپ مجموعہ شائقین دفترِ کشمیری میگزین سے طلب کر سکتے ہیں۔ قیمت صرف ۶/ ہے۔ ''

قدیم اخبارات میں تذکرہ کشمیر

قدیم اخبارات کی فہرست کافی طویل ہے۔ اِن میں درج ذیل اخبارات قابل ذکر ہیں جن میں کشمیر اکثر و بیشتر موضوعِ بحث ہوتا تھا۔

''اُردو اخبار'' دہلی (۱۸۳۶ء) ''سیدالاخبار'' دہلی (۱۸۳۷ء) ''صَدرالاخبار'' آگرہ (۱۸۴۶ء) ''اُردو اخبار مدراس'' (۱۸۴۸ء)، ''سفیرآگرہ'' (۱۸۵۶ء)، ''تہذیب الاخبار'' علی گڈھ (۱۸۷۰ء)، ''اخبارِ عام'' پنجاب (۱۸۷۱ء)، ''مراۃ الہند'' لکھنؤ (۱۸۷۵ء) ''اَودھ پنچ'' لکھنؤ (۱۸۷۷ء)، ''آصف الاخبار'' حیدر آباد (۱۸۷۸ء)، ''پیسہ اخبار'' فیروز

والا، لاہور (۱۸۷۸ء)، ''کشمیر دَرپن'' الہٰ آباد (۱۹۰۳ء) وغیرہ۔ راقم نے اَپنے مضمون میں صرف سات نادر و نایاب اخبارات کا ذکر کیا ہے جو بالعموم قارئین اور بالخصوص صحافت کے طلبہ کے لئے کافی سُودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہ اخبارات درجِ ذیل ہیں:

۱/ ''اودھ اخبار'' لکھنؤ (۱۸۵۹ء)

۲/ ''سفیرِ ہند'' اَمرت سر (۱۸۸۰ء)

۳/ ''دکن پنچ'' حیدر آباد (۱۸۸۷ء)

۴/ ''سرمُور گزٹ'' ناہن (۱۸۸۸ء)

۵/ ماہنامہ ''حسن'' حیدر آباد (۱۸۸۸ء)

۶/ ''الوقت'' گورکھپور (۱۸۹۲ء)

۷/ اخبار ''چودھویں صدی'' راولپنڈی (۱۸۹۵ء)

مذکورہ بالا اخبارات میں دیگر موضوعات کے علاوہ تذکرۂ کشمیر پیش پیش ہے جن کے مطالعہ سے ریاستِ کشمیر کے سیاسی و سماجی حالات، نیز یہاں کے موسم، تعلیمی نظام، صحافت، تجارت، آمدورفت وغیرہ کے بارے میں سو سال قبل سے بھی زیادہ کا اَندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ سبھی اخبارات اپنے زمانے کے مشہور ترین اخبارات میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن اَب اکثر و بیشتر لوگ اِن سے ناواقف ہیں۔ صحافت پر جتنی کتابیں راقم کی نظر سے گزری ہیں ان میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی کتاب ''صحافت پاکستان و ہند میں'' ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ کتاب واقعی بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے مرتّب کی گئی لیکن ''اُردو اخبار'' کو چھوڑ کر اِس میں مذکورہ بالا اخبار کوئی جگہ نہ پا سکے۔ اِن کی عدم

دستیابی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اِن اُخبارات کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

پروفیسر اکبر حیدری نے اِن اخبارات کا تفصیل سے ذکر اپنے مضامین میں کیا ہے جو ایک کتابی شکل میں سہ ماہی ''اردو'' کراچی جلد: ۷۳، شمارہ ۱ تا ۴ (۱۹۹۷ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔ بقول حیدری صاحب:

''خدا کا شکر ہے کہ میری ۲۰ سال کی صبر آزما کوششیں بارآور ثابت ہوئی کہ یہ سبھی بیش بہا اخبار مجھے ملک کے دُور دراز مختلف کتب خانوں میں خون پسینہ ایک کر کے دستیاب ہوئے۔ اِن اخباروں کے بحرِ بے کراں میں گوہر ہائے نایاب چھُپے ہوئے ہیں اِن کو منظرِ عام پر پیش کرنا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جو لوگ اِس وادیٔ پر خار سے گزرے ہیں وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل ہے''۔

کشمیر کے حوالے سے اِن اخبارات میں جو موضوعات شامل ہیں اِن کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ''**اَودھ اخبار**'' لکھنؤ: یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مشہور تاجر کتب منشی نَول کشور نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں اُردو پریس قائم کیا جو ''اَودھ اخبار'' کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسرے ہی سال میں یعنی ۱۸۵۹ء میں ''اَودھ اخبار'' جاری کیا۔ اِس اَخبار کو کشمیریوں سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر سے متعلق مضامین اور خبریں اِس اُخبار کی ہمیشہ زینت بنا کرتی تھیں۔ کشمیر کے سیاسی حالات کو منظرِ عام پر لانے کے لئے ''اَودھ اخبار'' نے ایک اہم کردار اَدا کیا ہے جو دُنیائے صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ لیکن اِس اَخبار کا جُھکاؤ مہاراجہ کی طرف تھا کیونکہ مہاراجہ کشمیر بھی اِس اخبار کے

خریداروں میں سے تھے۔ جموں کی ترقی میں مہاراجہ کشمیر نے جو کردار نبھایا ہے اِسے اَخبار یوں پیش کرتا ہے:

"مہاراجہ رنبیر سنگھ والئ کشمیر جموں میں لوگوں کو آباد کرنے کے لئے متعدد (؟) سرگرم ہوئے۔ اچھی اچھی عمارتیں تیار کی ہیں اور شال کے کارخانے والوں کوتحریک وترغیب دیتے ہیں اور اکثر سوداگرانِ امرتسر سے کہا ہے کہ تم وہ جگہ چھوڑ کر میری قلمرو میں بودوباش کرو۔ اَزاں جا کہ اِس ملک میں خوف ٹیکس کا لوگوں کے دلوں پر چھایا ہُوا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ سوداگرانِ شال اِس سمت کو روانہ ہوں۔ اگر مہاراجہ صاحب برخلاف رہنے والا کے نظرترحم اپنی رعایا پر رکھیں گے تو یقین ہے کہ ان کے ملک کی دوچند آبادی ہوجائیگی"۔ (اودھ اخبار، مطبوعہ: ۳۱/اکتوبر ۱۸۶۱ء، ص ۷۱۱)

"اودھ اخبار" اَپنے ۲۲ فروری ۱۸۶۰ء کے شمارے میں جموں کے بعض علاقوں کے بارے میں لکھتا ہے:

"مقام سانبا اور جسروتا اور رام نگر وغیرہ کے علاقوں میں مہاراجہ رنبیر سنگھ صاحب نے مالگزاری کی تخفیف کی۔ بہ نسبت سابق کہیں رفاہ خلائق پر نظر ہے اور نذر بھی کسی کی قبول نہیں فرماتے۔ بلکہ جو شخص نذر گزرانتا ہے اس کو حقیر سمجھتے ہیں"۔

اِس اَخبار میں تار برقی (Telegraph) کے بارے میں بھی ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ سرکار جموں اور کشمیر کے درمیان تارِ برقی جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

سرینگر میں ایک تاریخی علاقہ حبہ کدل کے نام سے اَب تک موجود ہے جہاں مکانات ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے آگ کی وارداتیں اکثر و بیشتر رونما ہوتی رہتی ہیں۔ "اَودھ اخبار" نے ایک ایسی ہی خبر کو ۷/اگست ۱۸۶۰ء میں اِس طرح شائع کیا ہے:

''خبر آمد کشمیر سے معلوم ہوا کہ ۲۳ر جولائی یوم جمعہ کو وہاں شیر گڈھ کی طرف سے آگ لگی اور حبہ کدل کے محلے میں تخمیناً پانسو گھر خاکِ سیاہ ہو گئے۔ مگر غنیمت ہے کہ شیر گڈھ سلامت رہا جس میں اسباب سرکارِ مہاراجہ صاحب بہادر بھی بہت افراط سے رہتا ہے''۔

تحائف یعنی لین دین کا سلسلہ آج سے سو سال قبل بھی جاری تھا، موجودہ دَور میں ہم اس لین دین کو کئی ناموں سے منسوب کرتے ہیں مثلاً کرپشن (Corruption) کمیشن (Commission)، کِک بیک (Kick Back) وغیرہ۔ ''اوَدھ اخبار'' نے بھی ان تحائف کا ذکر اپنے کئی شماروں میں کیا ہے۔ جیسے ''مہاراجہ رنبیر سنگھ والی کشمیر نے جو تحفے نواب گورنر جنرل بہادر کو بھیجے اِن میں ایک دُوشالہ بہت عمدہ نہایت نفیس قیمتی ۲۰ ہزار روپے کا ہے'' (۹ مئی ۱۸۶۰ء)۔ ایک اور جگہ اخبار لکھتا ہے: مہاراجہ صاحب نے پنجاب کے گورنمنٹ کے منظوری حاصل کر کے کچھ تحائف قیمتی ملکہ کے پیش کش کو پرنسپ صاحب کے ذریعے سے بھیجے تھے۔ چنانچہ وہ منظور نظر ملکۂ معظّمہ ہوئے اور بہت پسند آئے''۔ (۲۲ فروری ۱۸۶۰ء) اِسی طرح ایک اور موقع پر اخبار لکھتا ہے: ''خبر ہے کہ گورنمنٹ پنجاب نے مسٹر کوپ صاحب بہادر کی معرفت مال پشمینہ قریب ۵۰ ہزار روپیہ کا عطائے خلاع راجگان و سرداران پنجاب کے واسطے خرید کیا ہے'' (یکم فروری ۱۸۶۰ء)

۲/ **سفیر ہند**' امرتسر: اخز الدولہ سیّد محمد اشراف لکھنوی نے اپنی کتاب ''اختر شاہنشاہی'' مطبوعہ جون ۱۸۸۸ء میں ''سفیر ہند'' کے نام سے دو اُخباروں کا ذکر اِس طرح ذیل میں کیا ہے۔

ا۔ سفیر ہند: دہلی محلّہ پیپل مہادیو اندرون چھتہ صوفی جی، ڈاک خانہ حوض خاص، رجسٹرڈ نمبر ۳۶، پندرہ روزہ، چار ورق، اوسط سالانہ گورنمنٹ انگریزی و نوابانِ والا شاہی و مہاراجگان بلند مکان...... مہتمم منشی بولاتی داس، سالِ اجرا جنوری ۱۸۷۴ء (ص ۱۵۰)

۲۔ ''سفیر ہند'' امرتسر، ہفتے وار، ۸ ورق اوسط، یوم شنبہ، سالانہ ۱۳ روپے مالک پادری، رجب علی صاحب، از مطبع سفیر ہند پریس، اجرا یکم جنوری ۱۸۷۸ء (ص ۱۵۱) معلوم ہوتا ہے کہ ''سفیر ہند'' امرتسر کا زیرِ نظر اخبار صاحب ''اختر شاہنشاہی'' کی نظر سے گُزرا تھا اور نہ ان کے بعد کسی شخص نے آج تک اس کا حوالہ اپنی کتاب یا مضمون میں دیا ہے۔ خوش قسمتی سے راقم کو اِس نادرالوجود اخبار کے سال بھر کے شمارے جن کی تعداد ۳ر جنوری ۱۸۸۰ء سے ۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء تک ۵۲ کی ہوتی ہے، پروفیسر اکبر حیدری کے ذریعے دستیاب ہوئے۔ اس کا سائز ۳۱×۲۴ سم، دو کالمی، فی کالم ۱۷ سطریں، ضخامت، ۱۶ صفحات، کاغذ چکنا ولایتی، شہر والوں سے سالانہ چندہ، بیرون جات ۱۰ر آنے ''سفیر ہند'' کے ایڈیٹر کا نام ابوسعید مولودی محمد حسین تھا لیکن ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

''سفیر ہند'' نمبر ۲۲ر مئی ۱۸۸۰ء کے شمارے میں کشمیر کے تعلّق سے ایک اہم مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ''ریاست کشمیر اور پنجابی اخبار'' ہے۔ ''پنجابی اخبار'' دراصل کشمیر کے مہاراجہ کے مداحوں میں سے تھا جو مہاراجہ کے ظلم وستم کو ایکس پوز (Expose) کرنے کے بجائے اُن کی کرتوتوں پر پردہ پوشی کرتا تھا۔ اِس اخبار کے برعکس ''سفیر ہند'' کشمیر عوام کا ہمدرد تھا اور ''پنجابی

اخبار'' کی دل کھول کر تنقید کرتا ہے۔ اخبار کشمیریوں کے حق میں لکھتا ہے۔

''لیکن غریب رعایا نے کیا قصور کیا ہے کہ اِن پر ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ یعنی کسی کو چابک مارے جاتے ہیں اور کسی کو ڈنڈے، یا قلیل مزدوری پر انگریزوں کا کام اِن سے لیا جاتا ہے''۔

جولائی ۱۸۸۰ء کے شمارے میں اخبار، نے ایک بار پھر اُن مظالم کو دہرایا ہے جو مہاراجہ کی سرکار نے کشمیریوں پر جاری کئے تھے۔ اخبار ''مہاراجہ صاحب کشمیر اور اُن کی مسلمان رعایا'' عنوان کے تحت لکھتا ہے ''جتنے مسلمان تحصیلدار تھے' وہ موقوف کر دیئے گئے۔ مرزا عزیز الدین' افسرِ وزارت شہرِ خاص جو کہ جناب مرزا غلام محی الدین صاحب' رئیس اعظم کے چھوٹے بھائی تھے اور سرکار کے دلی خیر خواہ اور رعایا کے بہت دادرس، عرصہ ڈیڑھ برس سے بوصفِ منتظم اور دیانت دار ہونے کے عہدۂ مال جنسی (محکمہ خوراک) بھی ان کی تفویض میں تھا، انہوں نے چند متعصبین کے خلاف کارروائی کی تو مہاراجا نے اِنہیں موقوف کیا۔''

اخبار مزید لکھتا ہے:

''جب کہ یہ وزیر صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے موقوف کیا گیا تو قیاس کرنا چاہئے کہ رُوئے زمین کے مسلمان تو اپنے دین پر فخر کریں اور کشمیر میں وہی دین وبال جان و مال ہے''۔

۴/ دکن پنچ

اُردو کا مشہور اخبار ''اَودھ پنچ'' ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء کو منشی سجاد حسین کی زیرِ ادارت پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ چھپتے ہی اس کی شہرت پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے طول وعرض میں متعدد پنچ پیدا ہونے لگے۔

ان میں ''بہار پنچ''، ''بنگال پنچ''، ''بنارس پنچ''، ''پنجاب پنچ''، ''جالندھر پنچ'' ''لاہور پنچ''، ''مدراس پنچ'' ''دکن پنچ'' اور ''اپنچ'' پٹنہ قابل ذکر ہیں لیکن ان میں تین اخبار ''اودھ پنچ''، ''دکن پنچ'' اور ''اپنچ'' ادبی اعتبار سے زیادہ اہم اور مفید ہیں۔ سرِ دست دکن پنچ کی تفصیلات درج جاتی ہیں۔

اختر الدّولہ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر آباد دکن میں ''دکن پنچ'' کے نام سے دو ظریفانہ اَخبار شائع ہوتے تھے۔

۱۔ دکن پنچ:

مدراس باغ حسام الملک، ڈاک خانہ رائے پٹا، ہفتہ وار، ۴ ورق خورد، مالکِ اخبار مرزا قاسم بیگ، مہتمم منشی محی الدین حسین تسنیم از مطبع ہدایت، اجرائے اشتہار یکم جنوری ۱۸۸۵ء۔

۲۔ دکن پنچ:

حیدر آباد، بازارِ رشیدی، عنبر محلّہ گولی گڈھ، ہفتہ وار ۶ ورق اوسط، ۳، ۱۰، ۱۷ اور ۲۴ تاریخ کو چھپتا تھا۔ مالک کشن راو مہتمم عبدالکریم ظریف، ایڈیٹر مولوی غریب الدین، اَز مطبعِ دَکن پنچ۔ اجرا یکم جون ۱۸۸۷ء۔

کشن راوَ کے ''دکن پنچ'' میں کشمیر کے متعلق جو مضمون جولائی ۱۸۸۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے اس کا عنوان ''کشمیر کے بارے میں انکشاف'' کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اخبار سر لیپل کے حوالے سے لکھتا ہے ''کشمیری کے راجا کی مخالفت کے مطلق پَرواہ نہ کرنی چاہیے۔ یہ شخص ہرگز اِس لائق نہ تھا کہ اس کو مسند نشین کیا جائے۔ اس شخص کے والد مجھ سے کہتے تھے کہ مجھ کو اُمید نہیں کہ میرے بڑے فرزند کا چال چلن کبھی درست ہو سکے۔ اس شخص کے دادا

نے جموں کی ریاست کو قائم کیا تھا۔ یہ شخص ریاست کو کھو بیٹھے گا۔ اخبار مزید لکھتا ہے:

"کشمیر یا جموں کی ریاست ڈوگرہ راجپوتوں کی ریاست ہے اور کل کی قائم کی ہوئی ریاست ہے۔ اس ریاست کے اوّل مہاراجا کا نام گلاب سنگھ تھا۔ گلاب سنگھ مہاراجا رنجیت سنگھ، شیرِ پنجاب کے خدمت گار تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے ترقی پائی تھی۔ جب سرکار انگریزی کی سکھوں سے پہلی جنگ ہوئی اس وقت گلاب سنگھ برائے نام راجا کہلاتے تھے اور سکھوں کی طرف سے کشمیر کے صوبیدار تھے۔ اس وقت کے ہندوستان کے گورنر جنرل نے کشمیر اور جموں گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ یہ ملک گلاب سنگھ کو اس رشوت میں دیا گیا تھا کہ وہ سوبراؤن کی لڑائی میں سکھوں کے ساتھ شریک نہ ہوں اور علیٰحدہ رہیں۔ گلاب سنگھ نے اپنا وعدہ وفا کیا، یعنی اِس نے اُپنے آقاؤں کا ساتھ نہ دیا اور لاہور کے قلعے کے خزانے کو لوٹ کر ملک کی قیمت کی بابت سرکار انگریزی کو ایک کروڑ روپے دے دیئے۔ سکھوں کو ستلج دریا کے کنارے پر سخت شکست ہوئی اور اُن کا کام بالکل تمام ہوگیا"۔

اِسی اَخبار کے اگست ۱۸۸۹ء کے شمارے میں صفحہ ۵ پر چار کارٹون ہیں جن میں سے ایک مہاراجا کشمیر کا ہے جو حقہ پی رہے ہیں۔

۴/ سرمُور گزٹ، ناھن:

یہ اخبار منشی سراج الدین احمد کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ منشی صاحب ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک اور ہرفن مولا تھے۔ وہ اَدیب، مصنّف، صحافی، مرتّب اور سماجی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ بیرسٹر بھی تھے۔ وہ سرسید کے حامی، مخلص کارکن اور مددگار تھے۔ اُنہوں نے سرسیّد کے کارناموں کو اُپنے اخباروں کے ذریعے ملک کے طول وعرض میں مشتہر کیا۔ ان کی جملہ تقریروں کو

مرّتب کر کے جلال بخش، سیّد صاحب، مولانا حالی، حاجی اسماعیل خان اور علی گڈھ تحریک کے جُملہ کارکن منشی صاحب کی بڑی قدر کرتے تھے۔

حاجی سید محمد اشرف اختر الدّولہ اپنی مشہور اور نادر کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''اِس اخبار (سرمور گزٹ) کا دُنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی خاص منشا اور اصل غرض یہ ہے کہ ہر معاملے کو رعایا اور گورنمنٹ دونوں کی نظر سے دیکھے اور تاج اور پبلک دونوں کے تعلقات کو مضبوط کرے جس سے موجودہ آزادیاں روز بروز نازک کرتے جاتے ہیں۔ بمقام ناہن، براہِ انبالہ، ہفتہ وار، بروز دوشنبہ سالانہ اجراء یکم مئی ۱۸۸۸ء''۔

اِس اخبار میں بھی کشمیر سے متعلق مضامین اور خبریں اکثر و بیشتر شائع ہوتی تھیں۔ اپریل ۱۸۹۱ء کے شمارے میں اِس اخبار نے ایک مضمون ''کشمیر میں تعلیمی ذوق'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ جس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر میں تعلیمی ذوق آج سے سو سال قبل بھی تھا اِس ضمن میں اخبار لکھتا ہے:

> ''کشمیر کے بھَلے دن آگئے ہیں۔ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ اگر ریاست کشمیر اپنی رعایا کی تعلیم کا خود انتظام کر سکے تو ہرگز کسی خارجی مداخلت کی رائے دینے کے روادار نہ ہوں گے۔ ہماری رائے میں ایک بادشاہ کا اِس سے بڑا کوئی فرض نہیں ہے کہ اپنی رعایا کو تعلیم دے اور حیوان سے انسان بنا دے''۔

اخبار مزید لکھتا ہے:

> ''شیخ ضیاء اللہ صاحب، ہیڈ ماسٹر مدرسہ سرینگر، جن کی محنت اور کوشش کا یہ پہلا ثمرہ ہے، نہایت تعریف کئے جا رہے ہیں اور در حقیقت وہ نہایت تعریف کے مستحق ہیں کہ صرف ایک سال میں ان طالب علموں کو امتحان کے لئے تیار کر کے ایسا عمدہ نتیجہ دکھلایا۔ بلاشبہ کشمیر میں تعلیم کی بنیاد ڈالنے اور ذوق پیدا کرنے کے

واسطے یہ سال ایک عمدہ واقعے کے لئے یادگار رہے گا۔“

۱۵/نومبر ۱۸۹۱ء کے شمارے میں یہی اخبار سرینگر کی ایک مسجد کے بارے میں خبر شائع کرتا ہے جو سکھوں کے وقت میں چھن گئی تھی۔ اِس خبر کو اخبار یوں پیش کرتا ہے:

”کونسل کشمیر نے بڑی دانش مندی کے برتاؤ کے ساتھ مسلمانوں پر احسان کیا اور ان کی دلجوئی کی کہ ایک مسجد واقع سرینگر جو سکھوں کے وقت میں چھن گئی تھی، مسلمانوں کو واپس دی۔ کوئی شک نہیں کہ کشمیر کے واسطے یہ بہت اچھے دن ہیں۔ بہت سے لائق اہلکار ایک عمدہ طاقت سے کام کر رہے ہیں جو راجا اُمر سنگھ صاحب کی نیک نامی کا باعث ہوں گی۔“

”سر مُور گزٹ“ میں مختصر خبریں چھپتی تھیں۔ اِس میں زیادہ تر ادَبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے لکھنے والوں میں سر سیّد، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی محمد شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، حاجی محمد اسماعیل دتاولی، منشی سراج الدین احمد (ایڈیٹر) چودھری خوشی محمد ناظر، مولوی سید ممتاز علی، اکبر الٰہ آبادی، مولانا ذکاء اللہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اخبار ”چودھویں صدی“ منشی سراج الدین احمد کا دُوسرا اخبار ہے جو اخبار ”سر مُور گزٹ“ کے بعد منظر عام پر آیا۔

۵/ماہ نامہ ”**حسن**“ حیدر آباد:

یہ پہلی مرتبہ دکن سے اگست ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا اور اِس کے ایڈیٹر حسن بن عبداللہ، المخاطب نواب عماد نواز جنگ بہادر تھے۔ اُردو رِسالے ”مخزن الفوائد“ (سال اجرا: مئی ۱۸۷۴ء) کے بعد غالباً ”حسن“ دوسرا اعلیٰ معیاری درجے کا رسالہ تھا جس کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اِس کے بہترین لکھنے

والوں کو ایک اشرفی صلے میں نذر کی جاتی تھی۔ اس کے مدیر "حسن" دنیا کے ان نامور لوگوں میں سے تھے جو محض اپنی قوتِ بازو اور جوہر لیاقت سے اونچے سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور اپنے کارناموں کی زندہ مثال چھوڑ گئے۔

"حسن" جلد دوم، نمبر ۷ بابت جولائی ۱۸۸۹ء کے شمارے میں ایک مضمون کشمیر میں طلائی زیور کے بارے میں شائع ہوا ہے جس کا تقابل لکھنؤ، ڈھاکہ اور اورنگ آباد میں مینا کاری کے کام سے کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل "حسن" یوں پیش کرتا ہے:

"کشمیر میں طلائی زیور زیادہ سرخ سونے کا بنتا ہے اور یہی امتیازی رنگ مشہور ہے اس کی چمک دمک اور اس کا نقش و نگار نہایت دل فریب ہوتا ہے۔ کچھ کے نقرئی زیور جو خاص طور سے ہتھوڑوں سے تیار کرتے ہیں وہ اگرچہ اب وہیں کے تصور کئے جاتے ہیں، لیکن بنیاد ڈچ لوگوں سے ہے۔ ایسے ہی کام لکھنؤ اور ڈھاکہ میں بنتے ہیں اور اورنگ آباد میں مینا کاری کا کام نہایت قابلِ تعریف تیار ہوتا ہے"۔

۶/ "**الوقت**" گورکھپور:

اردو کا ایک نادر الوجود اخبار ہے جس کا اجراء ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ "الوقت" کی واحد فائل سالارِ جنگ میوزیم حیدرآباد کے بیش بہا کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اِس میں اُردو کے مشہور و معروف ناول نگار ڈاکٹر نذیر احمد اور لاہور کے نامور اَدیب، شاعر اور صحافی محرم علی چستی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کئے گئے ہیں۔ اخبار میں سر سیّد احمد خان، مولانا حالی، مولانا شبلی، محمد علی جوہر اور چودھری خوشید محمد ناظر وغیرہ کے بارے میں اہم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ دیگر موضوعات کے علاوہ کشمیر سے متعلق خبریں بھی اخبار کی زینت

بنا کرتی تھیں۔

کشمیر ۱۹۹۳ء کے موسم سرما میں شدید سردی کی لپیٹ میں رہا۔ ''الوقت''
اپنے ۱۵؍مارچ کے شمارے میں صفحہ ۶ پر اِس کی تفصیل یوں درج کرتا ہے:

''کشمیر میں اِمسال سردی ایسی سخت پڑی کہ بیان کرتے ہیں کہ سمبت ۱۹۳۶ (۱۸۸۹ء) کے بعد سے یہ دوسرا موسم سرما کا ایسا کڑا ہوا ہے۔ کوچہ و بازار، درو دیوار برف مجسم ہو رہے ہیں۔ مکانوں کے صحن میں چھ چھ گز برف اونچی جم گئی ہے اور ایسا پاکیزہ برف کا فرش معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس پر سفید کپڑے پہن کر لیٹتے پھرے تو کیا مجال کپڑوں پر کہیں داغ تک پڑ جائے یا میلا ہو جائے''۔

سردی کی شدت کے بارے میں اخبار لکھتا ہے:

''دریائے جہلم ۷؍فروری کو ایک فٹ گہرا جم گیا تھا اور اس کے بعد تمام سطح بلوری ہو رہی ہے اور بعض حصوں میں گز بھر سے زیادہ جما ہوا ہے۔ لوگوں کی حالت ناگفتہ بہہ ہے۔ پانی پینے کے لئے گلاس میں رکھا اور کھانا کھانے بیٹھے۔ جب پانی کی ضرورت پڑی تو دیکھا کہ گلاس جم کے قلفی ہو گیا ہے۔ حقّہ تازہ کیا، چلم بھری گئی، دو چار ہی دم لگائے تھے، دفعتاً آواز بند ہو گئی۔ ہر چند کش لگاتے ہیں مگر آواز نہیں آتی، آخر معلوم ہوا کہ جہاں تک پانی ہے وہاں تک جما ہوا ہے۔ جائے ضرورت گئے۔ گرم پانی ساتھ لیتے گئے۔ تھوڑی سی بھی دیر ہو گئی تو پھر وہیں سے ہُوں ہُوں کر رہے ہیں کہ اور پانی آئے تو اُنہیں کیوں کہ لوٹے کا پانی برف کا ڈلا بن گیا تھا۔ غرض کہ عجب مصیبت ہے۔ اِس موسم کی سختی کی وجہ سے چھ سات واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ لوگ راہ چلتے سردی میں ٹھٹھر کے رہ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جان گئی۔''

ایسی ہی خبریں ''سرمُور گزٹ'' کشمیر کے بارے میں اکثر و بیشتر شائع کرتا رہتا تھا جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ کافی معلوماتی بھی ہُوا کرتی

تھیں۔ ۱۶/اگست ۱۸۹۳ء میں اخبار ایک خبر کشمیر میں سیلاب کے تعلّق سے شائع کرتا ہے۔ یہ لکھتا ہے:

"کشمیر میں بَلا کا سیلاب آیا۔ لوگوں کو بچانے کے لئے کشتیاں کام میں لائی جارہی ہیں"۔

یہ اخبار بھی منشی سراج الدین احمد کی ادارت میں ۱۸۹۵ء کی ابتداء میں راولپنڈی سے جاری ہوا۔ اِس اخبار کے ایڈیٹوریل (Editorial) زیادہ تر کشمیریوں سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ بات قابلِ فکر ہے کہ مہارار نبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجا پرتاپ سنگھ ۱۸۸۵ء میں کشمیر کے حکمران ہوئے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ انتظامیہ کی ریاستی کونسل تشکیل دی۔ اس میں کسی مسلمان ممبر کو شاؔمل نہیں کیا۔ اکثریت کے باوجود مسلمانوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ اُن کے حقوق پامال کئے جاتے تھے اور وہ زیادتیوں کا شکار ہورہے تھے۔ اخبار "چودھویں صدی" نے اُن کی دَبی ہوئی آواز کو بلند اور انتظامیہ، خاص کر سورج مل کے سخت گیر رویئے کو طشت اَز بام کیا۔ اخبار اَفسر شاہی کے مظالم کی پُرزور مذمت کرتا تھا اور اَپنے اِداریوں میں کشمیریوں کے حقوق کی ترجمانی زوروشور سے کرتا تھا۔ غرض یہ کہ اخبار "چودھویں صدی" ادبیات کے علاوہ تاریخ کشمیر کے ایک گمشدہ باب کے عینی مشاہدے کی دَستاویز بھی پیش کرتا ہے۔

اخبار کے ۸ جون ۱۸۹۵ء کے شمارے میں صفحہ ۳ تا ۶ پر جو مضمون "کشمیر کے مسلمانو، تمہارا خدا حافظ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو چُن چُن کر کشمیر سے کس بے رحمی اور ناخدا پرستی سے نکالا گیا تھا۔ اخبار موقوف شدہ مسلمانوں کے نام کی فہرست، جن میں کشمیر کے اعلیٰ عہدے

دار مسلمان افسر بھی شامل تھے اِس طرح شائع کرتا ہے۔

خان بہادر میجر کالے خان، گورنر گلگت، عبدالحکیم خان، وزیرِ وزارت گلگت، سیّد عالم شاہ، مہتمم بندوبست کشمیر، شیخ نُورالدین صاحب، تحصیلدار، عبدالرحیم خان، ڈویژنل انجینئر، سلطان احمد، اوورسیر اور متعدد دیگر عہدیداران جن کے نام اِس مضمون میں درج کرنے کے لئے کئی صفحات کی ضرورت ہے۔

اِسی شمارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کی تعداد ازرپورٹ، مردم شماری، ریاست کشمیر، مطبوعہ لاہور، مفیدِ علم پریس ۱۸۹۳ء سے نقل کر کے حسبِ ذیل شائع ہوئی ہے:

صوبۂ جموں	ہندو=۲۳۱۲۲۵،	مسلمان=۵۹۷۴۵۹
صوبۂ کشمیر	ہندو=۶۸۳۱۶،	مسلمان=۸۸۳۰۹۹
لداخ	ہندو=۱۸۲	مسلمان=۲۹۹۱
اُسکردو	ہندو=۶۴	مسلمان=۱۱۰۰۲۲
گِلگت	ہندو=۱۳	مسلمان=۱۳۹
میزان	ہندو=۲۹۹۸۰۰	مسلمان=۱۵۹۳۷۱۰

صوبۂ جموں میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے قریب پونے دولاکھ سے زیادہ ہے اور کشمیر میں تو قریب نَو لاکھ مسلمانوں کی تعداد میں ہندوؤں کی ساٹھ ہزار تعداد، آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

اخبار ''چودھویں صدی'' شمارہ ۲۳ جون ۱۸۹۵ء میں ''نوحۂ دیگر مسلمانان کشمیر'' (۶۹ شعر) از ''غم کدۂ کشمیر'' مرزا سعدالدین صاحب سعؔد، سابقہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر شائع ہوا ہے۔ ذیل میں چند شعر پیش خدمت ہیں:

چہ شود است ایں کہ می بینم دریں دور اَز پریشانی
نہ جائے امن و نے راحت نہ در جائے تن آسانی
مسلمان کشمیر اَز ہجومِ حادثات دہر
ہمہ گریاں، ہمہ نالاں ز قومی مرثیہ خوانی
محمد اکبر و عبدالحکیم و نیز افضل خاں
سراج الدّین و عالم شاہ از جرم مسلمانی
یکے بعدا ز یکے گشتند واپس در پنجاب
ز ہندو یک نہ شد واپس مگر تقدیر ربّانی

آج سے سو سال قبل بھی سرینگر تک ریلوے لائن بچھائے جانے کی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک خبر اخبار ''چودھویں صدی'' بابت ۸ دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی ہے جس کی سُرخی کچھ ایسی ہے:

''سرینگر تک ریلوے لائن''

اِس ضمن میں اخبار لکھتا ہے:

> ''ریاست کشمیر نے سرینگر تک ریلوے بنائے جانے کی تجویز گورنمنٹ کو پیش کر دی ہے۔ دَربار نے اس کام میں تساہل برتا ہے اور ابھی معلوم نہیں کہ یہ تجویز پوری پوری شکل کب اختیار کرے گی''۔

بہر حال سو سال بعد ہی سہی، ریلوے لائن پر کام تو شروع ہو چکا ہے لیکن ریل سرینگر کب پہنچ گئی یہ وثوق کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے۔ فی الحال ہم اِتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ:

''دیر آید درست آید''

☆☆☆

موتی لال ساقی

وید، مہابھارت پُران اور کشمیر

تواریخ کا مطالعہ نظر اور علم میں وسعت کے علاوہ، مشاہدے اور تواریخ سے وابستہ دیگر شعبوں کی گہری اور وسیع جانکاری کا تقاضا کرتا ہے۔ جو باتیں ہمیں کُتب بینی سے حاصل نہیں ہوتیں اُن کا سُراغ ہمیں لوک اُدب، زبان، رَسوم ورواج اور مختلف روایتیں اور رُسُومات دیتے ہیں۔ اِس طرح ایسی بہت سی گھتیاں سُلجھ جاتی ہیں جو کتابوں کے گہرے مطالعے کے باوجود سلجھنی ناممکن ہوتی ہیں۔ بات واضح ہے کہ جو اہم باتیں مورّخ سے چھُوٹ جاتی ہیں اُن کو عوامی ذہن اور تخیّل سنبھال کے رکھتا ہے۔ یہی حقیقت سامنے رکھ کر مجھے محمد یوسف ٹینگ کا یہ کہنا بامعنی اور وزن دار لگتا ہے کہ کسی علاقے کی تواریخ کے ساتھ وہی شخص انصاف کرسکتا ہے جس کی جڑیں وہاں کی زمین میں گہری ہوں۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مورّخ اُس علاقے اور لوگوں کے تہذیبی اور تمدّنی سفر کے علاوہ وہاں کے جغرافیہ، زبان، اُدب، لوک اَدب، سماجی زندگی وغیرہ سے پوری طرح واقف ہونا چاہئے جس علاقے کی تواریخ

اُس نے مرتّب کی ہو۔ اِس کے ساتھ ہی مورّخ کا گروہ بندی سے بالاتر ہونا بھی ضروری ہے۔ لکھتے وقت اُسے اُپنے عقاید سے بالاتر ہونا چاہئے اور واقعات کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔ اس کے نتائج واقعات کی سطح پر مضبوطی کے ساتھ بندھے ٹکے ہوں۔ ذاتی پسند یا ناپسند کا تواریخ نویسی میں کوئی دخل نہیں۔

اکثر صورتوں میں اُگلے وقتوں میں عقیدے، تواریخ پر غالب ہوتے تھے جس وجہ سے تواریخیں صحیفہ نویسی کے نمونے بن گئیں ہیں۔ تمہید تھوڑی لمبی ہوگئی ہے لیکن مجبوری کا کیا کیا جائے کہ کشمیر کے بارے جو بے شمار کتابیں آج تک لکھی گئیں ہے اُن میں سے اکثر کتابوں میں تحقیق کا مادّہ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔ سہل اُنگاری نے اِن کتابوں کو داغدار بنادیا ہے۔ لکھنے والے کا ذاتی عقیدہ تحقیق و تجسّس پر غالب ہوتا دکھائی دیتا ہے، چاہے وہ کلہن ہو یا حسن کھویہامی ۔ بیربل کاچرو ہو یا اعظم دیدمری، کشمیری تمدّن کے ساتھ وابستگی نہ ہونے کی وجہ سے سراَرل سٹین جیسے عظیم محقّق کے پاؤں بھی ڈگمگا گئے ہیں۔ جہاں تک کشمیر کی تواریخ کے ویدی، رَزمیہ اور پورانی منبعوں کا سوال ہے، اکثر تواریخ نویسوں نے وہی بات بار بار دہرائی ہے جو پہلے نیل مت اور بعد میں راج ترنگنی میں درج ہے۔ ستی سر سے بات شروع کر کے سیدھے گونند تک پہنچائی جاتی ہے۔ بیچ کا جو ہزاروں سال کا وقفہ ہے اُس کا کیا کیا جائے؟ قدیم مورّخوں کی بات ہی نہیں آج کل کے مورخوں نے بھی یہ تکلیف برداشت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ اِشارہ ہی کرتے کہ مختلف شہادتیں کِس نتیجے پر پہنچاتی ہیں کہ بیچ کا جو وقت ہے اس کے بارے

میں کوئی حتمی چیز سامنے آسکے اور یہ افسوسناک اَمر ہے کہ اِس حقیقت سے آنکھیں چُرانا موجودہ دَور میں تحقیق کی رُوح کے منافی ہے۔ تبھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کشمیر میں آج تک تالیف کی گئیں اکثر تواریخی کتب صحیفہ نگاری یا داستان گوئی کے دائرے سے باہر نہیں آسکی ہیں۔

ستی سر کے اسطور کو ماہرینِ اَرضیات نے توڑ دیا ہے اور قبل از تاریخ دَور کو آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے بہت حد تک سامنے لایا ہے۔ اِتنا کچھ ہونے کے باوجود ابھی بھی ہمارے بعض تواریخ نویس لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ یہ بات باعثِ تعجب ہے کہ کشمیر کی تواریخ کا جائزہ لینے والے موؔرخوں نے دستیاب تواریخی حوالوں سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ چینی اور یونانی ماخذ تو دُور کی بات ہیں، ملکی حوالوں سے بھی واقف نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ماضی کے بارے میں بہت سی باتیں پوشیدہ ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ آریوں کی قدیم ترین کتاب رِگ وید میں کہیں بھی نام لیکر کشمیر کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور اِسی وید کے دسویں منڈل میں نام لے کر کشمیر کے دریاؤں کا تذکرہ ہے اور کسی بھی موّرخ نے اِس حوالے کا نام بھی نہیں لیا ہے۔ رگ وید کا حوالہ بہت ہی اہم ہے۔ اس کے طفیل کشمیر کی تواریخ کا وہ دَور آنکھوں کے سامنے آتا ہے جس کے متعلق دستیاب تواریخوں میں کوئی بھی تفصیل درج نہیں۔ منڈل میں شامل شلوک یوں ہے۔

''ہے گنگائے، یمنائے سرسوتی، ستودری (ستلج) پروشنی (ایراوتی، راوی) میری آرادھنا قبول کر۔ اِسکنی (اسکن۔چناب) سمیت سُن، مرڈواڈھا اور وتستا کے ساتھ سُن۔ ارنگیا سوشما کے ساتھ''

رِگ وید کا یہ حمدیہ اقتباس سے بہت اہم ہے کہ اِس میں جن دریاؤں کا نام لیا گیا ہے، ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود اِن میں سے اکثر کے نام ابھی بھی ویسے ہی ہیں لگتا ہے کہ جب یہ بھجن تخلیق کیا گیا ہے اُس وقت مختلف آریہ قبیلے گنگا اور جمنا کے اِس پار تھے اور اس علاقے کے محل وقوع اور وسعت وپھیلاؤ اُن کے زیرِ نظر تھا۔ اُس وقت آریہ خانہ بدوشی اور مستقل بستیاں قائم کرنے کے عبوری دَور میں تھے۔ تہذیبی اعتبار سے لگتا ہے کہ پُرانے بسکینوں کو بھگا کے یا زیر کر کے وہ ثابت قدمی سے اُپنے قدم جمار ہے تھے اور جو ہڑپا تہذیب موجودہ ہریانہ بلکہ اس سے بھی آگے پہنچی ہوئی تھی اس کے ملبے پر آریہ ایک نیا تمدّن تعمیر کرنے میں جُٹے ہوئے تھے۔ آریہ بنیادی طور خانہ بدوش تھے مگر ہڑّپا تہذیب کے بانی کار مستقل بستیوں میں رہنے والے تھے۔ اِس بات کا اعادہ شاید غلط نہیں کہ پُرانی بستیوں کو دیکھ کر ہی آریوں کو مستقل بستیاں قائم کرنے کا خیال آیا ہو اور جس تہذیب کو ہم ویدک تہذیب کہتے ہیں اُس کو سنوارنے سنبھالنے میں قدیم ہڑپا تہذیب کا حصہ اُتنا ہی اہم ہو جتنا کہ خود آریوں کا رہا ہے، جو اُس تہذیب کے بانی کار مانے جاتے ہیں۔ اُس دور کے آریہ کیسے خانہ بدوش اور مستقل آبادی کے عبوری دَور میں رہ رہے ہوں گے، اِس کا پتہ ندی استوتی میں دَرج مرڈ واڈھا دریا کے ذکر سے لگتا ہے۔ یہ نالہ مڑواہ اور وارڈون علاقے کا تمام پانی جمع کر کے کشتواڑ کے نزدیک چناب کے ساتھ جا ملتا ہے۔ اگر آریہ خانہ بدوش اُپنے مال مویشی کے ہمراہ چراگاہوں کی تلاش میں اس علاقے میں نہ آئے ہوتے تو اس پہاڑی نالہ کا ذکر رِگ وید میں آنا ناممکن تھا۔ آج بھی ہمارے شہروں اور قصبوں میں رہنے والے پڑھے

لکھے لوگوں کو سارے کشمیر کا کیا، کشمیر کا اکثر حصّہ، نالے اور مرگیں زیرِ نظر نہیں۔
رِگ وید میں درج اِس دریا کا ذکر نیل مت پُران کی اُس اسطوری روایت کو بھی معنی بخشتا ہے جس کے مطابق چندر دیو کے وقت تک آریہ جاتی کے لوگ گرمیوں میں یہاں آتے تھے اور سردیوں میں پہاڑوں سے واپس چلے جاتے۔ اُس زمانے میں بھی لگتا ہے کہ آریوں نے کشمیر کا چپّہ چپّہ چھان مارا تھا۔ اپنا مال مویشی لے کر یہ خانہ بدوش اُونچی چراگاہوں کا رُخ کرتے۔ اِسی کے ساتھ ایک اور سچائی بھی ہے کہ یہ وادی کشپ مَر وغیرہ کے نام سے مشہور نہیں تھی۔ جہاں کشمیر کے دریاؤں کا ذکر رِگ وید میں آیا ہے وہاں اُس علاقے کا نام اِس میں کیوں نہیں آتا جہاں سے یہ دَریا اُبل پڑتے۔ ''ندی استوتی'' میں نہ سہی کسی دُوسرے شلوک میں علاقے کا نام ضرور آیا ہوں۔

نیل مت پوران، اَندازے کے مطابق، ساتویں صدی عیسوی میں لِکھا گیا ہے جب کہ رِگ وید ۲۵۰۰ ق-م سے ۱۴۰۰ ق م کے درمیان تخلیق ہونا مانا گیا ہے۔ حالانکہ تازہ تحقیق رِگ وید کو ۲۰۰۰-ق-م کا گردانتا ہے۔ نیل پوران کی روایت کم وبیش ساڑھے تین سے چار ہزار سال پرانی اُس حقیقت کی طرف اِشارہ کرتی ہے جو اُسطور کا جامہ پہن کر لوک روایات نے محفوظ رکھا اور اَب اس کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔

اگر رِگ وید میں فقط وتستا کا نام آیا ہوتا تو اِسے اِتفاق مانا جا سکتا تھا۔ حالانکہ ہزاروں برس اِس نام کا موجود رہنا اِس اندازے میں بھی حائل ہو سکتا ہے ''ندی اُستوتی'' میں اس نام کا شامل ہونا بہت ہی اہم ہے مگر اس کے ساتھ ہی حمد میں اسکنی کا نام بھی آیا ہے۔ اس دریا کا ایک اور نام چندر بھاگا (چاندکا

عکس ہے اور سکنی چناب کا ویدک نام ہے جس کا ''کالا'' ہونا معنی لئے جاتے ہیں۔اِسی دریا کی یونانی صورت اسکنس یعنی سکندر کو دریا کے پار ے جانے کی ہے۔مگر بنیادی طور خود اسکنس بھی اسکنی نام کی یونانی صورت ہے۔

چناب کو کیوں ویدک شاعروں نے اسکنی کام دیا ہے۔اِس کے سرچشمے تک وہی پہنچ سکتا ہے جس نے یہ دریا گھنے جنگلوں کے بیچ بہتے ہوئے دیکھا ہو۔اِس سارے علاقے میں گھنے جنگلوں کا سایہ چناب کے بدن کو کچھ کچھ کالا سا دِکھاتا ہے اور یُوں اِس دَریا کا پانی بظاہر کالا نظر آتا ہے۔

چناب کو ویدک شاعر کا اسکنی نام دینا بہت ہی معنی خیز ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس شاعر نے یہ نام دیا ہے وہ اُس سارے علاقے سے باخبر رہا ہوگا جہاں سے یہ دریا بہتا ہے۔اُس زمانے میں اِس دُور دَراز علاقے کا جائزہ لینا آریوں کا کشمیر اور اس کے گردونواح کے علاقے پر گہری نظر رکھنے کا عندیہ دیتا ہے۔اِتنا ہی کیوں، وتستا اور چندر بھاگا کیساتھ ملنے والا ایسا ہی ایک پہاڑی نالہ ویدک دور کا مڑواڑہا ہے۔یہ نالہ کشتواڑ علاقے میں چناب میں جا گرتا ہے۔ سروے نقشے میں اِس نالے کا نام مڑواہ 'واڑ وَن درج ہے جب کہ عام لوگ اسے مڑواہ وادی کہتے ہیں۔اُپنے لگ بھگ ۱۶۰ کلومیٹر لمبے سفر میں یہ نالہ اَمر ناتھ سے نُن کُن چوٹی تک کا تمام برفیلا پانی جمع کر کے چناب میں جاتا ہے۔

ویدوں میں اِس نالے کا ذکر ظاہر کرتا ہے کہ گلہ بانی کے دوران آریہ کن دشوار گذار پہاڑوں میں گھُوما کرتے تھے۔کشمیر میں آئی لِسانی تبدیلی کی وجہ سے شہری علاقوں میں ''ڈ'' ''ر'' بن گیا ہے۔مڑواہ وادی کا ذکر کرتے ہوئے سٹین لکھتا ہے۔

"اِس بات پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ مڑواہ اور واڈوَن جو اِس وادی کا نام ہے اِس کا صوتیات کی بنیاد پر ویدک مرڈواڈھا نام سے زبردست مماثلت ہے۔ راج ترنگنی میں اگرچہ اس نالے کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے مگر صوتیاتی مماثلت اس کا مبدل ہے۔ لفظ وَن، ایک طرف چھوڑ کے مرڈ لفظ کا تلفظ مڑواہ اور واڑ ڈاڈھ لفظ کا بدلا ہُوا رُوپ ہے جو کشمیری لِسانی قاعدوں کے مطابق ہوتا ہے۔"

سٹائین خود مڑواہ نہیں گیا ہے نہیں تو اُس نے نالے نام براہِ راست مڑواہ سندھ لکھا ہوتا اور اُسے وَن لفظ پر بحث نہیں کرنا پڑتی۔ وَن بہت سے الفاظ کے بعد میں آتا ہے۔ مثلاً کایہ وَن، رُوپ وَن، ڈنڈک وَن وغیرہ۔ جہاں تک سندھ لفظ کا تعلق ہے اِس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ رگِ وید کے بعض شلوکوں میں سندھ مطلب سمندر ہوسکتا ہے۔ مگر معنی میں تبدیلی جغرافیائی حالات زیرِ نظر رکھ کر سمجھ میں آسکتی ہے اِیسی بھی جگہیں ہیں جہاں لوگ اصلی سندھ کو تیر کر پار کرتے ہیں بعض مقامات پر سندھ اتنی چوڑی ہے کہ اس کے کنارے پر کھڑا یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہتا ہے کہ کنارے کھڑا ہے یا سمندر کے کنارے۔ میکس مُولر کے مطابق سندھ لفظ کے معنی تقسیم کرنا یا کانٹے والا یا حفاظت کرنے والے اور سامنا کرنے والا ہے۔ اِس لفظ کا اصل "سدھ" یعنی دُور رکھنا یا پیچھے رکھنا ہے۔ یہ لفظ پہلے نر تھا اور بعد میں مادہ بن گیا۔ چنانچہ قدیم آریہ بستیوں کا ہندوستان میں عام نام سپت سندھ یعنی سات دریاؤں کا علاقہ تھا۔ اگرچہ دیگر دریاؤں کو بھی اَلقاب کی رُو سے سندھ کہا گیا ہے لیکن ہندوستان کی تواریخ میں یہ سب بڑے دریا کی بابت مخصوص رہا۔

اِن سات دریاؤں میں پنجاب کے پانچ دریا بھی شامل تھے۔ کشمیر کے معاملے میں سندھ دریا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک ایسا سیلابی دریا جس کو پار کرنا مشکل ہے اور جب وہ غضبناک ہو جاتا ہے تو سب کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔

سندھ لفظ کی بعض اور تاویلیں بھی کی گئیں ہیں۔ آریہ ورت کا ہندوستان نام پڑنے کی وجہ یہی دریا ہے۔ سندھ لفظ کے معنی کالا، چوری کرنا بالکل گمراہ کن ہے جو بہت سی جگہوں پر نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سند علاقے کے ہمسایہ لوگ ایرانی بولتے تھے جو ''س'' کا تلفظ ''ہ'' کرتے تھے۔ اس طرح سندھو، ہندھو بن گیا جو بگڑتے بگڑتے ہندو بن گیا۔

رگ وید کے ندآستوتی بھجن میں کشمیر کے تین اور اگر 'سندھ' بھی شامل کیا جائے تو چار دریاؤں کا شامل ہونا ثابت کرتا ہے کہ وید کی زمانے کے لوگوں نہ صرف کشمیر کے سرسری پہچان تھی بلکہ اس علاقے کی جغرافیائی صورت حال کی بھی علمیت تھی جسے آج کل کشمیر کہتے ہیں اور اگر سیاسی اصطلاحات میں بات کی جائے تو آج کی جموں وکشمیر ریاست سے وسیع علاقہ تھا۔ کشمیر کے ساتھ اُن کا یہ تعلّق اور وابستگی ہر دُور میں قائم رہا ہے۔ باتوں باتوں میں یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ کشمیر اُس جغرافیائی خطے کا حصّہ تھا جسے سپت سندھو یعنی سات دریاؤں کا علاقہ کہا گیا ہے۔ بات کو مزید واضح کرنے کیلئے ویدک دُور کا سپت سندھو وہ علاقہ تھا جسے ندآستوتی میں درج سات بڑے دریا سیراب کرتے تھے۔ آر۔ این۔ سلنور سپت سندھو کے دریاؤں میں گنگا، جمنا سرسوتی، ستلج، راوی اور چناب گنتا ہے لیکن اُسے سندھ اور وتستا کا نام بھُول گیا ہے حالانکہ اس کا اشارہ خود ندِ آستوتی دیتی ہے اور جغرافیائی اصطلاح پنج ند

(پنجِ آب) جس کا نام بعد میں پنجاب پڑ گیا۔ اسی طرح ایس۔سی۔رے کا یہ کہنا عجیب لگتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ویدوں میں مڑواہ، واڑ وَن کا ذکر نہیں۔ لگتا ہے کہ دونوں فاضل دوستوں نے خود وید دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اِسی لئے اُن کی نظر اصل سے بھٹک گئی ہے۔ ندا ُستوتی، راج ترنگنی مرتب کرتے وقت مارک اُرل سٹین کے زیرِ نظر نہیں رہی ہے۔ لیکن یہ کمی اُس نے تب پوری کی جب اُس نے ۱۹۲۱ء میں ندا ُستوتی کی بنیاد پر Some River Names in Rigveda نامی ایک چھوٹا سا کتابچہ شائع کیا۔

ویدک دَور سے ہی کشمیر کے ساتھ آریوں کے تعلق کی صراحت بعض دوسری چیزیں بھی کرتے ہیں جن کی شہادت کشمیری زبان اور بعض کشمیری رسوم ورواج دیتے ہیں۔ یہ ایسی شہادتیں ہیں جن کی تہہ تک پہنچنا اگرچہ ناممکن نہیں کیا جاسکتا لیکن مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ اِسی بے خبری کی وجہ سے اکثر مورّخ کشمیر کی تواریخ کی مختلف اُلجھیں سُلجھا نہیں سکے ہیں اور کشمیری مورّخوں نے بھی معاملہ فہمی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

سب سے پہلے ہم کشمیری زبان کا تذکرہ چھیڑتے ہیں جس کے متعلق بہت سے نظریات ہیں اور اکثریت اِس بات پر متفق ہے کہ بنیادی طور اس کا تعلق پشاچ زبانوں کے خاندان سے ہے۔ پشاچ نام سُن کر چونکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پشاچ بھی بنیادی طور آریہ تھے۔ عالموں کا خیال ہے کہ میدانی علاقوں میں رہنے والے آریہ، پہاڑی علاقوں میں رہنے والے آریوں کو غیر مہذب

جان کر پشاچ کہتے تھے ۔ دراصل پہاڑوں میں رہنے والے آریہ زیادہ جفاکش اور سرکش تھے اور وہ میدانی علاقوں میں رہنے والے آریوں کی برتری تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے جس وجہ سے پشاچ کہہ کر اُن سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے آریہ پہلے آئے تھے اور میدانی علاقوں میں رہنے والے ذرا دیر میں ۔ خیر یہ طویل قصہ ہے اسلئے اصلی موضوع کی طرف لوٹ آتے ہیں اِس بات سے کوئی بھی جانکار شخص انکار نہیں کرسکتا کہ کشمیری سرمایہ الفاظ میں ایسے الفاظ کی اچھی خاصی تعداد ہے جو اَب بھی کم وبیش ویدک صورت میں موجود ہیں ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ناخواندہ کشمیری کی زبان پر ہوتے ہیں ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ الفاظ ہزاروں برسوں سے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں ۔ عام بول چال کے الفاظ ہونے کی وجہ سے نہ اِن کو سنسکرت مٹا سکا اور نہ فارسی ۔ یہاں سوال کیا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ سنسکرت سے کشمیری میں آئے ہوں گے مگر خود سنسکرت میں ان الفاظ کی صورت بگڑ گئی اور تبدیل ہوئی ہے ۔ الفاظ کا اپنی اصل حالت میں کشمیری کا حصہ ہونا بیّن ثبوت ہے کہ کشمیر سپت سندھو کا حصّہ رہا ہے ۔ کشمیری میں مروّج تمام ویدک الفاظ کا درج کرنا ممکن اور مناسب نہیں لیکن حوالے کیلئے میں بعض الفاظ یہاں درج کرتا ہوں ...... درج، پُور، دُرگ، کھل، گُلال، دھانیہ (کشمیری دَھان) کول، مُسر، منڈل، واکھ، کھار، گندھر، شتہ، مون، سب، ارُن (کشمیری دُرن) دِج، ہان وغیرہ بات چل ہی رہی ہے اور مجھے یاد آیا کہ کشمیری میں بہت سے آسٹرک الفاظ موجود ہیں ۔ آسٹرک وہ لوگ ہیں جنہیں سنسکرت کتابوں میں نشاد نام دیا گیا ہے ۔ آسٹرکوں کے متعلق

اس بات کو دہرانا مناسب ہے کہ کھش اور آسٹرک مغربی راستے سے آریوں سے قبل ہندوستان آئے۔ اس کے بعد جب آریہ اکثریت میں ہو گئے تو انہوں نے اِن دونوں ذاتوں کو بھگا دیا اور بہت سے آگے کے علاقے میں چلے گئے۔ کشمیری اُل، وانگن، وڑن وغیرہ الفاظ اصل میں آسٹرک ہیں۔ لفظوں کا جائزہ بعض دوستوں کو یہ سوال کرنے پر مجبور کر سکتا ہے کہ بعض الفاظ کا کسی زبان میں ہونے کو تواریخ سے کیسے جوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات جاننی لازمی ہے کہ زبان آپس زمانے کا مکمل ریکارڈ ہے جب لکھنا پڑھنا رائج نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ویدوں کی زبان بنیاد بنا کر یہ حقیقت مترشح ہو جاتی ہے کہ آریہ اُس عظیم خاندان کا حصّہ رہے ہیں جو خاندان ایران اور یونان سمیت ہندوستان اور سارے یورپ میں اِس وقت آباد ہے۔ نسلیات کے سب سے مشکل معاملے سُلجھانے میں زبان ایک ایسا ثبوت فراہم کرتی ہے جس کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ زبان صرف ذریعۂ اظہار ہی نہیں بلکہ مختلف تمدّنی، نسلی، تواریخی اور سماجی مسائل کو حل کرنے میں زبان کلیدی رول اُدا کرتی ہے۔ کشمیری بُرز (بھوج پتر) اور روسی بیرز ہم معنی الفاظ ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی رُوسی اور کشمیری ایک ہی خاندان کے فرد اور ایک ہی درخت کے پھل رہے ہیں۔

ہمارے کشمیر میں تسلیم شدہ اُصول ہے کہ باپ کی وراثت بیٹے کو ملتی ہے نہ کہ بیٹی کو۔ بیٹی صرف اُسی حالت میں وراثت کی حقدار ہوتی ہے جب باپ کے اولادِ نرینہ نہ ہوں۔ اِسی طرح متبنّیٰ بنانے کی رسم ہمارے سماج میں آج بھی جائز ہے اور مروّج بھی۔ یہ سماجی قوانین ویدک زمانے سے قبل آج تک ہماری عام سماجی زندگی کا حصّہ رہے ہیں۔ کشمیر میں اگرچہ کئی سو برس قبل اکثریت نے

اسلام قبول کیا اسکے باوجود یہ رسومات اور سماجی قوانین مسلمانوں میں ایک زندہ حقیقت ہیں۔ اِسی طرح گھر داماد بنانا بھی بہت ہی قدیم روایت ہے۔ یہ ایک ہندو رسم ہے جو کشمیر میں یکساں طور مروّج ہے۔

مہابھارت، شمالی ہندوستان کا مہا کاویہ (رزمیہ) ہے جب کہ رامائن، وسطی مشرقی اور جنوبی ہندوستان کے بارے میں ہماری جانکاری میں کافی اضافہ کرتا ہے۔ مہابھارت کے مطابق ناگ، کدرو کے بچے ہیں اور کشمیر کا کشپ کی نسبت کشپر یا کشپ مر نام پڑا۔ اِس طرح کشمیر وجود میں آنے کے اَسطور کا مہابھارت سے سیدھا مَیل ہے۔ کیونکہ گرڈ کے خوف سے ناگ، ستی سر میں چھُپنے کیلئے آئے تھے۔ اِس اسطور کے پیچھے جو نسلی تصادم کام کرتا ہے وہ اُس نسلی تصادم کا اسطور ہے جو ہزاروں برس سے ذہنوں میں پلتا رہا اور یہ عیاں کرتا ہے کہ رزمیہ کال میں کروکشیتر کی جنگ میں کشمیر کے راجاؤں نے کوروُں کی طرف داری کی۔ اس بات کا اِشارہ کلہن نے کسی تفصیل کے بغیر کیا ہے۔ ساتھ ہی بعض دیگر ذرائع بھی اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ کشمیر کے ہمسایہ اُبھیسار کے (پونچھ اور جموں علاقہ) کے راجاؤں نے بھی اِس جنگ میں کوروُں کا ساتھ دیا۔ کشمیر کے راجہ کو فوج کے ساتھ اِن ہی علاقوں سے ہو کے گُزرنا تھا جس سے عندیہ ملتا ہے کہ شمال مغرب کے اِن راجاؤں نے مِل کر کوروُں کا ساتھ دیا ہوگا۔ اِس طرح کلہن کے بیان میں صداقت کی کِرن نظر آتی ہے۔ خود مہابھارت میں بھی کشمیریوں کا ذکر ''کھشر'' نام سے ہوا ہے جو ''کشمیری'' لفظ کے بہت قریب ہے۔ مہابھارت کے بعد پانِنی اور پاتنجلی نے بھی اس طرح کشمیر اور کشمیریوں کا نام لیا ہے۔ یہ وہی ہیں جن کو یونانی،

کشمیری لکھتے ہیں۔ مہابھارت میں کشمیر کا نام جنگ ختم ہو کے یدھشٹر کی تاجپوشی کے موقعے پر بھی آیا ہے جب کشمیر کے ہمسایہ ایک راجہ نے پانڈوؤں کو سونا بطورِ تحفہ پیش کیا۔اس سونے کو پلیکا سونے کا نام دیا گیا ہے یعنی وہ سونا جو چیونٹیوں نے کھودا تھا۔ ایسا سونا پچھلے زمانے میں سندھ کے بالائی علاقے میں جمع کیا جاتا تھا۔اسی طرح نام لئے بغیر یہ بھی کہا گیا ہے کہ شمالی علاقوں کے راجاؤں نے یدھشٹر کو ایک شال نذر کی تھی۔ یہ راجے گاندھار۔یا کشمیر جن پد کے رہے ہوں گے۔ کیونکہ یہی علاقہ بہت پہلے ان اشیاء کے لئے مشہور رہا ہے، اور کشمیر کا بھرت ورش کے ساتھ قریبی تعلّق رہا ہے۔ مہابھارت میں جن مختلف ناگ راجاؤں کے نام آتے ہیں ان کے ناموں سے منسوب بہت سے مقامات آج بھی کشمیر میں موجود ہیں۔

مہابھارت ہندوستان کی قدیم زندگی کے متعلق اپنی نوعیت کا واحد انسائیکلو پیڈیا ہے۔اِسی لئے کہا جاتا ہے کہ جو بات مہابھارت میں نہیں وہ کسی اور جگہ نہیں ہو سکتی۔اِس کے اندر اگرچہ مختلف شعبوں کے حوالے دیئے گئے ہیں لیکن یہ حوالے ایک تواریخی تسلسل اور ایک باقاعدگی سامنے لانے میں مدد کرتا ہے۔ مہابھارت مہاتما بدھ سے قبل تخلیق کیا گیا۔بعض محققّین اِس کی تخلیق کا زمانہ مسیح سے قبل چھٹی صدی اور بعض دسویں سے بارھویں صدی مانتے ہیں۔اِس طرح مہابھارت میں آئے دَور آج سے قبل اڑھائی ہزار برس قبل سے زیادہ زمانے کا اشارہ دیتے ہیں اور واقعات بیان کرتے ہیں۔

''سبھاپرون'' باب میں ہے کہ راجے کو شمال مغربی علاقے کے ایک راجہ نے ایسا دھاگہ پیش کیا جو کیڑوں نے تیار کیا تھا۔ یہ دھاگہ صرف ریشم

ہوسکتا ہے اور شمال مغربی علاقے میں کشمیر کے بغیر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ریشم تیار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ریشم کا سرچشمہ چین تسلیم کیا جاتا ہے لیکن لگتا ہے کہ ریشم چین سے کسی زمانے میں کشمیر آیا ہوگا یا ریشم، زعفران کی طرح اپنی چیز رہی ہے۔

جھیل وُلر کے بارے میں بھی مہابھارت میں ایک بلاواسطہ حوالہ ملتا ہے۔ سُپرنہ ادھیائے میں واضح طور لکھا گیا ہے کہ مہاپدم ناگ چوٹی پر ایک بڑی جھیل میں رہنے ۔۔۔۔۔۔ کیلئے گیا۔ بات واضح ہے کہ ہندوستان کیا، سارے ایشیاء میں وُلر سب سے بڑی جھیل ہے۔ کلہن بھی لکھتا ہے کہ گرڈ کے خوف سے ناگ شنگھ پدم سر میں پناہ گزین ہوگئے۔ یہ وہی ناگ ہیں جن کا ذکر سُپرنہ ادھیائے میں شدھا اور پدم نام سے آیا ہے۔ دُوگل لکھتا ہے کہ پدم ناگ وہی ہے جسے مہاپدم کہا گیا ہے اور جو وُلر کا نگہبان ہے یَر کا ذکر پورانوں میں بھی ہوا ہے۔ بات کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر ایس-اے- ڈانگے لکھتے ہیں۔ "جس جھیل کا ذکر پدم ناگ سرس یا مہاپدم ناگ سرس نام سے ہوا ہے، یہ وہی جھیل ہے جو کشمیر کی پہاڑی وادی میں ہے"

اِسی طرح مہابھارت میں زعفران کا ذکر بھی آیا ہے جو ابتدائے آفرینش سے کشمیر سے مخصوص ہے۔ کشمیر میں اُگائی جانی والی چیزوں اور وُلر کا بلاواسطہ ذکر ظاہر کرتا ہے کہ رزمیہ دَور میں کشمیر کا دیگر ممالک کے ساتھ رابطہ اور بھی استوار ہوا ہے اور کشمیر کا آج کا نام رَزمیہ دَور اور پانِنی کے وقت بھی مرّوج تھا۔ ایک اور روایت دہرانے کے قابل ہے کہ پشوپت مت کا ذکر مہابھارت میں بھی آیا ہے اور ایک زمانے میں یہی فِقت کشمیر میں بھی مرّوج رہا ہے جس کے بعد آٹھویں صدی عیسوی میں اس نے تَرک شاستر کا روپ اختیار کیا۔

سرشٹی شانتر پرناگ ارجن کے شنی واداور مول سرواستہ وادن کا بھی گہرا اثر ہے جس پر اس وقت بات کرنے کی گنجائش نہیں۔ مہار بھارت میں شامل تمثیل کے مطابق شیو پت مت کا پرچار پہلے شوشری کنٹھ نے کیا ہے اور دلچسپ بات ہے کہ شومت کے بانی کاراور شیوآگمن کا تعلق بھی شری کنٹھ کے ساتھ ہے۔

وایوپوران میں کشمیر کا ذکر یہ کہہ کے کیا گیا ہے ''کشمیرا (یعنی کشمیر) شمالی علاقوں کی قوموں میں شامل ہیں۔'' وشنو پُوران میں کشمیرا نام سے کشمیریوں کا ذکر کنک گن، تیل براسن، سیمرن، موہومت، سکندکن، سندھو ساور، گاندھار، درشک، ابھیسار، اُتل، شوالہ اور بالکا کے درمیان ہوا ہے۔ جن مختلف قوموں اور قبیلوں کا ذکر آیا ہے، اُن تمام کی نشاندہی نہیں ہو سکی ہے لیکن بعض کے متعلق تفصیلات یوں ہیں۔ سندھو ساور' پنجاب میں سندھ پر بستے تھے۔ انہوں نے مہابھارت کی جنگ میں خاص حصہ لیا ہے۔ گاندھاری شمال مغربی علاقوں کے بسکین تھے۔ اِن کا کشمیر کے ساتھ خاص تعلق رہا ہے۔ ایک وقت گاندھار کشمیر کا جن پد تھا۔

درشک وہ لوگ ہیں جن کا ذکر داور نام سے بھی کیا جاتا تھا۔ یہ پونچھ سے اُدھر جموں علاقے میں رہتے تھے۔ اکثر درشکوں اور داوروں کا ذکر ابھیسار، مرکب لفظ کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ ابھیساری پونچھ علاقے کے بسکین ہیں۔ مہابھارت اور اُپنشد میں یہ علاقہ گھوڑوں کے لئے نہایت مشہور مانا گیا ہے۔ ارجن کی دِگ وجے میں اِس علاقے کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہاں پہنچنا نہایت مشکل ہے۔ وِشنو پُوران کا ایک پیراگراف مہابھارت سے

لیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کشمیریوں کے ہمسایہ گُلٹا، ہُن، پارشک اور وامن جیسے غیر مہذّب اور خوفناک لوگ رہتے ہیں۔ اُن کے اندر پارشکوں کے متعلق خیال ہے کہ یہ یا تو فارس کے رہنے والے تھے یا وہ لوگ جو دریائے سندھ کے اُس پار رہتے تھے۔ دڑو، ابھیساری اِس پوران میں نیچ ذات کے مانے گئے ہیں۔ خاص توجہ کے لائق یہ بات ہے کہ کشمیر کے ہمسایوں میں ویش اور شودر الگ الگ قومیں شمار کی گئیں ہیں جن کی بود و باش کا علاقہ شمالی مشرقی علاقہ ہے۔ لیسن کے مطابق شُدرک اور شودر ایک ہی ہیں۔ اُس نے یہ نام اُن لوگوں کو دیا ہے جو سکندر کی مشرقی فتح مندی کے دوران اُن کے آنے کی نشاندہی کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ قوم پنجاب میں بود و باش کرتی تھی۔

برہت سمتہا اگر چہ پوران ہے لیکن تواریخی اعتبار سے اِس کی بے پناہ اہمیت ہے۔ کتاب کے مصنّف وراہ مہر نے کشمیریوں کا ذکر دردوں، کھشوں اور رکرتوں کے ساتھ کیا ہے جس میں صداقت جھلکتی ہے لیکن اُس کا کشمیر کو شمالی مشرقی خطے میں شامل کرنا گراں گزرتا ہے۔ وراہ مہر کی طرح چھٹی صدی عیسوی میں شُدرک نے بھی کشمیر کا مختصر ذکر کیا ہے۔

پُورانوں میں کشمیر کا ذکر مہابھارت کے مقابلے میں زیادہ ہونا چاہیے تھا لیکن معاملہ اِسکے برخلاف ہے۔ لیکن اِس میں حیرانی یا تعجب کی کوئی بات نہیں۔ رَزمیہ دَور کے بعد لیکن پُورانوں کے دَور سے قبل بُدھ مت کشمیر پہنچا اور زبردست عروج حاصل کیا۔ کشمیر مہایان کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ پوران لکھنے والے بُدھ مت سے کوئی لین دین نہیں رکھتے تھے۔ اِس لئے وہ کیوں کر اُس دَور میں کشمیر میں دلچسپی لیتے، وہ صحیفہ نگار تھے اور کشمیر کے متعلق تفصیلات فراہم کرنا اُن کی

دانست میں غلط بات تھی۔ پوران خاص مقصد کے تحت لکھے گئے۔ وہ کشمیر کا ذکر کیوں کرتے کیوں کہ اُن کے عقیدے کے مطابق اِس کی بہت کم گنجائش تھی۔ اِتنے فراخ دِل بھی نہ تھے کہ بُدھ مت کا مرکز ہوتے ہوئے بھی کشمیر کا ذکر کرتے۔ کسی غیر مذہب کی سر پرستی اُن کے مطابق گناہ تھا اور اُس زمانے میں کشمیر کا ذکر بُدھ مت کی سر پرستی کے برابر تھا۔

کشمیر کی تواریخ اور تہذیب کے متعلق تفصیلات دیگر کتابوں میں بھی موجود ہیں لیکن موضوع کا تقاضا یہی ہے کہ فی الحال اِسی پر بس کیا جائے۔

☆☆☆

کتاب نامہ

1. Ando Aryan languages:Dr.S.K.Chatterji

2. Hindu Civilisation:Dr. R.K. Mukarji.

3. River Names in Rigveda:M.A.Stein

4. Vedas:F. Maxmuller.

5.The Early History And Culture of Kashmir: Dr. S.K Ray.

6. The Rigveda: Kaegi

7. Legends of Mahabharta: Dr.S.A. Dange.

8. Mahabharta,Critical: Bhandarkar Institute.

9. The Vishnu Puran: H.H.Wilson.

10. Encyclopedia fo Indian culture: R.N.Saltore.

11. Bhagvat Purana: Naval Kishore.

12. Kalhanas Rajtarangni: R.S Pandit and Stein.

13. History and Culture of Indian People: Bhart Vidya Bhawan, Mumbai.

14. Cultural Heritage of Indian (Culture):Dr. S.K. Chatterji.

پروفیسر سیوا سنگھ☆

گُورونانک دیوجی کشمیر میں

سکھ مذہب کے بانی گورونانک دیو جی ۱۳/اپریل ۱۴۶۹ء کو رائے بھوئے کی تلونڈی، جسے ننکانہ صاحب کہتے ہیں (مغربی پنجاب، پاکستان) میں مہتہ کلیان چند کے ہاں پیدا ہوئے۔ گورو جی کو بچپن میں ہر طرح کی تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔ پنڈت سے حساب اور منڈے مہاجنی اور مولوی سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ بچپن ہی سے گورو مہاراج سادھوؤں اور سنتوں کی صحبت میں رہ کر یادِ الٰہی میں محو رہتے۔ آپ نے اپنے والد صاحب کے حکم سے گائیں اور بھینسیں بھی چرائیں۔ دُنیاوی کام کاج میں جی نہ لگا تو بڑے ہونے پر آپ کی شادی کر دی گئی۔ آپ کے ہاں دو بیٹے بابا سِری چند اور لکھمی چند پیدا ہوئے۔

گھر گرہستی کے بندھنوں میں جکڑنے کے باوجود آپ دُنیاوی کاموں سے کھنچے کھنچے رہتے۔ چند روز اِدھر اُدھر ملازمت کر کے بعد آپ سب کچھ چھوڑ

☆للہ دید کالونی، گوری پورہ بائی پاس سرینگر

چھاڑ کر یا ترا پر نکل پڑے۔ تلونڈی سے ایک میراثی بھائی 'مردانا، جو رُباب بجانے میں مہارت رکھتے تھے، کو بُلوالیا جو صوفیانہ اور عارفانہ کلام گا کر عوام کو یادِ الٰہی میں وقت گزارنے کی تلقین کرتا تھا۔

ایک روز گورونانک ندی میں نہانے گئے تو تین رُوزتک باہر نہ آئے۔ سب پریشان ہوگئے۔ تین دِن کے بعد جب پانی سے باہر نکلے تو آپ کی زبان پر ورِدِ نجات تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ہندو مُسلم سب ایک ہی ہیں لیکن اکثر اپنے مذاہب کی تعلیمات فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اگر وہ سچّے دل سے اپنے مذاہب کی پیروی کریں تو من وتُو کا جھگڑا مِٹ جائے گا۔یہاں ہی سے گوروجی نے اپنی تعلیمات کا پرچار کرنا شروع کیا۔ آپ نے اپنے اہل وعیال کو اَلوداع کہا اور بھائی مَردانہ کو ساتھ لے کر خدا کی عظیم تخلیق یعنی اِنسان کو اُس کے خالق سے قریب تر کرنے کے مِشن کو ساتھ لے کر چل پڑے۔ آپ کی تعلیمات تھیں کہ انسان کو زندہ رہنے کے صحیح راستے کے لئے راہنمائی کی جائے۔ نیکی، کارِخیر، اِنسان دوستی، مَساوات، حق وصداقت، خدا کی عبادت کرنا، نیک اور حلال کمائی کرنا اور مل بانٹ کے کھانا۔ آپ جہاں بھی گئے اِن ہی اصولوں پر کاربند رہے۔ گوروجی تبلیغ کی غرض سے تمام ہندوستان، لنکا، عرب ممالک، مکّہ مکرّمہ، مدینہ شریف، بغداد، ایران، افغانستان، تبتّ اور کشمیر وغیرہ میں ہزاروں میل کا سفر پیدل طے کیا۔ تبلیغ کے اِن دَوروں کو اُداسی کا نام دیا گیا ہے۔ آپ کئی بار اُداسیوں میں مصروف رہے اور اپنے وقت کے تمام بڑے مذہبی مراکز کا سفر کیا۔ صوفی، سنتوں سے ملاقاتیں کیں اور اُنہیں اپنی تعلیمات سے روشناس کیا، ہر مذہب کے پیروکاروں کو اپنی مذہبی تعلیمات پر سختی سے

کاربند رہنے کی تلقین کی۔ اِس سلسلے میں سکھ دھرم کے ایک عالم بھائی گورداس کہتے ہیں:

بابے بھیکھ نبھایا/ اُداسی کی ریت چلائی/ چڑھا سودن دھرت لگائی

یعنی گورو جی نے اُداسی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے دنیا کو راہِ راست پر چلنے کی تلقین کی۔ گورو جی کی چار اُداسیاں کہی گئیں ہیں۔ پہلی اُداسی پنجاب سے لے کر آسام تک بارہ برس کی تھی جو ۱۴۹۷ء سے ۱۵۰۹ء تک رہی۔ پہلی اُداسی میں وہ بُدھ دھرم اور جین دھرم کے مذہبی مراکز میں گھومے۔ دُوسری اُداسی جنوب کی تھی جس کے دوران وہ سری لنکا تک جا پہنچے۔ تیسری اُداسی شمال کی تھی جس میں وہ سُمیر پربت، تبت اور کشمیر جا پہنچے جہاں گورو جی نے جوگیوں اور ریشیوں سے ملاقاتیں کیں۔ چوتھی اور آخری اُداسی مغربی ممالک کی طرف تھی جس کے دوران آپ مشہور اِسلامی مراکز پر گئے۔ اِن اداسیوں کے اختتام پر گورو جی نے راوی دریا کے کنارے کرتارپور نامی مقام کو آباد کر کے وہاں سترہ سال بِتائے۔ یہاں آپ کے پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی جو آپ کا اُپدیش سُنتے اور اپنی زندگی سنوارتے۔ گورو جی نے سنگت یعنی اچھے لوگوں کی صحبت میں رہنے کا درس دیا۔ کھیتی باڑی بھی کی اور لنگر کی روایت قائم کی۔ ۱۵۳۹ء میں بھائی لہنا کو گورو انگت کے نام سے دوسرے گورو کے روپ میں مذہبی فرائض انجام دینے کے لئے گہری نشستیں کیں۔ اُسی برس گورو نانک دیو جی واصل بحق ہوئے۔

گُورو جی کا کشمیر آنا:

گورو جی نے دُنیا کی مختلف سمتوں میں سفر کرنے اور انسانی کردار و

گفتار میں بہتری لانے کے لئے ہزاروں میل کی مسافت پیدل طے کی۔ اِس کا تذکرہ گورو جی نے اپنی بانی (کلام) میں بھی کیا ہے۔

تٹ، تیرتھ ہم لوکھنڈ دیکھے

یعنی میں نے دُنیا کے نَو حصّوں کو دیکھا، بازار، دُکانیں اور شہر گاؤں دیکھے۔ گورو جی کی سوانح عمری کے بارے میں کئی تخلیقات ملتی ہیں۔ اِن میں سے ایک سوانحِ حیات کا ذکر ملتا ہے۔ جسے ہم...... جنم ساکھی کہتے ہیں۔ سکھ عالم بھائی ویر سنگھ نے اِسے ایڈٹ کیا ہے۔ اِس کے بارے میں ذکر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم کوبرک نے دریافت کر کے لنڈن کی ایک لائبریری میں رکھا جہاں سے اِس کی نقل پنجاب لائی گئی۔ اس سوانح حیات سے مشابہت رکھتی ہوئی دوسری کتاب بھی جنم ساکھی کہلاتی ہے۔ اِن جنم ساکھیوں میں گورو جی کے کشمیر وارد ہونے کا ذکر ہے۔ باقی جنم ساکھیاں گورو جی کے کشمیر آنے کا ذکر نہیں کرتیں۔ گورو جی کی یاد میں مٹن میں قائم کئے گئے گوردوارے کے بارے میں مٹن کے بعض پنڈت صاحبان شکوک پیدا کرتے تھے لیکن کشمیر کے ہی بعض تاریخ دان گورو نانک صاحب کی مٹن کشمیر میں آمد کی تصدیق کرتے ہیں جیسے پنڈت نارائن، چیف پروہت مٹن اپنی کتاب ''نارائن پرکان یا اُمرناتھ یاترا'' صفحہ ۱۰۱ پر گورو جی کی یاد میں قائم شدہ گوردوارے کو تسلیم کرتے ہیں۔

''کشمیر میں سکھوں کی حکومت'' کے مصنّف ڈاکٹر آر کے پارمو صفحہ ۹۷ پر گورو نانک دیو جی کی کشمیر میں آمد کے بارے میں اپنی تحقیق اور تاریخ کشمیر میں سکھ حکومت کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''سوہن لال سوری اسلام آباد کو ایک صحت افزا مقام کہتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اِس پرگنے کا مٹن گاؤں زمانہ قدیم سے بہت قدیمی ہندو زیارت کے لئے مشہور رہا ہے۔ یہاں گورو نانک دیو جی آئے جس وجہ سے یہ سکھوں کے لئے ایک مشہور زیارت بن گیا''۔

گورو جی نے کشمیر آنے کے لئے کونسا راستہ اپنایا:

پہاڑوں سے ہر طرف سے گھری ہوئی کشمیر کی وادی کسی ایک سڑک سے باہر کے ملک سے جُڑی ہوئی نہیں تھی۔ پھر بھی یہ وادی الگ حیثیت رکھنے کے باوجود بھی رَسائی سے باہر نہ تھی۔ قدیم زمانے سے پہاڑی مقامات تک پہنچنے کے لئے دریاؤں کے ساتھ ساتھ یا پہاڑوں کے دروں سے گزر کر لوگ اپنا سفر کرتے تھے۔ درّۂ خیبر، درّہ گومل، درّہ ٹوچی، وہ مشہور راستے ہیں جن کے ذریعے حملہ آور سیّاح یا تاجر ہمارے ملک میں آتے رہے ہیں۔ اِس طرح سے ہی باہر کے ممالک سے ہمارا میل جول بنا رہا ہے۔

کشمیر کی وادی کا باہر کی دنیا سے انہیں درّوں سے تعلّق بنا رہا ہے۔ چین اور رُوسی ترکستان جیسے ممالک سے آنے جانے کے لئے یہی رَستے استعمال کئے جاتے تھے۔ مَیل جول کے لئے کچھ مشہور راستے حسبِ ذیل تھے:

۱۔ کشمیر کے شمال کی طرف سندھ وادی کی طرف جانے کے لئے دُو درّے تھے۔ ایک برزل کا راستہ تھا جس کی اونچائی ۱۱۰۰۰ فٹ تھی۔ اِس کو پار کر کے گلگت کے راستے سے کاشغر سے میل ہوتا تھا اور دوسرا زُوجیلا (اونچائی ۱۱۳۰۰ فٹ) کرگل کی طرف سے کاشغر کی جانب جاتا تھا۔ اِس راستے سے کشمیر کا چین کے ساتھ باہمی میل جول بہت قدیم تھا۔

گورونانک دیو جی

گردوارہ پتھر صاحب.....لداخ

گرُدوارہ ننکانہ صاحب......لاہور

گرُدوارہ سچّا سودا......لاہور
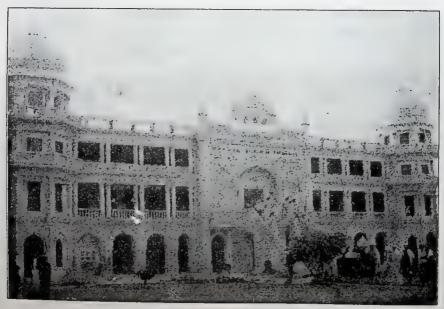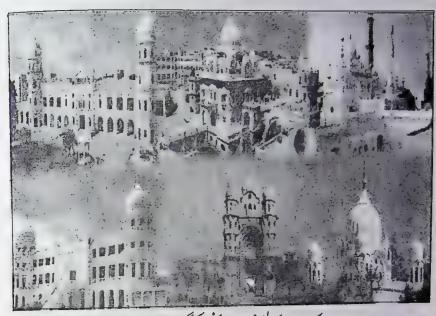
پاکستان کے بعض تواریخی سکھ گردوارے

گردوارہ پتھر صاحب ۔ لداخ

گردوارہ گورونانک......بیج بہاڑ۔
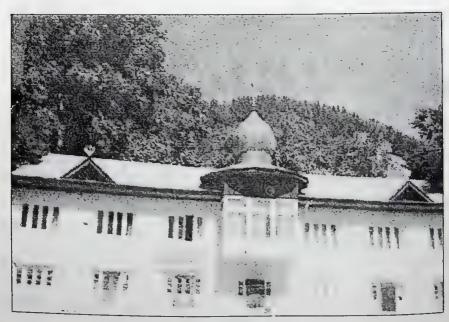
گرُدوارہ گورونانک......انت ناگ

گرُدوارہ گورونانک......اَونتی پورہ

گرُدوارہ سنت روچا سنگھ......شالکوٹ
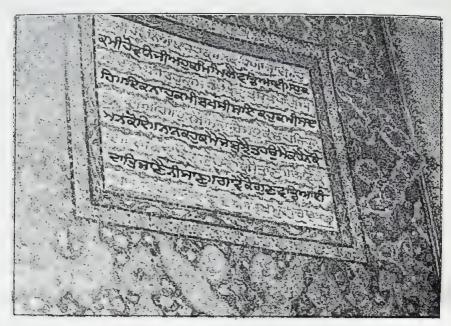
گرُدوارہ مٹّن صاحب میں محفوظ گرنتھ صاحب کا قدیم نسخہ
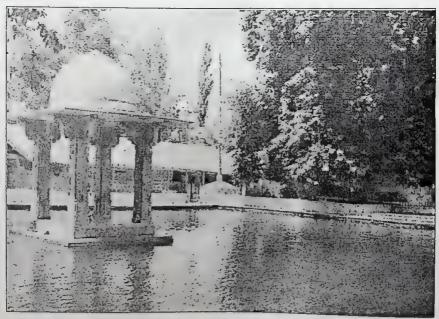
گرُدوارہ گرُونانک مٹّن

۲؍جنوب کی جانب بھی کئی درّے استعمال میں رہتے تھے۔ کشتواڑ کی طرف جانے کے لئے (۱۱۰۰۰ فٹ) مورگن درّہ ،سمتھن درّہ سنگھپورہ لگ بھگ ۱۱۰۰۰ فِٹ اُونچا ہے۔ بانہال کی طرف سے جانے کے لئے ۱۰۰۰۰ فِٹ اُونچا اورراجوری کی طرف پنجاب جانے کے لئے درّہ شوپیان کی طرف سے دوبجن، علی آباد درّہ ۱۲۰۰۰ فِٹ کی اُونچائی پر واقع ہے اوراِسے ہی بعد میں مغل شاہراہ کے نام سے جانا جانے لگا ہے۔ اِسی طرح پُونچھ کی طرف سے کشمیر وادی میں توسہ میدان اوراُوڑی کی طرف سے جانے کے لئے حاجی پیر کا دُرّہ مشہور ہے۔

گورونانک دیو جی نے اُوپر بیان کئے گئے راستوں میں سے کشمیر آنے کے لئے کس راستے کو ترجیح دی اِس پر بات کچھ آگے چل کر کی جائے گی۔ گورو جی کی یاترا صرف کشمیر وادی تک ہی نہیں تھی۔ آپ کی شمال کی طرف کی یاترا کو 'اُتراکھنڈ کی اُداسی' سے موسوم کیا گیا ہے جس میں کشمیر کے علاوہ ہماچل، لیہہ، لداخ اور تبت وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اِس لئے آپ کی مسافت کے سلسلے کو متعین کرنے کے لئے کچھ قدیمی گرنتھوں اور گورو جی کی سوانح حیات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔

اِس سلسلے میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے پروفیسر فوجا سنگھ اور پروفیسر کرپال سنگھ کی طرف سے ۱۹۷۶ء میں شائع کئے ہوئے ایٹلس "Atlas of Travels of Guru Nanak Dev Ji" کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اِس ایٹلس کی تیاری میں گورو جی کی جنم ساکھیاں اور روائیتوں پر بحث ہے۔ اِس ایٹلس میں اُتراکھنڈ کی یاترا کو دُوسری اُداسی کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق ''گورو جی ہمالیہ پربت میں بہت دُور تک چلے گئے جہاں آپ جی

نے کانگڑا وادی، کلو وادی، سپتی کا پٹھا، پچھمی تبت، لداخ، کشمیر اور پچھمی پنجاب کی یاترا کی۔ اِس یاترا کے سِلسلے میں کچھ اُہم مقام کرت پور، منڈی، روال سر، جوالا مکھی، بیج ناتھ، متی کرن، کلو، مٹن، اننت ناگ، سرینگر، بارہ مولہ، حسَن اَبدال (پنجہ صاحب) ٹِلا بال گڈائی، سیالکوٹ، سرو ور اور سیّد پور وغیرہ میں گھومے۔ "Atlas of Travels of Guru Nanak" صفحہ ۳ نقشہ ۱ / گورو جی کے سفر کے تیار کئے گئے مصنّف کے ایٹلس کے مطابق:

"سُمیر پربت کی یاترا کا حوالہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سُمیر پربت ایک فرضی نام نہیں۔ یہ ویدوں اور پُرانوں کا مِیرو پربت ہی ہے جو آج کل کیلاش پربت کے نام سے مشہور ہے اور جو مان سرووردرّے کے نزدیک واقع ہے۔ سمیر پرَبت کی یاترا کا ذکر بھائی گورداس اور تمام جنم ساکھیوں میں کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گورونانک دیو جی کی تصاویر اُس علاقے کے لوگوں کے پاس موجود ہیں۔"

گورو جی کی جنم ساکھی جو بھائی ویر سنگھ کے ولایت والی جنم ساکھی کے نام سے جو حافظہ کار اور جسے میکالف صاحب نے ترتیب دیا، میں سمیر پربت اور کشمیر اور دیگر مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ گورو جی سُمیر پربت کے خطّے کو نزدیک سے مشاہدہ کرتے ہوئے شمال مغربی راستہ اپنا کر براستہ چشول گورٹوک اور ردھوکی سے گزرتے ہوئے لداخ میں وارد ہوتے ہیں۔

سُمیر پربت سے واپسی سفر میں گورو جی چشول کے راستے ڈٹوک اور ردوک سے ہوتے ہوئے لیہہ پہنچے۔ اِس یاترا کے دَوران گورو جی نے ہیمس گُنپا بھی دیکھا۔ ہیمس گُنپا میں بودھی اَدب میں اس یاترا کا ذکر موجود ہے کہ

نہیں، یہ بودھی زبان کے ماہر ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن بودھوں نے گورو ناک دیو جی کو لاموں کا نام دے دیا ہے جس کے بارے میں عام بودھ ذکر کرتے ہیں۔

لیہہ سے ۸۱ میل دُور گورو جی بوسگو مقام پر پہنچے تو روایت ہے کہ وہاں ایک دیو نے آپ پر حملہ کر دیا۔ لیکن گورو جی کی واپسی حملے کی تاب نہ لا کر دیوا ایک چٹان سے ٹکرا گیا اور اَب بھی دیو کا عکس چٹان پر قائم ہے۔ یہاں گوردوارہ قائم کیا گیا ہے جسے پتھر صاحب کہا جاتا ہے۔ آتے جاتے لوگ چڑھاوا دیتے ہیں۔ دو وقت لنگر چائے اور روٹی وغیرہ کے انتظام کے ساتھ ساتھ کافی رونق دیتی ہے۔

اِس طرح کرگل اوُ اسکردو میں گورو جی کی یاد میں گوردوارے قائم کئے گئے ہیں جہاں پنجابی تاجر اِن کا انتظام چلایا کرتے ہیں۔ کرگل سے گورو جی دراس، زوجیلا درّہ سے ہوتے ہوئے بال تل کے راستے مشہور ہندو تیرتھ اَمرناتھ پہنچے۔

اَپنی یاترا جاری رکھتے ہوئے گورو جی پہلگام آ گئے۔ یہ کشمیر کی ایک خوبصورت وادی ہے۔ یہاں سے کچھ دُوری پر مٹن کا گاؤں واقع ہے جہاں تواریخی مندر مارتنڈ موجود ہے۔ اِسی مقام پر پہنچ کے ایک برہمن کشمیری پنڈت برہم داس سے گورو جی کی ملاقات ہوئی۔ جس جگہ گورو جی ٹھہرے وہاں گوردوارہ قائم ہے۔ سکھ حکومت کے دوران یہاں سات گوردوارے قائم کئے گئے لیکن بعد میں ان کی طرف بے توجہی کے کارن یہ گِر گئے۔ اَب ایک ہی گوردوارہ موجود ہے۔ گورو جی کی یاد میں مٹن کے علاوہ اننت ناگ، بیج بہاڑہ اور اونتی پورہ میں گوردوارے قائم کئے گئے ہیں۔

گورو نانک دیو جی کے اِس سفر کے بارے میں متضاد آراء قلمبند کی

گئیں۔ یہ محض اپنے علاقے کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لئے ہی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ مثلاً گیانی بدھ سنگھ گورو جی کا پونچھ سے کشمیر میں وارد ہونے کا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح گیانی کرتار سنگھ کومل توسہ میدان کی جانب سے گورو جی کا کشمیر میں آنے کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق بیرو بڈگام میں گورونانک تیرتھ استھان گوردوارہ تعمیر کیا گیا ہے۔ اِس جگہ کے بارے میں کوئی تاریخی حوالہ جات نہیں ملتے۔ گیانی جی نے تو گورو جی کے بارے میں یہاں تک بھی لکھا ہے کہ گورو جی یہاں کشمیر کی یاترا کے وقت کروہن کامراز، بانگل، لولاب کے علاوہ تین بار سرینگر آئے۔ گورو جی کشمیر کی سرزمین پر کس مقصد کے لئے آئے تھے؟ یہاں ہندو مذہب کے مشہور تیرتھ موجود تھے اور سنسکرت زبان کے عالم بھی رہتے تھے۔ آپ نے اُن عالموں اور اسی طرح بدھ مت کے مذہبی مراکز پر جا کر اُن سے ملاقات کی اور بحث ومباحثے کیے اور انہیں اپنے مذہب کے اصولوں سے روشناس کیا۔

اِس سے قبل کہ ہم گورو جی کی برہم داس پنڈت سے ہوئی ملاقات کا ذکر کریں، یہ جاننا ضروری ہے کہ گورو جی کے ہم عصر حالات، حکومت اور دیگر واقعات کیسے تھے؟۔

کشمیر میں کئی مذاہب کے دَور ہوئے ہیں۔ قدیم تاریخی ریکارڈ نیل مت پوران آریہ تہذیب کے ظہور اور نشوونما کا پتہ دیتا ہے۔ یہاں یہودی مذہب کی چھاپ بھی ملتی ہے۔ تواریخی دَور میں ہندو دھرم کی نشوونما ہوئی۔ پہلی صدی عیسوی تک شیو اور ویشنو مذاہب کا بول بالا رہا۔ بعدازاں پہلی سے آٹھویں صدی تک بدھ مت عروج پر رہا۔ مہاراجہ اشوک کے وقت یہاں بدھ مت کی

تیسری اور کنشک کے وقت چوتھی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہندومت اور بُدھ مت کی کافی دیر تک باہمی کشمکش چلنے کے بعد آخر ہندو دھرم، بدُھ مت پر غالب آگیا۔

کشمیر میں اسلام کے اثرات محمد بن قاسم کی سندھ کی فتح کے ساتھ ہی آنے شروع ہو گئے تھے۔ جتنی دیر تک راجہ چندرا پیڈا اور للتا دتیا جیسے طاقتور حکمران رہے، اِسلام کا کشمیر میں اثر ونفوذ محدود رہا لیکن مہاراجہ ہرش کے وقت تک (۱۰۸۹ سے ۱۱۰۱ء) اسلام کا کشمیری راجاؤں پر کافی اثر پڑ چکا تھا۔ ۱۳۲۰ء میں ایک بودھ رینچن شاہ نے اسلام قبول کیا۔ اُنہی دنوں میں شرف الدّین عبدالرحمٰن بلبل شاہ کشمیر میں آئے جنہوں نے اِسلام کی تبلیغ کی اور ہزاروں کشمیری ہندوؤں کو اِسلام کے دائرے میں لایا۔ اِسی طرح شہمیری دَورِ حکومت (۱۳۷۶ء) حضرت میر سید علی ہمدانی کشمیر میں آئے۔ اُن کے ساتھ ۶۰۰ سادات (مبلّغ) بھی تھے۔ یہی وقت تھا کہ کشمیر میں للہ عارفہ اور شیخ نورالدّین ولی یعنی نُندہ ریشی اُپنی مادری زبان کشمیری میں صوفیانہ کلام کی تخلیق کر رہے تھے۔ وہ انسانی ایکتا، اونچ نیچ کے تفرّقات دُور کرنے اور توحید پرستی کا پرچار کر رہے تھے۔ کشمیر میں ہندومت اور شیومت کا اِسلامی فلسفہ سے ٹکراؤ ہوا۔ حالانکہ ۸ ویں صدی سے ہی برہمنوں نے شیومت میں مشہور آچاریہ سومہ نند، اُت پَل، ابھنو گپت وغیرہ نے اِس کے اَثر انداز ہونے کی کافی کوشش کی۔ شیومت میں ذات پات پہ یقین نہیں اور کھانے پینے میں اس کا یقین آزادانہ ہے۔ خدائی ایکتا اِس کا اُٹوٹ دَھرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ہندو آبادی نے جب اسلام قبول کیا تو انہیں اپنی سوچ اور اعمال میں کوئی غیر ضروری فرق

نظر نہیں آیا۔ (سنت اور صوفی، پروفیسر کاشی ناتھ در، ہمارا ادب ۱۹۸۵ء، صفحہ ۲۱۴-۲۱۷) مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر۔

گورو نانک دیو جی کشمیر میں سموت ۱۵۷۴ء یعنی ۱۵۱۷ء میں وارد ہوئے۔ اُس وقت یہاں شاہ میری گھرانے کا راج تھا۔ اُس وقت کے بادشاہ محمد شاہ نے تیسری بار حکومت سنبھالی تھی۔ یہ دَور (۱۴۸۴-۱۵۴۰ء) کشمیر کی تاریخ کا سیاہ دَور تھا جس کے اَثر سے بہت سے پنڈتوں نے اِسلام قبول کیا۔ اِسی دَور میں میر شمس الدّین عراقی کشمیر آئے۔ انہوں نے نورُ بخشیہ فرقے کی تبلیغ کی۔ اِس تبلیغ میں موسیٰ رینہ (۱۵۰۴-۱۴) اور کاجی چک (۱۵۱۴--۲۶) کا بھی ہاتھ تھا جو کشمیر کی حکومت میں پرائم منسٹر تھے۔ اِسی دوران کنٹھ بٹ ایک ہندو سدارک نے ہندوؤں کو اَپنے مذہب میں واپس لانے کی کوشش کی۔ (ہسٹری آف مسلم رُوٗل اِن کشمیر، مصنف: ایس کے شرما، صفحہ ۴۳۰-۳۱/ ۴۳-۶۱)۔ اس کے علاوہ ریشی سلسلے کے کئی بزرگ انسانی ایکتا کا پرچار کرتے رہے۔ گورو نانک دیو جی کی اُس وقت کے بادشاہ یا حاکم سے میل ملاقات ہوئی یا نہیں اس کے بارے میں کوئی تواریخی حوالہ نہیں ملتا۔ کوہل جی نے گورو جی کا اُس وقت کے بادشاہ سے ملنے کا ذکر کیا ہے لیکن تاریخی حوالہ نہیں دیا۔ ہاں گورو جی کی ہندو تیرتھ مٹن اور بیج بہاڑہ اننت ناگ کی یاترا کے بارے میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور اِس بارے میں معقول اور مناسب شہادتیں ملتی ہیں۔

پنڈت برہم داس کے ساتھ ملاقات اور مباحثہ:

گورو جی کی ولایت والی جنم ساکھی یعنی سوانح عمری کے مطابق "اُتراکھنڈ کی اُداسی کے وقت گورو جی کی خوراک جنگلی پھل پھول تھے۔ آپ

کے پاؤں میں چمڑا اور سر پر بھی چمڑا یعنی تمام جسم کو چمڑے سے لپٹا ہوا تھا۔ ماتھے پر کیسر کا ٹیکا تھا۔ گورو جی کے ہمراہ سہولو ہار اور ؟؟؟ تھے۔ گورو جی اس لباس میں ملبوس ساتھیوں کے ساتھ کشمیر میں وارد ہوئے۔ بہت سے لوگ کشمیر میں آپ کے نام لیوا تھے۔ اُسی دوران پنڈت برہم داس سے آپ کی ملاقات ہوئی''۔

چنانچہ بھائی ویر سنگھ لکھتے ہیں:

ایک بار پتہ کرنے پر کسی شخص سے دریافت ہوا کہ برہم داس بیج بہاڑے کا رہنے والا تھا۔ اُس کی ملاقات گورو جی سے مارتنڈ کے چشمے پر ہوئی۔ تب سے یہ مقام مٹن صاحب کہلاتا ہے۔ چشمے میں ایک چبوترا تھا جس بیٹھ کر دونوں میں بحث و مباحثہ ہوا۔ گاؤں کے لوگ گورو جی کے پیروکار بن گئے''۔

(جنم ساکھی، بھائی ویر سنگھ، صفحہ ۴۹)

جنم ساکھی میں اِس ملاقات کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے:

''برہم داس نے سنا کہ کوئی فقیر آیا ہے۔ اُس نے (برہم داس) اپنے ساتھ کتابوں کے دو بوجھ لائے۔ گلے میں ٹھاکر لٹکائے ہوئے آئے تو رام رام، کہہ کر بیٹھ گئے۔ گورو جی کے لباس کو دیکھ کر اُس نے پوچھا'' آپ کیسے سادھو ہیں۔ چمڑا کیوں پہن رکھا ہے اور رسی کیوں لپیٹے رکھتے ہیں۔ مانس، مچھی بھی کھا رہے ہیں''۔ یہ سن کر گورو جی نے ملہار کی بانی میں اُسے سمجھایا'' پرماتما نے یہ دُنیا اور کائنات پیدا کی ہے۔ سورج چاند، دھرتی، آسمان، دن رات، تیرتھ دھرم کرم اُسی نے بنائے ہیں۔ اُس کے بغیر اور کوئی نہیں اور سچے تخت پر بیٹھا ہے۔ باقی تو دنیا میں بے ثباتی ہے۔ اس سبق کو سُن کر برہم داس گورو جی کے قدموں پر جھک گیا۔ جب دُنیا کی چیزیں نہیں تھیں تو خدا کہاں پہ تھا۔ گورو جی نے جواباً فرمایا: اربد تربد، دھندوکارہ، دھرن نہ گگنا حکم اپارا۔'' نہ دِن رین نہ چندر نہ سورج سُن سمادھ لگایا (مارو سولہے)

اِس کلام میں گورو جی نے خدا اور اُس کی بنائی کائنات کے بارے میں بڑی وضاحت سے برہم داس سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

"اس وقت ماحول میں دھند اور غبار تھا اور یہ کیفیت لاکھوں برسوں تک چھائی رہی۔ دُنیا میں کوئی پیدائش نہ تھی، ہوا پانی، آنا جانا زمین مختلف حصے، آکاش و پاتال، سات سمندر وغیرہ کا وجود نہیں تھا۔ ندیاں اور پانی دوزخ جنت، پیدائش اور موت وغیرہ کے عمل وجود میں نہیں آئے تھے۔ برہما، وِشنو اور دیوی دیوتا بھی نہیں تھے۔ صرف ایک خدا اپنی کائنات کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ نیز ذات پات، مندر مسجد، راجے اور رعایا، شاستر، پوران، پوجا پاٹھ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس اُس ایک خدا کی مرضی تھی۔

جب خدا کی مرضی ہوئی تو اُس نے دُنیا بنائی۔ ستونوں کے بغیر آسمان کھڑا کر دیا۔ برہما، وِشنو اور شیو پیدا کئے اور دولت کا پسار پیدا کر دیا۔ اس طرح کا گیان کسی نے نہ سمجھا۔ صرف گورو ہی سمجھا سکتا ہے۔ اُسی پرماتما کے نام وِرد کرو اور اُس کی حمد وثناء میں مشغول رہو"۔

یہ الٰہی کلام سن کر برہم داس گورو جی کے پاؤں پہ جُھک گیا۔ گلے سے ٹھاکر اُتار پھینکا اور گورو جی کا معتقد بن گیا۔ لیکن اُس کی انا ویسے ہی بنی رہی۔ مایا یعنی دولت کا بوجھ اُس کا ویسے ہی قائم رہا تو گورو جی نے اُسے کہا کہ جاؤ اپنا گورو حاصل کرو۔ برہم داس نے کہا کون سا گورو بناؤں۔ گورو جی نے فرمایا "جنگل میں ایک کوٹھا ہے وہاں چار درویش بیٹھے ہیں۔ وہی تمہیں بتا دیں گے۔" برہم داس اُن کے پاس پہنچا جنہوں نے گورو کے بارے میں بتایا۔ پنڈت آگے بڑھا تو ایک خوبصورت لال لباس میں ملبوس ایک عورت نے اُسے اپنی جُوتی سے خوب پیٹا۔ یہی داستان اُس نے فقیروں کو آ سُنائی۔ تو جواباً انہوں

نے اُسے سمجھایا کہ تیرا گورو تو دولت ہے۔ وہ عورت مایا کے روپ میں تھی۔ تو گورو جی کے پاس آ کر برہم داس پچھتانے لگا اور اچھی صحبت میں رہنے لگا۔ اُس نے کتابوں کے بوجھ پھینک دیئے۔ گورو جی کا خادم بن گیا۔ اُس وقت پر کہے کلام جو گورو جی نے کہا سہو لوہار اور سیہے چھینبے ؟؟؟ نے قلمبند کر لیا۔

جنم ساکھی کی کہانی کا ذکر کرنا اس لئے ضروری تھا کہ عام لوگ گورو جی کی تعلیم سے مستفید ہو سکیں۔ گورو جی نے کشمیر میں آ کر ہندو دھرم کے تیرتھ پہ جا کر عالم پنڈت کو سمجھایا کہ انسان کا صحیح مقصد کیا ہونا چاہئے۔ برہم داس کو گورو جی نے مایا اور غرور اور اَنا سے ہٹا کر نیک صحبت کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی۔ اِس ساکھی میں کچھ اور فقیروں سے گورو جی کی ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن سے گورو جی کا کلام ہوا اور وہ گورو جی کے معتقد ہوئے۔ کشمیر میں اُس وقت بہت سے ریشی اور صوفی سنت بھی موجود تھے لیکن اُن سے ہوئی ملاقات کا ذکر نہیں ملتا۔ ہاں سِکھ تاریخ دانوں نے پیر ہجرا، مٹن میں جمعہ چوپان، اور کمائی نام کے درویشوں سے ہوئی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

ایک اور بات جس کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے کہ بعض سِکھ تواریخ دانوں نے لکھا ہے کہ جب گورو نانک دیو جی کشمیر آئے تو آپ اُپنے بیٹے بابا سری چند کے ٹھکانے، بابا شری چند چنار، (جو اَب بھی کوٹھی باغ سرینگر میں موجود ہے) پر قیام کیا۔ بابا شری چند کے بارے میں مشہور تاریخ داں کے۔ ایم۔ منشی لکھتے ہیں:

> بابا سری چند کا جنم ۱۴۹۴ء میں ہوا۔ اُس وقت گورو نانک دیو جی دولت خان لودھی کی نوکری میں تھے۔ بابا شری چند صرف چار برس کے تھے جب گورو جی نے نوکری چھوڑ کر دُنیا کے کلیان کے لئے سفر پر چل پڑے۔ ماتا سلکھنی دیوی، سری

چنداور دوسرے بیٹے لکھمی داس کو لے کر اپنے میکے پکھو کے چلی گئی۔ بابا سری چند
سادھو خیال کے تھے۔ ہر سمے یادِ الٰہی میں مست رہتے۔ بابا سری چند کے نانا نے
گیارہ برس کی عمر میں اُن کی شادی کے بارے میں سوچا۔ لیکن وہ اپنی ماتا کے
آشیرواد سے چُھپکے سے مشہورِ عالم پرشوتم کول کے پاس جا کر سنسکرت پڑھنے کے
لئے چلے گئے"۔

مؤخرالذکر لیکھ سے ایک بات عیاں ہوتی ہے کہ بابا سری چند جی بھی اُداسی بن کر حصولِ علم کے بعد یادِ الٰہی میں مگن ہو گئے۔ اِس مقصد کے لئے آپ نے کشمیر میں کئی برس گزارے ہوں گے۔ تیسری اُداسی کے وقت جب گورونانک دیو جی کشمیر آئے تو بابا سری چند جی کا یہ ڈیرا کافی مشہور ہو چکا تھا۔ اُداسی مت بابا سری چند کے ساتھ ترقی کرتا گیا۔ جہاں کہیں بھی انہوں نے ٹھکانے بنائے وہاں ساتھ ہی گوردوارے قائم ہیں۔ اُداسی سلسلے کی نشو نما میں بابا شری چند کی تحریک بڑی نمایاں ہے۔ بابا جی کا یہ مقام کیسے قائم ہُوا اِس کے بارے میں کے۔ ایم۔ منشی ایک کہانی کا ذکر کرتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ ایک دن کشمیر کا بادشاہ یعقوب اُپنے وزیر کے ساتھ بابا
شری چند کا امتحان لینے کے لئے آئے۔ بابا جی نے اُس کے دِل کی بات کو بھانپتے
ہوئے اُپنی ارسوئی سے جل رہی چنار کی ایک لکڑی نکال کر زمین میں گاڑ دی۔ اُس
وقت جل چکی ٹہنی سر سبز درخت میں بدل گئی۔ بادشاہ اور اُس کے وزیر بابا جی کی
عظمت کے قائل ہوئے اور دوسرے مذاہب سے رَواداری کا عہد کیا۔ بابا سری چند
نے بہت لمبی عمر پائی۔ اور آپ کا یہ مقام اب تک اپنی عظمت کی ایک درخشاں مثال
ہے"۔

(Miracles of BABA SRICHAND: Sunday Tribune; Sep.22,1985)

گورونانک دیو جی کی کشمیر آمد کے بعد یہاں سکھ مذہب کی داغ بیل پڑ گئی۔ گورونانک دیو جی کے بعد چھٹے گورو ہر گوبند صاحب بھی خود چل کر آئے

اور یہاں پر گاہے بگاہے دیگر مبلغ لوگ بھی آتے رہے ہیں۔ ساتویں گورو ہرراے صاحب جی کی ایک یادگار دیوی آنگن ہاری پربت قلعے کے دامن میں ''چاہ گورو ہری رائے'' کے نام سے مشہور ہے۔ اِس سے عیاں ہوتا ہے کہ سکھ گورو صاحبان وقتاً فوقتاً کشمیر آتے رہے ہیں۔

..................☆..................

تاریخی حوالے:

۱/ دی سکھ ریلی جن...... میکالف، جلد پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی۔

۲/ بھائی گورداس۔ پہلی وار

۳/ پرُان جنم ساکھی۔ ایڈیٹ بھائی وِیر سنگھ۔

۴/ پروفیسر کرتار سنگھ۔ جیون کتھا گورونانک دیو جی۔

۵/ سیوارام۔ دی ڈِواین ماسٹر۔

۶/ مرُدم شماری، انڈیا۔ جلد۲۲، جموں کشمیر، حصہ پہلا و دوسرا۔

۷/ ڈاکٹر فوجا سنگھ اور کرپال سنگھ۔ ٹراولز آف گورونانک دیو جی۔ نقشہ نمبر۱، صفحہ ۳-۵-۶، نقشہ۴، نقشہ۱۶-۱۷، صفحہ ۳۰-۳۱۔

۸/ ہیمال میگزین، جلد پہلی و دوسری، شائع کردہ پنجابی ساہت سبھا، سرینگر ۱۹۶۹ء۔

۹/ مِسٹیر لیس کیوٗ (گپھا) اُمرناتھ۔ پنڈت سنسار چند کول، صفحہ ۲-۸۔

۱۰/ ہمارا اَدب (کلچرل اکیڈیمی) سنت اور صوفی، کاشی ناتھ در، پروفیسر ۱۹۸۵ء

۱۱/ ایس کے شرما۔ ہسٹری آف مسلم رول اِن کاشمیر۔ صفحہ جات ۳۰-۳۱-۴۳-۶۱۔

۱۲/ کے ایم منشی۔ بابا سری چند۔ ؟؟؟؟ لیٹرز، ۱۹۵۶ء، ایڈیشن ۳۔ سکھ ریویو، فروری ۱۹۸۵ء

۱۳/ تواریخ گورو خالصہ۔ حصہ اول، گیانی لال سنگھ۔

۱۴/ پروفیسر کرتار سنگھ۔دھارمک پوتھی۔حصہ ۶-۱۰

۱۵/ پروفیسر بیر سنگھ-ساڈا اتہاس

۱۶/ دلیپ سنگھ دیپ-بھائی گورداس-کشمیر میں

۱۷/ تزک جہانگیری

۱۸/ بھاشا دبھاگ پنجاب، پنتھ پرکاش

۱۹/ گیانی گیان سنگھ-تواریخ گورو خالصہ

۲۰/ ویر سنگھ-دیباچہ مٹک ہلارے

..................☆..................

غلام نبی خیالؔ ☆

ہنٹن نوئولز

کشمیر کی لوک کہانیوں کا اوّلین ترتیب کار

انگریزی پادری جے ہنٹن نوولز کہتا ہے۔ ’’سرزمینِ کشمیر پر اِس کے لوک اَدب کی زرخیزی میں غالباً اور کوئی ملک سبقت نہیں لے جا سکتا۔ لیکن اِس کے باوجود جبکہ ہر سال اِس موضوع پر بنگال ۔ممبئی، مدراس، پنجاب اور دیگر خِطّوں سے کتابیں شائع ہوتی ہیں اور جب انڈین انٹی کیوری، انڈین نوٹس اینڈ کوائریز، کرسچن کالج میگزین اور انڈین ایوان گلی کل ریویو جیسے رسائل میں برابر اِس پر مضامین شامل ہوتے ہیں، کشمیر میں یہ شعبہ، جو اَب بہت آگے بڑھ چکا ہے ابھی تک پسِ پردہ ہی ہے۔ اِس غفلت کی وجہ سے یہ بھی کہ کشمیر کی ایک الگ تھلگ شکل وصورت ہے اور اِس کی زبان بھی مشکل ہے۔

لہٰذا مجھے یہ کہتے ہوئے اور زیادہ مسرّت ہوتی ہے کہ وادیٔ کشمیر میں اَپنے چار سالہ قیام کے دوَران میں اِس میدان میں میسّر مواقع سے استفادہ

☆ ۱۵-راولپورہ ہاؤسنگ کالونی-سرینگر

کرتا رہا۔"

نووَلزاگر چہ ایک مشنری کی حیثیت میں کشمیر آیا تھا اور مذہبی فرائض سر انجام دینا اور عیسائیت کی تبلیغ کرنا اُس کا بنیادی کام تھا لیکن کشمیر کے لوگوں کے ساتھ گھل مِل کر اُس نے یہاں کے عوامی اَدب اور لوک کتھاؤں میں اِس قدر دلچسپی لینا شروع کیا کہ اُس کی اِس لگن اور دلچسپی کے نتیجے کے طور پر "کشمیر کی لوک کہانیاں" نام کی پہلی کتاب معرضِ وجود میں آ گئی جسے نووَلز نے اپنے پیشِ لفظ کے ساتھ ۲۸ اپریل ۱۸۸۷ء کو مکمل کیا اور اِس کی اوّلین اشاعت ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔

نووَلز نے یہ مجموعہ حکایات اپنی شریکِ حیات کے نام منسوب کیا ہے جو بقول اُس کے برابر چالیس سال تک ہر غم اور خوشی میں اُس کی شریک رہی۔

کشمیری لوک اَدب کے بارے میں مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ کشمیر حکایات، دیومالا کی کہانیوں اور طلسماتی داستانوں کی صدیوں سے ایک آماجگاہ رہا ہے۔

کشمیر چونکہ خود ایک ہندو دیومالائی حکایت کی پیدائش ہے جس میں کشمیر کو ایک بہت بڑی جھیل یعنی ستی سَر سے وجود میں لایا گیا ہے لہٰذا اِس سرزمین کے بارے میں جتنی بھی دیومالائی داستانیں کہی گئی ہیں غالباً ان کے تناظر میں صرف یونان کی دیومالا ہی کو دیکھا جا سکتا ہے اور اِن دونوں ممالک کی دیومالا اتنی عظیم اور مالا مال ہے کہ دُنیا کے اکثر ممالک میں اِس کی شان اور زیبائی کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ کشمیری لوک کہانیاں نووَلز کے بعد کئی مقامی تحقیق کاروں نے سالہا سال تک مرتّب کیں جن کی تعداد اَب سینکڑوں تک پہنچ چکی

ہیں اور یہ سلسلہ برابری جاری ہے۔

کشمیر کی لوک کہانیاں انگریزی، اُردو اور کشمیری کے علاوہ ہندوستان کی چند اور زبانوں میں دَرجنوں جِلدوں میں مجتمع کی گئی ہیں اور اِس خزانے میں نیا سرمایہ جمع ہونے کا تسلسل منقطع ہونے کا نام بھی نہیں لیتا۔

روایت یہ ہے کہ سوم دت کی کتھا سرت ساگر دُنیا کی اَوّلین لوک کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ تھا جس میں اِس کشمیری قلم کار نے لاکھوں اُشعار پر مشتمل ہزاروں کشمیری لوک کہانیوں کی شیرازہ بندی کی تھی۔ حاکمِ وقت نے سوم دت کی جمع کردہ کہانیوں کے اُسلوب پر تنقید کی جس کے ردِ عمل میں سوم دت نے اپنی کہانیوں کے سارے ذخیرہ کو نذرِ آتش کر دیا۔ بعد میں اِس حادثہ میں جو کچھ بچا اِسی پر دُوسرے ہاتھوں نے اَزسرِ نو مرتب کر کے کتھا سرت ساگر کو مرتب کر لیا اور بعد میں اِس کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

سوم دیو ایک کشمیری برہمن تھا جس کا اصلی نام سوم تھا اور برہمن ہونے کے ناطے اُس نے اَپنے فرقہ کی رسم کے مطابق اَپنے نام کے ساتھ دیو کا اضافہ کیا۔

سوم دیو نے اَپنی ضخیم کتھا سرت ساگر یعنی ''کہانیوں کا سمندر'' ۱۰۷۰ء کے آس پاس مکمل کر لی جس میں حکایات پَریوں کی کہانیوں اور لوک کتھائیں شامل ہیں۔

کتھا سرت ساگر، اَٹھارہ جِلدوں اور ایک سو چوبیس اَبواب پر مشتمل ہے جس میں نثری عبارت کے علاوہ اکیس ہزار اُشعار دَرج ہیں۔ ایک روایت کے مطابق سوم دیو کی تخلیق میں لاکھوں اُشعار درج تھے۔

اس تصنیف میں مرکزی کہانی نرواہن اوتا کے بارے میں ہے جو حکایاتی بادشاہ اُدیانا کا بیٹا تھا۔

کتھاسرت ساگر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گُنتا ڈیہ کی برہت کتھا پرمبنی ہے جسے جنوبی ہند کی پشاچی بولی میں لکھا گیا تھا لیکن محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ کشمیری برہت کتھا، جس کا سوم دیو نے استفادہ کیا، پشاچی سے مختلف تھی۔ کیونکہ کشمیر میں برہت کتھا کے دو متن موجود تھے۔

لوک اَدب اصل میں ہر علاقے میں... زمانہ قدیم سے سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دُوسری نسل تک منتقل ہوکر موجود رہا ہے اور اِس عمل میں لوک گیتوں یا لوک کہانیوں میں تبدیلیاں بھی واقع ہوئی ہیں جو ایک فطری عمل ہے۔ اِس کے باوجود لوک اَدب ساری دنیا میں ہر اَدبی صنف کے مقابلے میں سب سے مقبول اور پسندیدہ صنف رہی ہے جس کا حظ ہر ماحول اور ہر حال میں عام لوگ اور خواص اُٹھاتے رہے ہیں۔

لوک کہانیوں کے موضوعات میں زیادہ تر متعلقہ علاقوں یا ممالک کے رسم وَرواج۔ خوشی اور غم کے واقعات، معاشرے کی روایتی زندگی اور نیکی اور بدی کی ڈرامائی حکایات شامل ہوتی ہیں۔ اِس کے باوجود ایک علاقے کی لوک کہانیاں دوسرے ممالک میں بھی عام طور پر مقبول ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر کشمیر کی کئی لوک کہانیوں کا پسِ منظر ایران کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان کہانیوں کو، جن میں یوسف زلیخا، شرین فرہاد، گلریز، گل وبکاولی وغیرہ شامل ہیں اہلِ کشمیر نے بھی ہاتھوں ہاتھ لے کر انہیں اُپنے دِلوں اور ذہنوں میں ہمیشہ کے لئے جگہ دی ہے۔ اِسی طرح کشمیر کی مقامی لوک

کہانیوں ہی ٔمال نا گی رائے، اُکہ ننذن اور بومُبر یمبر زل وسطِ ایشیاء کے کئی ممالک میں پڑھی اور سُنی جاتی ہیں۔

نووٗلز کے بعد سَر آرل سٹاین نے ایک مقامی داستان گو حاتم تیلی کی زبانی کشمیری کہانیاں سُن کر انہیں پہلے رومن رسم الخط میں منتقل کیا اور ساتھ ہی ان کا انگریزی میں ترجمہ کر کے انہیں Hatim Tales کے نام سے شائع بھی کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں لالہ رخ پبلی کیشنز، سرینگر کے اہتمام سے نورمحمد روشن کی مرتب کردہ کشمیری کہانیوں کا مجموعہ ''پوشہ تھَر'' کے نام سے شائع ہوا۔

شیام لال سادھو نے ۱۹۶۲ء میں فوک ٹیلز آف کشمیر کے نام سے اُنتیس[۲۹] کشمیری کہانیاں انگریزی میں منتقل کر کے ایشیا پبلشنگ ہاؤس دہلی کے اہتمام سے انہیں منظرِ عام پر لایا۔

اِسی طرح ریاستی کلچرل اکادمی نے بھی کئی جِلدوں میں کشمیری لوک کہانیوں کو مجتمع کروا کے انہیں شائع کیا۔

لیکن نووٗلز کی کتاب کو اِس لحاظ سے ایک مقدّم حیثیت حاصل ہے کہ یہ تصنیف انگریزی زبان میں کشمیری لوک کہانیوں کی اوّلین جمع بندی کی حیثیت رکھتی ہے۔ نووٗلز کے مجموعہ میں چونسٹھ کہانیاں شامل ہیں، جن میں (۱) سات ٹانگوں والا حیوان (۲) وہ بِلی جو ملکہ بن گئی (۳) حاتم ایک نیک بادشاہ (۴) تبدیلی ہیت (۵) مسحور انگوٹھی (۶) کوی لڑکی (۷) مشورہ کے لئے روپیوں کی تھیلی کی پیش کش (۸) آدم خور ملکہ (۹) سنار اور اس کے دوست (۱۰) شہزادی کی کہانی، شہزادہ جِسے بھیڑ بنایا گیا (۱۱) سالید اور ساعد / ظالم سوداگر / شیراز کا

آدمی/ شب رنگ شہزادہ اور چور/ تکلیف دہ دوست/کمینی سوتیلی ماں/ سچی دوستی/ تین اَندھے/ ایک پیسے کی خاطر/ خاک شدہ تکبر/ دو بھائی / بنیادی حبیب/ حیابند اور زہرہ خاتون/ چالاک گیدڑ/ بے وقوف لڑکا/ چار شہزادے جو پتھر بن گئے/ بہادر شہزادی/ تین شہزادے/ محنتی بادشاہ/ ہاتھی دانت کا شہر اور وہاں کی شہزادی/ ایک عجیب دَرخواست/ بے انصاف بادشاہ اور کمینہ سُنار/ فلسفہ دان کا پتھر/ بَدخُو بیٹے کس طرح لُٹ گئے/ ایک احمق شوہر اور چالاک بیوی/ عابد فقیر/ اِتفاق میں طاقت ہے۔ پھٹا پور کا پیر، دانش مند گورنر، ان کا واحد یاقوت، گیدڑ بادشاہ/ سیاہ اور سفید ڈاڑھیاں/ جولاہے کی کہانی / چوڑ جو لُٹ گئے/ نوجوان جواری سوداگر/ دُزدِ روز اور دُزدِ شب/ چالباز سُنار/ شہزادی نے کس طرح اُپنے خاوند کو پالیا/ چالاک طوطا/ مردانہ روگ کا علاج/ بیوقوف کسان/ کرم یا دھرم/ چار بَدخُو بیٹے اور اُن کی تقدیر/ اَشراف چور/ ایک بادشاہ اور اس کا دغا باز وزیر/ شہزادہ جس کا جہاز برباد ہو گیا/ گھا گھر والا اور اس کی نوکر رتن/ کمینی ملکائیں/ چار شہزادے/ جوگی کی بیٹی/ گلالہ شاہ/ مچھلیاں کیوں ہنسنے لگیں اور ہی مال اور ناگی رائے۔

نووَلز نے اُپنی کتاب میں جن کشمیری اور ہندوستانی الفاظ کا استعمال کیا ہے ان کے معنی اُس نے ترجمہ کے آخیر پر شاملِ کتاب کر لئے ہیں۔ اِن الفاظ میں اُشرفیاں، بخشیش، بازار، چپاتی، چِلم، قلی، گوسانی، گبو، اِمام، کسابہ، کلچہ، موقدم، پٹواری، پُلاؤ، تماشہ، دُونی اور زنانہ وغیرہ شامل ہیں۔

نووَلز نے اُپنے قیامِ کشمیر کے دَوران جن مقامی داستان گو لوگوں سے یہ کہانیاں سُنی ہیں اُس نے اُن کے نام بھی ہر کہانی کے بعد حوالہ جات میں درج

کر کے ان کی اس خدمت کا اعتراف کرلیا ہے۔اِن کہانی سنانے والوں میں رعناواری سرینگر کا شیوابابو، رازی پنڈ تانی ٔسرینگر، قادر حجام ٔامیراکدل سرینگر، نرائن کول ٔفتح کدل سرینگر، لال چند کھمنو ہ وُلر پرگنہ، پنڈت چڈھہ رام ٔحبہ کدل سرینگر، آنند رام ٔسونہ مسجد سرینگر، مکند بابو ستھو سرینگر، کیلاش کول ٔنٹی پورہ سرینگر، رحمان نجار سرینگر، لال سنگھ کھادن یار بار ہمولہ، مہتر شیر سنگھ ٔقائم مقام گورنر کشمیر، آنند رام رعناواری سرینگر، چند رکول سرینگر، قادر ٔامیراکدل سرینگر، لسہ کسِان ٔسونہ وار سرینگر اور شیورام بھانہ محلّہ سرینگر۔

عبدالغنی شیخ☆

لَداخ- مُہم جوؤں کی سَرزمین

لداخ نے ماضی میں جفاکش، من چلے اور عالی ہمّت کوہ پیما اور مُہم جو آرغون پیدا کیے ہیں۔ آرغون' لداخی مسلمانوں کو کہتے ہیں جو چینی ترکستان اور لداخ یا کشمیر اور لداخ کی نسلوں کی اُولادیں ہیں۔ آرغون کے لفظی معنی بھی مخلوط النسل ہے۔ آج لیہہ کے اکثر مسلمان آرغون ہیں۔ یہ صدیوں سے یہاں آباد ہیں۔ اِن آرغونی مہم جوؤں میں محمد عیسیٰ، گلوان رَسول، شکور علی، قلم غلام رسول، رمضان علی عرف ارَچونگ، جُمعہ مالک، محمد رحیم، بڑا اِسلام، چھوٹا اِسلام، محمد وحسین، مقسوم، صدیق، لسو آرغون اور متعدد نام آتے ہیں۔ یہ سرد وگرم چیدہ اور گرگ باراں قسم کے لوگ ہی نہیں تھے بلکہ باغ وبہار طبیعت بھی رکھتے تھے۔

مثل مشہور ہے کہ شرپا کے بغیر کوہ ہمالیہ کی بلندیاں سر نہیں کی جاسکتیں اسی طرح یورپی مہم جو سیاحوں نے اعتراف کیا ہے کہ آرغون رہبروں اور قلیوں کے بغیر اس دَور میں وسطِ ایشیا، تبت، پامیر وغیرہ میں سَفر اَور سردے کرنا

☆ معرفت، یاسمین گیسٹ ہاؤس لیہہ لداخ

ڈُو بھر تھا۔

جس طرح شرپا کوہ پیماؤں کا سامان لیکر انتہائی بلندیوں پر چڑھتے ہیں اور کوہ پیماؤں کو چوٹی پر قدم رکھنے اور جھنڈا گاڑنے کے قابل بناتے ہیں اِسی طرح یہ آرغون جسمانی مصائب سہہ کر مُہم پسند یورپیوں کا کام آسان بناتے تھے۔

کرنل سر فرانسس ینگ ہسبنڈ ، نار ڈاریلی آف ڈینمور ، ڈاکٹر سون ہیڈین ، کپتان ایچ ، ایچ ، پی ڈیزی ، سُر فریڈرک ڈِریو ، میجر گوڈوین آسٹن وغیرہ نے اپنی تصنیفات میں آرغون کی سراہنا کی ہے۔ اِس طرح اِن کے کارنامے جزوی طور پر منظرِ عام پر آتے ہیں۔ تاہم کم وبیش سارے مہم جو آرغون گُمنامی میں پڑے ہیں۔ لارڈ ڈینمور ایک مرتبہ لداخ کے راستے پامیر جاتا ہے اور اُپنی معرکتہ الآرا کتاب ''پامیر'' کی وجہ سے غیر معمولی شہرت پاتا ہے۔ اِسی طرح سویڈن کے نامور مُہم جو سیاح ڈاکٹر مون ہیڈین اور برطانیہ کے کرنل سر فرانس ینگ ہسبنڈ اُپنی مہمات سے متعلق کتابوں کی بدولت شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس چند آرغون انفرادی طور پر لارڈ ڈونیمور، ینگ ہسبنڈ اور سون ہیڈین جیسے متعدد یورپیوں کے ساتھ وَسطِ ایشیاء اور تبت کے لق ودق صحراؤں، بے آب وگیاہ میدانوں اور برف پوش کوہساروں میں گھومتے ہیں۔ لیکن یہ گُمنام ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے پیچھے کوئی دستاویز نہیں چھوری۔ وہ تو بھلا ہوا اُمریکی سیاح رابرٹ براٹ کا جس نے گلوان رسول کو اَپنی سوانح حیات (Servant of the Sahiks) لکھنے کی ترغیب دی اور ہم نے

اس کی اَوائل زندگی سے متعلق کچھ اہم باتیں معلوم کیں۔

اِس میں شک نہیں کہ مُہم پسند یورپیوں کے ساتھ آرغون کی حیات اور اُن کی ملازمت کا بنیادی محرّک حصولِ معاش تھا۔ تاہم اَپنی جان جوکھم میں ڈال کر اِن ویران علاقوں میں سالہاسال مسلسل کٹھن سفر پر رہنے میں آرغون کی مہم جوئی کو دخل تھا۔ چنانچہ ینگ ہسبنڈ نے گلوان غلام رسول کی کتاب "Servant of the Sahibs" کے پیشِ لفظ لکھا ہے۔ یہ اَفرادِ مہم جوئی کے اِتنے ہی دِلدادہ ہیں جتنے اُن کے Employees یا مالکان ہیں۔

گلوان رسول نے اَپنی اِس کتاب میں لکھا ہے کہ ''چینی ترکستان میں اُس کے ایک رشتہ دار نے اُس کو مادّی وَسائل فراہم کرتے ہوئے کہا کہ اس کو مزید سفر کے مصائب جھیلنے کی ضرورت نہیں لیکن اُس نے مال دولت کو ٹھکرایا اور کہا کہ اِس کو حقیقی سکون بادہ پیمائی اور سیاحت میں ملتا ہے۔''

آرغون کے علاوہ کئی لداخی بودھوں نے بھی یورپی مہم جوؤں کے ساتھ کام کیا ہے۔ اِن کے سفر ناموں میں تنڈوپ صنم، رالسپانگ، ایشے چھرنگ وغیرہ کے نام آتے ہیں جو اَچھے شکاری اور جفاکش مہم پسند تھے۔ بودھ اَکثر قلی یا گھوڑے والے ہوتے تھے۔

اے، ای، وارڈ نے اپنی کتاب Tourist and Sportsmans Guide to Kashmir and Ladakh. میں آرغون سے متعلق لکھا ہے:

''طویل مسافت کے لئے آرغون بہترین خادم ہیں۔ کیونکہ یہ بڑے جفاکش اور فرمانبردار ہوتے ہیں۔''

مون ہیڈ ین نے اپنی مشہور کتاب Trans Himalayas میں لکھا ہے:

"آرغون نسل اپنی جسمانی طاقت اور اچھے تن و توش کی وجہ سے عام لداخیوں سے منفرد ہے۔"

In Tibet and Chinese Turkistan میں کپتان ایچ، ایچ، پی ڈیزی لکھتا ہے۔

"کارواں میں کام کرنے کے لئے موزوں ترین افراد لداخ کے آرغون ہیں۔ وُہ ترکستان کے باشندوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ موخر الذکر بلند مقامات اور ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے عادی نہیں ہیں اِس لئے جلد تھک جاتے ہیں لیکن آرغون انتہائی صبر آزما حالات میں پورے اُترے ہیں۔"

سر فریڈرک ڈِریو کی تصنیف The Jammu & Kashmir Territories کشمیر پر ایک معرکتہ الآرا تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس میں صفحہ ۲۴۰ پر مندرجہ عبارت درج ہے:

"اگر لداخیوں کو مناسب وقت اور موقع فراہم کیا جائے تو وہ سیکھنے کا اُچھا مادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے گوڈوین آسٹین کے اس بیان کو حق بجانب قرار دیا ہے کہ ایک لحاظ سے لداخی منشی (Map reading) نقشہ فہمی میں ہندوستان کے منشیوں یا لیکھکوں سے سبقت لے گئے ہیں۔"

لارڈ ڈینمور نے رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے سامنے اپنی مہم کی روئیداد سُناتے ہوئے اِن الفاظ میں لداخیوں کی سراہنا کی ہے۔

''اِس سے پہلے مجھے کبھی اِس قسم کے جفاکش، عمدہ اور فرمانبردار آدمیوں کی خدمات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔''

اپنی کتاب ''پامیر'' کے دیباچے میں اِن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ڈینمور لکھتا ہے:

''یہ میرے لئے ناشکراپن ہوگا اگر میں اس دیباچے کو اُن جفاکش اور ممتاز لداخیوں کو خراجِ تحسین پیش کئے بغیر ختم کروں جو رمضان (رمضان علی کارواں لیڈر) کے تحت میرے ہمسفر تھے۔ انہوں نے اِس مہم میں پاپیادہ ۲۲۰۰ میل لمبا سفر طے کیا اور اِس دوران ۲۹ دریا اور ۴۱ پہاڑی درّے عبور کئے جن میں بہت سارے دُنیا کے بلند ترین درّے تھے۔''

ڈینمور رقمطراز ہے:

''رمضان نے (پورے قافلے کے ساتھ) رات کے دس بجے طوفانِ برف وباد میں ۱۸،۶۸۰ فٹ بلند قراقرم صحیح سلامت طے کیا۔ تھوڑے وقفے میں خیمے نصب کئے۔ رات کا کھانا تیار کیا۔ دِگرگوں حالت میں یہ ایک لداخی باورچی کے ہی بس کی بات ہے۔''

اِس کتاب میں آگے وہ لکھتا ہے۔

''اس میں ذرّہ بھر شُبہ نہیں کہ ہمارے ساتھ دُنیا کے بہترین (Pony-men) گھوڑے والے تھے۔ میں نے ان کے جیسے جفاکش اور محنتی آدمی کبھی نہیں دیکھے۔ اِنہیں اَپنے کام کا پورا علم ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ خوش وخرّم رہتے ہیں۔ جب کبھی اِن پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو یہ گیت گاتے ہیں۔''

ہیڈین نے تبت میں اَپنی مہم کے دوران اِنتہائی کٹھن اور صبر آزما

مسافت' لداخیوں کی خوش مزاجی کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے۔

''چند لداخی جانوروں اور اپنی مشکلات کو ہلکا بنانے کے لئے
گیت گا رہے تھے۔ وہ ایسے خوش وخرم اور پُر سکون تھے گویا فصل کٹائی
کے تیوہار پر جا رہے تھے۔''

یورپیوں اور لداخی قلیوں میں گہری قُربت اور اُنسیت تھی۔ مہم تبت کے بعد جب شکور علی، رحیم علی، تنڈوپ صنم اور چھرنگ سون، ہیڈین سے جُدا ہوتے ہیں تو یہ لداخی بہت روتے ہیں۔ ہیڈین لکھتا ہے:

''جب یہ لوگ دُربوگ (تبت سے بطرفِ لداخ) روانہ ہوئے
تو میں اُن کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اُوجھل ہوئے
اور خیمے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔''

تبت کی دُوسری مشہور مہم کے اِختتام پر ہیڈین چھ لداخیوں کے ساتھ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۸ء کو شملہ پہنچتا ہے۔ وائسرائے ہند لارڈ منٹو اور لیڈی منٹو، ہیڈین کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ دوسرے روز ہیڈین ایک سو پچاس معززین کے سامنے اپنے سفر کی روئیداد سُناتا ہے۔ اِن میں ہند میں برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف لارڈ کچنسر، اَلور اور گوالیار کے مہاراجے اور کئی جرنیل ہوتے ہیں۔

یہاں چھ لداخیوں کو ہیڈین ایک مختصر تقریب میں اَلوداع کہتا ہے۔ لارڈ منٹو اور لیڈی منٹو اِس میں شرکت کرتے ہیں۔ اِس موقع لارڈ منٹو ایک مختصر اور مَسرور کُن تقریر کرتا ہے۔ جُدا ہوتے وقت لداخیوں کو روتے دیکھ کر لارڈ اور لیڈی منٹو بہت متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ بے ساختہ کہتے ہیں:

''یہ کتنے وَفا شعار اور عقیدت مند لوگ ہیں۔ الفاظ میں ان کے
آنسو بیان نہیں ہو سکتے۔''

بعد میں سویڈن کے شاہ گستاف نے اِن چھ اور مہم کے دوسرے تمام لداخیوں کو اعلیٰ خدمات کے لئے سونے اور چاندی کے تمغے عطا کیے۔

وسطِ ایشیا، تبّت، پامیر سے واقف اور اُنیسویں صدی میں اِن خِطّوں میں یورپی مہم پسند سیاحوں اور محققّوں سے اَحوال واکوائف پڑھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ اِس دَور میں اُن دشوار گذار قسطوں کی مسافت نہایت ہی صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام تھا۔ رستے میں رَہزنوں کا خطرہ رہتا تھا۔ گھوڑے اور آدمی برف باری کی نذر ہو جاتے تھے۔ رسید پھینکنی پڑتی تھی۔ کارواں اُپنی راہ سے بھٹک جاتا تھا۔ کپتان ویلبی (۱۸۹۶ء) کپتان ڈیزی (۹۹-۱۸۹۶ء) اور کپتان رالنگ (۱۹۰۳ء) کی مہمات اِس قبیل کی اہم مثالیں ہیں۔ کبھی مہم کے یورپی لیڈر غیر دوستانہ آدمیوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ اِس ضمن میں فرانس کے سیاح (Dulre De Rhins) (۱۹۸۵ء) برطانیہ کے (Dalgleish) اور جرمنی کے (Adolphe Schlagint weit) (۱۸۵۷ء) کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

ناموافق موسمی حالات بھی سفر میں تکلیف کا باعث تھے۔ ہیڈین نے تبّت میں اُپنے سفر کے دَوران نقطۂ انجماد سے نیچے تقریباً ۴۰ ڈگری حرارت کا ریکارڈ کیا ہے۔

ایسے سفر میں بار برداری اور سواری کے جانوروں کا مَرجانا معمولی بات تھی۔ ڈینمور نے ایک چینی تُرکستانی کے حوالے سے بتایا ہے کہ یارقند (چینی ترکستان) سے لیہہ تک سفر کرنے کے دوران بیس فیصد گھوڑے مرجاتے تھے۔ ہیڈین کی تبت کی سات مہموں کے دوران صرف ایک مہم میں سفر کی

تکمیل سے پہلے اس کے کارواں کے ۵۸ گھوڑوں اور ۳۶ خچروں میں ۲۹ گھوڑے اور ۶ خچر مر گئے۔

ایسے حالات میں جانباز اور باہمت مہم جو بھی مایوس ہو جاتے ہیں۔ صحرائے گوبی میں سفر کرتے ہوئے جب ینگ ہسبنڈ کو سخت آلام اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور رات کی نیند آنکھوں سے اُڑ جاتی ہے تو وہ سخت پچھتاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''اس رات میں نے آپ سے کہا کہ میں کتنا بیوقوف ہوں اور قسم کھائی کہ آئندہ رُوئے زمین کے ایسے ویران علاقوں میں کبھی نہیں گھومونگا۔ ہم مسافر یاسیت کے ایسے لمحات سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔ بھلا اس دشت نوردی کا ماحصل کیا ہے؟''

لیکن ایک مہم جو انسان کے لئے یہ مایوسی عارضی ہوتی ہے۔

لداخ کے آغون مہم جو بڑے دلچسپ اور Colourful لوگ تھے۔ یہ بڑے اطاعت گزار تھے اور رقص و سرود کے بھی بڑے دلدادہ تھے۔ مشہور مہم جو آرغون گلوان غلام رسول! جو گلوان رسول کے نام سے مشہور ہے، بنجو (ایک ساز) بجانے کا بڑا شیدائی تھا۔ محمد عیسیٰؑ بڑے چاؤ سے گٹار بجاتا تھا۔ جس روز اُس کا انتقال ہوا اس کی پچھلی رات وہ اپنے مرغوب گٹار پر گیت گا کر سویا تھا۔

قلم غلام رسول بڑا ظریف اور زندہ دل آدمی تھا۔ لیہہ کی مجلسی زندگی میں وہ اپنی شمشیر بازی، مشعل ناچ اور بھانت بھانت کے رقص سے رونق لاتا تھا۔ اس نے چین کے مشہور رقص امبان اور کشتی، اور اژدہا ناچ

Dragon dance سے لداخیوں کو روشناس کیا جو لداخ میں تقریباً رُبع صدی تک میلوں تماشوں میں باقاعدگی سے دِکھائے جاتے تھے۔

یہ لوگ اُپنے آپ کو "جنگ بامٹی" یا "جنگامٹی" کہتے تھے اور "جنگامٹی یورولونگی خوب لالہ" کا گیت گاتے ہوئے والہانہ انداز میں ناچتے تھے۔ جنگبامٹی یا جنگامٹی کے لفظ کا ماخذ معلوم نہیں ہوسکا۔ کوئی اِس کا مطلب جنگجو بتاتا ہے۔ یہ لوگ سفر اور حضر دونوں میں راگ رَنگ کی محفلیں جماتے تھے۔ لداخ میں تیر اَندزی کے میلے لگتے ہیں۔ ماضی میں لیہہ میں ہر سال تیر اَندازی کی دلچسپ تقریب ہوتی تھی۔ یہ آرغون "تیر اَندازی" کے نام سے مشہور تھا۔ جنگبامٹی خاندان کے یہ مہم پسند اَفراد اِس میلے کے رُوحِ رُواں تھے۔ اُپنی زِندہ دِلی اور خوش مذاقی سے یہ اِس میں نئی جان ڈالتے تھے۔

اُن دنوں ترکی زبان کو لداخ میں Lingua Franca کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ لوگ تُرکی زبان میں ماہر تھے۔

تاریخ میں ایسے متعدّد شہرۂ آفاق فن کار، اَدیب اور فلسفیوں کے نام آتے ہیں جنہوں نے اِنتہائی تنگ دستی اور مفلوک الحالی میں اُپنی زندگی گزار دی۔ فلسفی کلیانت رِواتی، بہشتی، مشہور فلسفی فارابی، مالی اور ولندیزی شیکسپیرُ، ونڈرل ایک معمولی کلرک تھا۔ لداخ کے اکثر نامور مہم جو آرغون انگریز جوائنٹ کمشنر اور وزارتِ لداخ کے دفاتر میں چپراسی تھے۔ بعد میں کئی نے مالی اور سماجی لحاظ سے ترقی کی۔

اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اَوئل کے مہم جُو یورپی محقّقین کی تصنیفات سفرناموں، یاداشتوں اور دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ

آرغون نے اِنفرادی اور اجتماعی طور نمایاں کردار اُدا کیا ہے۔

رمضان علی نے ایک نگریز جوائنٹ کمشنر کے ساتھ لیہہ سے سرینگر کا سفر گھوڑے پر چوبیس گھنوں میں طے کیا۔ یہ اُس زمانے میں پندرہ دِن کا کٹھن سفر تھا۔ پھر پڑاوَ پر اُن کے لئے تیز رَو گھوڑے کا اہتمام تھا۔ مسلسل سَواری کی اَذیت اور جھٹکے سے محفوظ رہنے کے لئے انہوں نے سارے بدن پر پٹی باندھی تھی۔

محمد عیسیٰؑ نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ پاپیادہ دسؔ روز میں اپنا سامانِ خورد ونوش خود اُٹھا کر لیہہ سے چینی ترکستان گیا تھا۔ اِسی طرح ایک آرغون' خوشحال رمضان' تنِ تنہا لیہہ سے چینی ترکستان کے سفر پر رُوانہ ہوا اور رَستے میں قافلوں کی چُھپائی ہوئی اشیائے خورد ونوش سے وہ اُپنی شکم پُری کرتا ہُوا اُپنی منزل تک پہنچ گیا۔ لیہہ سے چینی ترکستان پہنچنے میں ایک ماہ سے زیادہ عرصہ لگتا ہے۔ رَستے میں کئی کئی روز آبادی کا نام ونشان ہی نہیں تھا اور دنیا کے چند بلند ترین درّوں اور تیز رُو گہرے دریاؤں سے پالا پڑتا تھا جن پر کوئی پُل نہیں تھا۔

وِلیم مُور کرافٹ ۱۸۲۰ء میں ہماچل پردیش کے رستے لداخ وارد ہُوا۔ اِنہیں لیہہ کی طرف آنے کی اجازت نہیں ملی لیکن لداخی مسلمان خواجہ شاہ نیاز نے لداخ کے کلون (وزیر اعظم) سے ملاقات کی اور اَپنے اَثر ورَسوخ اور قوتِ استدلال سے قائل کیا کہ اِس سفید فام آدمی کے آنے سے اُناج کی سلامتی اور حاکمیت کو خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ اِس طرح مور کرافٹ کو خانقاہوں اور لاماؤں کے ممنوعہ دیش میں داخلے کی اِجازت مل گئی۔

مُور کرافٹ لداخ میں دؔو سال رہا اور یہاں کے مختلف علاقے دیکھے

اِس دَوران اُن کو گورنر کشمیر، تبت کے حکمران اور اُسکردو کے راجہ کے مکتوبات میں اُن کی تشویش اظہار کرنے پر مور کرافٹ کو لداخ سے باہر نکال دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ایک اور مرتبہ خواجہ شاہ نیاز کی مداخلت کی وجہ سے اِس فیصلے پر عمل نہیں ہوا۔

مُور کرافٹ نے اُپنے مشاہدات اور تجربات کو ہمیں ایک کتاب کی صورت میں دیا ہے جو اُس دَور کے لداخ کی گرانمایہ تاریخی دستاویز ہے۔

۱۸۳۵ء میں جب جی ٹی وینی (G.J.Vigne) لداخ آیا تو اس وقت لداخ بغاوتوں اور جنگوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وینی لداخ کے معزول راجہ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن ڈوگرہ فوج نے اِجازت نہیں دی۔ چنانچہ اُس نے زور زبردستی راجہ سے ملنے کا اِرادہ کیا۔ اِس موقع پر اُس کے لداخی معاون منشی علی محمد نے ساتھ دیا۔ وہ دونوں گھوڑے پر سوار ہو کر راجہ کے محل کی طرف دوڑے اور وینی ڈوگرہ پہرہ داروں کا حصار توڑ کر راجہ سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔

Adolphe Schlegirt Weit پہلا یورپی محقّق سیاح تھا جو ۱۸۵۷ء میں اَکسائی چین کے رستے یارقند (چینی ترکسان) پہنچا۔ اس سفر میں اُس کے ہمراہ ایک لداخی آرغون محمد اُمین تھا۔ بعد میں Adolphe Schlegirt Weit کاشغر میں مارا گیا۔ اس کی قیمتی دستاویز ایک نسوار فروش کے ہاتھ لگی تھی جسے مرزا عبدالودود نامی ایک شخص نے سولہ ماہ کی تلاش و جستجو کے بعد ایک روپیہ میں حاصل کیا تھا۔

حاجی حیدر شاہ اور حاجی ناظر شاہ ماضی میں لداخ کے سرکردہ مسلمان

ہو گذرے ہیں۔ تقریباً پونے چار سو سال قبل لداخ کے ایک راجہ نے اُن کے اَجداد کو فارسی میں خط و کتابت کرنے کا فریضہ سر انجام دینے کے لئے کشمیر سے لداخ بلایا تھا اور یہاں جاگیر دے رکھی تھی۔ اُن دِنوں مغلیہ گورنروں سے فارسی زبان میں خط و کتابت ہوتی تھی۔

ڈوگرہ دَورِ حکومت میں اَپنے اَثر و رُسوخ سے اور فہم و فراست کی وجہ سے اِس خاندان کو ہر سال دلائی لامہ کو لہاسہ (تبّت) تحائف لے جانے کا شرف حاصل تھا۔ لداخ اور تبت کے مابین ایک پُرانے معاہدے کے مطابق لداخ سے ہر تیسرے سال دلائی لامہ کو تحائف کے ساتھ ایک خیر سگالی مِشن بھیجا جاتا تھا۔ اِسے ''لوپ چق'' یا سالانہ سفارت کہا جاتا تھا ''لوپ چق'' کا فریضہ سرانجام دینے والے کو خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ لیہہ سے لہاسہ تک بار برداری کے لئے سینکڑوں گھوڑے مُفت فراہم کئے جاتے تھے۔ چنانچہ یہ خاندان لداخ میں بہت متمول تھا۔

سون ہیڈین نے اَپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ناظر شاہ کا نام اندرونِ ایشیاً اور تبّت میں مشہور تھا۔ اِس خاندان کے ایک بزرگ خواجہ غلام رسول نے ہیڈین کو مغربی تبت کی مہم کے دَوران مالی اِعانت کی اور دوسری سہولتیں فراہم کیں۔

بعد میں سون ہیڈین کی سفارش پر سویڈن کے شاہ گستاف نے خواجہ غلام رسول کو سونے کا تمغہ دیا اور برطانوی ریاست نے ان کو خان بہادر کا خطاب دیا۔

اُس زمانے میں تبت اور وسطِ ایشیا کی سَروے مُہم پر جانے والے

کارواں اَپنے جلو میں بڑی رنگینیاں اور دِلچسپیاں رکھتے تھے۔ کچھ کارواں چند اَفراد، تیس چالیس گھوڑوں پر مشتمل ہوتے۔ مشہور فارسائیتھ مِشن (Forsyth Mission) میں ۱۶۲۱ اِیاک اور گھوڑے اور ۶۴۷۶ قُلی تھے جن میں ۱۲۵۶ ڈولی بردار تھے۔ یہ مِشن برطانوی ہند نے ۱۸۷۰ء میں لداخ کے رستے اہم سیاسی اور تجارتی اُمور پر گفت وشنید کے لئے سَر ڈگلس فارسائیتھ کی قیادت میں وسطِ ایشیا بھیجا تھا۔

کارواں اکثر دلچسپ اَفراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ سون ہیڈین کے ایک کارواں کو لیجئے۔

تنڈوپ صنم شکاری تھا۔ ہیڈین اِس کو Grand Court Huntman کہتا تھا۔

لوبزانگ ریگ والی کارواں کا مسخرا تھا۔ اُس کی ذات میں ہر ایک کے لئے دلچسپی کا سامان تھا۔

حاجی غلام رسول کارواں لیڈر محمد عیسیٰ کا باورچی تھا۔ وہ دُو مرتبہ حج کر آیا تھا۔

تنڈوپ گیاچن داستان گو تھا۔ دِن کو سفر کرنے کے بعد وہ رات کو طویل داستان بالاقساط سُنایا کرتا تھا۔

بائیس سالہ عدول جہاں کارواں کا سب سے کم عمر قلی تھا، باسٹھ سالہ غفور کارواں میں سب سے عمر رسیدہ آدمی تھا۔ وہ ۳۳ سال قبل فارستھ مشن کے ساتھ وسطِ ایشیا گیا تھا۔ ہیڈین پہلے اس عمر رسیدہ آدمی کو اَپنے ساتھ لینے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ جب بوڑھے آدمی نے اَپنے ساتھ کفن اُٹھایا تو ہیڈین

اور محمد عیسیٰ ہنس پڑے۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ یہی کفن اِسی سفر میں محمد عیسیٰ کے کام آیا اور بوڑھا آدمی صحیح سلامت اَپنے گھر پہنچا۔

لداخ کے ایک مہم پسند آرغون کی مُہم جویانہ زندگی کے تمام گوشوں سے پَردہ اُٹھانا مشکل ہے۔ اِس کی تین وجوہات دی جاسکتی ہیں۔ اَوّل ماسوائے گلوان رسول کسی آغون نے اَپنا سفر نامہ مرّتب نہیں کیا ہے۔ گلوان رسول نے اَپنی کتاب پینتالیس برس کی عمر میں لکھی۔ اِس کے بعد بھی وہ متعدد یورپیوں کے ہمراہ سفر پر گیا۔ اِس لئے اُس کی خودنوشت سوانح عمری نامکمل ہے۔ دوئم اُس زمانے میں اُن کے کام کو اہمیت نہیں دی گئی۔ اِس لئے کسی نے اُن کے مہم جویانہ سفر کے اَحوال و کوائف لکھنے میں دلچسپی نہیں لی۔ لیہہ کے ایک باذوق آدمی منشی غلام محی الدین مرحوم نے قلم غلام رسول کی زبانی اُس کی مختصر آپ بیتی قلم بند کی ہے لیکن یہ اَدھوری اور تشنہ ہے۔ منشی غلام محی الدین نے یہ دستاویز میرے حوالہ کی۔ سوئم اُس وقت یہ مہم جو آرغون ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

وسطِ ایشیا' تبت اور لداخ میں مہمات اور سروے سے متعلق تصنیفات کے آئینے میں ایک آرغون کی اِنفرادی زندگی پر کئی جلدیں لکھی جاچکی ہیں۔

ہم یہاں چند نامور مہم جو آرغون کی زندگی کے حالات اختصار سے پیش کرتے ہیں۔

محمد عیسیٰ:۔

محمد عیسیٰ نے تیس سال تک متعدد مہم جُو سیاحوں کے ساتھ وسطِ ایشیا اور تبت کی خاک چھانی۔ بہت سی مشہور مہموں میں وہ کارواں لیڈر رہا۔ ۱۹۰۳ء کی کرنیل ینگ ہسبنڈ کی سرکردگی میں بھیجی گئی لہاسہ کی مشہور مہم میں محمد عیسیٰ

کارواں لیڈر تھا۔

محمد عیسیٰ کا باپ چینی ترکستان کا تھا اور ماں لداخی بودھ تھی۔ سویڈن کے مشہور مہم جو ڈاکٹر سوین ہیڈین نے محمد عیسیٰ کی شخصیّت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"وہ اُونچے قد و قامت کا ایک ذیشان انسان تھا۔ ریچھ کی طرح مضبوط اور نہایت بُردبار انسان تھا۔ وہ نہایت ہی معتمد، دیانتدار، حاضر جواب، ظریف اور خوش طبع انسان تھا۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے کے لئے تیار رہتا اور مایوس کن حالات میں سب کو خوش و خرم رکھتا تھا۔"

ہیڈین کے ساتھ تبت سے واپس آتے ہوئے یکم جون ۱۹۰۷ء کو وہ تبت میں اسکاڈوزونگ کے مقام پر چل بسا۔ وہ اُس وقت ۵۳ برس کا تھا۔

ہیڈین کو محمد عیسیٰ کی ناگہانی موت کا بہت دُکھ ہوا۔ وہ پانچ اَفراد کے ہمراہ برہم پُتر کا سنگم دیکھنے گیا تھا۔ جب واپس آیا تو محمد عیسیٰ بسترِ مرگ پر تھا ہیڈین بڑے کرب سے لکھتا ہے۔

"میری روانگی کے وقت میرا کارواں لیڈر ایک بَلی (Pole) کی طرح دَراز قد اور سیدھا تھا اور، ہمارے تھیلوں میں رَسد ڈلوا رہا تھا۔"

محمد عیسیٰ کی میّت کو سکاڈوزونگ میں لاسہ تجارتی شاہراہ کے پاس سپردِ خاک کیا گیا۔ ہیڈین نے قبر پر ایک پتھر کا کتبہ لگوایا جس پر یہ عبارت نقش کرائی۔

" گیرے ڈمکیش ...... محمد عیسیٰ، ینگ ہسبنڈ رالنگ رائنڈر اور دیگران کے کارواں لیڈر، جو یکم جون ۱۹۰۷ء کو ۵۳ برس کی عمر میں سوین ہیڈین کی سروس میں چل بسے ہیں"۔ اِس موقعے پر میرِ کارواں سے خطاب کرتے ہوئے

ہیڈین نے تُرکی زبان میں مرحوم کو جن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا وہ محمد عیسیٰ
عظمت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

''اپنے تمام سفر کے دَوران میں نے اُس جیسا قابل، تجربہ کار اور وفادار
کارواں لیڈر کبھی نہیں دیکھا۔ اُس نے کارواں کا نظم وضبط برقرار رکھا۔ وہ اُس
کے باپ تھے۔ اُس نے جانوروں کا بہت اچھا خیال رکھا۔ وہ نہایت ہی قابل
مترجم تھے اور تبتیوں کے معاملے میں محمد عیسیٰ نے اِنتہائی حکمتِ عملی کا ثبوت دیا۔
اور خوش مزاجی اور طبعی ظرافت سے سب کو خوش رکھا۔ مشکل صورتِ حال میں
اُس نے آسان راہ نکالی۔ اجنبی ملک میں بہترین راستے کی تلاش میں وہ
دَرّوں پر چڑھے۔ چوٹیاں سَر کرلیں۔ وہ ہمیشہ خود گئے اور دوسروں کو نہیں بھیجا۔
ہم اس کو ہمیشہ احترام سے یاد کریں گے۔ اُس نے ایشیا کی کھوج میں اپنی اعلیٰ
کارکردگی سے نام سے پیدا کیا ہے۔ مرحوم نے گذشتہ تین سال میں وفاداری
اور دیانتداری سے میری طرح متعدد یورپیوں کی خدمات انجام دیں۔''

ہیڈین نے اپنی مشہور کتاب Trans Himalayais میں
جابجا محمد عیسیٰ کا ذکر کیا ہے۔ بقولِ ہیڈین' ایشیا میں محمد عیسیٰ کی بڑی قدر
ومنزلت تھی۔

رالنگ (Rawling) اَپنے تاثرات جیو گرافیکل جرنل، اپریل
۱۹۰۹ء صفحہ ۴۲۲ میں ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

سکاڈزونگ (Skaudzing) کا ذکر کرتے ہوئے مجھے سون
ہیڈین کے وفادار خادم کے احترام میں ایک لمحہ رُک جانا چاہیئے، جو یہاں فوت
ہوئے، وہ نہایت ہی معتمد اور اَپنے فرائض کی اَدائیگی میں غیر متزلزل انسان

تھے۔ ایشیا پر اُپنے تمام ہم وطنوں سے اس کی معلومات زیادہ تھیں۔ اس کی یہی وجوہات ہیں۔ وہ ینگ ہسبنڈ کے ساتھ چین کے مشہور سفر پر روانہ ہوئے وہ کیلے کے ہم سفر تھے وہ ڈلگیشن کے ہم سفر تھے جو بعد میں مارے گئے۔ محمد عیسیٰ بے یارومددگار دیکھتے رہے۔ رودوقِ کی مہم میں محمد عیسیٰ کارواں لیڈر کی حیثیت سے میرے شریکِ سفر تھے۔ حالیہ سفر میں وہ سون ہیڈین کے ہمسفر تھے اور تیس سال تک وفادارنہ خدمات کے بعد ایک ویراں مقام پر اِنتقال کر گئے۔

اِسی طرح ینگ ہسبنڈ، اوکونورا اور رائڈر نے محمد عیسیٰ کے مرنے پر گہرے دُکھ کا اظہار کیا ہے۔

محمد عیسیٰ کو کارکردگی کے لئے ینگ ہسبنڈ کی طرف سے دیا ہوا تمغہ اور سند آج بھی اس کے لواحقین کے پاس ہے۔

قلم غلام رسول

تاریخ کے اُستاد ہمیں بتاتے ہیں کہ اگر قلم رسول اُپنے سفر کی روداد لکھتے تو مشہور سیاح مارکو پوپو کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا۔

مارکو پولو کی طرح قلم غلام رسول نے، جو قلم رسول کے نام سے مشہور ہے صحرائے گوبی کی خاک چھانی ہے۔

قلم رسول کے متعلق لیہہ میں یہ مثال مشہور تھی کہ اُس نے ساری زندگی گھوڑے کی پیٹھ پر گزاردی۔ اگر ہم اس کی زندگی کی ساری کڑیاں ملائیں تو اس کی سچ سچ توثیق ہوتی ہے۔

کمسنی میں اُس کے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ چنانچہ دس برس کی

عمری میں اُسے زندہ رہنے کے لئے جدو جہد کرنا پڑی۔ ایک انگریز جوائنٹ کمشنر نے اِس کمسنی میں قلم غلام رسول کو بھیڑیں چرَانے اور بطخوں کی دیکھ بھال کے لئے ملازم رکھا۔ دو سال بعد جب جوائنٹ کمشنر تبدیل ہوا تو اُس کی ملازمت بھی چھوٹ گئی۔ اِس کے بعد اُس نے بہت سارے یورپی سیاحوں کے ساتھ کم عمری میں چھوٹے چھوٹے سفر کیئے۔

وہ گلوان رسول کا ہمعصر تھا، ینگ ہسبنڈ، ڈینمور اور اُمریکی سیاح کپتان لٹیل ڈیل کی مہمات میں دونوں کے ساتھ تھے۔ قلم رسول نے لیٹل ڈیل کی بڑی تعریف کی ہے۔

قلم رسول نہایت ہی زندہ دل، رنگین مزاج اور ظریف تھا۔ لیہہ میں اس سے وابستہ آج تک کئی لطیفے ہیں۔ گلوان رسول نے بھی اپنی کتاب جس کا عنوان Servant of the Sahibs میں ایک دُو لطیفوں کا ذکر کیا ہے۔ گلوان لکھتا ہے۔

> ''قلم رسول بڑا فضول خرچ تھا اور بڑی دلچسپ گفتگو کرنے والا تھا۔ پچھلے مضمون میں، میں نے غلام رسول کی آپ بیتی کا ذکر کیا ہے۔ منشی محی الدین مرحوم نے ۱۹۳۳ء میں یہ آپ بیتی نوٹ کی ہے۔ قلم رسول اس وقت ۶۳ برس کا تھا۔ وہ اپنے متعلق کہتا تھا۔''

'' میں اب تریسٹھ سال میں پہنچا ہوں، اِسے بڑھاپا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میری صحت وتندرستی دیکھئے میں ابھی جوان ہوں، میرے بال اور داڑھی قدرے سفید ہوگئی ہے لیکن آج کے پنتیس سالہ نوجوان کے بال اور داڑھی اس سے زیادہ سفید ہیں۔ میرا قد ریا پانچ فٹ چار انچ ہے اور رنگ گندمی ہے۔''

ڈیڑھ سال تک وہ چینی ترکستان اور لداخ کے درمیان ینگ ہسبنڈ کے خطوط کے تبادلے کا کام کرتا رہا۔اس کے بعد گلگت اور استور کا سفر کیا۔

۸۹۵ء میں قلم رسول نے امریکی سیاح جارج آر لٹیل ڈیل کے ہمراہ تبتّ کا سفر کیا۔اُن دنوں تبتّ میں یورپیوں کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔یہ لوگ اصلی رَستے کو چھوڑتے ہوئے اور مزاحمت کا سامنا کرتے ہوئے تبتّ کی راجدھانی لہاسہ پہنچ گئے۔ یہاں مُسلح تبتیوں نے اُن کو لہاسہ جانے سے روک دیا اور تبتیوں اور لداخیوں کے درمیان جھڑپ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جب لٹیل ڈیل مایوس ہوا تو اس نے مسلح تبتیوں کے حاکم سے استدعا کی کہ کارواں کے دُولداخیوں، قلم رسول اور صنا آخون کو لہاسہ تک جانے کی اجازت دیدی جائے تاکہ وہ دلائی لامہ کے تحفے اور نذرانے پیش کر کے اُن سے رسید لیکر واپس چلے جائیں لیکن حاکم نے یہ درخواست قبول نہیں کی۔ چنانچہ یہ دونوں ایک ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ایک میل آگے تقریباً ایک ہزار مسلح تبتیوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ''چھوت چھوت'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے دونوں گھوڑوں کی دُم اور ایال کے بال اُکھیڑنے لگے۔حتیٰ کہ دُم اور ایال کے سارے بال صفاچٹ ہوئے اور کمپ تک واپس لائے۔ انہوں نے دونوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی اور نہ اُن پر ہاتھ اُٹھایا۔

قلم رسول نے اپنی آپ بیتی میں اس سفر سے متعلق اپنے دلچسپ تجربات اور مشاہدات کا ذکر کیا ہے جن کیلئے الگ باب درکار ہے۔ واپسی کے سفر میں لیہہ پہنچنے میں اُن کو دو ماہ سے زیادہ کی مدت لگی۔

قلم رسول کو جس سفر سے شہرت ملی وہ ویلبی (welbay) کی مہم تبتّ

ہے یہ ۱۸۹۶ء میں کپتان ویلبی اور کپتان سرنیل ملکولم کی سرکردگی میں لیہہ سے تبت گئی تھی۔ کارواں رستے سے بھٹک گیا اور ڈیڑھ ماہ تک ایک ایسے علاقے سے گذار جہاں کوئی انسانی آبادی نہیں تھی۔ سامان خورد ونوش ختم ہوگیا۔ بہت سے گھوڑے مر گئے۔ ویلبی نے بندوق کی نوک پر قلم رسول، اُس کے چھوٹے بھائی جُمہ مالک، عثمان چونکا، اور محمد رحیم کو ایک ویران مقام پر چھوڑ دیا، اور کارواں کے باقی اَفراد شکور علیم، لسو آرغون، ایشے چھرنگ اور افغان شہزادے کو اَپنے ساتھ لیا۔ عثمان چونکا بڑا طاقت ور اور جوشیلا جوان تھا۔ اُس نے ویلبی کو مارنے کا منصوبہ بنایا لیکن قلم رسول اور جُمہ مالک نے اُسے باز رکھا۔

شروع شروع میں چاروں ویلبی سے ایک یا دو دِن پیچھے سفر کرتے رہے۔ بُھوک سے مجبور ہو کر یہ گھاس پات کھانے لگے۔ کہیں گھاس پات بھی نہیں ملی۔ انہوں نے اَپنے چمڑے کے کپڑے اور جوتے تک چاٹ لئے۔ ایک مقام پر ان کو ایک مُردہ جانور کی لاش ملی۔ قلم رسول نے اِس کی ٹانگ کو بھون لیا اور یہی چاٹتے اور بھنبھوڑتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا۔ صحرائے گوبی کی وسعتوں میں بھٹکتے ہوئے یہ منگولوں کی ایک بستی میں جا پہنچے جہاں وہ کچھ دنوں گڈریے کا کام کرتے رہے۔ وہاں سے ایک دن رُفو چکر ہوئے اور چین پہنچے۔ اُن دنوں چین کے ایک شہر میں فرقہ وارانہ فساد تھا۔ مقتولین کے سر جا بجا لٹکے ہوئے تھے۔ یہ فساد ایک مسلمان اور ایک بودھ قصاب سے شروع ہوا تھا۔ ان دونوں کی دُکانیں آمنے سامنے تھیں۔ گوشت کے لٹکے ہوئے دھڑوں پر مکھیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اس پر مسلمان قصاب نے بودھ قصاب سے شکایت کی تھی اور دُکان بند کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ بودھ قصاب نے نہیں مانا۔

اس بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور سارا شہر فساد کی لپیٹ میں آ گیا۔

یہاں انہوں ے کچھ مدت سخت مزدوری کر کے گذارہ کیا اور ایک دن ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چینی ترکستان روانہ ہوئے۔

اُدھر لیہہ میں ان کے عزیز و اقارب نے ان کی زندگی سے مایوس ہو کر فاتحہ خوانی و سوئم وغیرہ کی رسومات اُدا کیں۔

تین برس بعد جب یہ لیہہ پہنچے تو لوگ ششدر رہ گئے۔ عثمان چونکا ان کے ساتھ نہیں تھا۔ آپ بیتی میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔

قلم رسول نے اپنی آپ بیتی میں اس سفر کے کچھ احوال دیئے ہیں یہاں ان کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔

''کارواں میں کُل بارہ آدمی اور تیس چالیس گھوڑے تھے۔ تختہ آخون کارواں لیڈر تھا جس کو اس قسم کی سفر کا خاص تجربہ نہیں تھا۔ لیہہ سے روانگی پر ہمیں منزلِ مقصود اور سفر کی تفصیل نہیں بتائی گئی تھی۔ جب رَسد کم ہونے لگی اور مال مویشی مرنے لگے تو ویلبی نے مجھے تختہ آخون کے بجائے کارواں لیڈر بنایا۔ میں نے صاحب بہادر کو کہا۔ اب میرا کارواں لیڈر بنانے سے کیا فائدہ ہے۔ اگر لداخ میں ہم میں سے کسی کو کارواں لیڈر بنایا ہوتا تو بہتر انتظام کر سکتا تھا۔ سفر کئے تقریباً ایک ماہ بیت گیا۔ سامان خورد و نوش ختم ہونے لگا۔ کئی گھوڑے مر گئے جو زندہ بچے وہ بھی مرنے کے قریب تھے۔ صرف دس بارہ خچریں رہ گئیں۔ ویلبی کو بہت سارا سامان چھوڑنا پڑا۔ راشن کا استعمال احتیاط سے ہونے لگا۔ اس حالت میں بھی دس پندرہ دن سفر جاری رہا لیکن آبادی نہیں ملی۔ اب صاحب بہادر نے کہا۔ جو لوگ جانا چاہتے ان سے کہہ دو وہ واپس جا سکتے

ہیں۔ میں نے سب کو بتایا۔ کوئی جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سب نے کہا۔ زندہ گھر پہنچنا ناممکن ہے۔ رستہ اِتنا دُوبھر ہے جس جگہ پیر پڑتا ہے۔ دوسرا پیر پڑنے سے پہلے ہَوا سے قدم کا نشان مِٹ جاتا ہے۔ ایسے میں رَستہ کیسے ملے گا۔ ہمیں تنخواہ نہیں چاہئے صِرف صاحب بہادر اُپنے ساتھ لیں۔ ہم جئیں گے تو اِکٹھے جئیں گے اور مَریں گے تو اِکٹھے مریں گے۔"

بہر حال سفر جاری رہا۔ تختہ آخون اِس کٹھن سفر سے بہت کمزور ہو گیا تھا اور سلو کو بندوق کی اِتفاقیہ گولی سے مجروح ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ ہونے کی ہدایت ہوئی۔ کئی روز وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتے رہے اور شام کو پڑاو پر ہم سے آ ملتے لیکن ایک دن وہ دونوں نہیں پہنچے۔ بعد میں ان سے متعلق کچھ نہیں سُنا غالباً دونوں مر گئے تھے۔

آخر کار صاحب بہادر نے بندوق کی نوک پر عثمان چونکا، جُمہ مالک، محمد رحیم اور راقم کو کارواں سے نکال دیا اور تین لداخی شکور علی، ایشے چھرنگ، لسو آرغون اور اُفغان شہزادے کو اُپنے ساتھ لیا۔

عثمان چونکا بڑا جوشیلا اور تنومند جوان تھا۔ وہ ویلبی کو مارنے پر تُلا ہُوا تھا لیکن جُمہ اور میں نے اُسے باز رکھا۔

ہم ویلبی سے ایک یا دُو دِن پیچھے چلتے تھے۔ دو تین دن ہم نے بھوکے سفر کیا۔ پھر رَستے میں آٹے کی بوریاں پھینکی ہوئی ملیں۔ ہم نے یہ آٹا کمر سے باندھا اور تھوڑا تھوڑا آٹا مُنہ میں پھانکتے ہوئے اُپنا سفر جاری رکھا۔ چند روز تک ہمیں شام کو پڑاوَ پر آگ جلتی مِلی لیکن ایک دن یہ بھی نہیں ملی۔ روزانہ آگ پر پانی ڈالا ہوا ملتا۔ بعد میں لداخیوں سے معلوم ہوا کہ ویلبی بذاتِ خود آگ بجھا

دیتا تھا۔ ہمارے پاس آگ جلانے کا کوئی آلہ نہیں تھا۔ اِس لئے ہم نے یہ ترکیب سوچی کہ ہر ایک آدمی روزانہ سُوت، پگڑی یا کپڑے کا ٹکڑا پھاڑ پھاڑ کر جلاتا ہوا دوسرے پڑاو تک پہنچا دیتا۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنے قمیض، کرُتے بھی آگ کی نذر کرنے پڑے اور ہمارے بدن پر کپڑے ختم ہونے لگے۔ ہم بہت کمزور ہو گئے تھے۔ راستے میں کہیں کہیں گھاس پات پائی جاتی تھی اور ہم یہی کھاتے تھے۔ کئی مقامات پر یہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ پھر ہم نے چمڑے کی ہر چیز جلا کر پتھر پر کُوٹ کر کھانا شروع کیا۔ حتیٰ کہ کمر بند اور جوتے تک چاٹ لئے۔ گھاس پات کے مقابلے میں چمڑا زیادہ قوّت بخش تھا۔ اِس سے ہم اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔

اِنتہائی کمزوری کے عالم میں بھی زندہ رہنے کی خواہش ہمیں نئی طاقت بخشتی تھی اور ہم اپنا سفر جاری رکھتے تھے۔ چاہے روزانہ ایک یا آدھا میل ہی کیوں نہ چلیں"۔ اِس سے آگے آپ بیتی یک لخت ختم ہو جاتی ہے۔ قلم رسول کے ہم عصروں اور واقف کارواں کے بیانات کے مطابق یہاں سے یہ قزاقستان، چین سے ہوتے ہوئے چینی ترکستان پہنچے جس کا اُوپر مختصراً ذکر آ گیا ہے۔ اِس سفر کی روائداد انتہائی دلچسپ اور حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ اِنتہائی جرأت اور عزم واستقلال کی ایک مثالی داستان بھی ہے۔

قلم رسول نے اِس کے بعد بھی متعدد یورپیوں کے ساتھ سفر کئے لیکن اِن سے متعلق معلومات نہیں ملیں۔

آپ بیتی کے ساتھ مجھے دو سٹرفکیٹ بھی ملے۔ یہ کپتان ویلبی اور اس کے ساتھی کپتان سر نیل ملکولم نے ایشے چھرنگ کو دیا ہے جو اِس سفر میں اُن

کے ساتھ تھے۔ کپتان ویلبی نے اپنے سٹوفکیٹ میں لکھا ہے۔"ایشے چھرنگ وفادار تھا اور اِس سفر میں وہ سب سے مفید نوکر تھا۔ انتہائی نا گفتہ بہ ماحول میں وہ ہشاش بشاش رہتا تھا وہ تبتی زبان لکھ پڑھ سکتا تھا۔ خچروں پر بوجھ لادتا تھا۔ کھانا پکاتا تھا اور کچھ کرنے کیلئے کہا جائے خوشی خوشی کر لیتا تھا۔

سر نیل ملکولم نے کہا ہے:

"ایشے چھرنگ ہمیشہ خوش وخرم رہتا ہے۔ وہ اِس وقت بھی ہشاش بشاش تھا جب حالات دگرگوں اور خوراک کی قلّت تھی۔"

ویلبی اور اُس کی دوسری پارٹی شمالی چین سے ہوتے ہوئے پیکنگ پہنچی بعد میں ویلبی بُوسر جنگ میں کام آیا۔

شکورعلی:۔

شکورعلی بھی محمد عیسی، گلوان رسول، اور قلم رسول کا ہمعصر تھا اور ان کی طرح ایک سرکردہ مُہم پسند اِنسان تھا۔ کئی اہم مہمات میں وہ اُن کے ساتھ تھا۔ وہ پہلا لداخی تھا جس نے ۱۸۷۷ء میں مشہور پیر مستق عبور کیا۔ مستق کا لفظی مفہوم یخ کا پہاڑ ہے۔ یہ پیر سچ مچ ہے بھی یخ کا پہاڑ۔

۱۸۹۰ء میں جب کرنل سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو پامیر کی اہم مہم پر بھیجا گیا، شکورعلی ، ینگ ہسبنڈ کا خانساماں تھا۔

وہ لارڈ ڈنیمور کے ساتھ پامیر کی مہم میں شامل ہوا۔ ان دنوں پامیر، روس چین، افغانستان اور برطانیہ کی سیاسی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا تھا اور ساری طاقتیں ایک دُوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ ویلبی کی پُر آشوب مُہم میں وہ بھی کارواں کا ایک اُہم فرد تھا۔ ویلبی نے اُس کو اُپنے ساتھ لیا تھا۔

۱۹۰۷ء میں وہ ہیڈین کے ساتھ تبت گیا۔ وہ شکور علی کو اِن الفاظ میں یاد کرتا ہے۔

"وہ فطری ظریف تھا۔ جب وہ مُنہ کھولتا تو آدمی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ وہ تجربہ کار اور کم تجربہ رکھنے والے لداخیوں میں میرا سب سے پُرانا واقف کار تھا۔"

ویلبی کی اَلمناک مہم ۱۸۹۶ء کے ایک سال بعد وہ متبرک جھیل مانسرور کی کشتی رانی کی مہم میں وہ میرے ساتھ تھا۔ وہ میرا ممد و معاون ہی نہیں تھا بلکہ اَپنی ظرافت سے میرے لئے تفریح کا سامان بھی فراہم کرتا تھا۔ شکور علی دیانتدار، صحت مند اور طاقتور اِنسان تھا۔ وہ اُپنا کام کہے بغیر اور کسی سے جھگڑا کئے بغیر سرانجام دیتا تھا اور ہر قسم کا فریضہ انجام دینے کیلئے ہر آن رضامند اور کمر بستہ رہتا تھا۔ جھیل کے وسط میں جب ہمیں طوفان نے آگھیرا اُس وقت بھی وہ پُرسکون اور خوش مذاق تھا۔ میں نے دُوبارہ سے ایک بچے کی طرح روتے دیکھا پہلی دفعہ جب محمد عیسیٰ کی نعش سُپردِ خاک کی گئی اور دوسری بار جب ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔ ینگ ہسبنڈ نے اُپنی ایک مہم سے متعلق لکھا ہے۔

"ہم ایک گلیشر کے پاس پہنچے جس سے ایک تیز نالہ نکل رہا تھا۔ ہمیں یہ نالہ عبور کرنا تھا۔ پانی کمر تک گہرا تھا اور اِس میں یخ کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ میرے پاس بَدلنے کے لئے کپڑے نہیں تھے۔ اِس مَرحلے پر وَفا شعار شکور علی نے، جو میرے ہمراہ اِس سے قبل دُو مرتبہ سفر کر چکا تھا اُپنی رضامندی سے مجھے پیٹھ پر اُٹھایا۔"

"پامیر" میں ڈینمور نے شکور علی سے وابستہ ایک لطیفہ سنایا ہے۔

پامیر کے سفر کے دوران شکور علی کو کھانسی کی شکایت ہوئی۔ ڈینمور نے چوسنے کے لئے اسے Loze-nages دئے۔ کارواں کے دوسرے قلیوں کے کان میں لوزنجیز کی مٹھاس کی بھنک پڑی اور اُن کو بھی یہ کھانے کا شوق ہوا۔ اَب کیا تھا، کارواں کے سارے قلیوں کو کھانسی کی شکایت ہوئی۔ چنانچہ ڈینموز نے اِن سَبوں میں لوزنجیز بانٹے۔

ینگ ہسبنڈ نے شکور علی کی بڑی سراہنا کی ہے۔ اِس کی سفارش پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے شکور علی کو تمغہ اور سَند عطا کی اور وظیفہ مقرّر کیا۔ اِس کی اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف میں ینگ ہسبنڈ نے اپنی کتاب میں اُس کی تصویر نمایاں طور پر شائع کی ہے۔

غلام رسول گلوان

گلوان غلام رسول، جو رسول گلوان یا گلوان رَسول کے نام سے مشہور ہے، لداخ کے چند سرکردہ آرغون مہم پسندوں اور کوہ پیماؤں میں شمار ہوتا ہے۔ اُس کے آباواَجداد کشمیری تھے۔ اس کا دادا اُخیرا گلوان تھا جس کے کارناموں کو اَفسانوی رنگت ملی ہے۔ رسول گلوان کی ماں بلتستان سے لیہہ آئی تھی۔ اُس نے اَپنا بچپن نہایت ہی غربت میں گذارا۔ وہ اُپنی کتاب Servant of the Sahibs میں لکھتا ہے:

> "میں کھال (بکری کی) پہنتا تھا اور گوبر جمع کرتا تھا۔ اَپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ ہم "بُرژے" (ایک سُوکھی جھاڑی) کے لئے بھی جایا کرتا تھا۔ غلام رسول بھی ان میں ایک تھا۔ اَپنے پاپوش سِلانے کے لئے ہم سُو اور دَھاگہ ساتھ رکھتے تھے۔ جب پیاس لگتی تو پتھر

پر برف پگھلا کر اِسے کھال پر ڈال کر پی لیتے۔ اِس طرح ہم پیاس بجُھاتے تھے۔

گلوان رسول پہلے پہل ایک انگریز ڈاکٹر Jrall کے ساتھ سرینگر جاتا ہے۔ ۱۸۹۷ء میں وہ سَر فرانسس ینگ ہسبنڈ کی مُہم میں بطورِ قلی علاقہ پامیر اور چینی ترکستان کا سفر کرتا ہے۔ ۱۸۹۲ء میں وہ لارڈ ڈینمور اور میجر روچے کے ہمراہ پامیر کے خطرناک سفر پر رَوانہ ہوتا ہے۔ اِس سفر کے دَوران چین اور ہند کی سرحد پر ایک وادی کا نام رسول گلوان کے نام پر ''گلوان وادی'' رکھا جاتا ہے۔ یہ وُہی ''گلوان ویلی'' ہے جس کا ہند اور چین کی جنگ کے دَوران اور بعد میں اَخبارات ریڈیو وغیرہ میں خوب چرچا ہُوا۔ یہ نام کیوں پڑا اِس اُجمال کے تفصیل یہ ہیں۔

پامیر جاتے ہوئے رَستے میں خراب موسم اور دُھند کی وجہ سے ڈینمور کا قافلہ بَھٹک گیا۔ یہ لوگ راستے سے ہٹ کر دُشوار گذار پہاڑوں میں بھٹکنے لگے۔ حتیٰ کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ گلوان رَسول کی مُہم جوئی نے اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ رَستے کی تلاش میں نِکلا اور ایک عجیب وادی میں وارد ہوا چنانچہ وہ سارے قافلے کو یہاں لے آیا۔ یہاں سے ایک نئے راستے کا سراغ لگایا۔ لارڈ ڈینمور اِس دریافت پر بہت خوش ہوا اور اُس نے اِس وادی کا نام گلوان کے نام کی مطابقت سے ''گلوان ویلی'' رکھا۔ جسے اَب گلوان نالہ بھی کہا جاتا ہے۔

۱۸۶۵ء میں وہ جارج آرنٹیل ڈیل کے ہمراہ تبت گیا اور مزاحمت کے باوجود کارواں تبت کی راجدھانی لہاسہ سے صرف ۴۲ میل دُور رہ گیا۔ یہاں تبتی

اُن کو روکنے میں کامیاب ہوئے۔ لٹیل ڈیل نے دِلائی لامہ سے اپیل کی کہ ان کے کارواں کو تبت کے علاقے سے دارجلنگ کے رستے واپس ہندوستان جانے کی اجازت دی جائے اور اگر وہ ضرورت محسوس کریں تو کارواں کے سبھی اَفراد کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے لیکن دلائی لامہ کی منظوری نہیں ملی۔ چنانچہ یہ لوگ دوسرے رستے سے لداخ واپس آ گئے۔ گلوان رسول اور قلم رسول اور رزاق آخون نے اِس غیر دوستانہ علاقے سے صحیح سلامت واپس لداخ آنے کیلئے ایک چال سوچی۔ گلوان رسول دلائی لامہ کا ایک نمائندہ بن گیا۔ اس کا ذمہ کارواں کی رہبری اور مدد کرنا تھا۔ قلم رسول کارواں میں چین کا ایک لامہ بن گیا۔ اِس مقصد سے دونوں نے اَپنے سُرخ چوغے بُرو۔ے کار لائے۔ وہ سیدھے سادے تبتیوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے میں کامیاب ہوئے اور باربرداری کے لئے یاک وغیرہ مفت حاصل کئے۔ آخر کار وہ اَہم تجارتی مرکز رودوق پہنچے جہاں لداخی تاجروں سے اُن کی بات چیت ہوئی۔ وہاں سے وہ لداخ لوٹے۔

اِس کے بعد گلوان رسول نے متعدّد یورپی سیاحوں کے ساتھ سیاحت کی ان میں مسٹر چرچ، مسٹر مارٹائن، پادرڈ کے پروفیسر رونالڈ ڈکسن، اٹلی کے ڈاکٹر فیلیپو فلیپی اور امریکہ کے مسٹر روبرٹ براٹ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اَپنے تجربہ، معاملہ فہمی، دیانتداری اور ہوشیاری کی وجہ سے وہ اکثر مہمات میں کارواں لیڈر لیا گیا۔

ینگ ہسبنڈ نے اِن الفاظ میں گلوان رسول کی سراہنا کی ہے۔ "بڑے بڑے کوہ پیماؤں کو ناز ہو سکتا ہے وہ سفر کسی لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ محض شوق کی

وجہ سے کرتا تھا۔"

گلوان رسول کی شخصیت بڑی جاذب اور پُر کشش لگتی ہے۔ اُمریکی سیاح مسٹر لِٹیل ڈیل کی اہلیہ جو سفر میں اُپنے شوہر کے ہمراہ تھی اِس کے متعلق لکھتی ہے۔

"گلوان رسول کو دیکھ کر ہر عورت پہلی نظر میں اِس پر فریفتہ ہو سکتی ہے۔ یہ بڑا خوش اِخلاق انسان ہے۔"

گلوان رسول بعد میں لیہہ میں اقسقال بن گیا جس کا فریضہ لیہہ میں چینی تُرکستان اور لداخ کے مابین آنے جانے والے تاجروں کی دیکھ ریکھ کرنا تھا۔

اس کے علاوہ اُن کے کئی ہم عصر مشہور آرغون مہم پسندوں کے نام بھی لئے جاسکتے ہیں جن کے کام کو مذکورہ بالا مہم جوؤں کی کارکردگیوں کے آئینہ میں تولا جاسکتا ہے۔

اِس صدی کے اَوائل میں چند اور مہم پسند آرغون رہبر اور قُلی ہو گذرے ہیں اِن میں صابر ملک، عبدالخالق، حاجی حبیب اللہ، عزیز شیخ، خوشحال رمضان وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اِس دَور کے آرغون میں اِس وقت حاجی حبیب اللہ اُکیلے بقید حیات ہیں۔ وہ اس وقت اکیاسی برس کے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں وہ ڈاکٹر فیلپو فلیپی نے اُپنے سٹوفکیٹ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ گلوان رسول اِس مہم میں کارواں لیڈر تھا۔ حاجی حبیب اللہ نے ڈاکٹر ٹنکلر کے ساتھ اَکسائی چین، امریکی مہم جو سیاح رابرٹ براٹ کے ساتھ بلتستان میں

باشو بلدور میجر مین کے ساتھ شادکام نالہ کا سفر کیا۔ اُنہوں نے روز ویلٹ اور تھیوڈر روز ویلٹ کے ساتھ بھی لداخ میں مختصر سفر کیا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ اُمریکہ سے لداخ آئے تھے جہاں سے وہ ایک سائنسی مُہم پر چینی تُرکستان روانہ ہوئے۔

میں گذشتہ سال نومبر ۱۹۷۳ء میں لیہہ میں حاجی حبیب اللہ سے ملا۔ اُنہوں نے مجھے اُپنے سفر کی کچھ روداد سنائی۔

لداخ میں ''جنگ مامٹی'' خاندان کی یہ آخری یادگار اَب چراغِ سحری ہے، جو کسی لمحہ گُل ہوسکتا ہے۔

بیسویں صدی کے پہلے رُبع میں صحرائے گوبی کے لوب نور اور چینی ترکستان کے مدفون آثارِ قدیمہ کی کھوج میں کئی آرغون کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہاں سے اِن یورپیوں نے اپنے ساتھ کیا کیا نوادرات لیں اُس کے تذکرہ کے لئے ایک مفصل باب چاہئے۔

خوشحال رمضان

حال کے آرغون مہم جووٗں میں خوشحال رمضان ایک مثالی مُہم پسند آدمی ہوگذرا ہے۔ اُس نے چین، برما، رُوس، تبت وغیرہ کی سیاحت کی ہے۔ زارِ روس کی ایک نواسی اور اس کے شوہر کی جلاوطنی کے ایما میں وہ کچھ مدت کے لئے ان کا معتمد خاص تھا۔ بعد میں وہ ذہنی طور پر ذرا غیر متوازن ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ ڈھنگ سے باتیں نہیں کرتا تھا۔ جب کبھی اُس سے سفر کے حالات دریافت کیئے گئے تو وہ اول فول باتیں بتاتا تھا۔

خوشحال رمضان کے متعلق لیہہ میں یہ تاثر عام تھا کہ بادیہ پیمائی اور مٹر

گشتی میں ہی اُس کی رُوح کو سکون ملتا ہے۔ ایک مقام پر کچھ مدت رہنے کے بعد وہ مضطرب اور بے چین ہو جاتا۔ اور اُس کی مہم جوئی اُسے کہیں سے کہیں لے جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ پیدل سفر کرتا تھا۔ لیہہ سرینگر سڑک بننے سے پہلے جب یہ سفر کٹھن سمجھا جاتا تھا، خوشحال رمضان لیہہ اور سرینگر کے درمیان سال میں کئی مرتبہ اور کبھی سال میں متعدد بار سفر کرتا تھا۔ وہ گھوڑے اور بستر کے لوازمات اور اشیائے خورد و نوش کے تکلفات سے بے نیاز سفر کرتا تھا۔

وہ جہاں بھی جاتا اپنے لئے گذارے کا سامان پیدا کر لیتا۔ کبھی بچوں کے لئے پاپوش کھلونے ٹوپیاں بناتا۔ کبھی ایک چھوٹا موٹا ہوٹل چلاتا۔ جب کچھ رقم پس انداز ہوتی تو خدا کا یہ نیک اور عجیب بندہ دوبارہ سفر پر نکلتا اور اپنی پونجی لٹا دیتا۔ اُس کے پاس نسوار کا ایک ڈبہ تھا۔ کہتے ہیں ہنگامی حالت میں وہ اِس میں چائے بھی بنا لیتا تھا۔

رُمضان اپنے پُرانے ''جنگ بامٹی'' گروپ کی طرح ناچ گانے کا دِلدادہ اور ہنسی مذاق کا شیدا تھا۔

یہ دلچسپ (Colourful) آدمی سرینگر میں دسمبر ۱۹۷۰ء میں اپنے رشتہ داروں اور ہم وطنوں سے دُور کسمپرسی کے عالم میں فوت ہوا۔ وہ رعناواری کے قبرستان میں مدفون ہے۔

لداخ کے دوسرے آرغون مہم جوؤں کی طرح اس کی زندگی، ماضی کے گمشدہ اوراق اور اِس کی قبر گُمنام ہے۔

☆★☆

جلاآلی شاہجہاں پوری

کشمیر کی قدیم مشہورِ عالم صنعتیں

تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں

خطۂ کشمیر اُپنے رُوح پرور مناظر، صحّت نواز آب وہوا، سدابہار مرغزاروں، عشرت فزا وادیوں، دِل کش سبزہ زاروں، جاذب نظر پھولوں اورلذیذوشیرین پھلوں ہی کے لئے مشہورنہیں بلکہ تخلیقی ذہن اور اختراعی صلاحیتوں کے لئے بھی مشہور ہے۔ صنعت اور کشمیریت دو الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ قدرت نے اِس لالہ وگُل کی سرزمین کو اگر ایک طرف پُرکیف وخمار آگیں ماحول اور نموخیز وصحت بخش آب وہوا ہے نوازا تو دوسری طرف ساکنانِ خطۂ گل کے تخیّلات وتصوّرات کو صناعتِ فکر کی دولت سے سرفراز کیا۔

اگرچہ ساکنانِ مرغزار، زمانہ کی نامساعدت سے ہمیشہ شکوہ سنج رہے لیکن فن کاری سے جودِل بستگی بزمِ فطرت سے ساتھ لائے تھے وہ آج بھی اُن

کے خمیر میں داخل ہے۔ اہالیانِ کشمیر کی صناعیاں اُن کے اُس ذوقِ جمال کی نشان دہی کرتی ہیں جو اُن کو اِس فردوس نظر خطہ میں بطورِ ورثہ کے ملا ہے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی تحیّر خیز صناعیوں سے اپنے معاشی مسائل بھی حل کیے لیکن فن کو برائے فن بھی ترقی دے کر اپنی صناعتِ ذہنی کا سکّہ دُنیائے صنعت میں قائم کیا اور جو کچھ حاصل کیا اُس کو ایک مقدّس وطنی فریضہ سمجھ کر حاصل کیا۔ اِس ہمہ رنگ وبُو سرزمین کے چابکدست صناع، صنعت کے ہر شعبہ کو بامِ عروج پر پہنچا کر رہتی دُنیا تک اپنے ملک کا نام روشن کر گئے۔ اگر ایک طرف اُن کے بوقلموں قالینوں اور نظر نواز شالوں نے شہرتِ دوام حاصل کی تو دوسری طرف اُن کی کشیدہ کاری، کارچوبی اور زردوزی کے نادر نمونوں نے بھی قدردانوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔

کشیدہ کاری، کام دانی اور کارچوبی، یہ تینوں الفاظ تھوڑے فرق کے ساتھ ہم معنی اور ہم عمل ہیں۔ چونکہ یہ سب سوزن کاری کی مختلف صورتیں ہیں اِس لئے اِن کے مجموعہ کا نام سوزن کاری کا عمل کہلاتا ہے۔ عرفِ عام میں سوتی یا ریشمیں دھاگوں سے پھول پتی بنا کر کشیدہ کاری اور زرّی کے تاروں سے کاڑھنا کامدانی کہلاتا ہے اور کارِ چوبی میں بھی زرّی کے تاروں سے کام لیا جاتا ہے لیکن اِس میں تاروں کا استعمال نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور کپڑے کی سطح ڈیزائن کاری سے چھپ سی جاتی ہے۔

ہندوستان کی قدیم صنعتی تاریخ کے واقف کار اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اِس سرزمین میں سوزن کاری کا فن قدیم زمانہ سے مقبولِ خاص وعام رہا ہے اور قدامت کے لحاظ سے یہ کہنا کافی ہے کہ اِس کا ذکر مہابھارت

بلکہ ویدوں تک میں موجود ہے۔ کالی داس نے اپنے یگانۂ روزگار ڈراموں میں بھی مختلف النوع کشیدہ کار ملبوسات کا ذکر بڑے دِل کش اَنداز میں کیا ہے۔ راجہ ہرش کی سوانح حیات کی مصنّف ''بانا'' نے بھی یہاں کی خوبصورت اور نظر نواز کشیدہ کاری اور اُس کے حسین و جمیل ڈیزائینوں کی دِل کھول کر تعریف کی ہے۔ مہنجو دارو، ہڑپّا اور مشرقی پنجاب وغیرہ کی کھدائیوں کے سلسلہ میں جو مورتیاں دَست یاب ہوئی ہیں ان کے کشیدہ کار اور زردوز لباسوں، سانچی، پرہٹ اور اجنتا کی مورتیوں کے مشاہدہ سے اِس فن کی قدامت کا پتہ چلتا ہے علاوہ اَزیں وادیٔ سِندھ کی دوسری کھدائیوں کے نتیجہ میں بعض ایسی مورتیاں بھی ملی ہیں جن سے ذکور واُناث کے لباسوں میں کشیدہ کار ملبوساتی یک رنگی نظر آتی ہے۔

تاریخ کی زبان بتاتی ہے کہ کشمیری صنعتوں کی پیشِ رفت کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی کا آغاز ہے اور آج کی طرح اِس وقت بھی سرینگر اور اِس کے ملحقات و توالبات اِس صنعت کے خاص مرکز تھے اور اِن مرکزوں سے ہٹ کر بھی وادی کے مختلف حصوں میں اِس صنعت کا جال پھیلا ہوا تھا اور یہ تمام توالباتی پیداوار سرینگر کے کاروباری ایجنٹوں کے پاس آکر جمع ہو جاتی تھی اور یہاں سے ہندوستان کے صنعتی اور تجارتی مرکزوں میں پہنچ کر بیرونِ ہند برآمد ہوتی تھی۔

اگرچہ چودھویں صدی کے آغاز ہی میں اِس صنعت کے قدم آگے بڑھنا شروع ہو گئے تھے لیکن اِس کی اجتماعی تنظیم اور خصوصی پیش رفت مغلوں کے صنعتی دَور سے شروع ہوئی اور مغل شاہی سرپرستی کے سایہ میں پروان چڑھ

کر اِس کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ موجودہ کشیدہ کاری کا فن بھی مغل سرپرستوں کی نشاندہی کرتا ہے اور آج کی ساری شہرت پُرانی بنیادوں پر قائم نظر آتی ہے۔ مغل سلاطین کے فردوس مثال دَرباروں میں بیرونی ماہرینِ صنعت کے علاوہ کشمیر کے مشہورِ عالم صناع اور فن کار بھی ملازم تھے جو طلائی و نقرئی تاروں سے ملبوسات تیار کر کے انہیں بیش بہا جواہرات سے مزّین کرتے تھے۔ شاہی ہاتھیوں اور گھوڑوں کی جھولوں، درباری شامیانوں اور خیموں کے لئے بھی زردوز کپڑے تیار کرتے تھے۔ مرکز کے علاوہ صوبہ جات میں بھی کشیدہ کاری کے فن نے اہم خصوصیت حاصل کرلی تھی جو رنگوں کی متناسب آمیزش اور ڈیزائنوں کی نظرنوازی کے اعتبار سے بھی ممتاز مقام رکھتی تھی۔

اگرچہ ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں بھی ریشمین کپڑوں پر کشیدہ کاری کے آرٹ کی نمائش کی جاتی تھی، لیکن قدرت کی اِس حسین اور ہمہ رنگ و بُو وادی کے کشیدہ کار صناع اُونی کپڑوں پر بھی اپنے آرٹ کی نمائش کرتے تھے۔ ڈیزائنوں اور نمونوں کی تعداد اگرچہ متعین نہ تھی لیکن ڈیزائنوں کی تشکیل اور رنگوں کی ترتیب کا بنیادی تصوّر بالعموم وادی کے خوش نما مناظر اور ہلکے پھولوں سے مستعار ہوتا تھا اور چونکہ اِن حسین مناظر اور گُلہائے رنگارنگ کا ہند کے دوسرے حصوں میں پتہ نہ تھا۔ اِس لئے وہ رنگینی اور نظر فریبی بھی پیدا نہ ہوسکی جو کشمیری ڈیزائنوں اور نمونوں میں موجود رہی ہے۔

کشمیری کشیدہ کاری کے فن سے پہلے پنج آبہ (پنجاب) کی سرزمین نے اَپنی قربت کے لحاظ سے فائدہ اُٹھایا اور اس علاقہ کو بھی اس فن میں ایک خاص اہمیّت حاصل ہوگئی۔ کشمیری صناعوں نے تجارتی سہولت کے لحاظ سے اس کو

اَپنی صنعت کا ایک ماتحت علاقہ بنالیا۔ اگرچہ ڈیزائن سازوں اور صناعوں کی اکثریت خاص کشمیر سے تعلق رکھتی تھی لیکن پھر بھی مقامی ماحول کا کچھ نہ کچھ اثر اِس پر ضرور پڑا اور یہ علاقہ ہلکی پھلکاری کے لحاظ سے خاص شہرت کا مالک بن گیا۔ کشمیری کشیدہ کاری کو جِس قدر مقبولیت حاصل ہوتی گئی اِس نسبت سے وہ حدودِ کشمیر سے نکل کر ھند کے مختلف آب وہوائی علاقوں میں اَپنے قدم جماتی گئی، سندھ کے علاقہ میں پہنچی لیکن وہاں کی یابس مزاج آب وہوا اِس کو راس نہ آئی۔ کچھ اور آگے بڑھ کر کاٹھیاوار کے ساحلی علاقوں میں پہنچی اور وہاں صناعانِ کشمیر کے تربیّت یافتہ گردوں نے مقامی پسند کا رنگ دے کر اِس میں مزید دِل کشی کے اَنداز پیدا کر دئے اور ایسے انمول نمونے تیار کئے کہ تماشہ بین نظریں اُن کے متنوع سے خیرہ ہونے لگیں۔ وادئ کانگڑہ کی کشیدہ کاری کی صنعت کو بھی حقیقت میں خالص کشمیری صنعت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اِس وادی کے ضلع چمبہ میں کشمیری کشیدہ کاروں نے سَر پر باندھنے اور گلے میں ڈالنے کے لئے مخصوص قسم کے رومال بھی تیار کئے تھے جن پر مختلف رنگ اور وضع کے پھول، بُوٹے، بیلیں حتیٰ کہ خوش نُما پرندوں اور مشہور ہستیوں کی دِلکش تصویریں بھی کشیدہ کی جاتی تھیں۔ بنگال جیسے دُور دُراز علاقہ میں بھی کشمیر کی یہ عام پسند صنعت پہنچی اور مقامی رنگ اختیار کر کے نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ دہلی، لکھنؤ، بنارس اور اِس کے بعد حیدر آباد اور کرناٹک کی طِلائی ونقرئ تاروں کی کشیدہ کاری کی قدیم تاریخ ابھی صفحۂ دماغ سے محو نہیں ہوئی ہے۔ جے پور اور کاٹھیاوار کے چمڑے اور مخمل کے کشیدہ کار جوتے بھی اپنی نفاست و پائیداری کے لحاظ سے تاریخی اہمیت رکھ چکے ہیں۔ سلاطینِ گجرات بھی اَپنی ہُنر پروری

اور فن دوستی کے مظاہرہ میں کسی سے پیچھے نہ رہے بلکہ اِس معاملہ میں اُن کی مساعیٔ جمیلہ کچھ آگے ہی رہیں جن صنائع بدائع سے دنیا اب تک نا آشنا تھی، سلاطینِ گجرات نے اُن کے صدہا کارخانے قائم کردیئے جن میں صناعانِ کشمیر کو اپنی صناعیوں کے جوہر دکھانے کی صلائے عام دی گئی۔ کشمیری صناع بھی اَپنے حقیقی جوہروں اور تخلیقی صلاحیتوں کی نمائش کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ سلاطین گجرات جیسے قدر دانوں کی صلائے عام سے کون اِنکار کرسکتا تھا۔ ان صنعت کاروں نے سرزمینِ گجرات پہنچ کر اَپنی فطری صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھائے کہ دُنیا اُن کے تخلیقی ذہن کے اَنمول نمونے دیکھ کر وَرطۂ حیرت میں پڑ گئی۔ اِن صناعوں کی شب وروز ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ گجرات کا نام صنعتی دُنیا میں ہمیشہ کے لئے مشہور ہوگیا۔ قدردانوں سے خراج تحسین حاصل کرنے کے لئے اِن بے مثال صناعوں نے ہزاروں طرح کی بیش قیمت اور نادر اشیا اَز قسم زردوزی، زربفت، سقراطی، چکن، اَلاَیچہ اور چیرہ وغیرہ ناموں سے ایجاد کیں جو اَندرون اور بیرون ملک گراں تر قیمت پر فروخت ہُوا کرتی تھیں۔ باہر کی دُنیا میں اِن کی اتنی مانگ تھی کہ بَسا اوقات اِس کی تعمیل ناممکن سی ہو جاتی تھی۔ شاہی ہاتھیوں اور گھوڑوں کی جھالریں اور مرصع کار جھولیں اور محلوں کے کارچوب پردے وغیرہ بھی ان کارخانوں میں تیار کئے جاتے تھے۔[1] گجرات میں کشمیری صناعوں کے ہجوم در ہجوم جمع ہو جاتے اور مملکت میں عام صنعتی ترقی کی بنا پر احمد آباد کے قریب ایک اور عالی شان شہر محمود آباد کے نام سے آباد کیا گیا تھا۔ صنعتی ترقی کی ہماہمی کی وجہ سے اس شہر کو جو صنعتی ارتقا نصیب ہوا اُس کی تفصیل اُس

---

[1] تاریخ گجرات صفحہ ۱۴۵

دَور کے مشہور مورخ مرزا احمد علی کے اس تاریخی بیان سے بخوبی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

''الحق بخوبی آں شہر کم تر خواہد بود، چنانچہ آں راز نیت البلاد و عروس المملکت خوانند، اقمشۂ نادرہ بسعی عناعانِ گجرات و کشمیر بعمل می آید، وباکناف واطراف عالم می برند وتجار بری و بحری ازاں متمتع می گردند، بتدریج ارباب صنائع وبدائع فراہم آمدند، وتخصیص کار پارچہ بانی وانواع اقمشۂ وزرّیں وابریشم از جنس کم خواب وسقراطی ومخمل وزری وکار چوب بنابر موافقت آب وہواواورنگ بہار راج بر جمیع ولایت ہندوستان برآمد کردواطرافِ عالم واقصائے بلدانِ ایران وتوران وشام نیام ونشان کار گجرات بوسیلۂ صناعانِ کشمیر مشہور و معروف شدہ بُود''

یعنی سچ تو یہ ہے کہ جو خوبی اور شہرت اِس نوتعمیر شہر کو حاصل ہوئی ہوگی، اس بنا پر یہ شہر زینت البلاد اور عروس المملکت کہلایا۔ کشمیری اور گجراتی صناعوں کی مشترکہ کوششوں سے یہاں ایسے نادرہ کار کپڑے تیار ہوتے تھے جو اطرافِ عالم میں بھیجے جاتے تھے اور برّی و بحری تاجر اُن کی تجارت سے خاطر خواہ نفع حاصل کرتے تھے۔ کشمیر کے اَربابِ صنائع تدریجاً اِس جگہ جمع ہو گئے تھے اور اِن کی کوششوں سے طرح طرح کے زرّیں اور کار چوب کپڑے اَز قسم کم خواب، سقراطی اور مخمل وزرّی وغیرہ مقامی ماحول کے اعتبار سے تیار کئے جاتے تھے جو اپنی خوبی میں باقی ہندوستان کے کپڑوں سے بہت بہتر ہوتے تھے۔ تمام دنیا اور خصوصاً ایران وتوران اور شام میں گجراتی صناعی کا نام کشمیری صناعوں کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا۔

اکبرؔی حملہ کے نتیجہ میں تمام گجرات میں ایک عام سیاسی بحران عرصہ

تک قائم رہا جس کی وجہ سے بہت سے کشمیری صناع گجرات چھوڑ کر کشمیر واپس چلے گئے اور اپنی صنعتی تخلیقات سے سرزمینِ کشمیر کا نام روشن کرنے لگے۔ اَب چونکہ کشمیری صناعوں کو عام مقبولیت ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان حاصل ہو چکی تھی اور بیرونی تاجر، کشمیری زردوزیوں زربفتوں کشیدوں اور تار بادلوں کی تلاش میں دُور دُور کا سفر کر رہے تھے لیکن اِن کو حسبِ ضرورت سامان میسّر نہ آتا تھا۔ اِس لئے اکبر نے لاہور، ملتان، آگرہ، فتح پور اور گجرات وغیرہ میں زربفت وکم خواب سازی اور کشیدہ کاری کے صنعتی کارخانے قائم کئے جن میں کشمیر وملحقات کے اعلیٰ صنعت کاروں کو بُلا کر ملازم رکھا گیا۔ چنانچہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:۔

"کہ از توجہ گیتی خداوند گوناں گوں تماش چہرہ برافروخت و اُستاد ان کار پرداز و ہنرمندان نادرہ کار بطرف کشمیر آمدہ ہنگامۂ آمرزش گرم ساختند و پیش گاہ حضور و شہر لاہور و فتح پورہ واحمد آباد و گجرات کارنامہ ہا پدید آمدند۔ بہ گوناں گوں تصویر نقش وگرہ وشگرف طرح ہاردانی گرفت وعام نوردان کالاشناس بہ شگفت آمدند وقدردانی نادرہ کاران زودیاب ایں مرزنیز آموختند"

یعنی اکبر کی توجہ خاص سے طرح طرح کی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ کشمیر کے ہنرمند اور نادرہ کار اُستادوں نے اِس جگہ جمع ہو کر صنعتی ہماہم پیدا کردی اور لاہور وفتح پور واحمد آباد اور گجرات وغیرہ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور طرح طرح کے ایسے نادرہ کار کپڑوں کا عام رواج ہو گیا کہ فنکارانِ جہاں اُن کو دیکھ کر تعجب میں پڑ جاتے تھے اور ان نادرہ اور چابک دست

صناعوں کی قدر و منزلت کی بنا پر اس فن کاران جگہوں پر بڑی ترقی حاصل ہوئی۔

اکبر کے ذوقِ صنعت گری نے اِن جگہوں کے علاوہ خود سرزمینِ کشمیر میں بھی اِس صنعت کے متعدد کارخانے قائم کئے تھے جن کے صنعتی نوادر سے مدت تک آگرہ اور دہلی کے رشک آرم دَرباروں کی سجاوٹ اور زیب وزینت ہوتی رہی۔ احمد آباد کے زردوزی اور کشیدہ کی زوال پذیر صنعت کو شاہجہاں نے بھی اپنی گجرات کی صوبہ داری کے زمانہ میں ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور متعدد سرکاری کارخانے بھی اِس صنعت خاص کو فروغ دینے کے لئے قائم کئے جن میں کشمیر کے صدہا مشہورِ عالم صناعوں کو بلا کر گراں قدر مشاہروں پر ملازم رکھا گیا۔ کشمیر کے تخلیقی ذہن کے مالک صناعوں کے قدردان حقیقت میں یہ ہُنر شناس اور فن دوست حکمران ہی ہو سکتے تھے کیونکہ اِن کی تخلیقی محنت کا معاوضہ سِوائے ہنر دوست شہنشاہوں کے اور کون دے سکتا تھا جس کے خزانوں میں مالی و دولت کے اَن گنت ذخیرے موجود ہوں، وہی ذہنی تخلیقات کی قیمت اَدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ شاہجہاں نے جہانگیر کو نذر دینے کے لئے اپنی تلوار، جو کارِ چوب اور جواہرات سے مرصّع غلاف کشمیر کے نادرہ کار صناعوں سے تیار کرایا تھا۔ اِس میں دُو لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ دہلی میں معلّٰی اور تختِ طاؤس کے تیار ہونے پر جو دَربار ہُوا تھا اُس میں سونے چاندی کے تاروں کے بُنے ہوئے فرشِ فروش اور زربفت و کمخواب و اَطلس اور دیر دیبا کے زرّیں پردے اور ملازمینِ شاہی کے زرّیں پٹکے کشمیر ایجاد دوست اور اختراع پسند صناعوں نے تیار کئے تھے اِن صنعتی نمونوں میں ایک زربفتی شامیانہ بھی تھا جس کی صرف لاگت کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی اور صناعوں

کی صناعت ذہنی اور شبانہ روز کی دیدہ ریزی کا معاوضہ اور انعام واکبرام کی رقم علیٰحدہ تھی اور اس کا مخملی کشیدہ کارسامان بھی کشمیری صناعوں کو صناعتِ فکر کا نتیجہ تھا اور اس کے طلائی ونقرئی ستونوں کے نقش ونگار بھی کشمیری نقاشوں کا اعلیٰ نمونہ تھے۔اِس دور کے ایک مورّخ کی زبانی اِس کا حال سنیئے۔

''در روزِ نوروز اسپک مخمل زربفت کہ در کارخانۂ سرکار در حدودِ کشمیر کہ ہُنر وران وصنعت گرانِ کشمیر انواعِ صنع دراں بکاردہ بودند و بہ یک لک روپیہ مہیا گشتہ بود وسائبان مخمل وزربفت وستوں ہائے طلاؤ نقرہ بحضور، ارسال واشتہ بودند دراں جشن نوروزی در پیش ایوان رفیع بنیاں دولت خانۂ خاص برآفراشتہ شُد۔''

یعنی زر بفتی مخمل کا ایک قیمتی شامیانہ حدودِ کشمیر کے سرکاری کارخانے میں کشمیری صنعت گروں نے تیار کر کے جشنِ نوَروز کے موقع پر پیش کیا تھا۔ اِس شامیانہ میں طرح طرح کی صنعت کاریوں سے کام لیا گیا تھا اور ایک لاکھ روپے اس کی لاگت تھی۔سائبان زربفتی مخمل کا تھا اور ستون طلائی ودُوسری صنعتکاریوں سے مرصّع تھے اور جشنِ نوَروز کے موقع پر اِس شامیانہ کو بلند بنیاد دولت خانۂ خاص کے سامنے نصب کیا گیا تھا۔اِس صنعت پرور اور ہُنر دوست شہنشاہ کے عہد میں ایک دوسرا مخمل کشیدہ کار شامیانہ پچاس ہزار روپے کی لاگت کشمیری صنعت گروں نے تیار کر کے شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا تھا جس کا طول چوالیس گز اور عرض تینتیس گز تھا۔

''ہم دریں سال در جشن قمری، خاقانِ گیتی سال خرگاہِ مخملی زربفت لغرق کلابتوں باف، بطول چہل چہار درع وعرض سی ودو درع کہ در کارخانۂ سرکار بحدودِ کشمیر، مبلغ پنجاہ ہزار روپے مہیا شدہ بُود برآفراشتہ شُد۔''

عالمگیر کے انتقال کے بعد جب شاہ عالم سریر آرا سلطنت ہوا تو اُس نے بھی چار مخملی ستارہ دار خوش وضع اور مضبوط شامیانے کشمیری صناعوں سے پنسٹھ ہزار روپے کی لاگت سے تعمیر کرائے تھے۔

مغل سلاطین جب کبھی شاہانِ عالم کو تحائف بھیجتے تھے تو اُن میں کشمیری ساخت کے رنگا رنگ قالین، بُوقلموں شالیں اور نظر نواز کارچوبی نوادر ضرور ہوتے تھے جن کے شرفِ دیدار سے سلاطینِ عالم کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں اور اس طرح کشمیری سوزن کاری کا سکّہ سارے عالم پر جم گیا تھا اور اطرافِ عالم سے شاہانہ فرمائشات کی بہتات رہتی تھی۔ علاوہ ازیں جب کوئی سیّاح یا سفیر اپنے وطن واپس جاتا تو کشمیری سوزن کاری کا کوئی نہ کوئی نادر تحفہ اپنے ساتھ ضرور لے جاتا۔ چنانچہ برنیر وغیرہ شاہانِ دہلی کی طرف سے مختلف قسم کے کشمیری کشیدے، تار بادلے اپنے فرمان رواؤں کے لئے لے گئے تھے جن میں کشیدہ کار ملبوساتی نوادر کی تعداد زیادہ تھی۔ اِن نوادر کی شہرت سُن کر مغرب کے تاجروں نے کشمیری ملبوساتی مصنوعات کی خریداری کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ فرانسیسی سوداگروں کے علاوہ یوسف نامی ایک آرمنی تاجر کشمیری کشیدہ کاری اور کارچوبی کے ایک سو (۱۰۰) اعلیٰ نمونے لے کر مصر و رُوما کے سلاطین و اُمرا کے ہاتھ فروخت کرنے کیلئے لے گیا اور مُنہ مانگی قیمت پا کر مالا مال ہو گیا۔

جس رنگ میں سلاطین رَنگے ہوئے تھے عمائدین سلطنت کا اسی رنگ میں رنگنا ایک اصولی بات تھی۔ اِن سر آمدۂ روزگار اُمرا میں ایک نمایاں ہستی خانِ خاناں کی بھی تھی جو علمی سرپرستی کے ساتھ ملکی صنعت و حرفت کی بھی خاص مربّی تھی۔ اس فدائے صنعت نے لاکھوں کے سرمایہ سے ایک دار الحرفت قائم

کیا تھا جس میں کشمیر کے یکتائے روزگار صناع صدہا کی تعداد میں کام کرتے تھے اور ان صناعوں کی نگرانی میں ذہین افراد کو کشیدہ کاری، رزدوزی، زربفت بافی، مخمل سازی اور سراپردے بنانے کا کام بھی سکھایا جاتا تھا۔ اِس دارالحرفت سے متعلق ایک میوزیم بھی تھا جس میں صناعانِ کشمیر کے تیار کردہ صنعتی نوادر بطورِ نمونہ اور نمائش موجود رہتے تھے اور بیرونی نمونوں کے مقابلہ میں صنعت کا کوئی اعلیٰ نمونہ تیار ہونے پر بڑے بڑے انعام واکرام سے اِن صناعوں کو نوازا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں اِس فن کو جو ہمہ گیر ارتقا حاصل ہوا، وہ حقیقت میں کشمیری صنعت کا بالواسطہ ارتقا تھا اور اِسی بنا پر ان تمام ذہنی اختراعات وایجادات کا سارا کریڈٹ کشمیری صناعوں کے مخترع دماغ کو پہنچتا ہے۔

کشمیری صنعت دُوسروں کی نظروں میں

مغل سلاطین کی ہُنر پروری کے نتیجہ میں کشمیر کی اِس صنعت خاص کو جو ارتقا نصیب ہوا، اِس کی مثال ہندوستان کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ برنیر کے بقول ''خطۂ کشمیر کے صناعوں کے تحیّر خیز اور استعجاب انگیز صنعتی نمونے مغل سلاطین کی صنعتی سرپرستی کے نتیجہ میں قدم قدم پر دیکھنے میں آتے ہیں اور ان صنعتی نوادر کو دیکھنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ قدرت نے عروسِ کشمیر کو مغل سلاطین کی آغوشِ تربیّت میں صرف زیورِ صنعت سے آراستہ کرنے کیلئے بنایا تھا۔'' آگے چل کر یہی سیاح اِس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ ''مغل دربار میں ریشم اور سونے چاندی کے تاروں سے کشیدہ کار فرش فروش، زرّیں پردے اور اُمرا کے زرق برق کارچوبی لباس آنکھوں میں خیرگی پیدا کردیتے ہیں اور اِن نوادر کو

دیکھ کر صناعانِ زمانہ کی عقل وَرطۂ حیرت میں پڑ جاتی ہے اور بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کہ مشینوں کی اِمداد کے بغیر کشمیری صناع ایسے حسین وجمیل کشیدہ کار اور کارِ چوب لباس، جن کو دیکھ کر بصارت کا نُور بڑھ جاتا ہے، کس طرح تیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ تمام کمالات اور جذب طرازیاں ان صناعوں کے ذہنی اختراعات کا نتیجہ نہیں بلکہ اُن فن دوست سلاطین کی سرپرستی کا نتیجہ ہیں جن کی سرپرستوں نے ایجاد پسند اور اختراع دوست دماغ پیدا کئے۔"
ایک قدیم سیاح ارمنڈ ورلے نامی کشمیری کار چوبی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "کشمیری صناعوں کے اختراعی ذہن کی بدولت کشیدے اور کارِ چوبی کی صنعت کے ایسے نادرِ روزگار صنعتی نمونے دیکھنے میں آتے ہیں جن کو دیکھ کر خود افلاطونِ عقل بھی تھوڑی دیر کے لئے بادیۂ تحیّر میں پڑ جاتی ہے۔ رنگوں میں ایسا توازن اور ڈیزائنوں میں ایسی دِل کشی کہ باید و شاید! اِن بے مدیل صناعوں کی سوزن کاری ایسی بے مثال ہوتی ہے کہ اِس سے بہتر شاید رُوئے زمین پر نہ ہوتی ہوگی۔ آگے چل کر یہی سیاح مزید استعجاب کے عالم میں لکھتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک کشیدہ کار کپڑا دیکھا۔ اِس پر انگور کی بیل اِن صناعوں نے ایسے خوش نما طریقے سے بنائی تھی کہ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سوزن کاری کا نمونہ ہے یا موئے قلم کی مصوّرانہ گُل کاری۔ کپڑا بھی اِتنا باریک اور سبک تھا کہ اس سے زیادہ ناممکن ہے اور قیمت بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ ولایت میں ایسے برآمد شدہ کپڑے تیس پونڈ فی تھان کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں اور یہاں مجھ کو اس کی قیمت ولایت کی نسبت ایک تہائی بتائی گئی۔" مسٹر بیلن نے اپنی مشہور تصنیف "تاریخِ پارچہ بافی" مطبوعہ ۱۸۴۰ء پر کشمیر کے

کشیدہ کار اور زردوز کپڑوں کے حُسن وجاذبیت اور فردوس نظری سے متاثر ہو کر بڑے پُر جوش انداز میں لکھا ہے کہ کشمیر کے کشیدہ کار صناعوں کے جوفن کارانہ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں وہ اِنسانی دَست کاری نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پَریوں نے تیار کئے ہیں یا فطرت صناع کیڑوں نے ایک خوش نُما جال اُپنے چاروں طرف بُن کر تیار کیا ہے۔'' ایک انگریز مصّنف مسٹر تھارنٹن کے الفاظ میں کشمیری کارِچوبی کے اعلیٰ نمونے سلاطین عالم کی جان تھے اور کشمیری ساخت کی بیش قیمت زردوزیاں اور دُوسری رنگارنگ کشیدہ کار ملبوسات اگر ایک طرف اُمرا و سلاطین کے جسموں کی زینت و آرائش کا باعث تھیں تو دوسری طرف ہلکی پھلکی کشیدہ کاری دُنیا کے عوام کی جان تھی اور دُنیا کے تاجران عوام اور سلاطین پسند کشیدہ کار کپڑوں کی خرید و فروخت سے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے میں مصروف رہتے تھے[1] اس موقع پر مسٹر ٹامس ہالینڈ کے اِس مضمون کا خلاصہ پیش کرنا جو موصوف نے ۱۹۰۵ء کی ایک صنعتی کانفرنس میں پڑھا تھا، دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موصوف کی رائے میں کشمیری کشیدہ کاری اور زردُوزی کا کام دنیا بھر سے بہتر ہوتا تھا، متعدد سوزن کار ایک ساتھ بیٹھ کر بڑے اُنہماک اور توجّہ سے کام کرتے تھے، لیکن مخصوص وضع اور ڈیزائن کے ماہر سوزن کار تنہا کام کرتے تھے اور اعلیٰ دَرجہ کی بیش قیمت زردوزیاں، کشیدے، تار باوے، زربفت اور ریشمین وسادہ کار چکن تیار کرتے تھے جو سلاطینِ عالم کے لئے بڑی دِل کشی اور دلچسپی کا باعث ہوتی تھیں۔ ایک انگریز سیاح مسٹر ڈارلنگ، جو کشمیری کشیدے کے سو اعلیٰ نمونے کر انگلستان پہنچا تھا

---

[1] امپیریل گزٹ آف انڈیا'' جلد دوم صفحہ ۱۵ او ہسٹری آف انڈیا از اودھ بہاری۔

لکھتا ہے کہ ''میں انگلینڈ میں ایک سو قسم کے کشمیری کشیدے کے نمونے کر آیا ہوں، کیا یورپ کے صناع بھی ایسے بیش بہا اور خیرہ کُن نوادر تیار کر سکتے ہیں؟''
بشاری مقدسی نے ہند کے تجارتی شہروں کے حالات کے بیان میں اور ابن الفقیہ ہمدانی نے اپنی مشہور تصنیف ''کتاب البلدان'' میں اور ابنِ خرداذبہ نے ہندوستانی مصنوعات اور خام اشیاء کی برآمدی فہرست میں صنعت پناہ کشمیر کے خوش رنگ وخوش وضع قالینوں اور نظر نواز شالوں کے ساتھ کشمیر کے بے مثال کشیدہ کار اور کارِ چوبی کپڑوں کا ذکر بھی بڑے لُطف سے کیا ہے اور ان کی رائے میں کشمیر کی نظر فریب اور شاہ پسند مصنوعات، یعنی بوقلموں قالین، رنگا رنگ شالیں اور کارِ چوبی کا صد رنگ سامان عربوں کی وساطت سے مشرق ومغرب کے دُور دراز گوشوں میں پہنچا کرتا تھا۔

غرض کہ اِس دِل کشی اور جاذبیت کی بنا پر کشمیری کشیدہ کاری اور زردوزی کی صنعت بادِ مخالف کے چلنے کی باوصف آج تک زندہ ہے اور غالباً اُپنی عدیم المثال کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہے گی۔

چکن سازی:-

لفظ چکن فارسی الاصل ہے اور چکاون سے ماخوذ بتایا جاتا ہے۔ اس میں سوتی ریشمین دھاگوں سے سوزن کاری کی جاتی ہے۔ بظاہر اِس صنعت کو صوبۂ اَودھ میں پَروان چڑھنے کا موقع ملا لیکن کشمیری کشیدہ کاری اور زری سازی کی ارتقائی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بنیادی چیز یہی سادہ چکن سازی نظر آئے گی جو کشمیر کی رنگین کیفیات کے نتیجہ میں تدریجاً ترقی کر کے زری سازی اور پختہ کشیدہ کاری کے درجہ تک پہنچی۔ سرزمینِ لالہ وگُل میں ریشمین دھاگوں سے

اُنواع واُقسام کی پھول پتیاں بنانے کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آیا ہے اور مغل سلاطین کی سرپرستی سے اِس فن کو حدودِ کشمیر میں کافی فروغ حاصل ہو چکا ہے۔
کشمیر کی سوتی اور ٹسری چکنیں اپنے سادہ کارحسن کی بنا پر بیرونی دنیا میں بھی پسند کی جاتی تھیں اور ہزاروں لاکھوں کشمیری صناعوں کی روزی کا ذریعہ تھیں۔
اِس کے پیچیدہ ٹانکے اِس قدر باریک ہوتے تھے کہ اُن کو اِنسانی انگلیوں کی سوزن کاری کہنا مشکل تھا۔ حتیٰ کہ دُنیا کے مشہور دَست کار بھی اِن ٹانکوں کی نزاکت اور باریکی دیکھ کر دَنگ رَہ جاتے تھے۔

کشمیر کے بعض دست کاروں کی اِس فن میں اِتنی شہرت ہوگئی تھی کہ اُن کے تیار کردہ ٹسری چکنوں کے تھان کی قیمت دو ہزار سے چھ ہزار روپے تک پہنچی ہے۔ اسی فن کارانہ حُسن کی بنا پر اِنگلستان کی فیشن پرست امیرزادیاں وطن دشمنی کے جگر خراش طعنے سنتیں اور ملک کے صنعتی تحفظ کے قانون کی زد میں آکر بھاری جرمانے اُدا کرتیں لیکن اس قسم کے نادرہ کار کپڑے پوشیدہ طور پر منگوا کر پہنتی تھیں۔

ریشم سازی اور پارچہ بافی

ریشم کے کپڑے پالنے کی صنعت بھی یہاں کی ایک قدیم الایام صنعت ہے اور اِس فن میں اہلیانِ کشمیر نے اَپنی ذہنی صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھائے جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ کشمیری ریشم اَپنی عمدگی اور نفاست کے لحاظ سے ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ریشم سے بہت رافع اور اعلیٰ رہا ہے۔

ریشم سازی کی کہانی صدیوں تک دنیا کے اکثر ملکوں میں شہزادوں اور شہزادیوں سے وابستہ رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل

چینیوں نے ریشم کا کیڑا دریافت کیا تھا۔ ایک عشقیہ کہانی میں مذکور ہے کہ سن عیسوی کے آغاز میں ایک چینی شہزادی ریشم کے کیڑے کے انڈے اور شہتوت کے درخت کے بیج سر پر اُوڑھنے کے کپڑے میں چھپا کر ہندوستان لائی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں ریشم کے کپڑے پالنے کی صنعت سب سے پہلے دَریائے برہم پتر کی وادی اور گنگا کے درمیان واقع خطہ میں قائم ہوئی تھی۔اِس سے یہ خیال کرلیا گیا کہ ابتدا میں یہ صنعت باہر سے لائی گئی ہے۔ اِس کے برعکس سنسکرت کے قدیم گرنتھوں میں ایسا ذکر موجود ہے جس سے یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ غالباً چار ہزار قبل مسیح یہ صنعت ہندوستان میں موجود تھی۔ گنگا کی وادی میں یہ صنعت تدریجاً پچھّم کی جانب بڑھی اور وسطِ ایشیا کے اکثر علاقوں میں پھیل گئی۔

ریشم کے کیڑے شہتوت کے درختوں پر پالے جاتے ہیں اور شہتوت کی کاشت کے لئے زمین کی موزنیت سب سے پہلے درکار ہوتی ہے اور کشمیر کی نموخیز سرزمین قدیم الایام سے اس کے لئے انتہائی موزوں رہی ہے اور خام ریشم پیدا کرنے کے معاملے میں یہ ہندوستان کے کسی دوسرے حصہ سے کم نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کی اقتصادی زندگی میں ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعت کو ہمیشہ سے بڑا دخل رہا ہے اور آج بھی ہزاروں کی معاشی خوشحالی کا یہ صنعت ایک اہم ذریعہ ہے۔ کشمیری زمین کی قوت نمو اور آب وہوا کی لطافت اعلیٰ قسم کا ریشم اتنی وافر مقدار میں پیدا کرتی رہی ہے کہ علاقائی ضروریات کے بعد بیرونی ضرورتوں کی تکمیل بھی ہوتی رہی ہے۔

چونکہ کشمیری صناعوں کو اعلیٰ قسم کا ریشم خود اندرونِ ملک اَرزاں قیمت پر

دستیاب ہو جاتا تھا، اس لئے یہاں کشیدہ کاری، کارچوبی اور چکن سازی کے علاوہ ریشمین پارچہ بافی کی صنعت کو بھی خاص فروغ حاصل ہوا۔ یہ سادہ بھی ہوتا تھا اور پھول دار بھی اور سادہ کو چھاپ کر قلم کار بنانے میں یہاں کے صناع اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ مختلف ہلکے اور گہرے رنگوں سے چھاپ کر ایسا نشو نما بنا دیتے تھے کہ نظروں کے سامنے گُل ہائے رنگا رنگ کا چمن سا کھلا معلوم ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس لالہ وگل کی ہمہ رنگ و بُو سرزمین میں قدرت نے ایسے فن آزمودہ صناع پیدا کئے تھے جو ملک کے خام ریشم سے ایسے نظر نواز اور دیدہ زیب ریشمین کپڑے تیار کرتے تھے جن کو دُنیا سر اور آنکھوں سے لگاتی تھی۔

اکبر اور جہانگیر نے مختلف مقامات پر ریشمین پارچہ بافی کے جو کارخانے قائم کئے تھے ان میں کشمیری ریشم کا بڑا حصہ صرف ہوتا تھا۔ ابوالفضل نے اِن میں سے بہت سے کپڑوں کے نام بھی تحریر کئے ہیں جو کشمیری ریشم سے تیار کئے جاتے ہیں جن میں دیبائے یزدی، قطنی، طاس گجراتی، خانی، سہ رنگ، تانِ فرنگی، ریزئی، تافتہ، مطبق اور دیبائے فرنگی نام کے کپڑوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی اورنگ زیبی عہد میں کشمیری ریشم سے جو اعلیٰ قسم کا کپڑا تیار کیا جاتا تھا اُس کی تفصیل کپتان الیگزنڈر نے اپنے سفرنامے میں بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کشمیری ریشم سے ہندوستان میں ایسا اعلیٰ کپڑا تیار کیا جاتا ہے کہ اِس کی مثال یورپ میں ملنی بہت دشوار ہے اور وہ اتنا باریک، ملائم اور پائیدار ہوتا ہے کہ میں نے عمر میں اِس مجموعی خوبی کا کپڑا نہ دیکھا اور نہ کبھی استعمال کیا۔"

کپتان موصوف نے اپنے سفرنامے میں دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ:

اُورنگ زیب کے دورِ حکومت میں کشمیر کی ریشمین پارچہ بافی کی صنعت درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی اور اتنا کپڑا تیار ہوتا تھا کہ غیر ملکی ضروریات کی بھی کفالت کرتا تھا اور بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور بہت اچھے داموں میں فروخت ہوتا تھا۔"

پٹو سازی

سرزمین کشمیر ریشمین پارچہ بافی کی طرح اُونی مصنوعات کے لحاظ سے بھی مشہورِ عالم رہی ہے اُون کے بُنے ہوئے چغے، گاؤن، جیکٹ اور زنانہ کوٹ اپنی خُوبی اور نفاست کے اعتبار سے دنیائے صنعت سے خراجِ تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔ یہ تمام چیزیں نہ صرف سادہ کام ہوتی تھیں بلکہ اُن پر نہایت دِل کش اور دیدہ زیب گل کاریاں بھی کی جاتی تھیں۔ کاشمیرا نام کا اُونی کپڑا، جو ہندوستانی ملوں اور کھڈیوں پر تیار کیا جاتا ہے حقیقت میں یہ اسی صنعتی وادی کے کاشمیرا کی نقل ہے لیکن صنعت پارچہ بافی کی اس ہمہ گیر ترقی کے باوصف ہندوستانی ملوں کا تیار کردہ کاشمیرا وادی کے قدیم کاشمیرا کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کشمیری اُون سے نہ صرف کاشمیرا وغیرہ تیار کیا جاتا تھا بلکہ اعلیٰ قسم کے کمبل اور لوئیاں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ آج بھی وہاں یہ چیزیں تیار ہوتی ہیں اور اپنی خوبی اور نفاست کے لحاظ سے دُنیا بھر میں مشہور ہیں اور اِسی قدیم شہرت کی بنا پر ہندستان کے اکثر و بیشتر پارچہ فروش دوسری جگہوں کے گھٹیا سامان کو کشمیری سامان کے نام سے فروخت کر کے مُنہ مانگی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔

کشمیری ساخت کے تمام اُونی کپڑوں میں پٹو (ٹویڈ) کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی اور تمام اُونی کپڑوں میں گرم ترین کپڑا مانا گیا ہے۔ پائیداری

اور اَرزانی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ کشمیری زبان میں پَٹُو اُس اُون کا نام تھا جو ایک خاص قسم کے بھیڑ سے حاصل کیا جاتا تھا۔ مگر مرورِ زمانہ کے ساتھ اِس اُون سے تیار کردہ کپڑا پٹو کہلانے لگا اور راجہ سے پرجا تک اس کا استعمال عام ہوگیا۔ آبادی کے اضافہ اور کشمیری حددو سے باہر جانے کی وجہ سے جب اس خاص قسم کے بھیڑوں کا اُون کافی نہ ٹھہرا تو آس پاس کے پہاڑی علاقوں سے مختلف قسم کا پشم حاصل کر کے پٹو تیار کیا جانے لگا۔ زمانہ نے ہزاروں کروٹیں بدلیں مگر اس کی ساخت اور شہرت میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔

تاریخ کی وَرق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ محمود کے حملوں کے زمانہ میں یہاں کے راجہ اور اس کی فوج کا لباس بفرقِ اِقسام اِسی پٹو کا بنا ہوتا تھا۔ محمود کے دَرباری ملکُ الشعرا عنصری نے اِس شعر میں پتو پوش راجہ سے اِسی پٹو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بیا ساقی، بہ شادی مےُ گُنم نوش

سپر اندِ اختہ از خود پتو پوش

مسلمانوں کے عہدِ تصرف میں ''تبت خورد و کلاں'' تو البات کشمیر میں شامل تھے اور لداخ بھی آج کی طرح کشمیر کا حصّہ تھا۔ اِن جگھوں پر بھی پٹو وغیرہ تیار کیا جاتا تھا۔ اگر چہ ساخت کے لحاظ سے یہ کافی مضبوط اور گرم ہوتا تھا لیکن خالص کشمیری پٹو جیسی صفائی، عمدگی اور نفاست کبھی پیدا نہ ہوسکی۔ اِس فن کے جو ماہر کشمیرِ خاص میں موجود تھے وُہ اُن علاقوں میں نہ تھے۔

☆★☆

فاروق نازکی☆
مترجم: فاروق اَنوار مرزا

اَرِینی کی کشمیر سے متعلق یادداشتیں

اریِنی پیٹری (Irne Petrie) ایک مشنری کی حیثیت میں ڈوگرہ دَور میں بَرطانیہ سے کشمیر آئی۔ اُس نے اُپنی یاداشتیں ایک ڈائری کی صورت میں مرّتب کیں جسے بعد میں مسز اُشلیے کروز وِلسن (Mrs. Ashley carus wilson) نے کتابی شکل دی اور یہ کتاب Irne Petrie-Missionary to Kashmir کے نام سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔

اریِنی ایلنیورا اوریتا پیٹری، کرنل مارٹن پیٹری کی تین بیٹوں سے سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ وہ ہینوور لاج کنگسٹن' برطانیہ میں پیدا ہوئی۔ اُن کا کوئی بھائی نہیں تھا اور بڑے لاڈ پیار سے اُس کی پَرورش کی گئی۔ ہر ممکن کوششیں کی گئی کہ وہ شہری زندگی کے تناؤ سے آزاد رَہے۔ اُن کا گھر ایک روائیتی طرز کا

☆ شِو پورہ۔سرینگر کشمیر

لیکن صاف ستھرا مکان تھا۔ اُن کے گھر میں سنسنی پھیلانے والے اُخبارات نہیں آتے تھے، البتہ اُنہیں اِخلاقی کتابیں پڑھنے کیلئے دی جاتی تھیں۔

والدین انہیں اکثر تواریخی واقعات سُناتے جو کہ ''دی ٹائمز'' اور ''اَلسٹریٹیڈ نیوز لندن'' وغیرہ میں شائع ہوتے۔ اِس سے اُن میں وہ تواریخی شعور پیدا ہوگیا کہ وہ چھوٹے ذاتی مفادات اور تنگ نظری سے بالاتر ہوگئیں جِس کی جھلک اُن کے بول چال اور راہ وَرسم میں دِکھائی دینے لگی۔

ایرینی، فطرت کی شیدائی تھی اور جانوروں اور پھولوں کے ساتھ اُسے خاص لگاؤ تھا۔ بچپن میں ایَرینی کو "Sunbeam" کہا جاتا تھا اور ایک درخشاں اور پیارے بچّے کے طور اُس کا ذکر کیا جاتا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اُس کا چہرہ خُوش کن تھا اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے ایسا پُر اعتماد چہرہ اور کہیں دیکھا ہو''۔ یہ اَلفاظ وہ شخص لکھتا ہے جس نے اُسے صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا لیکن اِس خوش کُن چہرے کے پیچھے تدبر اور تفکر کا شاید ہی کس نے اندازہ کیا ہو۔

جب وہ صرف دس سال کی تھی تو اُس کی بہن اُویلن مارٹینا مائٹن پیٹری، بارہ سال کی عمر میں اِس جہاں سے رُخصت ہوگئی۔ یہ ایک ایسا زخم تھا جِسے اُلفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور نوخیز ایرینی تمام عمر اِس اَندوھناک واقعے کو بھول نہیں پائی۔

جب ایرینی اپنی زندگی کی دوسری دہائی میں داخل ہوئی تو اس کی سوچ کے دَھارے میں بعض نظریاتی اِنقلاب رونما ہوئے۔ اگرچہ اَپنی کم سِنی کی وجہ سے وہ اَپنے جذبات کی شدّت کو قابو میں نہیں کرسکتی اور اس کی دوشیزگی بعض سوالات سے دوچار ہوگئی۔ ''میرے لئے زندگی کیا مطلب رکھتی اگر ہم واقعی

غریب ہوتے ؟'' اُس نے اِس سوال کے بہت سے جوابات ڈھونڈے۔ ''امیر، پرواز کے لئے بہت مضبوط پنکھ رکھتے ہیں لیکن کیا زندگی کا سُکھ عیش و عشرت کے اَسباب کی رسائی تک ہی ہے؟''

جب وہ پندرہ سال کی ہوئی تو اُس نے ذاتی ڈائری مرّتب کرنا شروع کی۔ یہ وہ عادت تھی جو مرتے دَم تک اُس کے ساتھ رہی۔ یہ وہ ریکارڈ ہے جس میں اُس کے روزمرّہ کی مصروفیات منضبط ہیں اور یہی اُس کی معرکہ خیز سوانح عمری مرّتب کرنے کا محرّک بنی۔ اَیرینی کی تعلیم کی کہانی ہمیں عندیہ دیتی ہے کہ عام طورصرف اَپنے لئے جینے کی چارہ کے برعکس بعض لوگوں کے لئے زندگی دوسروں کے کام آنے کی بھی چیز ہے۔ اُس کے لئے زندگی حصولیابیوں خدمتِ خلق کا دُوسرا نام ہے۔ اگرچہ کتابوں کی دُنیا میں رہتی تھی لیکن نہ وہ کتابی کیڑا تھی اور نہ کتابی شخصیّت۔

اَیرینی نے تمام برطانیہ میں تاریخ کے مضمون میں امتیاز حاصل کیا۔ اُس کے ممتحنوں نے اَپنی رپورٹ میں لکھا کہ وہ اَدب میں کارہائے نمایاں دکھائے گی لیکن معدودے بعض متفرقہ مقامات کے اُس نے بعد میں اپنے قلم کا زیادہ استعمال نہیں کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعداُس نے ایک مذہبی مبلّغ بننے کا فیصلہ کرلیا اور اُسے اِس مقصد کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ وہ ہندوستان مذہبی جذبے، تربیّت یافتہ ذہن اور خدمتِ خلق کے جذبے سے وارد ہوئی۔ جب ایرینی کے بعض رشتے داروں کو اِسکے مبلّغ بننے کے فیصلے کی آگاہی ہوئی تو انہیں اَچنبھا ہُوا، بعض مغموم ہوئے جب کہ بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں اِس فیصلے سے کوئی

حیرانگی نہیں ہوئی۔

انجام کار، اکتوبر ۱۸۹۱ء میں اُسے ہندوستان جانے کا پروانہ ملا اور اُسے ہندوستان کے شمالی علاقوں کے مشنوں سے وابستہ کر دیا گیا۔ اِسی اثناء میں وہ رابرٹ وِلڈر سے ملی جو کہ برطانیہ میں یونیورسٹیوں میں رضا کار تحریک کا بانی کار تھا۔ وہاں اُسے گھریلو زندگی کو مکمل طور خیر باد کرنے کی تحریک ملی لیکن اُس نے ۱۴ر فروری ۱۸۹۲ء تک اِس بارے میں کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا اور اُس روز اُس نے اپنی ڈائری میں تحریر کیا "Told, May"۔

ایک اِتوار کو وہ اُس آتشداں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جہاں اُس کی ماں بیٹھا کرتی۔ جب اُس نے کہا کہ یہ اُس کی دِلی خواہش ہے کہ وہ کرسچن مشنری سوسائٹی کو اپنی خدمات وقف کر دے۔ ''میں کسی بھی جگہ جانے کے لئے تیار ہوں۔ جتنا میں زیادہ پڑھتی ہوں' میں ہندوستان کو عموماً اور پنجاب کو خصوصاً زیادہ جانتی ہوں۔ پنجاب، جہاں چیلنج بڑا ہے اور کارکردگی کے عمدہ مواقع۔''

گھر چھوڑتے وقت اُسے یہ خیال بار بار آرہا تھا کہ سات سمندر پار اگرچہ اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائیگا لیکن اُس کا گھر اُس سے ہمیشہ کے لئے چھُوٹ رہا ہے لیکن وہ اَپنی بہن کو ایک خط میں لکھتی ہے۔ ''ہم جانتے ہیں کہ ایک دِن ہم اَپنے پیارے گھر میں پھر سے ضرور ملیں گے۔''

ایرینی ۲۷/ اگست ۱۸۹۳ء کو ہندوستان کے لئے رَوانہ ہوئی۔ "Carthage" نامی یہ جہاز ۲۰ نومبر صبح دس بجے بمبئی پہنچا۔ ایرینی لکھتی ہے ''بندرگاہ پر عجب عالم تھا، لال پگڑیوں اور سفید کمر بند باندھے ہوئے لوگ مختلف زبانوں میں چِلاّ رہے تھے۔ آقا اور غلام میں فرق واضح تھا۔ ایک گھنٹے

تک مجھے یہ سب کچھ حیرانگی کے عالم میں مبتلا کرتا رہا لیکن آہستہ آہستہ میں مشرق کے مسرور آگیں ماحول ، پرندوں کے سنگیت ، مقامی نوکروں کی آوازوں میں محو ہوگئی۔ ہمیں ایک ایسی جگہ ٹھہرایا گیا جہاں کھُلے برآمدے اور وسیع و عریض باغات تھے جن میں طرح طرح کے درخت اور سامنے نیلگوں سمندر تھا۔ تصّور کیجئے۔ جولائی کی گرمی، مئی کے شگوفے اور الیسٹر کی تازگی جیسا مِلا جُلا احساس ہو رہا تھا۔ کیا میں خواب دیکھ رہی تھی اور کیا یہ صحیح ہے کہ انگلستان کے باشندے اُس وقت کہرے سے کانپ رہے تھے۔ میں اِسی تصّور میں تھی کہ میری میزبان کی خوبصورت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور اُس نے کمال خندہ پیشانی سے مجھے خوش آمدید کہا۔

ایرینی کے بہت سے دوست تھے اور لاہور جاتے ہوئے اُس کا وقت خوش گپیوں میں کٹ جاتا لیکن اُس کی چارہ تھی کہ وہ فوراً سے پیشتر اُپنے کام میں لگ جائے۔ وہ بمبئی سے دوسرے ہی دن یعنی ۲۱ رنومبر کو رَوانہ ہوئی۔ لاہور کا سفر سڑک سے دس دنوں میں یا تین دِن تین ذاتوں کے ٹرین کے سفر سے طے کیا جاسکتا تھا اور ایرینی نے سفر کا یہی طریقہ اُپنایا۔ راستے میں ٹرین راجپوتانہ کی راجدھانی جے پور، آگرہ، دہلی اور میرٹھ میں رُکی۔ جیسے جیسے اُس کی ٹرین وسیع و عریض میدانوں، صحراؤں اور کھیتوں گاؤں اور شہروں سے گذر رہی تھی ، ایرینی اُپنی ڈائری میں روئداد لکھتی جارہی تھی اور اُس نے خاص طور سے لکھا کہ راستے میں اُس نے کہیں بھی چرچ نہیں دیکھا۔

آگرہ میں اُس نے چودھویں کے چاند میں تاج محل کو دیکھا اور وہاں پہلی بار اُس کی ملاقات ''ہندو کرسچنوں'' سے ہوئی۔ دہلی میں وہ کچھ دیر کے لئے

رُکی۔ وہاں پر اُس۔ نے ایک اَرتھی دیکھی جس کو اُس کے ''نیم برہنہ'' دوست اور رشتہ دار لے جارہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں عجیب طرح کے پنکھا اور دُمامے تھے جن کو وہ ہِلا اور بجا رہے تھے۔ میّت کو مضبوطی سے کَس کر باندھا گیا تھا۔ اس سے ایرینی کے دِل و دماغ پر گہرا اثر پڑا۔ وہ مرنے والے اور اُن لوگوں کے بارے میں سوچنے لگی جو اُسے مَرگھٹ لے جارہے تھے۔ اِس فنا ہونے والی زندگی کا جیتا جاگتا اَنجام!

یکم دسمبر شام کے ۵ بجے لندن سے لاہور تک کا پانچ ہفتوں کا سفر اُپنے انجام کو پہنچا۔ لاہور میں اُس نے سب سے پہلے شاندار کیتھیڈرل دیکھا جسے بشپ فرنچ نے ۱۸۸۷ء میں تعمیر کیا۔ سینٹ ہلڈا خوبصورت یک منزلہ بنگلہ تھا جو کہ یورپیوں کی بستی میں واقع تھا اور یہ کیتھڈرل کے مشرق میں ایک میل کی دُوری پر تھا۔ کیتھڈرل میں روزانہ دوپہر کو دُعائیہ اور تبلیغی مجالس کا اہتمام کیا جاتا، سینٹ ہلڈا میں بیس ہفتوں کے دَوران اُس نے ضلع کے ایک سو پچاس دَورے کئے اور بائبل کی آٹھ کلاسیں لیں۔ گرداسپور کا کمشنر ایک خط میں لکھتا ہے کہ اُس کی تابندہ اور مصروف زندگی مشعلِ راہ ہے اور کہتا ہے کہ میں مِس پیٹری سے پہلے لاہور میں ملا اور اُس کی صلاحیتوں سے بے پناہ متاثر ہوا۔

لیکن اُس کی آنکھیں ایک مخصوص نشانے پر ٹکی ہوئیں تھیں۔ اپنے آپ کو ایک خاص مقصد کے لئے وقف کرنا...... وہ کرسمس کے روز لکھے گئے ایک خط میں لکھتی ہے...... ''میں ایک سچّی پیامبر بننے کے لئے بہت محنت کررہی ہوں لیکن اَب تک بہت کم کرسکی ہوں'' ہندوستان میں ہر نیا تجربہ اُس کے اِرادوں کو اور زیادہ تقویت دیتا تھا۔

جب ایرینی لاہور سے رخصت ہوئی تو اُس کی کوششوں کی بدولت شہر میں بائبل اور میڈیکل مشن کے لئے خواتین کی اچھی خاصی تعداد متحرک ہو چکی تھی۔ کرسچن مشنری سوسائٹی کے قواعد کے مطابق مشنریوں کو دیگر اُمور کے علاوہ مقامی زبان سیکھنی اور اِس میں دسترس حاصل کرنا لازمی تھا۔ لہٰذا ایرینی نے اُردو زبان سیکھنی شروع کی۔ چنانچہ لکھتی ہیں۔

''یہ ملی جلی اور محفوظ زبان جس کے معنی لشکری زبان کے ہیں، اِسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عربی، فارسی اور ہندی کے اختلاط سے پیدا ہوئی اور فی الوقت ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہے۔ یہ بنیادی طور عربی زبان ہے اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی کی علامت ہے۔''

ایرینی ہندوستان میں ذاتی طور زیادہ میل جول بڑھانے کے حق میں نہیں تھی لیکن مشنری میں اِس کی دوستی کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا اور اُس نے چار بار اُمرتسر کی سیر کی۔ جس طرح بنارس ہندوؤں کے لئے متبرک شہر ہے اُسی طرح امرتسر سکھوں کے لئے بہت ہی مقدّس ہے۔ اُمرتسر میں شمالی ہندوستان کے لئے مشنریوں کا ہیڈ کوارٹر تھا اور اُمرتسر کے دورے کے دوران کرسچن مشنری سوسائٹی کے بہت سارے اراکین کے جو کشمیر میں مراسم تھے، اُس سے متعارف ہوئے۔

دریائے سندھ کے معاون دریاؤں میں جہلم کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ پنجاب (موجودہ پاکستان) میں داخل ہونے کے قبل یہ شمال مشرقی علاقوں سے بھی ہو کے گذرتا ہے۔ یہ علاقے اُس وقت کشمیر میں داخل

ہونے کے لئے سب سے موزون خیال کئے جاتے تھے۔ کشمیر کے بارے میں اَریَنی کہتی ہے کہ کشمیر ایک قدیم تہذیب ہے۔ اس کی پانچ ہزار برسوں کی منضبط تاریخ ہے۔ جن کو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

پہلا، ۳۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۳۴۱ء تک کہ اِس پر مقامی راجے حکمراں رہے۔ دوسرا بہت ہی مُشکل دَور تھا جو کہ ۱۳۴۱ء سے شروع ہو کر ۱۸۱۹ء تک کا ہے جس دوران باہر سے آنے والے مسلمان حکمرانوں نے حکومت کی۔ اِس کے دَوران لڑائیاں اور خانہ جنگیاں رہیں۔ ۱۵۸۷ء سے ۱۷۵۳ء تک کشمیر مغل سلطنت کا ایک حصّہ تھا۔ مغل دَور کے بعد کشمیر پر قریب ستر سال تک افغانوں کا سیاہ دَور رہا۔ ۱۸۱۹ء میں کشمیر سکھ حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضے میں رہا اور ۱۸۴۶ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ جموال نے بیغامہ اُمرتسر کی رُو سے اِسے خرید لیا۔ وادیٔ کشمیر جو کہ بہت عرصے تک اَپنے ہمسایوں کے زیرِ نگیں رہی ہے، مختلف ذاتیں اور قبیلے رہتے ہیں اور یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ لوگ وجیہہ، خوبصورت، اُجلے، سُرخ وسپید، محنتی اور ہُنر مند ہیں۔ اُن کو آنے والے کل کا کوئی غم نہیں ہوتا اور وہ مقابلہ بازی کی فکر سے بھی آزاد ہیں۔ وہ جانوروں کی طرح کی قدرتی زندگی جیتے ہیں۔ آنے والے کل سے وہ بہت کم اُمیدیں باندھتے ہیں۔ اُن کی خواتین کی خوبصورتی کی مشہوری کی وجہ سے انہیں اغوا کر کے یا زور زبردستی سے ہندوستان کے تقریباً تمام حصّوں کے حکمرانوں کے حرم میں پہنچایا جاتا ہے۔ بچے بہت خُوش کن ہیں اور والدین اُن پر مہرباں رہتے ہیں۔

اُن کی خواتین سخت جسمانی محنت کرتی ہیں اور مَرد دستکاریوں میں لگے رہتے ہیں، جس میں بہت کم محنت دَرکار ہوتی ہے۔ فارسی میں ایک ضرب المثل

ہے کہ ایک کشمیری سے آپ افسوس اور غصّے کے سِوا کسی اور چیز کی توقع نہیں کر سکتے۔ مسز بشپ، جس نے ہندوستان کے مختلف دُور دراز علاقوں کا دَورہ کر کے وہاں کی مختلف نسلوں کا جائزہ لیا، کشمیریوں کو ''درَوغ گو، مُشتبہ اور عیار'' قرار دیتی ہے۔ مسٹر ای-ایف-نائٹ کہتا ہے کہ وہ ''دھوکے باز اور جھوٹے'' ہیں۔ وہ ناقابلِ یقین حد تک بزُدل ہیں کہ وہ اپنے سے ناتواں شخص کے ہاتھوں پِٹ سکتا ہے اور جواباً زبانی جمع خرچ کے بغیر کچھ اور نہیں کر سکتا۔ ایرینی مزید کہتی ہے کہ وہ محبِّ وطن نہیں۔ اُنہیں اپنے ہموطنوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میں نے وہاں ایک درزی کو چند بیگ سِلنے کے لئے دیئے تاکہ میں اُنہیں کچھ کشمیری طالب علموں میں بانٹ سکوں۔ دوسرے دِن جب وہ بیگ میرے سامنے لائے گئے تو اچھی خاصی اُجرت کے باوجود وہ اِس قدر گھٹیا سِلے ہوئے تھے کہ مجھے انہیں کسی کو دینے کے خیال سے ہی شرمندگی ہوئی۔ جب میں نے اس بارے میں استفسار کیا تو درزی نے مجھے بتایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ کشمیری بچوں کو دیئے جاتے ہیں، لہٰذا کوئی بات نہیں۔ اُن میں اجتماعی ہمت کا فقدان ہے اور تماشا بینی میں یقین رکھتے ہیں۔ اگر کہیں آگ لگی ہو تو وہ اِسے پھیلنے سے روکنے کے لئے آگے نہیں آتے بلکہ دُور ہی سے اِسے دیکھ کر کفِ افسوس مَلنے لگتے ہیں۔ زنانہ مشنری[1] کے اہلکاروں نے مجھے بتایا کہ ایک روز اُنہوں نے ایک کشمیری خاتون سے پوچھا کہ آپ صاف ستھری کیوں نہیں رہتی تو اس نے ہماری طرف حیرت سے دیکھا اور جواب دیا ''جانوروں اور ہمارے درمیان

---

[1] Zenana Mission وہ عیسائی مشن جس کی خواتین اہلکار ہندوستانی خواتین میں طبی اور دہری معاشرتی اصلاح کے لئے کوششیں کرتیں۔

کوئی فرق نہیں ہوتا اس لئے ہمیں صاف ستھرا رہنے کی حاجت نہیں ہوتی۔"
اِس سے ہر بات مترشح ہوجاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اُن کو صدیوں تک ناگوار مکرُوہ اور قابلِ نفرت گردانا گیا۔ اُن میں جیسے جینے اور زندگی کا مزہ لینے کی کوئی خواہش ہی دکھائی نہیں دیتی۔ بقول ورڈس ورتھ......"اِنسان نے اِنسان کو کیا بنا ڈالا ہے۔"

ایرینی ۱۸۹۵ء میں اپنی ڈائری میں لکھتی ہیں۔"میں آپ کو تخیّل کی دُنیا میں لے جانا چاہتی ہوں۔ ہمارا دریائی سفر ایک چھوٹے سے شکارے میں دریائے جہلم میں ہو رہا ہے۔ جہلم' سرینگر شہر میں آمدرفت اور بار برادری کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اِس کے کنارے پر سفیدے کے درخت ہیں جن کے پتے سنہری ہیں، ساتھ ہی آگ برساتے ہوئے چنار، چاروں طرف اُونچے سلسلہ ہائے کوہ ہیں جن پر تازہ برف جمی ہے اور پت جھڑ کی تیز دُھوپ اُن سے ٹکرا کر نیلگوں آسمان میں گُم ہوجاتی ہے...... سرینگر، اپنے دریائی راستوں' محلّہ جات، پُلوں اور گورے گورے لوگوں کے ساتھ وینس کی یاد دِلاتا ہے۔ اگرچہ سرینگر میں شکستہ حالی کچھ زیادہ ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وینس میں آپ کو پت جھڑ کا وہ سہاؤنا منظر دیکھنے کو نہیں ملتا جیسا کہ کشمیر میں نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی ہے دُنیا کا گندہ ترین شہر ہے اور اِس کے اکثر مکانات دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ بس اَب گرے۔ جہاں بلند مینار یا کلش ہوں وہاں زیارت گاہیں، خانقاہیں مساجد اور مندر ہوتے ہیں اور شہر میں عیسائی چرچ تلاش کرنا بے سُود ہے۔"

"گزشتہ بارہ برسوں کے دَوران لوگوں کی مادی ترقی کے لئے بہت سے اقدامات اُٹھائے گئے ہیں۔ ہمارے سپاہی مہاراجہ کی بے ترتیب اور غیر

گرُدوارہ گرُونانک اُونتی پورہ

گرُدوارہ گورُونانک...... بیروہ

a photo by Byrne & Co. Richmond
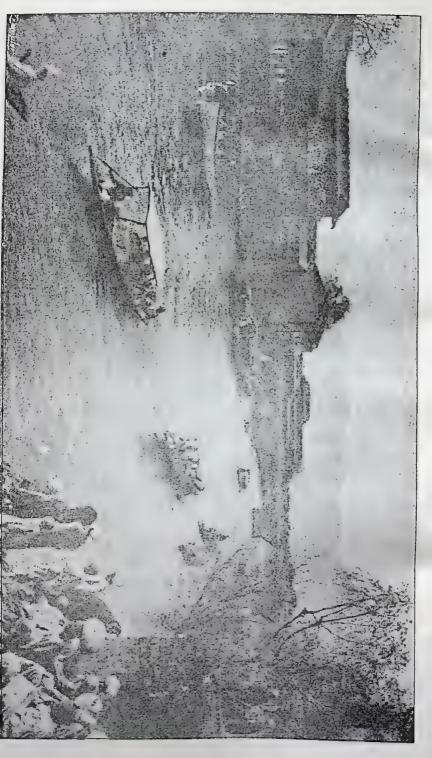
The Màharaja passing the C.M.S School on his state entry into Srinagar

From a photo by Mr. Jeoffroy Millais

HOLTON COTTAGE
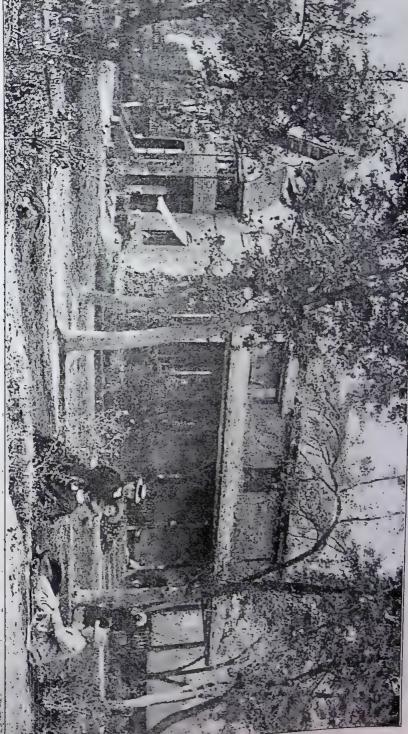
From a photo by Mr. George Tyndale Biscoe

HIS HIGHNESS' GOVERNMENT,

JAMMU AND KASHMIR.

NOTES

R

VISITORS TO KASHMIR.
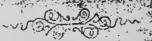
DIRECTOR, VISITORS BUREAU,

SRINAGAR.

PRINTED AT THE PRATAP GOVERNMENT PRESS.

1933, SAMBAT YEAR 1989-90.

تربیت یافتہ فوج کو ٹریننگ دے رہے ہیں۔ انگریز حکام، مظالم کو کم کرنے کی کوششوں میں لگے ہیں، ڈاک سروسز، پبلک ورکس، محکمہ جنگلات اور ریاست کے لئے مستحکم مالی نظام قائم کرنے میں پیش رفت ہوئی ہے۔ مسٹر والٹر لارنس اور ان کے عملے کی طرف سے زرعی اصلاحات کی کوششوں کے نتیجے میں کِسان طبقہ سر اُونچا کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ یورپی ممالک کے ساتھ تجارت کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ برطانوی انجینئر پُل اور سڑکیں بنا رہے ہیں، صاف پانی بہم کرایا جا رہا ہے۔ اِتنا ہی نہیں آفات سماوی جیسے سیلاب، وبائی بیماریوں اور قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے تدابیر کی جارہی ہیں اور یہاں کی زرخیز زمین اور خوشگوار موسم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کے لئے حکمتِ عملی اختیار کی جارہی ہے۔ لیکن اِس ملک میں ٹرانسپورٹ سسٹم انتہائی اَبتر، مہنگا اور غیر یقینی ہے کہ جہاں ایک علاقے میں کسی چیز کی بہتات ہوتی ہے وہیں دُوسرے علاقے میں یہ چیز نایاب ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ مقامی سرکاری اہلکار پرلے درجے کے رشوت خور اور ظالم ہوتے ہیں۔ ۷۸-۱۸۷۶ء کے بدنام زمانہ قحط جس میں کشمیر ایک تہائی آبادی ختم ہوگئی، کے لئے بقولِ سرلیپل گریفن اور ڈاکٹر ڈاونس، سب سے بڑی وجہ مقامی سرکاری اہلکاروں کی ستم رانیاں اور اس کے بعد کالرا اور ہیضہ کا پھوٹ پڑنا اور صحت وصفائی کا فقدان تھا۔ ایرینی لکھتی ہے کہ ہمیں لوگوں کو سمجھانا پڑتا ہے کہ صفائی کے اور فوائد کے علاوہ یہ آپ کو اپنے اللہ کے اور زیادہ قریب کر دیگی۔

ایرینی لکھتی ہے کہ سرینگر میں دو پہاڑیاں ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں اور ان کو جھیلِ ڈل ایک دوسرے سے جُدا کرتا ہے۔ ہاری پربت کے اُوپر

ایک قلعے کا تاج ہے۔ یہ پہاڑی قریب تین سو فٹ بلند ہے۔ اسطوری روایات کے مطابق اِس پہاڑی کے نیچے جل دیو ہے۔ دوسری پہاڑی تختِ سلیمان ہے جو قریب ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ یہاں سے پورا سرینگر دکھائی دیتا ہے اور ایسا خوبصورت منظر میں نے شاید ہی کہیں اور دیکھا ہو۔ اِس پہاڑی کے اُوپر کشمیر کا سب سے قدیم مندر ہے۔ یہ ایک ایسی عمارت ہے جو کشمیر کی مذہبی تواریخ کی گواہ ہے۔ قریب ۲۵۰ قبل مسیح جب کہ رُوم اور کارتھیج ایک دوسرے سے خونریز جنگوں میں نبرد آزما تھے، اشوک نے بُدھ مت کو کشمیر میں متعارف کرایا۔ اُس کے بیٹے جلوک نے اِس مندر کی بنیاد ڈالی اور قریب ۲۰۰ ق-م میں بُدھ بھکشوؤں کو یہاں جمع کیا۔ جب یورپ میں خونریزی کا ماحول تھا، اِس مندر کو پھر سے بنایا گیا اور اِسے مہادیو (بھگوان شِو) کے نام منسوب کیا گیا۔ اِسی دوران ہندو مت کو پھر سے کشمیر میں متعارف کرایا گیا اور قریب ایک ہزار سال تک یہ پوری آب وتاب سے اپنے عروج پر رہا۔ یہاں پر مختلف ہندو مدارس قائم کیئے گئے اور ہندو مت کے سرکردہ عالم یہاں جمع ہو گئے اور دُور دُور سے لوگ یہاں آکر فیضان حاصل کرتے۔ ہندوازم سے قبل یہاں بُدھ مت پوری طرح سے تحلیل ہو گیا لیکن اس کی باقیات کشمیر کے ریشی بزرگوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ارینی، کشمیر میں ایک ایسے شخص سے ملی جس کا پیشہ ایک مقبرے کی توسیع تھا اور جہاں اُس شخص کے باپ نے اپنی زندگی کے ۱۵ سال ایک غار کو کھودنے میں گذارے تھے، جب کہ اُسے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی پاداش مین سزا دی گئی تھی۔ اُس نے ایک شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی تمام عمر عبادت اور فاقہ کشی کے لئے وقف کردی تھی اور کشمیر کا مہاراجہ مُسلم تیوہاروں پر اُس کے ہاں

حاضری دیتا تھا۔

ائرینی کے مطابق ۱۸۹۱ء کی مُردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ۱۸۹،۰۰۰،۰۰۰ ہندو اور ۵۴،۰۰۰،۰۰۰ مُسلم تھے۔ کشمیر میں اِسلام کی آمد کے بعد وہاں آبادی کا تناسب بالکل بدل گیا اَب وہاں تین چوتھائی مسلمان اور ایک چوتھائی ہندو ہیں۔ کشمیر میں غیر مُسلم آبادی میں برہمنوں کا تناسب سب سے زیادہ ہے۔ اَدنیٰ ذاتوں کے غیر مُسلم یا تو وہاں سے بَھگائے گئے یا انہوں نے اِسلام قبول کر لیا۔ کشمیر میں غیر مسلموں کی کثیر تعداد سرکاری ملازمتوں میں ہے جب کہ مُسلم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہندوؤں کو یہاں پنڈت کہا جاتا ہے۔ ایک ایسا نام جب کہ عہدِ وسطیٰ میں ''کلرک'' یا منشی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دیکھا جائے تو کشمیری پنڈت' مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع القلب ہیں لیکن اِسے پسماندگی پر محمول کیا جا سکتا ہے کشمیری مسلمانوں کی تقریباً سو فی صد آبادی جدید تعلیم سے آراستہ نہیں۔ ایک کشمیری مسلمان صحیح معنوں میں مُسلمان ہونے کے بجائے ''پیر پرست'' ہے۔ وہ کلمہ پڑھتا ہے اور وہ اَپنے مذہب کی تعلیمات سے بھی آگاہ ہے لیکن مصیبت کے وقت وہ اپنے ''پیر'' کو پُکارتا ہے۔ اُس کے اکثر آستانے پُرانے ہندو منادر کی بنیادوں پر تعمیر کئے گئے ہیں اور ہندو دَھرم کی رَسومات وغیرہ کو وہ نادانستہ طور اَپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اِس کے لئے یہ وجہ دی جا سکتی ہے کہ یہاں کی آبادی وقتاً فوقتاً اِسلام کے دائرے میں آتی رہی ہے اور اُن کے تحت الشعور میں بعض ایسی رَسوم رچی بسی ہیں جو ہندو دَھرم کا خاصا ہیں۔

ائرینی رقمطراز ہے کہ کشمیریوں میں کوئی سیاسی تجسّس، کوئی بڑی ٹریجڈی

اور کوئی غیر معمولی نتائج مشنریوں کی توجہ قبل ازیں اپنی طرف مبذول نہیں کر سکی ہے۔ کرسچن مشنری سوسائٹی کی مثال پیش کرتے ہوئے وہ لکھتی ہے کہ اِس میں شامل مشنری اِس دُور دراز علاقے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بھاری رقومات محض اِس لئے جمع کی جاتی ہیں کہ یہاں لوگوں کو طبی سہولیات فراہم کی جاسکیں لیکن مسائل اِس سے کہیں زیادہ سنگین اور توجہ طلب ہیں۔ اِس وجہ سے ہماری کاوشیں محدود رہ جاتی ہیں اور اُس جذبے کی تکمیل نہیں ہو پاتی جس کو بروئے کار لا کر کارہائے نمایاں انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں ایرینی کہتی ہے کہ مسٹر آر۔ کلارک نے ۱۸۵۴ء میں کشمیر کا دَورہ کیا۔ اِس کے بعد وہ ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء میں پھر کشمیر آئے ۱۸۶۴ء میں اُس کی بیوی جو کہ ایک ڈاکٹر تھی، نے سرینگر میں ڈِسپنسری کھولی، اِس ڈسپنسری میں روزانہ سینکڑوں مریض آتے تھے اِس کے ساتھ ہی ایک مشنری سکول بھی کھولا گیا اور تبدیلیٔ مذہب کا دَور بھی شروع ہوا لیکن اِس نے مخالفانہ ماحول کو جنم دیا۔ شہر کے گورنر نے اَز خود اِس معاملے میں پیش دستی کرتے ہوئے اِس سلسلے میں مخالفتوں کی دَر پردہ سرپرستی بھی کی۔ ایک حکمنامے کی رُو سے غیر ملکیوں کے کشمیر میں قیام کی زیادہ سے زیادہ مدت چھ مہینے طے کی گئی۔ اِس ملک میں صرف میڈیکل مشن ہی چلائے جاسکتے ہیں۔

مئی ۱۸۶۵ء میں William Elmslie نے سرینگر میں اپنے بنگلے کے احاطے میں ڈسپنسری کھولی اور وہاں پانچ سال تک جانفشانی سے کام کرتے رہے۔ اکتوبر کے مہینے میں وہ اُن لوگوں کے ساتھ امرت سر آیا کرتا تھا جن کو وہ تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ کر لیتا۔ لیکن مذکورہ اشخاص کو اپنی بیویاں کشمیر ہی

میں چھوڑنا پڑتی تھیں کیونکہ کسی بھی کشمیری خاتون کو کشمیر سے باہر جانے کی اِجازت نہیں تھی۔ مہاراجہ نے ولیم کو خطیر رقومات کی پیش کش کی کہ وہ مہاراجہ کا دَرباری معالج بن جائے لیکن اُس نے مہاراجہ کی پیش کش ٹھکرادی۔ اِس پر مہاراجہ نے ایک اسپتال کھولا اور ولیم کی ڈسپنسری کے باہر اَپنے سپاہی تعینات کرائے تا کہ وہاں مریض نہ جاسکیں اور جو مریض وہاں جانے پر بضد ہوتے ان کے نام مہاراجہ کے پاس پہنچائے جاتے اور ان کو مختلف بہانوں سے ستایا جاتا۔ لیکن اِس مشنری ڈاکٹر کی مہارت اور مشفقانہ رَوّیہ سب مخالفتوں پر غالب آ گیا۔ یہ واقعہ بہت سے لوگوں کے لئے تبدیلیٔ مذہب کی وَجہ بن گیا اور بہت سے لوگ اُس کے گروَیدہ ہو گئے اگر چہ وہ عوامی طور اِس کا اعتراف نہیں کر سکے۔

وِلیم کو قادر بخش کی صورت میں ایک اچھا معاوِن مل گیا جس نے ۱۸۶۷ کے سیلاب کے بعد پھوٹ پڑی بیماریوں کے شکار کشمیریوں کو طبیّ راحت پہنچانے اور لوگوں کے دل جیتنے میں اُس کی مدد کی۔ ۱۸۷۰ء میں ولیم خرابیٔ صحّت کی بنا پر واپس برطانیہ چلا گیا۔ وہاں اُس نے کشمیری۔ انگلش ڈکشنری تیار کی جو کہ بعد میں کشمیر آنے والے مشنریوں کیلئے بڑی کار آمد ثابت ہوئی۔ کشمیر میں کرسچن مشنری سوسائٹی کی سرگرمیوں کا ماحصل یہ تھا کہ شہروں، گاؤں اور بازاروں میں عیسائیت کی تبلیغ کی جائے۔ لوگوں، خصوصاً مسلمانوں کو طبّی سہولیات بہم کی جائیں اور پنڈتوں اور خواتین میں تعلیم عام کی جائے۔

ایرینی نے راولپنڈی سے سرینگر ۱۹۰ کلومیٹر کا سفر پڑاؤ در پڑاؤ طے کیا اور اِس سلسلے میں اَپنی ڈائری میں دلچسپ روئداد تحریر کی ہے۔ چنانچہ لکھتی ہے "۴ مئی کی ایک پُرنور صبح کو ناشتے کے بعد تُوت کے دَرختوں کی چھاؤں میں ہم کشمیر کے

دارالحکومت پہنچ گئے۔اِس طرح میں نے اَپنی زندگی کا سب سے بڑا پیدل سفر طے کیا۔اِس دَوران ہمیں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی اور ہم راستے میں مناظرِ قدرت سے لُطف اندوز ہوتے گئے۔اِن ہرَے بھرَے پہاڑوں کے درمیان ہونا بہت ہی خوشگوار تجربہ ہے اور یہ ایسے مناظر ہیں جو دیکھتے ہی بَنتے ہیں۔

کشمیر موسمِ بہار میں جنّت کے مشابہ ہے لیکن گرمیوں میں جُھلسا دینے والی گرمی پڑتی ہے، خزاں ہر چیز کو جیسے اَپنے اَندر سمولیتا ہے اور سرما میں شدید ترین سردی پڑتی ہے۔ ۹۵-۱۸۹۴ میں سردی کی شدّت کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایرینی لکھتی ہے۔۲۰ راکتوبر، تمام پیر پنجال خطہ وقت سے پہلے ہی برف کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ منظر بہت ہی خوبصورت دِکھائی دیتا ہے۔یہاں صُبحیں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں اور رات کو آتشداں سُلگائے رکھنا پڑتا ہے۔

فروری میں درَجہ حرارت رات کو منفی ۴ ڈِگری رہتا ہے۔ بادلوں سے گِھرے آسماں اور کہرے میں لپٹی صُبحیں اور دِن میں کمزور سی دھوپ۔ روز نِت نئے مناظر دیکھنے کے ملتے ہیں۔ جب بَرف پِگھلتی ہے تو کیچڑ عبور و مرور مشکل بنا دیتی ہے۔ مضبوط سے مضبوط جُوتا جواب دے جاتا ہے۔ گھوڑوں کی ٹانگیں دَھنس جاتی ہیں۔اُرینی لکھتی ہے ”مجھے یقین ہے کہ ہم دُنیا بھر میں کیچڑ زدہ مِشنری ہیں“۔البتہ ان تجربات کے دوران اُس کی صحت بحال رہی۔

ایرینی نے کشمیر میں پَردہ نشین خواتین کیساتھ اَپنے تجربات بھی رقم کئے ہیں۔خواتین کی پَردہ داری کوئی قدیم ترین رسم نہیں ہندستان میں اس کی ابتدا دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔اِس کے اگر چہ بعض اخلاقی فوائد بیان کئے جاتے ہیں لیکن اِس نے مشرق میں

خواتین کی ذہنی اور جسمانی نشو ونما پر قدغن لگادی ہے اور وہ مرد سے کمتر شے بن گئی اور بعض خواتین ایسی ہیں جن کو اپنا مُنہ چھپانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔

بارہ سو سال قبل جب کہ برطانیہ ایک عیسائی مملکت بن رہی تھی تو اس کے اکثر مبلّغ بیک وقت پرچارک اور اُستاد تھے۔ یہی ماحول اُس وقت کشمیر میں بھی تھا۔ جب ڈاکٹر نیو اور ہنٹن نو ولز کشمیر آئے تو انہوں نے سرینگر اور اسلام آباد میں سکول قائم کئے۔ اگرچہ اِس سلسلے میں مختلف سطحوں پر مخالفتیں بھی ہوئیں لیکن انہوں نے صورتِ حال پر قابو پالیا۔ ۱۸۸۹ء میں اِن سکولوں میں تین سو شاگرد تھے اور ۱۸۹۴ء میں سکولوں کا نظم ونسق ٹینڈل بسکو کو سونپ دیا گیا۔

جولائی ۱۸۹۹ء میں اِن سکولوں میں ۴۶ مقامی اَساتذہ تھے، جن میں چار عیسائی، پانچ مُسلم اور باقی ہندو (پنڈت) تھے۔ اِن میں تقریباً تمام اَساتذہ اِن ہی سکولوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ وہ بہت ہی محنت اور ایمانداری سے کام کرتے تھے اگرچہ اُن کی تنخواہیں نہایت ہی قلیل تھیں۔ تمام سکولوں کا نظم و نسق براہِ راست یورپی اساتذہ کے ہاتھ میں رہتا تھا۔

اِن سکولوں کو اِبتدا میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا لیکن آہستہ آہستہ اِن میں طالب علم آنے لگے۔ اِن میں اکثریت پنڈتوں کی تھی، ساتھ ہی کچھ مُسلم اور سکھ طلباء بھی تھے۔ اِن میں مہاراجہ کے بعض رشتے دار بھی تھے، برہمن بھی تھے اور ہانجی بھی۔ کارکردگی میں پنڈت طلباء سب سے آگے رہتے۔

''ایک کشمیری، یورپی سے اُسی طرح مختلف ہے جس طرح ایک بھیڑ جنگی گھوڑے سے مختلف ہے۔'' اِن خیالات کا اظہار مشنری سکول کا پرنسپل ایک نجی خط میں کرتا ہے۔ کشمیری پھرن پہنے رہتا ہے جسے فاتحین نے اُس پر مُسلّط

کر دیا ہے۔ اُس کی ذات اور کپڑے معنی خیز طور گندے ہوتے ہیں۔ وہ پہاڑوں پر چڑھنے سے ڈرتا ہے کیونکہ یہ جگہیں آسیبوں کا مَسکن ہوتی ہیں؟ وہ اندھیرے میں گھر سے باہر نکلنے میں خوف محسوس کرتا ہے کیونکہ اندھیرے میں بھُوت پریت پھرتے رہتے ہیں؟ لیکن وہ دَروغ گوئی سے خائف نہیں کیونکہ دِکھاوٹ اور دَروغ گوئی سے اُن کو زبردست لگاؤ ہے۔ طلبا اکثر اَوقات سکول کے پرنسپل سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں جس کا ماحصل کسی اُستاد یا طالبِ علم کی نکتہ چینی ہوتا ہے لیکن یہی بات وہ اور لوگوں کی موجودگی میں نہیں کرپاتے۔ یعنی اخلاقی جرأت کی کمی۔ وہ (طالب علم) تمام دِن کتابوں پر بیٹھے گا اور بڑے شوق سے امتحان میں کامیابی کے لئے رَٹا لگائے گا۔ وہ اَپنے آپ کو بی اے، ایف اے' یا ایم اے کہلوانے کے لئے کوئی بھی حربہ اختیار کرتا ہے اور سب کچھ چھوڑ کے سرکاری نوکری کے پیچھے بھاگے گا۔ اِس پرنسپل کو ایسے بہت سے خطوط ملے جن میں عیسائیت اختیار کرنے کی بات کہی جاتی ہے لیکن ساتھ میں یہ بھی شرط عائد کی جاتی ہے کہ اِس کے لئے اُسے اعلیٰ سرکاری عہدہ، مکان اور ایک بیوی بھی چاہئے......؟

ہالٹن کاٹج میں قیام کے ایک مہینے بعد ایرینی نے اَپنا پہلا درس ۱۶ جنوری ۱۸۹۶ء میں حبہ کدل سکول میں دیا جہاں ۸۰ طالب علم موجود تھے۔ مارچ ۱۸۹۶ء میں اُس نے پہلی اور دُوسری جماعت کی بچوں کا اُردو میں امتحان لیا۔ مسز ٹینڈل بسکو لکھتی ہیں۔ ''ایرینی ہمیشہ سخت محنت اور مشقت سے کام لیتی تھی لیکن سامنے بیٹھی ہوئی خواتین کے لئے اُس کا دَرس اور یسوع کی کہانیاں نہ سمجھنے والی چیزیں تھیں۔ میں کبھی سوچتی ہوں کہ ایرینی کی محنت رائیگاں ہو رہی

ہے لیکن خدا کے نزدیک محنت کبھی بے کار نہیں جاتی اور عظمت کے لئے اُس کی پکار اُسے ضرور تقدیس سے ہمکنار کرائے گی۔"

ایرینی کی یہ کتاب اُس کی زندگی کا آئینہ ہے۔ یہ سوانح نہیں، نہ سفرنامہ ہے اور نہ کوئی تذکرہ۔ یہ صرف یادداشتیں ہیں۔ اِس میں اُس کا بچپن، تعلیم، جوانی اور کارہائے نمایاں کا مختصر سا پرتَو ہے جس میں لگن، تہذیبی، قربانی اور ایثار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اُس کے اندر موجود تھا۔ البتہ جن خیالات کا اُس نے اِظہار کیا ہے اُس میں عمیق مشاہدے کی کمی تھی۔ کتاب میں غریبی، ضعیف الاعتقادی بدعنوانیوں اور گندی عادتوں کا تعلّق لاعلمی اور حکمران طبقے کے تنگ نظری سے جوڑا گیا ہے نہیں تو اِس خطّے کی اَپنی علمی، اَدبی، ثقافتی رِوایات میں جن کی پوری دُنیا معترف ہے۔ مِشنریوں کی طبّی اور تعلیمی خدمات سے کون انکار کرسکتا ہے؟ وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ کتاب میں اِس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ ڈاکٹر اور اساتذہ اِس سرزمین پر یسوع کی دُنیا کے لئے اَپنی بہترین خدمات وقف کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اُن کی کوششوں سے ہمارے رُسوم ورواج میں بہتری ہوئی۔ ہماری عادتوں میں سُدھار آیا۔ ہماری زبان کا دائرہ وسیع ہوگیا اور ہماری اخلاقی قدریں بلند ہوگئیں۔ آج ایک سو سال بعد بھی اُن کے قائم کردہ سکول، سڑکیں، پُل اور اسپتال وغیرہ ہمارے روزمرّہ زندگی کے حصّے بنے ہوئے ہیں۔ آج یہاں زیادہ عیسائی نہیں۔ انہوں نے اپنے پیچھے محبّت اور خدمت خلق کا وہ جذبہ چھوڑا ہے جو حضرت شاہ ہمدانؒ کی تعلیمات اور حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کی روایات سے مطابقت رکھتے ہوئے ایک مکمل تہذیب ہے۔

☆☆☆

ہر بھجن سنگھ ساگر ☆

کشمیر میں گورو ہرگوبند صاحب کی آمد

سِکھ گورو صاحبان کی وادیٔ گُل (کشمیر) پر ہمیشہ نظرِ کرم رہی ہے اور اُن میں سے اکثر یہاں ایک خدا (اِک اُونکار) کی تبلیغ کرنے آئے۔ اِس ضمن میں سِکھ مذہب کے بانی شری گورو نانک دیو جی، چھٹی پادشاہی شری گورو ہرگوبند صاحب جی اور ساتویں پادشاہی شری گورو ہر رائے جی کے اِسمائے گرامی خاص طور سے لئے جاسکتے ہیں۔ شری گورو نانک دیو جی نے تقریباً نصف دُنیا کا پیدل سفر چار اَدوار میں مکمل کیا جنہیں اُداسی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ تیسری اُداسی میں سُمیر پرَبت (کیلاش پربت) تبت اور لداخ کے علاوہ کشمیر کی یاترا بھی شامل ہے۔ یہ یاترا اُنہوں نے (۱۷-۱۵۱۵ء) یعنی دُو سال میں مکمل کی اور لوگوں کو ایک خدا کی عبادت کرنے کا دَرس دیا۔ اس کے علاوہ نیکی، آپسی بھائی

☆ آلوچی باغ، پوسٹ آفس سنٹرل مارکیٹ، سرینگر ۱۹۰۰۰۱

چارہ، مہر-صدق، حق-حلال آپ کی تعلیم کے بنیادی نقطے تھے۔ آپ کی پُرنوُر رُوحانی شخصیّت اور انسانیت پر مبنی تعلیم سے متاثر ہوکر کشمیر کے کئی لوگوں نے سِکھ دَھرم قبول کیا۔ مٹن میں اُن کی ملاقات ایک کشمیری براہمن 'برہم داس' سے ہوئی جو ایک بہت بڑا عالِم تھا اور بجبہاڑہ کا رہنے والا تھا لیکن وہ بڑا گھمنڈی بھی تھا۔ چنانچہ گورو صاحب پر اپنی قابلیت اور علم کا رُعب جمانے کے لئے وہ کتابوں کا ایک ڈھیر خچروں پر لادلائے۔ لیکن دَورانِ بحث اُس کی کتابیں کام نہ آئیں اور گورو صاحب کی دلیلوں کے سامنے بغلیں جھانکنے لگا۔ چنانچہ گورو صاحب کی تعلیمات سے وہ اِس قدر متاثر ہوا کہ اَپنے ساتھیوں سمیت فوراً گورو صاحب کا معتقد بن گیا۔ کمال نام کا ایک فقیر بھی گورو صاحب کا پیرَوکار بنا۔ اِس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وادیٔ کشمیر میں پنڈت برہم داس جی کو پہلا مقامی پیروکار بننے کا شرف حاصل ہوا۔ سِکھوں کے تیسرے گورو امَرداس جی نے ریاست جموں وکشمیر کے سِکھوں کے ساتھ باقاعدہ رابطہ رکھنے کیلئے جموں میں ایک منجی (تبلیغی مرکز) قائم کیا۔ اِس طرح پانچویں گورو، شری اُرجن دیو جی (۱۶۰۶-۱۵۶۳) نے بھائی مادھو سیٹھی کو کشمیر میں سِکھ دُھرم کے پرچار کے لئے روانہ کیا۔ اِس طرح کشمیر میں سِکھ دُھرم کے پرچار کا سِلسلہ دسویں اور آخری گورو شری گورو گوبند سنگھ جی تک باقاعدگی سے جاری رہا۔

لیجئے اَب میں اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں، یعنی "کشمیر میں شری گورو ہرگوبند صاحب کی آمد"۔ گورو ہرگوبند صاحب جی سِکھ مت کے چھٹے گورو تھے۔ سِکھوں کے پانچویں گورو، شری گورو اُرجن دیو جی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی کشمیر تشریف لائے تھے لیکن یہ بات ابھی زیرِ تحقیق

ہے۔فی الحال یہ بات طے ہے کہ شری گورو نانک دیو جی کے بعد شری گورو ہر گوبند صاحب کشمیر آئے تھے۔جیسا کہ اُوپر ذکر ہوا ہے کہ گورو صاحبان کا کشمیر کے سکھوں کے ساتھ باقاعدہ رابطہ تھا،تو گورو صاحب کی کشمیر یاترا سے قبل کشمیر کی سکھ سنگتوں کے اصرار پر آپ نے بھائی گڑھیا نام کے ایک سکھ کو کشمیر میں گورمت کے پرچار کیلئے بھیجا۔لیکن سنگتوں کے مسلسل خلوص بھرے اصرار پر آپ نے کشمیر آنے کا فیصلہ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ آپ مغل بادشاہ جہانگیر کے ساتھ ہی کشمیر تشریف لائے تھے۔مشہور تاریخ داں شری اندو بھوشن لکھتے ہیں......"گوالیار کے قلعے سے نکلنے کے بعد گورو ہر گوبند صاحب کے مغلیہ سلطنت کے ساتھ تعلقات استوار ہو گئے تھے تا آنکہ شاہ جہاں سے لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔لیکن جہانگیر کی سوانح حیات "تزکِ جہانگیری" میں اِن تعلقات کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔" میکالف لکھتا ہے بادشاہ (جہانگیر) نے گورو ہر گوبند صاحب کو اُپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی لیکن اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی آیا کہ گورو جی نے یہ دعوت قبول کی یا نہیں۔ کننگھم بھی اِس بات کی نشاندہی کرتا ہے۔کہ......
"گورو صاحب شاہی کیمپ کے ساتھ کشمیر گئے۔" پرنسپل ست بیر سنگھ لکھتے ہیں......"کئی سکھ شری گورو ہر گوبند صاحب کے دیدار کی تمنا رکھتے تھے،اُن میں سے ایک نابینا بزرگ عورت مائی بھاگ بھری بھی تھی۔گورو جی نے کشمیر کا پروگرام بنایا۔وہ تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر سیالکوٹ سے ہوتے ہوئے سرینگر پہنچے۔"

بہر حال،گورو صاحب،مغل بادشاہ جہانگیر کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے

یانہیں، یہ ایک الگ موضوع ہے۔لیکن یہ بات عیاں ہے کہ وہ شری گورونانک دیو جی کے مشن اور وادیٔ میں سِکھوں کے بے پناہ اصرار کے پیشِ نظر کشمیر تشریف لائے تھے۔

گورو جی کا دورہ کشمیر براستہ مغل شاہراہ:۔

گورو جی ۱۶۲۰ء میں کشمیر تشریف لائے۔ کشمیر آنے کے لئے انہوں نے کون سا راستہ اختیار کیا، اس کے بارے میں مؤرخین کی مختلف آرا ہیں۔ پرنسپل ست بیر سنگھ کا ماننا ہے کہ آپ براستہ سیالکوٹ آئے لیکن راستے کی مکمل تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ گو یہ رائے مستند ہے کہ گورو صاحب کشمیر میں براستہ مغل شاہراہ تشریف لائے۔ کیونکہ اُس زمانے میں یہ شاہراہ زیادہ محفوظ اور قابلِ سفر سمجھی جاتی تھی۔ آپ امرتسر سے لاہور آئے۔ لاہور سے سیالکوٹ، ملوٹیاں، وزیر آباد، میر پور، بھمبر اور بیرام ہوتے ہوئے شوپیان پہنچے۔

میر پور میں ہزاروں لوگ آپ کے دَرشنوں کے لئے پہنچے، جن میں بھیر ودَت (براہمن) کو انہوں نے سِکھ دَھرم کی تعلیم سے نوازا اور اُسے سِکھ بنایا۔ دَبستانِ مذاہب کے حوالے سے تواریخ خالصہ میں بھائی جھنڈا نام کے ایک سِکھ کا بھی ذکر آیا ہے، جو بہرام علاقے کے جنگلوں اور جنگلی راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اِس علاقے سے گذرتے ہوئے گورو صاحب کے قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ایک پڑاؤ پر پہنچ کر گورو جی نے اُسے وہیں رُک جانے کا حکم دیا اور کہا ''تم ہمارا یہیں اِنتظار کرو۔ جب ہم واپس آئیں گے، تو تم بھی ہمارے ساتھ چلنا'' گورو صاحب تین دن کے بعد واپس آئے اور دیکھا کہ بھائی جھنڈا جی حکم کے مطابق وہیں کھڑے تھے۔ گورو جی اُن کی فرمانبرداری پر

بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے اُسے اِس علاقے میں سِکھ دھرم کے پرَچارک کے طورر پر نامزد کیا۔

شاہ جی مرگ (شادی مرگ):-

شوپیاں سے آگے بڑھتے اور سِکھ دُھرم کا پرچار کرتے ہوئے گورو صاحب بھائی کٹو شاہ کے ڈیرے قلم پورہ پہنچے۔ انگریز مورّخ میکالف بھی اس سچائی کی حمایت میں لکھتے ہیں کہ گورو صاحب کٹو شاہ کے ہاں ایک رات ٹھہرے۔ اِس سے قبل بھائی کٹو شاہ اَپنے علاقے کے لوگوں کے ساتھ گورو جی کے درشنوں کے لئے اَمرتسر گئے تھے اور سب نے وہیں سِکھ دھرم قبول کیا تھا۔ بعدازاں بھائی کٹو شاہ اِس علاقے میں سِکھ دھرم کی تبلیغ کے لئے مقرّر کئے گئے۔ عوام میں اُن کی ہر دلعزیزی اور جذبۂ خدمت (سیوا) کے پیش نظر اِس علاقے کا نام شاہ جی مرگ یا شادی مرگ پڑ گیا۔ وادی میں اِس مغل شاہراہ پر گورو صاحب کی یاد میں یہ پہلا گوردوارہ ہے۔ یہاں سے تقریباً ۲ میل کی دُوری پر ایک کنواں بھی ہے جو گورو جی نے وہاں کے مقامی لوگوں کی سہولت کے لئے کھُدوایا تھا۔ لوگ اِس کنویں کو "چشمۂ گورو ہرگوبند صاحب" کے نام سے جانتے ہیں۔ گوردوارہ صاحب کی زیارت کو آئے لوگ اِس کنویں کے درشن کرنا نہیں بھولتے۔

گوُردوارہ چھٹی پادشاہی کاٹھی دروازہ،سرینگر:-

شاہ جی مرگ سے گورو صاحب سرینگر آئے اور سیدھا بھائی سیوا داس کے گھر (موجودہ گوردوارہ کاٹھی دروازہ) پہنچے۔ بھائی سیوا داس کشمیری برہمن تھے اور سِکھ مذہب اختیار کیا تھا۔ اُن کے دل میں دَھارمک عقیدہ اور خدمت

خلق (سیوا) کا جذبہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا تھا۔ وہ اَکثر مذہبی مجالس اور لنگر کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے۔ اُن کی ماں، ماتا بھاگ بھری ایک عمر رسیدہ عورت تھیں جن کی آنکھوں کی بینائی بھی کمزور ہو چکی تھی۔ وہ اکثر اپنے بیٹے سے گورو صاحب کی عظمت کے بارے میں باتیں سنا کرتی تھیں۔ چنانچہ اُن کے دِل میں بھی گورو صاحب کے دَرشن کرنے کا جذبہ پیدا ہوا لیکن کافی عمر رسیدہ ہونے اور کمزور بینائی کی وجہ سے وہ پنجاب نہیں جا سکتی تھیں۔ اس لئے وہ گھر میں بیٹھ کر ہی اُن کے نام کی مالا جپنے اور اُن کے لئے ایک اُونی چولا بُننے لگیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ گورو صاحب انہیں ضرور دَرشن دیں گے۔

جب گورو صاحب بھائی سیوا داس کے گھر پہنچے، تو ماتا بھاگ بھری سے کہا، ''ماتا جی! لایئے!! میرا چولا کہاں رکھا ہے'' ماتا جی نے نہایت ہی عقیدت سے انہیں چولا پیش کیا، جسے گورو صاحب نے پیار اور احترام سے قبول کیا۔ کہا جاتا ہے کہ گورو صاحب نے اُن کی آنکھیں پانی سے صاف کیں، جس سے اُن کی آنکھوں کی بنیائی لوٹ آئی۔

اُس زمانے میں شہرِ سرینگر ایک فیصل کے اندر ہوا کرتا تھا اور کوہِ ماراں پر واقع قلعہ ہاری پربت بھی اِسی چار دیواری کے اندر پڑتا تھا لیکن بھائی سیوا داس جی کا گھر کاٹھی دروازہ کے بالکل نزدیک اور شہر کی فیصل سے باہر تھا، جہاں آجکل گوردوارہ چھٹی پادشاہی واقع ہے۔

گورو صاحب نے یہاں تین ماہ قیام کیا اور یہاں اُن کے دوران قیام ہر روز مذہبی مجالس سجا کرتی تھیں اور کئی لوگ گورو کے پیَروکار بنے۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ گورو کی گولک (خزانہ) غریبوں کی بھلائی اور عوام کی بہبودی

کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔

کئی مؤرخین کا خیال ہے کہ گورو صاحب کچھ عرصہ شالیمار باغ میں ٹھہرے تھے، جبکہ جہانگیر کا شاہی کیمپ نشاط باغ میں تھا۔ مزید یہ بھی لکھا ہے کہ ملکہ نورُ جہاں نے گورو صاحب کے درشن شالیمار باغ میں ہی کئے تھے۔ لیکن یہ بات حقائق سے بعید لگتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس وقت تک یعنی ۱۶۲۰ء میں جب گورو صاحب نے کشمیر کا دورہ کیا، نشاط باغ تیار ہی نہیں ہوا تھا۔ گورو صاحب کاٹھی دروازہ کے نزدیک اُس جگہ ٹھہرے تھے، جہاں آج کل گوردوارہ چھٹی پادشاہی موجود ہے جبکہ جہانگیر کا قیام کوہِ ماراں (ہاری پربت قلعہ) پر واقع محل میں تھا۔ اِس بات سے کسی حد تک جناب پرویز دیوان بھی متفق ہیں اور تاریخ دان سردار اَجیت سنگھ سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں......'' کہ جہانگیر کے سفرنامے باقاعدگی سے لکھے جاتے تھے۔ ۱۶۲۰ء یا ۱۶۲۲ء میں بھمبر دَرہ پیر پنچال سے کشمیر نہیں آئے اور نہ ہی اُس راستے سے واپس گئے، جہاں سے گورو صاحب گئے تھے۔ اَجیت سنگھ مزید لکھتے ہیں کہ نشاط باغ اُس کے ۵۰ سال بعد تک بھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔'' یہاں جناب پرویز دیوان صاحب گو سردار اَجیت سنگھ سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے لیکن اُن کی بات یکسر رَد بھی نہیں کرتے اور لکھتے ہیں......'' یہ بات (کہ نشاط باغ اُس کے ۵۰ سال بعد تک بھی تعمیر نہیں ہوا تھا) بھی بالکل دُرست نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ کچھ غیر مصدّقہ باتوں کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ چند برسوں سے نشاط باغ ۱۶۳۳ء تک بن چکا تھا لیکن ۱۶۳۳ء تک یہ ایک شاہی باغ کے طور پر نہیں جانا جاتا تھا۔ اجیت سنگھ کسی حد تک یہ بات کہنے میں حق بجانب ہے کہ جہانگیر نشاط باغ میں

گرُدوارہ چھٹی پادشاہی......سرینگر
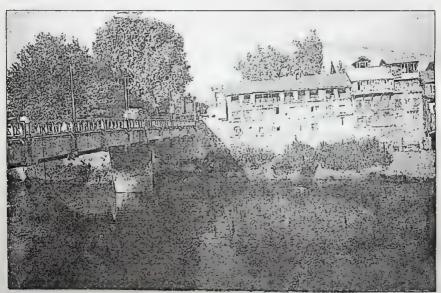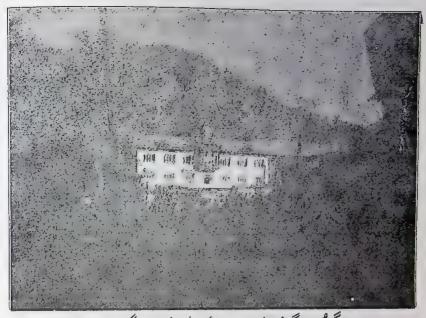
گوُردوارہ ڈیرہ گبھاجی......فتح کدل۔ سرینگر

گرُدوارہ گورُونانک......ناگہ بل، اَننت ناگ
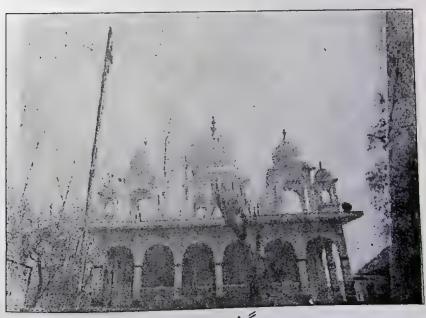
گرُدوارہ بیج بہارہ

گرُدوارہ شاجی مرگ، پلوامہ

گرُدوارہ تعلم پورہ سنگھپورہ

گرُدوارہ بارَہ مولہ

گردوارہ پرم پیلاں اوڑی
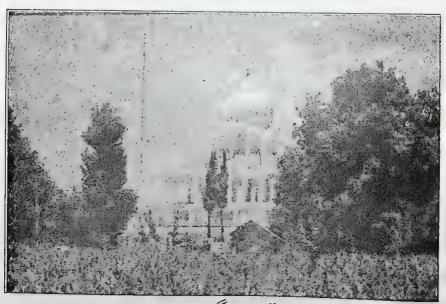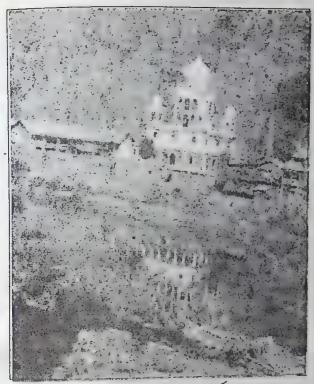
نہیں ٹھہرا تھا۔'' اِس لئے اگر جناب پرویز دیوان اور اجیت سنگھ کی تحقیق کو
دُرست مانا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم ۱۶۲۰ء یا ۱۶۲۲ء میں نشاط باغ تیار
نہیں ہوا تھا۔ اِس سے عیاں ہے کہ جہانگیر کے نشاط باغ میں ٹھہرنے کی بات
دُرست نہیں اور نہ ہی گورو صاحب شالیمار باغ میں ٹھہرے تھے۔ البتہ گورو
صاحب سے ملکہ نُور جہاں کی ملاقات کو رَد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ہاری پربت
قلعہ کے اندر واقع محل، جہاں جہانگیر کا شاہی کیمپ لگا تھا اور کاٹھی دروازہ
(جہاں گورو صاحب قیام پذیر تھے) کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ اس لئے
یہ بات قرین القیاس ہے کہ ملکہ نُور جہاں نے کہیں آتے جاتے گورو صاحب
کے دربار میں ضرور حاضری دی ہوگی اور دُعائیں لی ہونگی۔

گورُدوارہ چھٹی پادشاہی بارہمولہ:۔

گورو ہرگوبند صاحب سرینگر سے بارہمولہ پہنچے جہاں وہ دَریائے جہلم
کے دائیں کنارے چٹانی پہاڑی کے دامن میں بیٹھے، جسے ''کوٹ تیرتھ'' کہا
جاتا ہے۔ گورو صاحب کی آمد کے بارے میں جان کر لوگ ہجوم دَر ہجوم اُن کے
درشنوں کے لئے پہنچنے لگے۔ گورو صاحب انہیں گورو نانک دیو جی کا پیغامِ الٰہی
سُناتے اور سِکھ دھرم سے متعلق جانکاری دیتے۔ گورو صاحب نے بارہمولہ کی
سَنگتوں کی درخواست پر یہاں ایک چنار کا پودا لگایا، جو ۱۹۸۶ء تک گوردوارہ
صاحب کے آنگن میں زائد اَز ۳۵۰ برسوں کی تاریخ سمیٹے ہوئے تھا۔ وسیع و
عریض یہ خوبصورت چنار گوردوارہ صاحب کی نئی عمارت کی بھینٹ چڑھ گیا۔
کئی لوگوں نے اِس چنار کی ٹہنیاں اَپنے گھروں میں بطورِ تبرک محفوظ رکھی ہیں۔
گوردوارہ صاحب کی نئی عمارت سنت بابا ہربنس سنگھ جی، دہلی والوں کی زیرِ

نگرانی تعمیر ہو رہی تھی۔ اِسی بات کو لیکر سنگتیں جہاں گوردوارہ صاحب کی نئی عمارت کی تعمیر سازی پر خوش تھیں وہیں صدیوں پُرانے چنار کی کٹائی پر نالاں بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل راولپنڈی روڑ کی وجہ سے یہاں کافی رونق رہتی تھی گورو کا لنگر بلا ناغہ بانٹا جاتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے دوران بھی گوردوارہ صاحب کی پُرانی عمارت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا۔

سردار ہری سنگھ نلوہ جب کشمیر کے گورنر بنے تو انہوں نے اس گوردوارہ صاحب کی آمدن کے لئے تین گاؤں وقف کئے تھے جن میں جانباز پورہ، نادی ہل، اور واڈورا شامل تھے۔ یہ جاگیر ڈوگرہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے بند کروادی۔ گورو صاحب نے یہاں کئی دن قیام کیا۔

گوردوارہ چھٹی پادشاہی، قلم پورہ (سنگھپورہ):-

یہ گوردوارہ قلم پورہ گاؤں میں واقع ہے، جو سکھوں کے گاؤں سنگھپورہ سے تقریباً آدھ کلومیٹر اور بارہمولہ سے آٹھ کلومیٹر کی دُوری پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک وسیع گھُنا جنگل ہوا کرتا تھا اور گورو صاحب بارہمولہ میں اَپنے قیام کے دوران یہاں شِکار کھیلنے آتے تھے۔ روایت مشہور ہے کہ ایک فقیر بلول اور ان کے مُرید یہاں گورو صاحب سے ملتے اور گورو صاحب کے رُوحانی اور مذہبی خیالات کی وُسعت سے فیضاب ہوتے تھے۔ گورو صاحب کی پاک شخصیت، وسیع نظریات اور سِکھ فلسفہ سے وہ اِس قدر متاثر ہوئے کہ گورو صاحب کے جانے کے بعد وہ اِس جگہ ہر روز دِیپ جلاتے تھے۔ سنگھپورہ گاؤں کے آباد ہونے کے بعد یہاں ہر سال بیساکھی کا میلہ لگنے لگا جس میں وادی کے دُور دُراز علاقوں سے سنگتیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ روایت اَب تک

جاری ہے۔ سنت بابا ہر بنس سنگھ جی نے یہاں بھی گوردوارہ صاحب کی نئی عمارت تعمیر کی ہے۔

گوردوارہ پرم پیلاں اُوڑی:۔

یہ گوردوارہ شری گورو ہر گوبند صاحب کی یاد میں جہلم کے دُوسرے کنارے شمال کی جانب واقع ہے۔ گو یہاں سکھوں کی آبادی بہت کم ہے لیکن پھر بھی گوردوارہ صاحب میں ہر روز خوب رونق رہتی ہے اور سنگتوں کا آنا جانا جاری رہتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہاں سکھوں کے کچھ گاؤں آباد تھے، جو آج کل آزاد کشمیر (پاکستان) میں شامل ہیں۔ یہاں گورو جی کی ملاقات پانچ فقیروں سے ہوئی جن کے نام گُل شیر، بھور سُلطان، زنگی امام، نور نہال اور عبدالغفور بیان کئے جاتے ہیں۔ گورو صاحب نے دورانِ گفتگو انہیں نصیحت کی کہ خدا کے سچے دَرویش نیک سیرت ہوتے ہوئے، شیریں کلامی سے پیش آتے ہیں اور گھمنڈ سے دُور رہتے ہیں۔ اُن کے سامنے خدا کی کل مخلوق یکساں ہوتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے قبائلی حملے میں کچھ نیک مسلمانوں نے اِس گوردوارہ صاحب کو حملہ آوروں سے بچایا۔

گوردوارہ چھٹی پادشاہی کھٹائی:۔

اُوڑی سے آگے چل کر گورو صاحب کھٹائی میں رُکے۔ یہ جگہ دریائے جہلم کے دُوسرے کنارے پر واقع ہے اور چکوٹھی گاؤں سے تقریباً چار کلومیٹر دُور تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے سکھوں کے کچھ گاؤں، جن میں چکوٹھی بھی شامل ہے، اِس متبرک جگہ سے تقریباً تین تین، چار چار کلومیٹر دُور ہے۔ ۱۹۳۶ء میں

یہاں گوردوارہ صاحب کی پکّی عمارت تعمیر کی گئی۔ یہاں ہر سال بیساکھی اور گورپورب بڑی دُھوم دَھام سے منائے جاتے تھے۔آج کل گوردوارہ کٹھالی صاحب آزاد کشمیر(پاکستان)میں ہے۔

گوردوارہ چھٹی پادشاہی ،نلوچھی (مظفرآباد):-کٹھائی کے بعد گورو صاحب نلوچھی پہنچے۔یہ جگہ مظفرآباد سے ڈیڑھ کلومیٹر کی دُوری پر واقع ہے۔ تقریباً اتنی ہی دُوری دریائے جہلم اور کشن گنگا (نیلم) ندی کے سنگم سے بھی ہے۔یہ جگہ گوروجی کی کشمیر یاترا کا آخری پڑاؤ بیان کیا جاتا ہے۔۱۹۴۷ء سے پہلے اس گوردوارہ صاحب کی شاندار عمارت تھی، جہاں روزمرّہ کے دُھارمک دیوان سجتے تھے۔اس کے علاوہ بیساکھی ،گورپورب وغیرہ بھی ہر سال شان وشوکت سے منائے جاتے تھے۔یہ جگہ پورے کشمیر میں دُھارمک پرچار اور سکھ سیاست کا مرکز کہلاتی تھی۔۱۹۴۷ء میں یہ گوردوارہ صاحب حملہ آوروں کا پہلا نشانہ بنا۔

یہاں سے آگے گوروصاحب واپس پنجاب کی طرف مراجعت کر گئے۔

کتابیات

1. Macaulif — The sikh Religion
2. Dr. R.K. Parmu — A History of sikh Rule in Kashmir.
3. Cuonningram — History of sikhs.
4. Prof. Sewa Singh — کشمیری سکھوں کا سماجی اور سیاسی اتہاس (پنجابی)
5. Jasbir Singh Sarna — جموں کشمیر کی سکھ تواریخ (پنجابی)
6. jasbir Singh Sarna — جموں کشمیر کے اِتہاسک گوردوارے (پنجابی)
7. Parvez Dewan — The sikh Gurus and Kashmir.

غلام رسُول بٹ ☆

زین دیب ۔ پتّھر بولتے ہیں

سُلطان زین العابدین بڈشاہ اُپنے بھائی سُلطان علی شاہ کے بعد ۸۲۳ھ مطابق ۱۴۲۰ء میں کشمیر کا بادشاہ بنا۔ یہ عادل بادشاہ تعمیرات کا بہت ہی شوقین تھا۔ اُس کے عہد کا سرکاری سنسکرت مورّخ پنڈت جون راج اَپنی منظوم سنسکرت تواریخ زینہ ترنگنی میں لکھتا ہے کہ سلطان زین العابدین نے اَتھاہ گہرائی والے مہاپدم سر یعنی جھیلِ وُلر میں پتھروں سے لدی بڑی بڑی کشتیوں کو ڈبو کر ایک چھوٹے سے جزیرہ نما کی تعمیر کرائی اور اِس طرح سے جو زمین نمودار ہوگئی اس کو ''جینہ لنکا'' کا نام دیا گیا اور اِس پر ایک عمارت بھی تعمیر کی گئی۔

جون راج نے اِس جزیرہ نما کا تفصیلی حال بیان نہیں کیا ہے کہ اس کی لمبائی اور چوڑائی کتنی تھی۔ البتہ وہ لکھتا ہے کہ سُلطان زین العابدین سے قبل کوئی بھی ایسا بادشاہ نہیں گذرا ہے جس نے اس پُر خطر مہاپدم سر (جھیلِ ولر) میں سیر کرنے کی جراُت کی ہو۔ یہ پہلا ایسا باجراُت بادشاہ ہے جو کشتی میں بیٹھ کر اِس جھیل کی سیر سے لُطف اندوز ہوا۔ جونراج اس بات کا خلاصہ بھی کرتا ہے

☆ سولنہ، سرینگر کشمیر

کہ مہاپدم سر یعنی جھیلِ وُلراُس زمانے میں ایک شہر تھا جو لوگوں کی بَدفعلیوں اور گناہوں کے سبب زیرِ آب ہو گیا۔

جون راج نے اِس شہر کا نام نہیں لکھا ہے۔اِس شہر اور مہا پدم سر کے حالات بیان کرتے ہوئے لگتا ہے کہ جون راج کی لکھی ہوئی عبارت مربوط نہیں اور نہ اس میں کوئی تسلسل ہی ہے۔

جون راج نے اِس جزیرے پر موجود اُس کتبے کا ذکر نہیں کیا ہے جو وہاں پر بڈشاہ نے نصب کرایا تھا اور جس پر اِس جزیرہ نما کا نام اور مکمل ہونے کی تاریخ درج ہے۔ جون راج نے اِس جزیرہ نما کی تعمیر کی تاریخ بھی رَقم نہیں کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اُس دَور کے کسی بھی مورّخ کا کوئی بھی حوالہ دستیاب نہیں ہوتا جس کی روشنی میں ہم اِس جزیرہ نما کے متعلق مکمل تفصیلات حاصل کر سکتے ہیں۔

کشمیر کی تواریخوں کے مطالعے سے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُس دَور کے سرکاری مورّخ جون راج کے اِس جزیرہ نما کا نام ''جینہ لنکا'' لکھنے کے بعد کسی نے بھی اس بات کا جائزہ نہیں لیا ہے کہ اِس کا یہ نام کس حد تک صحیح ہے۔ اگر چہ جون راج کے بعد کشمیر کے بعض فارسی مؤرخین اور یوُرپی سیاح، قلمکار بذاتِ خود اِس جریرہ نما پر پہنچے ہیں اور انہوں نے وہاں موجود کتبے کا ذکر بھی اَپنی تحریروں میں کیا ہے لیکن اِس واضح کتبے کی عبارت پر کوئی غور نہیں کیا ہے۔ حالانکہ بعض مورّخین نے اِس کتبے کی عبارت بھی نقل کی ہے لیکن اِس کتبے کے دوسرے شعر جس میں اس جزیرہ نما کا نام ''زین دیب'' کُھدا ہوا ہے، اس کے بجائے انہوں نے اس کا نام ''زین وزیب'' ''زینہ لنک'' ''زینہ ڈینب''

''لنک'' وغیرہ لکھا ہے۔ لگتا ہے کہ اُن کا اِس جزیرہ نما کا نام بدل کر لکھنے کا سب سے بڑا سبب اُس دَور کے سرکاری موّرخ جون راج کا ''زین دیب'' کا سنسکرت ترجمہ ''جینہ لنکا'' لکھنا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اہم سنگِ میل کی عبارت پڑھنے میں تساہل سے کام لیا ہو؟

اِس دیب یا جزیرہ نما کا بے انتہا تواریخی اہمیت کا یہ کتبہ اِس وقت سری پرتاپ سنگھ میوزیم سرینگر میں صحیح حالت میں موجود ہے جو اِس جزیرہ نما کا اصلی نام چِلا چِلا کر کہہ رہا ہے۔ یہ کتبہ اُستادانہ خطِ نسخ میں لکھا گیا ہے۔ جزیرہ نُما کا نام زین دیب ہے اور اِس کی تعمیر کا سال فارسی اشعار میں یُوں دِکھلایا گیا ہے ؎

این بقعہ چو بنیاد فلک محکم باد
مشہور بزین دیب در عالم باد
شہ زین عِباد تادَر و جشن کند
پیوستہ چو تاریخ خودش ''خرم باد''

۸۴۷ھ

بحساب اِبجد ''خرم باد'' کے حروف کی قیمت ۸۴۷ھ ہے۔ یعنی یہ جزیرہ نما ۸۴۷ھ مطابق ۱۴۴۳ء میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اِس پتھر پر کندہ فارسی عبارت کا مفہوم یُوں ہے۔

۱۔ یہ بُقعہ بلند آسماں کی طرح محکم رہے

۲۔ یہ (جزیرہ) دُنیا میں زین دیب کے نام سے مشہور رہے۔

۳۔ عبادت کرنے والا بادشاہ (زین العابدین) اِس پر جشن مناتا رہے۔

۴؍ یہ ہمیشہ اُپنی تاریخ کی طرح شادرہے۔

اِس کتبے کی واضح عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بڈشاہ زین العابدین نے یہ جزیرہ بڑے شوق اور عزم سے پانی کے سینے پر تعمیر کیا ہے۔ اُس نے یہ جزیرہ ۸۴۷ھ مطابق ۱۴۴۳ء میں مکمل کرایا ہے اور اس کا نام ''زین دیب'' رکھا ہے۔

تواریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کا سنسکرت مورّخ فارسی زبان سے واقف نہیں تھا۔ اُس نے اِس جزیرے کے اصلی نام ''زین دیب'' کا سنسکرت ترجمہ ''جینہ لنکا'' کیا ہے۔ جوُن راج کے بعد کے مؤرخین نے بلا تحقیق جون راج کے کہنے پر عمل کر کے ''جینہ لنکا'' نام سے اِس جزیرے کا ذکر کیا ہے جو کسی بھی صورت میں دُرست نہیں جبکہ اِس جزیرے پر موجود کتبے کی عبارت بالکل عیاں ہے اور کتبے پر کندہ یہ بات زیرِ نظر رکھ کر کہ جزیرہ تعمیر کرنے والے بادشاہ زین العابدین کی یہ نیک خواہش کہ یہ جزیرہ عالم میں زین دیب کے نام سے مشہور کرنا چاہیئے کہ ''زین دیب '' نام کہہ کر ہی اِس کا احترام کیا جائے۔

تیرہویں صدی ہجری کے اِختتام پر کشمیر کا مورّخ اور محقق غلام حسن شاہ گامرو وُلر کے اِس جزیرے پر پہنچ گیا۔ وہ تاریخِ حسنؔ جِلد اوّل، صفحہ ۴۵ پر رقمطراز ہے کہ سلطان زین لعابدین نے کسی زمانے میں غرقِ آب ''سندمت نگر'' نام کے شہر کے پانی کے اُوپر یعنی جھیل وُلر میں پانی بھر ایک جزیرہ بنوایا۔ جس کی لمبائی شمالاً جنوباً ایک سو گز اور شرق غرباً چوڑائی ۷۵، گز ہے۔ اِس پر ایک فرحت بخش باغ ہے جس میں پھل پھول ہیں۔ اِس جزیرے کے شمالی

کونے میں ایک سہ منزلہ سنگی تعمیر اور ایک مسجد ابھی بھی قائم ہے۔

اِس جزیرہ نما پر وقتاً فوقتاً بعض یورپی سیاح / قلمکار بھی پہنچے ہیں جنہوں نے اِس کے متعلق بہت سی اور متضاد باتیں لکھی ہیں جو وہاں پر موجود کتبے سے کسی طرح میل نہیں کھاتیں۔ اُنہوں نے بھی اس کتبے کے متعلق یا اِس پر درج عبارت کے بارے میں کوئی بھی بات درج نہیں کی ہے اور نہ اس جزیرہ نُما کے اصلی نام پر کوئی بحث کی ہے۔ فرانکولیس برنیر، سر ولیم مُور کرافٹ، بیرن چارلیس ہیوگل، سر رچرڈ ٹمپل اور سٹین جیسے اصحابِ نظر بھی اِس جزیرے کا ذکر جون راج کے لکھے ہوئے ''جینہ لنکا'' نام ہی سے کرتے ہیں۔

کشمیر کی تواریخ کے عمیق مطالعے اور آثارِ قدیمہ کا جائزہ لے کر اس بات کا اِشارہ ملتا ہے کہ ہمارے محققین، مورّخ اور تہذیب شناس کہیں کہیں بھول بھلیوں میں کھو گئے ہیں۔

(کشمیری سے ترجمہ)

موہن لال آشؔ ☆

جمّوں میں ناگ مت

ناگ ہندوستان کے اصلی باشندے تھے جیسے کولؔ، دَراوڈؔ، بھیلؔ، گونڈ اور سنتھالؔ قبیلے یہاں رہتے تھے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ ناگ شمالی ہندوستان میں پہاڑوں کے دامن اور چشموں کے اِرد گرد رہتے تھے اور دیگر قومیں جنوبی میدانوں کے قریب رہتی تھیں۔

ناگ، نیک سیرت، بہادر اور جفاکش قوم تھی۔ فطرت ہر مرحلے پر اُن کی رہنما بنتی تھی۔ اُن کا کوئی منصوبہ بند مذہب نہیں تھا اور نہ رُوحانی زندگی میں کوئی فلسفہ اُن کی پشت پناہی پر تھا۔ شِو اُن کا دیوتا تھا اور اُسکے بغیر کسی اور پرستش نہیں کرتے تھے۔ اُن کے بہت سے تیوہار تھے جو کہ سانپوں اور شِو سے تعلّق رکھتے تھے۔ اُن کا چشموں، سانپوں اور شِو پر غیر متزلزل یقین تھا۔ ناگ، آزاد خیال، صحت مند اور ایماندار لوگ تھے۔ یہ پہاڑوں کی چوٹیوں، کریوُں، چشموں کے نزدیک اور بڑی چراگاہوں میں اپنے ریوڑ پالتے اور محنت مزدوری کرتے تھے۔

☆ سیکٹر I۔ دُرگا نگر۔ جموں (توی)

ارتقائی عمل کی وجہ سے ناگ (Neolithic period) (پتھروں کے دَور) سے لوہے کے دَور میں داخل ہونے والی قوم تھی۔ انہوں نے زمینداری کی ابتدائی فصلیں اُگائیں اور وحشی جانوروں کو پالتو بنایا۔ اَب تک اُن کی خوراک جنگلی پھل ، خودرَو گھاس وغیرہ تھی اسکے ساتھ ہی وہ جنگلی جانوروں کا شکار بھی کرتے تھے۔ مگر اَب انہیں زمینداری اور گلَہ بانی کا فن آ گیا اِس سے اُن کی زندگی میں سکون آیا اور جان توڑ محنت کم ہوگئی۔ اَب تک وہ جانوروں کی کھالیں پہنتے تھے لیکن اَب انہوں نے اُون کا تنا سیکھا اور اِس سے کپڑے بنائے۔

کلہن کی راج ترنگنی میں بہت سے ایسے حوالے ہیں کہ بہت سے ناگ کشمیر میں رہتے تھے لیکن اُن کی تعداد بتدریج کم ہو رہی تھی۔ کلہن لکھتا ہے کہ ناگ اپنی شکل تبدیل کر سکتے ہیں۔ اُن کو مافوق الفطرت طاقتیں حاصل ہیں۔ کشمیر کے مندروں میں آج بھی ایسی مورتیاں ملتی ہیں جن میں سانپ کو کنڈلی مارتے ہوئے دِکھایا گیا ہے یا اُنہیں ''کنڈلنی چکر'' یا رُوحانی زندگی کے پڑاؤ کی حیثیت میں دِکھایا گیا ہے۔ آریاؤں کے منظّم اور لشکری یلغار نے کشمیر میں ناگوں کی طاقت ختم کردی اور کشمیر سے ناگ مت پوری طرح نابُود ہو گیا لیکن کئی رُسوم اور رواج آج بھی زندہ ہیں جو ہمیں ناگ مت کے اُثرات اور کشمیر میں ناگوں کا سماجی اُثر طے کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔ دیوتاؤں کو چاول، مچھلی کھلانا مُونجھور، تہری بانٹنا، ڈیچہ ہور، کشمیری پنڈتانیوں کے خاص طرز کے ڈوپٹے وغیرہ پر سانپوں کی شبیہیں ملتی ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کی شادیوں پر صدر دروازے پر خاص رقم آرائش کی جاتی ہے اور سانپوں کی شبیہیں بنائی جاتی ہیں۔

آج بھی کشمیر میں موسمِ بہار کے آغاز پر ناگوں کے راجہ نیل اور عرفان کے سات رموزوں، سات ریشیوں، سات براعظموں اور سات راگوں کی پوجا کی جاتی ہے۔

لیکن راجہ نیل کے بعد کشمیر میں ناگوں کا زور بتدریج کم ہوتا گیا کیوں کہ وہ آریاؤں کی عسکری طاقت کے آگے ٹِک نہیں سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آریاؤں نے اُن کے رسم ورواج، عبادت خانے اور طرزِ معاش ختم کردیا ہے اور انہیں غلاموں کا درجہ دیا گیا۔ اِس کے برعکس جموں علاقے میں ناگ مت اصلی شکل میں موجود رہا لیکن اس سے یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہئے کہ جن علاقوں میں ناگ مت کی نشو ونما ہوئی وہاں سے یہ بالکل ہی ختم ہوگیا۔

جموں کے جن علاقوں میں ناگ مت اصلی شکل ہیں موجود رہا اُس کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّلاً جغرافیائی، دوّم سماجی۔ جموّں صوبے کے جن علاقوں میں آج بھی ناگ مت کم وبیش اصلی شکل میں ہے اُن میں ڈوڈہ، بھدرواہ، کشتواڑ، مَرمَت، ڈوڈہ، بسنت گڈھ، بِلاوَر، رام نگر کا سارا مشرقی علاقہ، گولڈی، سُدھ مہادیو' لاٹی دھونا کا چٹانی علاقہ، بٹوت، پوگل پَرستان اور ہماچل پردیش کا چمبہ، جوالا مُکھی، دھرم شالا وغیرہ ہے۔ یہ تمام علاقہ فلک بوس پہاڑوں سے گھِرا ہے۔ راہیں دشوار گذار ہیں، سرد موسم، تیز رفتار دریا اور بادوباراں وہ جوہات ہیں جس وجہ سے یہ علاقہ الگ تھلگ رُہا اور اِن علاقوں میں ناگ مت تازہ دَم رہا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آریا، ناگوں کی عسکری طاقت کو مکمل طور ختم نہیں کرسکے۔ اگرچہ تمام شمالی ہندوستان میں آریاؤں نے اُپنی جنگی صلاحیت، فن

سپہ گری، بہتر سماجی نظام، قبیلوں کی وفاداری، علمی اور عملی برتری سے ناگوں کو بھگا دیا لیکن ڈوڈہ علاقے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ اِس علاقے میں ناگوں کا اپنا منفرد سماجی مقام تھا۔ رُوحانی فلسفہ اور کسی قدر جنگی صلاحیت موجود تھی۔ اِن کی رُوحانی اور جنگی طاقت کی سرداری بہادر اور اعلیٰ روحانی دِلاوروں کے ہاتھوں میں تھی۔ اِن سرداروں میں واسک ناگ، گودرشن ناگ، گمانی ناگ، تکھشک ناگ، ڈامر ناگ، ناگل، کالی ناگ، سَنکھ ناگ اور ناگ سین کافی مشہور ہیں۔ اِن ناگ سرداروں کے ناموں سے ہی آج بھی ناگ مندر اور اَستھاپن موجود ہیں۔ آج بھی پُرانے زمانے کا کوئی ویشنو مندر یا پھر کسی اور آریہ دیوتا کا مندر نظر نہیں آتا۔ واسکھ ناگ اُن کا رُوحانی دیوتا اور جنگی سُور ماتھا۔ اِس علاقے کے لوگوں کو اَب بھی واسکھ ناگ سے زبردست عقیدت ہے۔ آریوں نے، بقول واسکی پوراَن، واسکھ ناگ کو زیر کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

کیلاش کوہ سے گاٹھا (بھدرواہ) تک واسکھ ناگ کے چُھپنے کی جگہ تھی اور آریہ اس جگہ کا پتہ نہیں لگا سکے۔ اُس نے آریوں کی جنگی طاقت کا مقابلہ کرتے ہوئے ڈوڈہ سے ہماچل پردیش تک طاقت ور اور خوشحال ناگ ریاست قائم کی۔

ضلع ڈوڈہ، اُودھمپور اور کٹھوعہ ضلع کا بیشتر علاقہ ناگ مت کے پیروکاروں کا علاقہ ہے۔ اِن علاقوں میں ہزاروں برس کی ناگ رسومات اَب بھی پوری طرح سے رائج ہیں اور ناگ پوجا سارا سال جاری رہتی ہے۔

خزاں میں جب لوگ فصلیں سمیٹتے ہیں، پہلا بھوگ ناگ مندر یا

استھاپن میں عقیدت مندوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔اِس کے بعد جگہ جگہ ناگ مت کا میلہ لگتا ہے۔ جسے ''کڑ'' کہتے ہیں۔گاؤں کے لوگ شام کے وقت مندر کہ قریب اکٹھے ہوتے ہیں' الاؤ جلائے جاتے ہیں اور اِسی ناگ کے اِرد گرد مرد و زن رات بھر ناچتے رہتے ہیں، ڈھول بجایا جاتا ہے اور گیتوں میں ناگ دیوتا کی عظمت کا تذکرہ ہوتا ہے۔صبح سویرے مندر سے نکلتے ہیں اور آگ کے قریب پہنچ کر کپڑے اور کھڑاؤں اُتارتے ہیں اور ترشول لے کر اَلاؤ میں گھس کر والہانہ طور ناچتے ہیں۔اِس کے بعد جب وہ اَلاؤ سے باہر نکل آتے ہیں تو عقل یہ دیکھ کر حیران ہوتی ہے کہ ناچنے والے پر اِس آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔اسکے بعد تمام لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل کر ناگ مندر جاتے ہیں اور واسکھ ناگ اور دیگر ناگ دیوتاؤں کی پُوجا کرتے ہیں۔دوسری حیران کُن رسم جو اَنجان کو بہت ہی عجیب اور خوفناک لگتی ہے اُس وقت دیکھنے کو ملتی ہے جب ناگ مت کا پیروکار مر جاتا ہے۔اُس کی استھیاں گنگا میں بہائی نہیں جاتی ہیں بلکہ انہیں مرنے والے کے گھر لایا جاتا ہے۔اماوس کی اندھیری رات کو محلے کے بزرگ ایک گھر میں جمع ہو جاتے ہیں۔دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے استھیوں پر علمیات کئے جاتے ہیں۔وہاں تمام رات عجیب آوازیں سُننے کو ملتی ہیں اور یہ عمل صبح چار بجے تک جاری تک جاری رہتا ہے۔اس دوران وہاں رکھی گئیں استھیاں کہاں جاتی ہیں اُس کا کسی کو کوئی پتہ نہیں چلتا۔اس رات کے دوران کوئی اور شخص اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتا، مہمان کا کوئی تذکرہ ہی نہیں۔

ناگوں کا دیوتا شنکر اور شنکر کی شکتی ''ژنڈی'' ہے۔اس کے علاوہ کسی دیوی

دیوتا کونہیں مانتے۔ اُن کے عقیدے کے مطابق شنکر کیلاش کوہ پر رہتا تھا اور عقیدت مند بہت دن سفر کر کے دشوار گذار پہاڑوں پر چڑھتے اور آخر کیلاش پربت پر پوجا کر کے سُکھ اور سکون حاصل کرتے۔ اِس یاترا کے متعلق بھی ایک حیران کُن واقعے کا تذکرہ ضروری ہے۔ وہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جس کو بُلایا جائے صرف وہی یاترا کر سکتا ہے۔ وہ شخص جو کسی خاص قسم کی بے چینی کا شکار ہو جائے اس کا دِل کسی کام کے ساتھ نہیں لگتا وہ مایوس، مایوس سا رہتا ہے جب وہ یاترا کی نیت کرلے اُس کی بے چینی یک دم سے دُور ہو جاتی ہے۔

ڈوڈہ علاقے میں ژنڈی کے تین استھاپن ہیں۔ سرما تا اشٹ بُجا ایک خوبصورت اور پُر سکون جنگل میں ہے جو اُونچے کوہساروں سے گِھرا ہے یہ بہت ہی مقدس تیرتھ مانا جاتا ہے۔ یہاں سال بھر عقیدت مندوں کی آمدرفت رہتی ہے۔ دوسرا پاڈر کشتواڑ میں بہت ہی دشوار گذار پہاڑوں، دریاؤں اور دریاؤں کو عبور کر کے مچیل آتا ہے۔ مچیل نام کی ایک پہاڑی چوٹی پر یہ مندر ہے۔ اس پہاڑی چوٹی پر خزاں میں ایک بڑا اجتماع منعقد ہوتا ہے۔ چھڑی مبارک چنوٹ (بھدرواہ) سے نکل کر واسکھ ناگ کے دربار گاٹھا میں رُکتا ہے۔ واسکھ ناگ اور دیگر دیوتاؤں کی پوجا کے بعد چھڑی مبارک مچیل روانہ ہو جاتی ہے۔ ایک ہفتے کی پیدل یاترا کے بعد یاترا مچیل پہنچتی ہے۔ تیسری جگہ ڈوڈہ کے مغرب میں ''دہدنی'' ہے۔ یہ علاقہ قدرتی حُسن سے مالا مال ہے۔ برفیلے پہاڑوں کے دامن میں، گھنے جنگل کے بیچ اور چراگاہوں کی گود میں اور مرمت علاقے کے مشرق میں بہت پُر سکوں اور دِل کو راحت بخشنے والا تیرتھ ''دیدنی'' ہے۔ کہتے ہیں اگر کسی کو پیلیا ہو جائے اُس کو وہاں کے چشموں

کا پانی پلایا جاتا ہے جس سے وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ وہاں نوراترہ کے اَیام میں میلہ لگتا ہے اور قربانی پیش کی جاتی ہے۔

واسکھ ناگ کوڈوڈہ کے تمدّنی منظرنامے پر مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ لوک عقیدوں نے واسکھ ناگ کو رُوحانی برتری عطا کی ہے۔ اُس کا مندر بھدرواہ میں ہے۔ کہتے ہیں واسکھ ناگ سانپ کی شکل میں ہے جسے بھگوان شِوناتھ نے اَپنے گلے کے گرِد لپیٹ رکھا ہے۔ کہتے ہیں جب واسکھ ناگ کسی پر مہربان ہو جائے تو اُس کو واسکھ ناگ کا سایہ ہر دَم محسوس ہوتا ہے۔ اسکی مثال راجہ ناگپال کی ہے۔ یہ بھدرواہ علاقے کا راجہ اور اکبر کا باجگذار تھا۔ ایک روز شہنشاہ اکبر نے تمام باجگذار بادشاہوں کو پایہ تخت دِلی میں اِکٹھا کیا۔ ناگپال کو بھی دعوت دی گئی۔ چنانچہ وہ راج دربار میں پہنچ گیا اور بادشاہ کے آگے جھکنے کے بجائے اپنی جگہ بَراجماں ہو گیا۔ بادشاہ بڑا غضبناک ہُوا اور حکم دیا کہ اس گستاخ کا سر قلم کیا جائے۔ ناگپال نے عرض کی کہ میں نے اپنا سر اَپنے روحانی بادشاہ واسکھ ناگ کے بغیر کسی اور کے سامنے نہیں جُھکایا ہے۔ اِس سے بادشاہ اور بھی خشمناک ہو گیا کہ ایک بدتمیز شخص نے میرا درجہ ایک سانپ سے بھی زیادہ گھٹا دیا۔ چنانچہ اکبر بادشاہ نے ناگپال کو سزا دینے کا حکم دیا۔ لیکن اسی اثناء میں سات سروں والا سانپ ناگپال کے سر پر نمودار ہو گیا چنانچہ دَرباری سخت حیران اور خوف زدہ ہو گئے۔ بادشاہ نے سراسیمگی کی حالت میں سزا معاف کی اور سانپ غائب ہو گیا۔ اسکے بعد اکبر نے بطورِ انعام بعض تحائف دیئے جن میں سونے کے ہار، چاندی کے زیور، چاندی کی چھڑی اور بے شمار چیزیں واسکھ ناگ مندر کو دیں۔ یہ تمام اشیاء آج بھی وہاں موجود ہیں اور ''میلہ پٹ'' کے موقعے پر اِن کی زیارت کرائی جاتی ہے۔

ناگ عقیدے کے مطابق مہاتما بدھ بھی ناگ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ کپل وستو ناگ علاقے ہی میں آتا ہے۔

کہتے ہیں ناگوں کا راجہ وہی بنتا ہے جس کے جسم پر جنم کے وقت سے ہی ''ناگ مہر'' کھدی ہو۔ جس کے جسم پر یہ ''ناگ مُہر'' یا ''ناگ منی'' ہوتی ہے اُس کا سماج میں بے حد احترام کیا جاتا ہے۔

جب ناگوں نے آریاؤں کو پسپا کیا انہوں نے ناگوں سے صلح کر لی۔ چنانچہ مہابھارت کا ''اشتک پرو'' ناگوں کی تعریف میں لکھا گیا۔ اِس میں جن ناگوں کی بہادری کی تعریفیں کی گئیں ہیں اُن میں شش ناگ، واسکھ ناگ، آروٹ، کارکوٹ ناگ، دَھنن جے ناگ، کالی ناگ، منی ناگ، اسپوران آہا پترا، وامن، نیل ناگ اور ائیل ناگ وغیرہ شامل ہیں۔

ناگ قبیلے میں آج دلچسپ رسم ورواج موجود ہیں جس کی مثال کسی بھی عالمی تمدّن میں نہیں ملتی۔

مشہور سماجی فلاسفر ''منو'' اپنی کتاب منوسمرتی میں لکھتا ہے کہ انسان کو تین گناہ کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ باکمال جنگ جُو اور فنونِ سپہ گری میں نامور شخص کی بے عزتی، رفیع الشان عالِم کی تعظیم نہ کرنا اور ناگ قوم کے کسی بے گناہ شخص پر سختی کرنا۔ ان تین باتوں کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے اور نیل مت پُران مین کہا گیا ہے کہ جو اِنسان سات براعظموں سُت ریشیوں پشاچوں کے راجہ نکمب کی روحانیت کے سات رموز اور ناگوں کے راجہ نیل کا احترام کرے، وہ زندگی میں سُکھ حاصل کرتا ہے۔

شریف حُسین قاسمی

نوّیں صدی عیسوی میں
کشمیر کی ایک جھلک

کشمیر اُن ایرانی سیاحوں، شاعروں، عالموں اور تاجروں کے لئے جنّت نشان کی حیثیت رکھتا ہے جو قدیم زمانے سے ہندوستان آتے رہے ہیں۔ یہاں کی سرسبز و شاداب وادیوں اور گُنگناتے جھَرنوں نے اِن ایرانی لوگوں کے دِلوں کو ہمیشہ لبُھایا ہے اور انہیں کشمیر کی فضا میں اَپنے وطن کی بُو آئی ہے۔ ایرانیوں نے اَپنی تحریروں میں کشمیر کا ذکر کچھ اِس انداز سے کیا ہے کہ جس سے اِس خطّہ سرزمین سے اُن کے قلبی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ ایرانی شعراء نے تو کشمیر کی تعریف میں اَپنا دِل نکال کر رکھ دیا۔ شاہجہاں کے زمانے میں ایرانی شعراء کی بڑی تعداد دَربار سے مستعفی ہونے کے بعد کشمیر منتقل ہوئی اور کشمیر کو ایک ایسا گوشۂ عافیت پایا جہاں اُنہوں نے حسین اور دِلکش قدرتی مناظر کی آغوش میں زندگی کے آخری دن گذارے اور آخر کار اِسی سرزمین کا حصّہ بن گئے۔

ناخدا بزرگ شہر یار رامہرمزی نے اپنی کتاب ''عجائبِ ہند'' میں کشمیر سے متعلق چند واقعات بیان کیے ہیں۔ ذیل میں انہی واقعات کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''عجائب ہند'' اواخر دسویں صدی عیسوی کی تالیف ہے۔ یہ عربی زبان میں ہے [1] جس کا فارسی ترجمہ، ایران سے شائع ہو چکا ہے [2] یہ کتاب ایک سو چھتیس (۱۳۶) معلوماتی خاکوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں نویں صدی عیسوی میں خلیج فارس سے چین تک بحری سفر کرنے والے جہاز کے کپتانوں اور سمندری تاجروں (ان میں ایرانی بھی تھے، ہندوستانی اور عرب بھی، نے اپنے ذاتی تجربات کے بعد بزرگ بن شہر یار سے جو بصرہ کا ایک بڑا تاجر تھا، بیان کیے تھے۔

شہر یار اپنی اس کتاب میں اُس زمانے کے اِس عقیدہ کا اظہار کرتا ہے کہ خدا نے دنیائے عجائبات کو دس حصوں میں تقسیم کیا ہے ان میں نو حصے دنیائے مشرق کی قسمت میں آئے ہیں اور ایک حصہ مغربی، شمالی اور جنوبی دنیا کو عطا کیا گیا ہے اور عجائباتِ عالم کے وہ نو حصے جو مشرق کو عطا کیے گئے ہیں ان میں سے آٹھ حصے ہندوستان اور چین کی سرزمین میں محفوظ ہیں۔

شہر یار نے اپنی کتاب کے آغاز ہی میں کشمیر سے متعلق ایک حکایت بیان کی ہے جو ملک را [3] (بلہرا کی تخفیف) کے خفیہ طور پر اسلام لانے سے متعلق،

---

[1] یہ عربی کتاب لائڈن سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر خورشید احمد فاروق، شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے بھی اپنی کتاب ''عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان'' میں عجائب ہند سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ [2] ''عجائب ہند'' تالیف ناخدا بزرگ شہر یار رامہرمزی، ترجمہ: محمد ملک زادہ، مطبوعہ بنیاد فرہنگ ایران۔ [3] اس راجہ سے راشٹراکوٹا تاجدار کہ ستنا دوم مراد ہے جس نے ۸۷۷ء سے ۹۱۵ء تک اڑتیس سال حکومت کی۔

ہے۔اس حکایت کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

ابو محمد حسن بن عمر دین حمویہ بن حرام بن حمویہ النجیر می نے بصرہ میں مجھ سے بیان کیا کہ وہ ۲۸۸ھ/۹۰۰ء میں منصورہ (سندھ) میں مقیم تھا (اس زمانے میں سندھ پر عربوں کی حکومت تھی) وہاں کے ایک معتبر شیخ نے بتایا کہ شاہِ رائق کے لڑکے مہروکب نے جس کی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیریں (دکن پلیٹو) کے درمیان ہے، ۲۷۰ھ/۸۸۳ء میں منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کو ایک خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کیلئے ہندی زبان میں[1] شریعتِ اسلام کے اصول وضوابط کی وضاحت اور تشریح کا انتظام کرے۔ عبداللہ نے، منصورہ کے ایک دانشمند شخص کو بلایا، جو شاعر بھی تھا۔ یہ شخص اصلاً عراقی تھا۔اس کی پرورش ہندوستان میں ہوئی تھی۔اسی وجہ سے ہندوستان کی مختلف زبانوں سے یہ شخص واقف تھا۔ منصورہ کے حاکم نے اس شخص کو ہندوستان کے بادشاہ کی خواہش سے مطلع کیا اور اس سے درخواست کی کہ یہ کام انجام دے۔

اس شخص نے ایک نظم میں ہندوستانی بادشاہ کی درخواست کے مطابق اسلام کی وضاحت کی اور نظم راجہ کو بھیج دی۔ جب یہ منظومہ راجہ کے سامنے پڑھا گیا تو راجہ نے اِسے بہت پسند کیا اور حاکم منصورہ، عبداللہ کو لکھ بھیجا کہ صاحبِ نظم کو اُس کے دربار میں روانہ کردے۔ حاکم منصورہ نے اِس شاعر کو ہندوستان بھیج دیا اور وہ یہاں تین سال مقیم رہا اور اس کے بعد منصورہ لوٹا۔

حاکم منصورہ نے اِن تین برسوں کے قیام کے حالات اِس سے

---

[1] یہاں ہندی زبان سے راجگان راشٹرکوٹا کی علاقائی زبان مراد ہے۔

دریافت کیئے ۔ صاحب نظم نے اُسے بتایا کہ :- جب میں واپس ہوا تو ہندوستانی راجہ، قلب وزبان سے مسلمان ہو چکا تھا۔ لیکن اس خوف سے کہ اگر اس تبدیلیٔ مذہب کا اعلان کردیا تو ممکن ہے اپنی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑیں، اس وجہ سے وہ خاموشی سے اِسلام کا پیروکار ہو گیا۔ ایک دن راجہ نے خواہش ظاہر کی کہ قرآن کریم تفسیر ہندی میں شروع کرے۔ جب میں سُورۂ یٰسین پر پہنچا تو اس آیت قَالَ مَنۡ یُحۡیِ الۡعِظَامَ وَہِیَ رَمِیۡمٌ قُلۡ یُحۡیِیۡہَا الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَہَاۤ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَہُوَ بِکُلِّ خَلۡقٍ عَلِیۡمٌ[1] ۝ کی تفسیر بیان کی۔ بادشاہ نے جو قیمتی لعل وجواہر سے آراستہ زرّیں تخت پر رونق اَفروز تھا، کہا: اس آیت کے معنی پھر سے بیان کرو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ تفسیر سن کر تخت سے نیچے اتر آیا اور سجدہ میں گر گیا۔ اور اس قدر رویا کہ اس کا چہرہ خاک آلود ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اُٹھا اور میری طرف رُخ کر کے بولا ۔ یہی ہے سب سے پہلا معبود اور اَزلی رب، یکتا، بے مثال اور عبادت کے قابل ۔ اس واقعہ کے بعد اُس نے اَپنے لئے الگ ایک محل تعمیر کرایا اور اس میں تنہا وقت گذارتا۔ ظاہری طور پر وہ کہتا تھا کہ اُمورِ سلطنتی کو سلجھانے کیلئے وہ اِس محل میں تنہائی میں غور فکر کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس تنہائی اور خلوت میں خدا کی عبادت کرتا تھا۔ نماز اَدا کرتا تھا۔ کوئی دوسرا اُس کے فعل سے آگاہ نہ تھا۔ اس راجہ نے مجھے تین بار میں چھ سو من[2] سونا (اس زمانے میں ایک من تیرہ

---

[1] ترجمۂ آیت: مخالفین کہتے ہیں، کون زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو جب کہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ جواب دیدیجئے ان کو کہ وہی اللہ پیدا کریگا جس نے پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر پیدائش کو جانتا ہے۔

[2] عرب، من کو رطل کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، رطل کا وزن اس زمانے میں بقول مقدسی، سندھ اور ہند میں، رطل مکہ کے برابر تھا یعنی تقریباً تیرہ چھٹانک (احسن التقاسیم، لائڈن، س، ص ۴۸۲)

چھٹانگ کے برابر تھا) عطا کیا۔

اِسی عالمِ دین شاعر نے کشمیر کے ایک واعظ سے متعلق ایک اور حکایت بھی بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کشمیر بالا کے رہنے والے ہر سال ایک جشن مناتے ہیں۔ اُس روز، لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ایک خطیب، وعظ ونصیحت کیلئے منبر پر آتا ہے۔ ایک بار یہ خطیب، حسبِ معمول وعظ کہنے آیا اور اَپنے ہمراہ، مٹی کا ایک کچّا گھڑا بھی لیتا گیا۔ منبر سے اُس نے لوگوں کو خطاب کیا:

"اے لوگو، اپنے نفس کے مالکِ بنو، اِس کے تابع نہ ہو، اور جہاں تک ہو سکے، اَپنے مال ومتاع کی حفاظت کرو۔"

اِس کے بعد اس نے مٹی کا کچّا گھڑا لوگوں کو دِکھایا اور کہا کہ اِس مٹکے کو دیکھو۔ چونکہ اس کی حفاظت کی گئی ہے، اس کو سلیقے اور احتیاط سے رکھا گیا ہے، اس وجہ سے چار ہزار سال گذرنے کے باوجود، یہ اپنی اصلی حالت میں باقی ہے۔

حسن بن عمرذ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ منصورہ میں کشمیر پائین کے لوگوں سے مِلا ہے۔ کشمیر اور منصورہ کے درمیان، خشکی کے راستے، ستر دِن کی مسافت ہے لیکن دریائے مہران[1] کے راستے جس کی رَوانی، طوفان کے زمانے میں دَجلہ وفرات کی رَوانی کی مانند ہے، یہ کشمیری قسط[2] سے بھرے بوروں کے ذریعہ منصورہ تک کا سفر کرتے ہیں۔ حسن کا کہنا ہے کہ ہر بورے میں سات سو آٹھ سو من قسط بھری ہوتی ہے۔ ان بوروں پر کھال منڈھ دی جاتی ہے۔ بوروں میں پانی نہ داخل ہو جائے اس لئے ان کو، کھال سے منڈھنے کے بعد،

---

[1] بلوچستان اور ہندوستان کے درمیان واقع ایک دریا کا نام تھا۔

[2] ایک قسم کی تلخ لکڑی کی طرح کی دوا کا نام جس کو ہندی میں کٹھ کہتے ہیں

تارکول سے لیپ دیا جاتا ہے۔اِس کے بعد بوروں کوایک دوسرے کے قریب لاکر، مضبوطی سے باہم باندھ دیا جاتا ہے۔- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - ۔اِن پر کشمیری بیٹھ جاتے ہیں اور دریا کا سفر، منصورہ تک، اِسی طرح طے کیا جاتا ہے۔اِس طرح قسط سے بھرے یہ بورے، پانی سے محفوظ، چالیس دن میں کشمیر سے منصورہ پہنچ جاتے ہیں۔

ایک دوسری حکایت کے مطابق، ایک مُلاّح جو طویل مدت ہندوستان اور قُربِ جوار کے علاقوں کا سفر کرتا رہا تھا۔شہریار، مصنّف عجائب ہند، سے ایک دلچسپ اور عجیب وغریب داستان بیان کی۔اِس ملاح نے یہ واقعہ ان لوگوں سے سُنا تھا جو ہندوستان میں رَہ چکے تھے۔ ملاّح کی اِس داستان کے مطابق:۔

کشمیر بالا کے علاقے میں، ایک جگہ، جسے ترنارابن (شمال میں ایک علاقہ) کہتے ہیں اور جہاں متعدد باغات ہیں۔ جہاں بہت سی نہریں بہتی ہیں، ایک بازار واقع ہے۔ یہ بازار، بازار جِنّہ (جن کی جمع) کے نام سے موسوم ہے۔اِس بازار میں خرید وفروخت کی ہماہمی، گاہک اور دوکاندار کے درمیان ہونے والی گفتگو اور تکرار کا شور سنائی دیتا ہے لیکن کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ یہ جگہ قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ ملاّح سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اِسے یہ معلوم نہیں کہ آیا یہ بازار اِسوقت تک موجود تھا یا نہیں۔اِس کے علاوہ ایک اور حکایت سے کشمیر میں ہیرے پائے جانے کا علم ہوتا ہے:

ایک شخص نے جو ہندوستان بہت آیا گیا تھا اور یہاں طویل سفر کئے

ہیں، شہر کو بتایا کہ کشمیر کے نواح میں بیش قیمت، صاف اور بے نظیر ہیرے دستیاب ہوتے ہیں۔ جہاں یہ ہیرے پائے جاتے ہیں وہ جگہ دُو پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ درّہ ہے جہاں ہر موسم میں سردی ہو یا گرمی اور ہر وقت، دن ہو یا رات، آگ کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ اِسی جگہ ہیرے پائے جاتے ہیں۔ اِن ہیروں کو حاصل کرنے والے لوگ، پائیں کشمیر کے ایک مخصوص طبقے سے تعلّق رکھتے ہیں جو اَپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ہیرے حاصل کرتے اس جگہ آتے ہیں ہیرے حاصل کرنے کیلیئے، اِس طبقے کے کچھ لوگ جمع ہو کر اس درّہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ دَرّہ کے قریب پہنچ کر یہ لوگ ایک بھیڑ کاٹتے ہیں اور اس کے ٹکڑے ٹکرے کرنے کے بعد، اِن ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے، منجیق سے اس تنگ دَرّہ میں پھینکتے ہیں۔ اِس درّہ میں داخل ہونا چند وجوہات کی بنا پر جان جُوکھوں کا کام ہے۔ مثلاً خود آگ کی تپش وہاں جانے میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔ اِس کے علاوہ، بڑے بڑے سانپ اور موذی اُژدھے اس آگ کے چاروں طرف کنڈلی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور وَہاں سے کسی انسان کے گذرنے کو ناممکن بناتے ہوئے، جب مذکورہ بالا لوگوں کا گروہ، گوشت کے ٹکڑوں کو درّہ میں پھینکتا ہے تو ان میں سے کچھ زمین پر گرتے ہیں اور کچھ آگ میں جا پڑتے ہیں۔

زمین پر گرِنے والے گوشت کے ٹکڑوں کو حاصل کرنے کیلیئے کچھ گدھ، جو وہاں منڈلاتے رہتے ہیں، اِن پر جھپٹتے ہیں اور انہیں اُٹھالے جاتے ہیں۔ جو گدھ زمین پر پڑے گوشت کے ٹکڑوں کو اُٹھالے جاتے ہیں لوگ اُن کا پیچھا کرتے ہیں اور گدھ جس جگہ بیٹھ کر، گوشت کے ٹکڑے کھاتے ہیں وہاں پہنچ کر

ہیروں کے وہ ٹکڑے اُٹھا لیتے ہیں جو گوشت سے چپک کر وہاں تک پہنچتے ہیں۔
یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گِدھ ناگ کے نزدیک پڑے گوشت کے ٹکڑوں کو اُٹھانے کی کوشش میں خود بھی جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ گِدھ، گوشت کے ٹکڑوں کو زمین پر گِرنے سے پہلے ہی جھپٹ لیتے ہیں۔

کشمیر سے متعلق یہ چند اور ہندوستان کے بارے میں دوسرے نکات جو عجائبِ ہند میں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے کچھ ممکن ہے عقل کہ کسوٹی پر پوری نہ اُتریں لیکن ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو اس زمانے میں ایک ایسا عجائب گھر سمجھا جاتا تھا، جہاں کے چپّے چپّے پر قدرت کی صنعت کاری کے نمونے دیکھنے والوں کو محوِ حیرت کر دیتے تھے اور خود ہندوستانیوں کی عقل وفہم اور اُن کی دانشمندی کے واقعات دوسرے لوگوں کے لئے سبق آموز ہوتے تھے۔

ولی محمد اسیر کشتواڑی

مملکتِ کشتواڑ
قدیم تذکروں اور سَفر ناموں کی روشنی میں

ضلع کشتواڑ کے طبعی خدوخال اپنی ساخت کے لحاظ سے کسی ایک عجوبہ سے کم نہیں۔ یہ ضلع سلسلہ وار پہاڑوں، وسیع ودِلفریب سبزہ زاروں، عریض و طویل کوہستانوں، سنگلاخ چٹانوں، پُر پیچ پُرخم ندی نالوں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریاؤں کوہستانوں کا بے ہنگم جغرافیائی خطہ لگتا ہے مگر اہلِ نظر کے لئے یہاں قدم قدم پر قلب ورُوح کی بالیدگی کے سامان پوشیدہ ہیں۔ اِس ضلع کا منفرد تاریخی پسِ منظر، تہذیب وتمدن اور کثیر اللسانی حیثیت، رنگارنگ ثقافت، مرغزاروں کی دلکش تراوت، جھرنوں اور آبشاروں کی رَوانی کا زیر و بم، بیابانوں کا سکوتِ، چراگاہوں کی اٹھکیلیاں، خوش رنگ وخوش لحن پرندوں کے ترانے، جڑی بوٹیوں اور خودرُو گلاب ولالہ کی بھینی مہک، نیلم کی چشمِ بینا کو خیرہ کرنے والی چمک دمک، ریگزاروں کی جھلملاہٹ اور فرقہ دارانہ ہم آہنگی اور

مذہبی رواداری کی رَوایات دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ کشتواڑ، وادیٔ چناب کے ایک بڑے حصّے پر پھیلا ہوا لیہہ اور کرگل کے بعد ریاست جموں وکشمیر کا تیسر بڑا ضلع ہے۔ یہاں کے اکثر قصبہ جات اور مواضعات چناب اور اُس کے معاون دریاؤں اور ندی نالوں کے ساتھ ساتھ آباد ہیں۔ دریائے چناب یہاں کی جغرافیائی، انتظامی، ثقافتی، تاریخی اور لسانی صورتِ حال پر نمایاں اَثرات مرّتب کرتا ہے۔ یہ ضلع بقولِ نشاط کشتواڑی، ریاست جموں وکشمیر کی انگوٹھی میں ایک ایسے نگینے کی مانند جُڑا ہوا ہے جس کی تابانی اور چمک دمک دُور دُور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اِس عریض وبسیط ضلع کی سرحدیں شمال میں اننت ناگ اسلام آباد، کرگل، جنوب میں کٹھوعہ، اُدھمپور اور چمبہ (ہماچل پردیش)، مشرق میں کرگل اور لیہہ (لداخ) اور مغرب میں اننت ناگ (کشمیر) اور اُدھمپور کے اضلاع سے جاملتی ہیں۔ مشہور فرنگی جغرافیہ دان فریڈرک ڈِریو نے اس خطے کو وسطی پہاڑوں کا علاقہ اور ایک اور معتبر جغرافیہ دان ایس-سی-بوس کے مطابق ضلع ڈوڈہ، پیر پنجال سلسلے کا اہم ترین حصہّ ہے۔ ضلع ڈوڈہ کا رقبہ گیارہ ہزار چھ سو اکانوے مربع کلومیٹر ہے۔ جو ۸،۶۵۵ مربع کلومیٹر دیہاتوں اور ۳۵۰۵ مربع کلومیٹر قصبوں پر مشتمل ہے۔ محکمۂ مال کی مثلِ حقیقت کے مطابق ضلع ڈوڈہ نے دیگر ضلعوں کی طرح ڈوڈہ میں واقع ہیڈکوارٹر کی نسبت سے اپنا نام حاصل کیا ہے۔ اِنتظامی اعتبار سے یہ ضلع رام بن، ڈوڈہ، بھدرواہ اور کشتواڑ کے چار بڑے سب ڈویژنوں اور مڑواہ، چھاترو، پاڈر، کشتواڑ، ٹھاٹھری، گندو، بھدرواہ، ڈوڈہ، رام بن اور بانہال کی دس تحصیلوں میں منقسم کیا گیا ہے جبکہ سب ڈویژن دُچھن، تحصیل عسر اور کشتواڑ ضلع کی

تشکیل حکومتِ کے زیرِ غور ہے۔ یہاں کی قدرتی خوبصورتی کی بجا طور پر مدح سرائی کرتے ہوئے ڈوڈہ کے نامور شاعر جناب مشتاق فریدی نے کیا خوب فرمایا ہے۔

چُھپا رکھا ہے فطرت نے یہاں کیا کیا ہے پردوں میں
چلے آؤ دکھائیں گے تمہیں تصویر فِطرت کی

کلہن کی ''راج ترنگی'' میں کشتواڑ کا نام ''کشتواٹ'' لِکھا گیا ہے۔ ہچی سن نے اِس کا مطلب ''باغِ بہشت'' نکالا ہے۔ ایک اہم فارسی تاریخ ''بہارستانِ شاہی'' میں کشتواڑ کو ''کاٹھواڑ'' کہا گیا ہے۔ سیّد نجم الدّین نے اپنی ''تاریخِ کشتواڑ'' میں لکھا ہے کہ کشٹہ خوبانی کے چھلکے کو کہتے ہیں اور ''واڑ'' جگہ کو۔ کشتواڑ کا مطلب بقولِ عشرت کاشمیری دُکھ کی جگہ ہے۔ یہی زیادہ مستعمل ہے یعنی ہندی میں ''کشٹ'' کے معنی رنج ہیں اور ''واڑ'' جگہ کو کہتے ہیں۔ اِس لئے کشتواڑ کے معنی ہوتے ہیں ''دُکھ کی جگہ'' جو کوئی کشتواڑ میں رہ جاتا ہے، دو باتیں اختیار کرتا ہے۔ دن کو بھوک کی آگ میں جلتا ہے اور رات کو سردی کی وجہ سے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ہری لال جیوتشی 'جو ایک مقامی مورّخ تھے' کے مطابق پنڈت سنگرام دیو نے اپنی قلمی کتاب ''راج وانش کیرتی کومُودی'' میں کشتواڑ کو '' کشتواڑاک '' لکھا ہے جس کا مطلب مصیبتوں سے دُور کرنا ہے۔ بھدرواہ کے واسک پُران میں اسے ''کشت تیواڑک '' کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ ناگ بادشاہ واسک نے کشمیر سے بھاگتے ہوئے یہاں پناہ لی تھی۔ ''مہاراجہ گلاب سنگھ'' نامی کتاب کے مصنف پنڈت سالگرام کول تحریر کرتے ہیں۔ ''روایت ہے کہ جس وقت کشمیر کی سرزمین ایک جھیل کی حالت

میں بلند کوہستانوں کی چوٹیوں تک پانی اور برف سے پُر ہو کر ''ستی سر'' کے نام سے ملقب تھی اُس وقت کیشپ جی (کشپ رِشی) کشتواڑ میں رہتے تھے اور یہاں ہی سے کشمیر کی جانب بڑھ کر اور کونسر ناگ کے پہاڑ پر بیٹھ کر جھیلِ مذکورہ کا پانی نکالنے کے لئے انہوں نے تپسیا شروع کی۔ کیشپ جی کا گذر چونکہ پہلے کشتواڑ میں ہوا، اِس واسطے اس سرزمین کا نام ''کیشپ وار'' یعنی کیشپ جی کے رہنے کی جگہ پڑا۔'' مؤرخین نے کشتواڑ کا قدیم ترین نام سمرتھ گڑھ یعنی ایک مضبوط قلعہ یا جگہ بھی بتایا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں اور مؤرخین نے ''گوردھن سر'' ''اور چیڑ ہاڑ'' کے قدیم ناموں کا بھی ذکر کیا ہے مگر مشہورِ عالم مورخ پروفیسر فدا محمد حسنین نے اپنی کتاب ''کلچرل ہسٹری آف کشمیر اینڈ کشتواڑ'' میں کشتواڑ کے مذکورہ بیانات کو مُسترد کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ ''لفظِ کشتاوار'' جسے اب کشتواڑ کہتے ہیں، کا اصلی سُراغ لگانے کے لئے ہمیں کشن (ایران کے ایک ضلع)، کاشغر (وسطِ ایشیاء کے مشہور شہر) ہندوکش (پاکستان کا شمال مغربی پہاڑی سلسلہ) کشکر (کافرستان اور چترال کے شمال میں واقع علاقہ) اور اُن تمام دوسری جگہوں کے ناموں پر غور کرنا چاہتے جن کے پہلے کَش، کشِ، اور کُش لفظ جُڑے ہوئے ہیں۔ کُش دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد کشمیر اور کشتواڑ آئے تو انہوں نے اِن دونوں وادیوں کو کشمیر اور کشتواڑ کے نام دئے۔'' محکمہ مال کی مثلِ حقیقت میں جو مُستند ترین سرکاری ریکارڈ ہے، کشتواڑ کی وجہ تسمیہ اِن لفظوں میں درج ہے۔ ''اصل نام'' کاٹھواڑ'' ہے۔ رفتہ رفتہ کشتواڑ کا لفظ ہو گیا ہے۔ ''کاٹھ'' لکڑی کو ہندی زبان میں بولا جاتا ہے اور ''واڑ'' یا ''واڑی'' ہندی

زبان میں جگہ کو کہتے ہیں۔ یعنی لکڑی کی کھیتی ۔ چونکہ تمام علاقہ راجدھانی کی جگہ یہی موضع تھا اور اِس واسطے سے اِسی خاص موضع کو کشتواڑ بولا جاتا ہے۔‘‘

آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے کشتواڑ یہاں کا سب سے بڑا قصبہ ہے۔ دریائے چناب کے کنارے واقع یہ قصبہ قدرتی خوبصورتی، تاریخی، مذہبی اور سیاسی لحاظ سے کافی مشہور رہا ہے۔ کشتواڑ، سرینگر سے ۲۸۰ کلومیٹر، جموں سے ۲۲۹ کلومیٹر اور ڈوڈہ سے ۵۹ کلومیٹر کی دُوری پر واقع ہے۔ ۲۰۰۱ء کی مُردم شماری کے مطابق موجودہ کشتواڑ سب ڈویژن کی آبادی ایک لاکھ بانوے ہزار نو (۱،۹۲۰۰۹) تھی ’’ہسٹری آف ہمالیاز‘‘ کے فاضل مصنف ایس۔سی۔بوس ضلع ڈوڈہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں......’’ پیر پنچال کا سلسلہ کشن گنگا کے کنارے سے ہماچل پردیش میں ’’دیوۂ تیپا‘‘ تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں وہ کوہِ ہمالیہ کے بڑے سلسلے سے جا ملتا ہے۔ یہ کشمیر کو چمبہ کی سرحد تک لے جاتا ہے۔ پیر پنچال کے بیچ میں دریائے جہلم اور چناب اُوڑی اور کشتواڑ میں گھرے تنگ راستے بنائے ہوئے ہیں۔

کشتواڑ کا دریائی کنارہ قابلِ دید ہے۔ اِس کی اُونچائی تقریباً ایک ہزار میٹر ہے۔ اس کے دونوں طرف پیر پنچال رینج ، مشرقی میں ناگین شوڑو پہاڑ (۴۰۸۹ میٹر) اور مغرب میں پیپارن پہاڑ (۴۰۴۱ میٹر) کی صورت میں اُبھرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ کشتواڑ کی وادی دریائے چناب سے ایک ہزار میٹر کی بلندی پر ایک تنگ الماری (لیج) کی طرح لٹک رہی ہے۔‘‘

ریاست اور بیرون ریاست میں لکھی گئی متعدد کتابوں میں کشتواڑ کا کسی نہ کسی انداز میں ذکر آیا ہے اس لئے یہاں کی تاریخ ٹھوس بنیادوں پر مرتب

ہوئی ہے۔ کشتواڑ کے بارے میں مرتب شدہ کتابوں ''دی جموں اینڈ کشمیر ٹیریٹریز'' (فرزیڈرک ڈریو) ''ٹریولز اِن کشمیر'' (لارڈ وائن)، ہسٹری آف پنجاب ہل سٹیٹس (ہچی سن اینڈ ووگل) ''وِدپین اینڈ رائفل اِن کشتواڑ'' (اوٹو روتھ فلڈ)، تاریخِ کشتواڑ (فارسی - پنڈت شیو جی در) تاریخِ کشتواڑ (قلمی نسخہ ہندی - پنڈت دینا ناتھ) تاریخِ جموں (مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی) تاریخِ کشتواڑ (اُردو - سید نجم الدین) ''خلاصہ اَحوال راجہائے کشتواڑ'' (قلمی، پنڈت ستیارام) کشیر (ڈاکٹر غلام محی الدّین صوفی) ''مکمل تاریخ کشمیر'' (محمد الدّین فوق)، تاریخ ڈوگرہ دیس (دیوان نرگس داس نرگس) تاریخِ کشتواڑ (عشرت کاشمیری)، ہمالین پرنسپلٹیز اِن جموں، کانگڑہ اینڈ بھدرواہ (ڈاکٹر پریتم کرشن کول)، کلچرل ہسٹری آف کشمیر اینڈ کشتواڑ (پرُوفیسر فدا محمد حسنین)، ہسٹری اینڈ کلچرل آف کشتواڑ (دُونی چند شرما) کشیر بالہِ اَپارِ (پروفیسر مرغوب بانہالی) خطۂ کہسار (سعد اللہ شاد فرید آبادی) اور تصویرِ ضلع ڈوڈہ و ضلع ڈودہ کی اَدبی شناخت (اسیر کشتواڑی) وغیرہ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِن جُملہ مطبوعات کا پورے انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو زعفران زارِ کشتواڑ کی ہو بہو تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے اُبھر آتی ہے۔

ہمالیہ کے چشمے اُبلتے ہیں کب تک خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے

عشرت کاشمیری نے اپنی ''تاریخِ کشتواڑ'' کے پیش لفظ میں کشتواڑ کا تعارف اِن خوبصورت اَلفاظ میں قلمبند کیا ہے..... ''کشتواڑ کی خوبصورت وادی سطحِ سمندر سے ۵۳۰۰ فٹ بلند ہے۔ اس کا طول بلد

مشرقی ۷۵٬۴۶٬۶ درجہ اور عرضِ بلد ۳۳٬۱۸ درجہ شمالی ہے۔ آب وہوا گرمیوں میں خوشگوار اور سرما میں سرد ہے۔ خاص کشتواڑ میں تیز اور تند ہُوا چلتی ہے جو سردیوں میں ناقابلِ برداشت اور گرمیوں میں دُھوپ کی حدّت کو اعتدال پر لاتی ہے۔ مجموعی طور پر آب وہوا صحت اُفزا ہے۔ کشتواڑ تحصیل (موجودہ کشتواڑ، چھاترو، مڑواہ، پاڈر تحصیلوں) کا رقبہ ۳۱۶۶۹ مربع میل ہے۔ تحصیل کشتواڑ شمال مشرق میں ہماچل پردیش، شمال میں کشمیر، مغرب میں ڈوڈہ اور جنوب میں تحصیل بھدرواہ سے ملتی ہے۔ قدیم ریاست کشتواڑ میں تحصیلاتِ ڈوڈہ ماسوائے مَرمَت اور رام بن کے علاوہ شامل تھے۔ اگر آج ریاست کشتواڑ برقرار ہوتی تو دو لاکھ آبادی کا راجوڑہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہانگیر نے اپنی تُزک میں راجہ کشتواڑ کو زمیندار پٹہِ کشتواڑ لکھا ہے۔ کشمیر کی طرح کشتواڑ بھی رواداری اور اتحاد پرور روایات کا علمبردار رہا۔ رَواداری اور احترام باہمی سے اُن کا ضمیر اُٹھا ہے۔"

پروفیسر غلام محی الدّین حاجنی نے، جو کشمیر کے ایک معتبر اور سَر برآوردہ ادیب اور نقاد تھے اپنی تصنیف "کاشُر شاعری" کے تعارف میں لکھا ہے کہ مشہور بُدھ عالم ناگ سین نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مِنندہ پنہہ" یا "شکوک کا اِزالہ" کشتواڑی زبان میں سوال وجواب کے پیرایہ میں لکھی تھی جس کا ترجمہ پالی اور سنہالی میں بھی ہوا تھا۔ عشرت کاشمیری بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ناگ سین کشمیری تھا۔ اگر یہ قیاس دُرست ہے تو یہ بُدھ عالم یقیناً کشتواڑی تھا۔ اَوّل تو اُس نے کشتواڑی میں اپنی کتاب لکھی اور دوسرے یہ آج بھی کشتواڑ کے ایک علاقے کا نام ناگسون یا ناگسینی ہے۔ شری ایس رادھا

کرشنن ''بُدھ مت کے ۲۵۰۰ سال'' میں ناگ سین کے بارے یُوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ''ہندی یونانی بادشاہ میندر بُدھ مت کا بڑا سرپرست اور حامی تھا۔ بادشاہ میندر (Menander) پالی کتاب ''ملندہ پنہہ'' یا مالندہ کے سوالات کے کرداروں میں سے ایک ہے۔ اُس کے شکوک قابلِ احترام ناگ سین نے دُور کئے تھے۔ میندر کی حکومت میں پشاور، کابل کی بالائی وادی، پنجاب، سندھ، کاٹھیاوار ایسا دُور دَراز علاقہ شامل تھا تو کشتواڑ نسبتاً ہمسائیگی میں تھا۔ یہ ایک خوش کُن اتفاق تھا کہ ایک دن بُدھ بادشاہ نے ایک بُدھ بھکشو ناگ سین کو دیکھا جو بھکشا مانگنے جارہا تھا۔ اُس کامیاب مکالمہ پر جو بادشاہ اور بھکشو کے مابین ہوا ''ملندہ پنہہ'' کی بنیاد رکھی گئی جو ابتدائی بُدھ مت کے پالی اَدب کی بے حد قابلِ ذکر کتاب ہے اور جسے بُدھ گوش نے سند تسلیم کیا ہے۔''

پروفیسر فدا محمد حسنین اپنی ''اے کلچرل ہسٹری آف کشمیر اینڈ کشتواڑ'' میں بُدھ مت اور ناگ سین کے بارے میں یہ معلومات فراہم کرتے ہیں...... ''کشمیر اور کشتواڑ میں بُدھ دَھرم یونانیوں کی آمد سے پہلے ہی آیا تھا۔ چنانچہ یونانی شہزادہ میندر نے بُدھ بھکشو سے متاثر ہو کر بُدھ دھرم اختیار کیا تھا۔ بُدھ مت پر ہوئے بحث و مباحثہ کو سولات اور جوابات کے انداز میں مرتّب کر کے ''ملندہ پنہہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر کشتواڑی بولی میں لکھی گئی ہے جو نایاب ہے۔ اندازہ ہے کہ بُدھ مت کشمیر اور کشتواڑ میں ساتویں صدی عیسوی تک موجود رہا ہو۔ ناگ سین کا نام ناگ سینی یا ناگوں کشتواڑ کے ساتھ بھی منسلک کیا جارہا ہے۔

شری دُونی چند شرما اپنی تصنیف ''ہسٹری اینڈ کلچر آف کشتواڑ '' میں بدھ دھرم کے عروج وزوال پر کئی اہم انکشافات کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''ایسا لگتا ہے کہ بدھ مت تقریباً دوسری صدی قبل مسیح میں کشتواڑ، بالخصوص ناگ سینی پرگنہ میں پھیلا تھا۔ سب سے بڑے بدھ عالم اور بھکشو ناگ سین کشتواڑ کے ناگ سینی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر موضع کن جنگل کے برہمن تھے۔ آج کل کن جنگل کو پرگنہ تریگام میں واقع گالی گڈھ کو کنج کہا کرتے ہیں۔ کنج سے ناگ سینی کے موضع بھاتن، جہاں بدھ کلچر کے آثار پائے گئے ہیں، کہ کنج گلا درّے سے پیدل راستہ جاتا ہے۔ ناگ سین کے والد سونو برہمن، جو وسطی خطے کا راجہ تھا، نے ناگ سین کو ویدوں کی تعلیم دینے کی غرض سے ایک برہمن اُستاد مقرر کیا تھا۔ بیس برس کی عمر میں اُن کے گورو اشوک گپت نے بدھ مت کے تری پی تاک (تین بنیادی قوانین) کو سیکھنے کے لئے پاٹلی پُتر بھیجا۔ اس طرح وہ ایک بڑے ''ارہت' بن کر چھوٹی عمر میں بودھ مبلغ بنے۔ بادشاہ میندر اور ناگ سین کے درمیان دوسری بحث (کانفرنس) موضع بھاتن ناگ سینی کے قریب ہونے کا اندازہ ہے جہاں گوتم بدھ کی ایک چھوٹی مورتی، ایک پتھر پر اشوک کا چکر اور سیڑھیوں کے چند نشانات، جو شاید صدارتی کرسی کی جانب جاتے ہیں، ابھی تک موجود ہیں۔ اگر اِن آثار کی جگہ کھدائی کروائی گئی تو وہاں ایک کانفرنس ہال دِکھائی دے گا۔ اُن تمام باتوں سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ناگ سین کا راجواڑہ کشتواڑ کا ناگ سینی پرگنہ تھا۔ اسی پرگنہ میں سب سے پہلے بدھ مت پھیل گیا۔''

حضرتِ امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ المعروف شاہِ ہمدانؒ صاحب تین مرتبہ (۱۳۷۲ء، ۱۳۷۹اور ۱۳۸۳ء) کشمیر تشریف لائے اور بقول سیّد نجم الدّین مصنّف ''تاریخ کشتواڑ'' جب حضرتِ امیر کبیرؒ سید اطراف کرتے ہوئے کشتواڑ پہنچ گئے تو آپؒ کی خدمت میں اِس شہر میں خانقاہ بنانے اور تبلیغ دین اسلام کی التجا ہوئی تو آپؒ نے جواب دیا کہ الفِ ثانی میں حضرت شاہ محمد فرید الدینؒ اولادِ غوث الثقلین قدس سرہٗ بہ امرِ روحانی جدِ بزرگوار نورِ اسلام سے منوّر فرمانے کے لئے تشریف لانے والے ہیں۔ اس لئے اس خطہ کا احیاء اُن کو خداوند تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔''

کشمیر کی ایک مشہور تاریخ ''کشیر'' کے منصّف ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے کشتواڑ کا بچشمِ خود جائزہ لینے کے بعد یوں تحریر کیا ہے۔ ''سید محمد فرید الدین قادریؒ ولد سید مصطفٰے جو بغداد کے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے خاندان سے تھے۔(۱۰۰۰ھ-۱۵۵۱ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے، وسیع سیاحت کرنے، حج کا فریفہ انجام دینے، مکہ شریف میں شیخ جلال الدین المغربیؒ سے فیضیاب ہونے اور مصر میں شیخ محی الدین قادریؒ سے رابطہ پیدا کرنے کے بعد وہ سندھ کے لئے بغداد سے روانہ ہوئے۔ سندھ سے شاہ جہاں کے آخری دورِ حکومت میں آگرہ اور پھر دہلی پہنچے۔ راجہ جے سنگھ جو ۱۶۷۲ء میں گدی نشین ہوا تھا، کشتواڑ کا حکمران تھا۔ فرید الدینؒ اُپنے چار ساتھیوں درویش محمدؒ، شاہ ابدالؒ، سید بہاؤ الدین سامانیؒ اور یار محمدؒ کے ہمراہ ۱۰۷۵ھ (یعنی ۱۶۶۴ء) میں ۷۵ سال کی عمر میں کشتواڑ میں اسلام کی تبلیغ کے لئے تشریف آور ہوئے۔ راجہ کیرت سنگھ یعنی راجہ جے سنگھ کا ولی عہد

(۱۶۸۱ء) میں مسلمان ہو گیا اور ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے اس
کا نام سعادت یار خان رکھا۔ شہزادہ محمد کیرت سنگھ کی دیکھا دیکھی اس کی
رعایا میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

شاہ فرید الدّینؒ کا مقبرہ قصبہ کے مرکز میں واقع ہے۔ اُن کے ساتھ اُن کے چھوٹے بیٹے حضرتِ انوار الدّینؒ جن کا انتقال صغرسنی میں ہوا تھا، دفن ہیں۔ مقبرہ کے باہر کے کمرہ میں حضرتِ اخیار الدینؒ کا روضہ ہے۔ حضرتِ اسرار الدینؒ کا آستانہ جو حضرت فرید الدینؒ کے سب سے بڑے بیٹے ہیں، قصبہ کے دوسرے کنارے چوگان کی جانب واقع ہے۔ چوگان، کشتواڑ کا ایک کُھلا سبزہ زار ہے۔ حضرت اسرار الدینؒ کا انتقال ۱۸ برس کی عمر میں ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۵ء) میں ہوا۔ دوسرے بیٹے، حضرت اخیار الدینؒ اپنے والد کے بعد بھی زندہ رہے۔ اخیار صاحبؒ کی ابتدائی تعلیم بٹالہ، گورداسپور (پنجاب) میں حضرت بدر الدین دیوان مسانیاںؒ جو اُس جگہ کے مشہور خدا شناس درویش تھے، کی زیرِ تربیّت ہوئی۔

"علاوہ ازیں بعد میں اخیار صاحبؒ نے لاہور، سیالکوٹ اور دہلی وغیرہ میں بہت سے کاملین سے فائدہ اُٹھایا۔ کشتواڑ واپس جا کر انہوں نے اشاعتِ اسلام میں معاونت کی۔ اخیار صاحبؒ ۷؍ذوالحجہ ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۵ء) میں فوت ہوئے۔"

حضرت شیخ نوالدین نورانیؒ المعروف علمدارِ کشمیر، کشتواڑ کے راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پروفیسر محمد اسد اللہ وانی نے 'شیخ العالمؒ ایک مطالعہ'' میں اس حقیقت کا اِن لفظوں میں خلاصہ کیا ہے۔

"جہاں تک حضرت شیخ العالمؒ کے سلسلۂ نسب کا تعلّق ہے یہ سرزمین

کشتواڑ کے اُن راجگان کے ساتھ ہے جن کا سلسلۂ نسب گوڑ بنگال
کے سورج بنسی خاندان کے راجہ بکرماجیت سے جاملتا ہے۔ جب ہم اُن
کے شاعرانہ لب و لہجے کی بات کرتے ہیں تو اُن کا کشتواڑ کے ساتھ ایک
لِسانی رشتہ بھی قائم ہوتا ہے۔ اُن کے کلام میں بعض ایسے الفاظ استعمال
ہوئے ہیں جو موجودہ کشمیری میں اگرچہ متروک ہیں لیکن کشتواڑ اور اُس
کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبانوں کے آثار موجود ہیں۔''

''تاریخِ حسن'' حصّہ سوئم میں حضرت علمدار کشمیرؒ کے خلفیۂ خاص
حضرت شیخ زین الدین ولیؒ جن کی زیارت عالیہ عیش مقام پہلگام روڑ پر
(ضلع اننت ناگ کشمیر) میں مرجع عوام و خواص ہے، سے متعلق جانکاری فراہم
کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ شیخ زین الدینؒ، حضرت نورالدین نورانیؒ کے
خلیفۂ ثانی ہیں۔ اُن کی اصل جائے پیدائش کشتواڑ کا موضع بھنڈارکوٹ
ہے۔ نام زیا سنگھ یا جیا سنگھ تھا، اس علاقہ کے حکمران خاندان سے تعلق رکھتے
تھے۔ اُن کے والد دشمنوں کے ہاتھ قتل ہو چکے تھے۔ آپؒ نے حضرت شیخ
نورالدین نورانیؒ کے پاس جا کر کشمیر میں اِسلام قبول کیا اور جیا سنگھ کا نام شیخ
زین الدینؒ رکھا گیا۔ حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر رہے اور عبادت و
ریاضت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ اُن کا اپنا مرتبہ بہت بلند ہوا۔ چنانچہ حضرت شیخؒ
سے اپنی مناجات میں یہ اشعار فرمائے ہیں ۔

زِینہ میون اوس امرت گرو
تُمہ تہٕ دِدُر سمسار کیوہ
گوٚ گورس تہٕ ژاٹھا ژرو
تیوتھ ئے وَردِتَم دیوہ

(ترجمہ: میرا پیارا زین الدینؒ پاکیزہ تھا۔ اُس نے زمانہ کیسے بھگت لیا کہ اُستاد سے بھی شاگرد بڑھ گیا۔ یا اللہ! مجھے بھی ویسا ہی مرتبہ عطا کر)

''حضرتِ بابا لطیف الدین صاحبؒ علاقہ مڑواہ واڑون (کشتواڑ) سے تعلق رکھنے والے حضرت شیخ العالمؒ کے مقربین میں سے تھے۔ ''اسرارالابرار'' مصنفہ حضرت بابا داوٗد مشکواتیؒ میں اِس بزرگِ دین کا یوں تذکرہ ہوا ہے'' شیخ عبداللطیف دنیا سے پرہیز اور دین کی حفاظت کرنے والے، راہِ سلوک کے بہادر اور درگاہِ طریقت کے شیر تھے۔ وہ شیخ نورالدینؒ کے مُریدِ خاص تھے۔ آپ کی عجیب حالت ہوا کرتی تھی کہ لوگوں نے ترکِ دُنیا اُن سے سیکھ لیا۔ ان کی ہمیشہ اپنے نفس کے ساتھ شدید کشمکش رہا کرتی تھی۔ آپ ''مڑواہ واڑوَن'' کے حاکم تھے۔ سال میں ایک بار شہر آیا کرتے تھے اور بادشاہ کی خدمت میں حاضری دے کر واپس جایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں ایک بار جب وہ شہر آئے بادشاہ سے واپس آکر چاہا کہ شیخ نورالدینؒ کو دیکھنے جائیں جب باریاب ہوئے تو شیخ نے حال پوچھا کہ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور میرے پاس آنے کا کیا مقصد ہے۔ عرض کیا کہ مڑواہ سے آیا ہوں، لدی رینہ میرا نام ہے اور میرا مقصد آپ کا دیدار ہے اور میری تمنا آپ کی دوستی ہے۔ آپ نے فرمایا جب تک دوست اَپنے دوست کا کام نہ کرے تب تک دوستی کا دعویٰ نہیں کرنا چاہئے۔ پوچھا دوست کا نام کیا ہے فرمایا حکم یہ ہے کہ مسلمان بن جاؤ اور اَپنے معبود کا بندہ ہو۔ کہا مسلمان تو نہیں بنوں گا البتہ اَپنے معبود کا بندہ بنوں گا۔ فرمایا ''تمہارا معبود کون ہے؟ کہا ''بُت'' آپ نے فرمایا کہ روزی اللہ کی کھاتے ہو اور پوجا بُت کی کرتے ہو۔ اُس نے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب

ہوش میں آیا مشرف بہ اسلام ہوا۔ کہتے ہیں شیخ نے اپنی غذا کے لئے خشک اور کڑوی گھاس جسے ''اوپلہا کھ'' کہتے ہیں گوشت اور مرغن غذا کے بدلے مقرر کیا اور وہی جنگلی گھاس پیر کے حکم سے مقرر کی۔''

''جموں، شیرائنز اینڈ پلگر یمجز '' کے مصنف جے۔این۔ گنہار سرتھل دیوی (کشتواڑ) (جو ویشنو دیوی کے بعد جموں صوبے میں سب سے بڑے متبرک اَستھان ہے) کے بارے میں رقمطراز ہیں...... ''شاریکا راشٹھ بُوجہ والی (اٹھارہ بازوؤں والی) دیوی ہے چونکہ یہ سَرتھل (تحصیل کشتواڑ) پہاڑ واقع ہے اس لئے اسے عام طور پر سرتھل دیوی ہی کہتے ہیں۔ بٹوت، کشتواڑ روڑ پر واقع کاندنی نامی اسٹیشن سے اُوپر ساڑے ۴ کِلو میٹر پیدل یا گھوڑے پر چڑھائی طے کرنے کے بعد استھان پہنچتے ہیں۔ سرتھل جانے کیلئے کشتواڑ سے گالی گڈ کے راستے بھی جاتے ہیں۔ سرتھل سطح سمندر سے ۷۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے۔ رسل ورسائل کی مشکلات کے پیشِ نظر ویشنو دیوی کے مقابلے میں سرتھل دیوی پر یاتریوں کی کم بھیڑ رہتی ہے۔ یہ تیرتھ استھان ایک مندر پر مشتمل ہے جن میں کالے رنگ کی اُٹھارہ بازوؤں والی دیوی کی مورتی نصب کی گئی ہے۔ یہ مجسمہ سازی کا ایک عمدہ نمونہ ہے جو بھگتوں پر جلدی اثر ڈالتی ہے۔ یہ مورتی یہاں کشمیر سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے آئی ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ شاریکا بھگوتی سرینگر میں ہاری پربت پہاڑ پر رہتی تھیں۔''

فرنگی سیاح وائن جنوری ۱۹۳۹ء میں ڈوڈہ آیا اور وہاں سے کشتواڑ چلا گیا۔ اُس نے اُپنے سفرنامے میں اُس وقت کی صورتِ حال اِس طرح قلمبند کی ہے...... ''ڈوڈہ ہمیشہ راجۂ کشتواڑ کے مقبوضات میں شامل رہا ہے اور

کشتواڑ کے ساتھ ہی گلاب سنگھ کے زیرِ تصرّف آیا۔ ایک منزل چھوڑ کر اگلی منزل پر برسالہ (برشالہ) دیوی تھی۔ یہ ایک گاؤں ہے جہاں ایک ہندو دیوی کا مندر ہے جس کا اس گاؤں میں شہرہ ہے۔ جنگل میں خودرُو زیتون اور اُنار عام تھے۔ میٹھے اور کھٹے (گرگلہ) گاؤں میں دستیاب ہوتے تھے۔ چکور بکثرت ملتے ہیں۔ ڈوڈہ اور کشتواڑ کے مابین علاقے کو مہابل (محالہ) کہتے ہیں۔ کشتواڑ سہہ گھٹ سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں گلاب سنگھ کے حکم سے ۱۸۳۶ء میں ایک شاندار لیور پُل تعمیر ہوا تھا۔ یہ پُل چودہ لیوروں کے سہارے تعمیر ہوا ہے۔ دریا کی (چناب) کی چوڑائی ستر گز کے قریب ہے۔ پُل سے قصبہ کشتواڑ ایک دن میں نہیں پہنچا جاسکتا۔ میں ایک گاؤں میں شب باش ہوا جس میں ایک مشہور اَشٹ بُوجہ (اُٹھارہ بُوجہ) یعنی اٹھارہ بازوؤں والی دیوی ہے۔ چہرہ عام سائز کا اور سیاہ تھا جس میں ایک چھوٹا سا کوُٹ تھا۔ تمام پہاڑی علاقے میں دیوی کی طاقت تسلیم کی جاتی ہے بلکہ پنجاب کے میدان تک حتیٰ کہ اس کا احترام پورے علاقے میں بھی کیا جاتا ہے۔ سرتھل سے کشتواڑ سات میل کے فاصلے پر ایک سیدھ میں ہے۔ نظارہ دِلفریب ہے۔ کشتواڑ کا میدان ڈُو میل چوڑا اور پانچ میل لمبا ہے۔ یہ بھدرواہ سے سؤ یا ڈیڑھ سو فٹ بلند ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ کشمیر کا زعفران خصوصیات کے لحاظ سے کشتواڑ کے زعفران سے کمتر ہے۔ سیب، ناشپاتی، خوبانی، شفتالو عمدہ اور کثرت سے ہیں۔"

"کلچرل ہسٹری آف ڈوڈہ" مرتبہ موہن لال آتش میں آٹھ ہزار پانچ سوفٹ کی بلندی پر علاقہ پاڈر میں واقع شری چندی دیوی مندر مچیل کے بارے میں لکھا گیا ہے...... اگر چہ یہ جگہ (مچیل دیوی) سبھی لوگوں کو

رُوحانی غذا فراہم نہیں کرتی تاہم یہ غمگین اور مجروح جذبات لوگوں کو سکون بخشتی ہے۔ چنانچہ ماہِ اگست کے وسط میں مچیل یاترا چنوت بھدرواہ سے نکل کر کشتواڑ کے راستے پاڈر چلی جاتی ہے۔ اِس یاترا کا پسِ منظر یہ بتایا جارہا ہے۔ کہ کلبیر سنگھ نامی پولیس کا ایک سب انسپکٹر مچیل میں بطورِ افسر چوکی تعینات تھا تو وہ اپنے اکثر اوقات چنڈی دیوی کی پوجا میں بسر کرتا تھا۔ جب اُس کی وہاں سے تبدیلی ہوئی تو وہ چنڈی ماتا کے مندر میں جا کر زاروقطار رونے لگا۔ اُسے اپنے کمرے میں ایک تیز روشنی نظر آئی ۔ کوئی اُسے کہتا تھا۔ ''میرے بچے ! جذبات میں نہ آؤ۔ میں آپ کے گھر آؤں گی۔ اُس دِن میں آپ کے باغ کی زمین سے نکلوں گی۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چنڈی دیوی چنوت (بھدرواہ) کی زمین سے ظاہر ہوئی۔ اُسے ایک جلوس کی شکل میں کلبیر سنگھ کے گھر لیجایا گیا اور دُور دُور سے لوگ دیوی کا درشن کرنے کے لئے وہاں ٹوٹ پڑے۔ اُسی واقعہ کی یاد میں دیوی کے پجاری (جن کی تعداد میں بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے) ہر سال چنوت سے مچیل تک جلوس کی شکل میں جاتے ہیں۔ یاترا واسک ناگ کے مندر واقع گاٹھا (بھدرواہ) سے چلتی ہے اور کشتواڑ جاتی ہے۔ اٹھولی (پاڈر) دوسرا اور چشوتی (پاڈر) تیسرا اڑاؤ ہے۔ اس طرح پانچویں دن یہ سالانہ یاترا مچیل (پاڈر) پہنچتی ہے۔ کشتواڑ، پاڈر سڑک تعمیر ہونے کے نتیجے میں یاترا میں شامل ہونے والوں کی تعداد سال بہ سال بڑھتی جارہی ہے۔''

''راج ترنگنی'' کے مترجم مسٹر ایم - اے - سٹین جلد اوّل کے صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں۔

''راجنک رتن کنٹھ کی یاد ابھی تک کشمیری پنڈتوں کی روایات میں

زندہ ہے۔ ایک بڑے عالم اور بہت تیز لکھنے والے کے طور پر میں نے
خود سرینگر میں مندرجہ ذیل مسوّدوں کی نقلیں جو اُس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی
ہیں، حاصل کی ہیں......ارامرکوش پر رائے مکت کے مسوّدہ سے، جو
کشتواڑ میں ۱۶۵۵ء میں لکھا گیا تھا، اندازہ لگاتے ہوئے عیاں ہوتا ہے
کہ رتن کنٹھ باہر سفر کرتے ہوئے بھی مسوّدوں کی نقلیں کرنا جاری رکھتا
تھا۔"

کشتواڑی زبان کے بارے میں پروفیسر محی الدین حاجنی کی کتاب ""کاشُر شاعری" میں لکھا گیا ہے کہ...." لیکن کشتواڑ پر فارسی زبان کا اثر کم پڑا۔ اس لئے بہت سے کشمیری الفاظ وہاں موجود ہیں جنہیں یہاں (کشمیر میں) فارسی نے اُپنے نیچے کچل دیا۔ علاوہ ازیں بہت سے کشمیری الفاظ نے وقت کے ساتھ ساتھ دوسرا چہرہ بدل لیا مگر کشتواڑیوں نے پُرانا چہرہ ہی برقرار رکھا۔ کشمیری میں بلاضرورت سنسکرت یا فارسی استعمال کرنے کے علاوہ ہماری زبان نے لہجہ اور اسلوب میں بھی کچھ مقامی طور طریقوں کو اپنا لیا ہے۔ اس لئے کشتواڑ کی اور لل واکوں کی کشمیری سرینگر کی کشمیری سے سو فیصد نہیں ملتی۔"

کشتواڑ اور اُس کے آس پاس رہائش پذیر قوموں اور قبیلوں کا مختلف تذکرہ نگاروں نے یوں اظہارِ رائے کیا ہے......

ا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں جب ناگ برسرِ اقتدار آئے تو
اُن کی ایک جماعت نے کشتواڑ کو بھی اَپنے زیرِ نگیں کیا۔ چنانچہ
یہاں ایسے متعدد مقامات ہیں جن کے ساتھ لفظِ "ناگ" وابستہ ہے۔
مثلاً ناگیں شیؤر، گودرش ناگ، گمانی ناگ، ناک سینی وغیرہ۔ ناگاؤں
کے بعد آریائی نسل کے قبیلے ان پہاڑوں میں آئے اور انہوں نے حکمران

قبیلوں کو شکست دیکر دُور اُفتادہ پہاڑی وادیوں میں بھگا دیا اور بچی کچھی آبادی کو مطیع کر لیا۔ اکثر خالص آریائی نقش سُرخ وسپید چہروں پر دکھائی دیتے ہیں اور کہیں کہیں خاص طور پر دیہات میں گندمی رنگ، کرخت چہرے، چھوٹی آنکھیں، موٹی ناک، غیر آریائی نسل کی طرف ذہن کو منتقل کر دیتے ہیں۔" (عشرت کاشمری۔ تاریخ کشتواڑ)

۲ر"دی ویلی آف کشمیر" میں سر والٹر لارنس لکھتے ہیں......" وادیٔ کشمیر کے جنوبی پہاڑوں میں لوگوں کا تقابلی مطالعہ کرنے والے کو اُچھے گلہ بان گدی نظر آئیں گے۔ اگر مقامی مورخین پر یقین کیا جائے تو اُسے کشتواڑ کے پُرانے قسم کے ہندوؤں کی رَسومات میں کشمیریوں کے قدم رسم ورواج دریافت ہوں گی جو وادی کے باشندوں کے مسلمان ہونے سے قبل قائم تھیں۔

۳ر"تاریخِ ریاستِ کشتواڑ" کے مُولفین جے ہچی سن اور پی ایچ دوگل تحریر کرتے ہیں۔" عام روایات اور لوک گیتوں میں زمانۂ قدیم کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے باب میں بے شمار اِشارے پائے جاتے ہیں جو دوسرے مقامات کی طرح "رانا" یا "ٹھاکر" کہلاتے تھے۔ خاص چندر بھاگا کی وادی میں رانا کا خطاب کم مشہور ہے لیکن ناگینی، کونتواڑہ، سرو ڑ اور بونجواہ میں اُن کی حکمرانی کے آثار پائے جاتے ہیں۔"

۴ر"وِدپین اینڈ رائفل اِن کشتواڑ" کے مصنف آٹو روتھ فیلڈ نے سنتھن بنگلہ کے چوکیدار کا تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے کہ......" میرے لئے شاید اس خوش باش اور وحشی کی عجیب تر چیز یہ تھی کہ وہ کس درجہ خلاف اُمید ہندوستانی دِکھائی دیتا تھا اور یہی حیرت مجھے دوسرے کشتواڑیوں کو دیکھ کر ہوئی۔"

۵ر ''پنڈت شیو جی دَر، جو وزیرِ وزارت کشتواڑ بھی رہے ہیں، اپنی فارسی میں لکھی ہوئی ''تاریخِ کشتواڑ'' میں کشتواڑ کے باشندوں کا یوں ذکر کرتے ہیں۔ ''اِس سرزمین میں حکام سلف کے عہد سے پہلے جگہ جگہ راٹھی یعنی چھوٹے چھوٹے رانا حکومت کا جھنڈا لہراتے تھے اور ایکدوسرے سے تعاوُن نہیں کرتے تھے۔ اِس جگہ کے باشندوں کی بڑی تعداد ٹھکروں اور تھوڑی سی براہمنوں اور میگھوں (ہریجنوں) پر مشتمل تھی۔''

٦ر ''ہسٹری اینڈ کلچر آف کشتواڑ'' میں دُونی چند شرما کشتواڑ تفصیلات بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں...... '' کچھ ناگ کنبوں کو دریائے اِسی کنی (چناب) کے ساتھ اِس سرزمین (کشتواڑ) کی جانب بڑھنے میں رہنمائی کی گئی۔ ایک چھوٹا سا سطح مرتفع (کشتواڑ) دیکھ کر وہ یہیں بس گئے۔ وہ ناگ یا سانپ کے پُجاری تھے۔ ناگ تہذیب کے اثرات علاقہ پاڈر میں کافی نمایاں ہیں کیونکہ پاڈر کے ہر گاؤں میں مندر کے دَروازے پر آج بھی ناگ کی کُھدی ہوئی تصویریں موجود ہیں۔ آریائی قبیلے کسی تنہا مقام کی تلاش کرتے ہوئے دَریائے اِسی کنی موجودہ چناب کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ یہاں پہنچے پھر ڈوڈ چھن، مڑواہ اور واڑون کی وادیوں میں چلے گئے۔ ان میں سب سے بڑھے لوگ جنہیں ''رِشی'' کہا جاتا تھا، واڑون میں آباد ہوئے اور ان کے نام پر وہاں ''رِشی نِواس '' کہنے لگے جسے آج رکنواس کہتے ہیں (بعض محققین کا خیال ہے کہ قدیم ویدوں کے بعض حصّے خاص طور پر ''رگ وید'' رکنواس میں لکھے گئے ہیں۔) رشیوں کے علاوہ آریاؤں میں سے جو قوم کشتواڑ اور اُس کے نواحی علاقوں میں آباد ہوئی وہ براہمن قوم

تھی ۔ راتھر اور گنائی بھی پرانے آریاؤں میں سے تھے جو کشتواڑ میں
رہائش پذیر تھے، کچھ وقت کے بعد پنجاب سے ایک تجارت پیشہ قوم ''پنج
سانسی'' یہاں آ کر آباد ہوئی۔ اُن کے چند گھرانے ابھی تک ٹند ہالی،
پلماڑ اور تند میں رہتے ہیں۔ دوسرا قبیلہ جو چنگام سے سنکپورہ تک
(موجودہ تحصیل چھاترو) آباد ہوا ''وہ کھش'' قبیلہ تھا۔ یہ ٹھاکر خاندان
سے تعلق رکھنے والا زراعت پیشہ لوگ تھے۔ جب کشتواڑ کا پہلا راجہ
کاہن پال یہاں کا حکمران بنا تو گوڑ براہمنوں ، بروالوں اور راجپوتوں
کی ایک بڑی تعداد گوڑ بنگال اور اوجین سے اُس کے ساتھ کشتواڑ
آئے۔ وہ مستقل طور پر راجہ کی ملازمت کرتے رہے ۔ انہوں نے
زراعت کو بھی اپنا پیشہ اپنا لیا۔ متا، پوچھال، بہٹیرہ بھاٹا اور پنڈت گام
میں گوڑ براہمنوں کے کئی کنبے بستے ہیں۔ کشمیر کے مخدوش حالات سے
مجبور ہو کر کشمیری مسلمانوں اور پنڈتوں کے گھرانے کشتواڑ میں آباد
ہو گئے۔ پنڈت، کشتواڑ کے علاوہ علاقہ دچھن میں بھی رہائش پذیر
ہوئے لیکن اُن کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ گجر چھاترو ، وڈیل ،
ٹھاکرائی، وُڈیل ٹھاکرائی ، ناگ سینی ، پھچھا، سرتھل، سروڑ اور بونجو
اہ میں بستے ہیں۔ انہوں نے اپنی انفرادیت کو بھی بحال رکھا ہے۔

''اے گزٹیئر آف کشمیر'' کے مرتب چارلس ایلی سن بٹیس نے ۱۸۷۰ء
اور ۱۸۷۱ء میں کشمیر اور اُس کے ہمسایہ اضلاع کشتواڑ اور بھدرواہ سے متعلق
معلومات جمع کرتے ہوئے کشتواڑ کا حال ان لفظوں میں تحریر کیا ہے...... ''اس
نام (کشتواڑ) کے صوبے کے بڑے قصبے کو کشمیری ''کارتادار'' کہتے ہیں۔ یہ
چندر بھاگا کے بائیں کنارے کے نزدیک ایک میدان پر واقع ہے جس کی
چوڑائی تقریباً ۲ میل اور لمبائی پانچ میل ہے۔ یہ مار بل درّہ کے راستے اسلام

آباد (انت ناگ) کے جنوب مشرق میں تقریباً ۴۷ میل اور بھدرواہ کے شمال میں تقریباً ۴۶ میل کی دوری پر واقع ہے۔ کشتواڑ جموں شہر سے بارہ منزل، اِنشن (واڑون) سے سات منزل اور کل ناگ (لاہول) براستہ پاڈر بیس منزل دور ہے۔ کشتواڑ کا قصبہ پہلے موجودہ قصبے سے کافی بڑا تھا۔ اَب لگ بھگ ایک سو چھوٹے گھروں یا جھونپڑیوں پر مشتمل ہے جن کی چھتیں کشمیری مکانوں کی طرح نہیں ہیں۔ یہ ہموار چھتوں والے عام طور پر ایک منزلہ ہیں اور لکڑی، پتھروں اور مٹی کے بَنے ہوئے ہیں۔ اِن میں پھلدار دَرخت لگائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی گلی، بازار ہے جہاں گھٹیا قسم کے شال بُننے کی پندرہ سے بیس کھڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ کھُردرے اُونی کمبل بھی بنائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ان کی ہر دلعزیز زیارت قصبہ سے تقریباً ایک چوتھائی میل کی دُوری پر شمال میں واقع ہے۔ (یہ حضرت شاہ محمد اسرارالدین صاحبؒ کی زیارت کی طرف اِشارہ ہے) ہندوؤں کی اُٹھارہ بازوؤں والی پتھر کی بنی ہوئی مُورتی (سرتھل دیوی) ہے جس کے صرف دُو بازو دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ اُسے کپڑوں میں ڈھانپ لیا گیا ہے۔ پرانے راجہ کا محل ایک مٹی کے بنے ہوئے قلعے سے گھرا ہوا ہے جو قصبہ کے ساتھ ایک اُونچے ٹیلے پر کھڑا کیا گیا ہے جب سکھوں نے کشتواڑ کو اپنے قبضے میں لیا تو اِسے بطور جیل استعمال کیا جانے لگا۔" مشہور انگریز جغرافیہ دان فریڈرک ڈِریو لگ بھگ ۱۸۷۲ء میں بھدرواہ جنگلواڑ کے راستے کشتواڑ تشریف فرما ہوا۔ اُس نے "دی جموں اینڈ کشمیر ٹریٹریز" میں اس وقت کی صورتِ حال یوں بیان کی ہے۔ سطح مرتفع کشتواڑ سطح سمندر سے ۵۳۰۰ یا ۵۴۰۰

فٹ اُونچا ہے۔ پہاڑوں میں کئی وسیع وادیوں کے برعکس یہ نہ پوری طرح
ہموار اور نا ہی بالکل ڈھلوان ہے بلکہ اس میں چھوٹے چھوٹے نشیب وفراز
ہیں۔قریباً سارا علاقہ زیرِ کاشت لایا گیا ہے۔گاؤں سفیدہ کے دَرختوں اور
پھل دار پیڑوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ایک موہٹرے سے دوسرے موہٹرے
کو جانے والی گلیوں کے ساتھ ساتھ سفیدے، پہلے اور سُرخ گلاب اور کئی
پھول دار جھاڑیاں قطار در قطار نظر آتی ہیں۔تقریباً دو سو گھر ہیں لیکن وہاں
دوسرے بازاروں کی سی چہل پہل بالکل مفقود ہے۔لوگ کافی غریب ہو گئے
کیونکہ یہ قصبہ گزشتہ برسوں میں وزیر خاندان کو دیا گیا تھا جوابھی تک اُنڑوَرسوخ
کا مالک ہے۔کشمیر کے امیر آدمیوں کے مکانوں کے طرز پر بنائے گئے اِس
خاندان کے بڑے بڑے مکانات اِس عام تباہ حالی سے مستثنیٰ ہیں۔ یہاں
بلندی پر ایک قدیم قلعہ ہے جس کی نگرانی پر تقریباً تمیں اَفراد مامور ہیں۔نصف
سے زیادہ باشندے کشمیری ہیں۔ باقی ٹھاکر، کراڑ اور دُوسری ذاتوں سے
تعلّق رکھنے والے ہندو لوگ ہیں۔کشمیری یہاں بھی شال بافی کا کام کرتے
ہیں۔اِس قصبہ میں شال بنانے کے لگ بھگ بیس وَرکشاپ ہیں۔ بھدرواہ کی
طرح یہاں بھی کشمیری کئی پشتوں سے آباد ہیں۔کشتواڑ کی آب وہوا بھدرواہ
کی آب وہوا سے مطابقت رکھتی ہے لیکن یہاں قدرے زیادہ گرمی اور بارش
وبرف پڑتی ہے۔برف، موسم سرما کے چار مہینوں کے دَوران پڑتی ہے مگر زیادہ
دیر تک زمین پر نہیں ٹکتی ہے یہ بیک وقت بیس دن سے زیادہ جمی نہیں رہتی۔
''پوتی ناگ'' آبشار کا پانی ایک بار نہیں بلکہ بار بار گرتا ہے۔ یہ پانی تقریباً
اَڑھائی ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے گرتا ہے۔دوسری کسی جگہ سے دیکھا جائے

تو پتہ چلے گا کہ یہ پانی اس سے بھی کئی سو فٹ اُوپر سے آتا ہے۔ پہلے دو حصّے ایک ہزار فٹ کے قریب ہیں۔ جو قصبہ کشتواڑ سے دِکھائی دیتے ہیں۔''

وزیر بھونچہ جو راجہ محمد تیغ سنگھ والیٔ کشتواڑ نے افغانستان کے معزول اور کشتواڑ میں پناہ گزین بادشاہ شاہ شجاع الملک کا مہماندار مقرر کیا تھا، کشتواڑ میں فریڈرک ڈِریو سے مِلا ہوا اور شاہ شجاع کے بارے میں یہ معلومات فراہم کیں...... ''کشتواڑ کے راجہ محمد تیغ سنگھ نے شاہ شجاع الملک کی بڑی خاطر تواضع کی۔ شاہ شجاع ایک بہترین انسان تھا۔ اُس کی شخصیت شاہی دبدبے کی مظہر تھی۔ دُو برس تک وہ کشتواڑ میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اُس نے کشمیر کو فتح کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اُس نے تین چار ہزار فوج کے ساتھ کشمیر پر حملہ کیا لیکن افغان صوبیدار محمد عظیم خان نے اُسے ہَرا دیا۔ اُسے دُوبارہ کشتواڑ لوٹنا پڑا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ خود تسخیرِ کشمیر کا خواہشمند تھا۔ شاہ شجاع کی پالیسی اور کشتواڑ میں اُس کی موجودگی اُسے بالکل ناپسند تھی۔ اُس نے راجہ محمد تیغ سنگھ کو حکم دیا کہ وہ شاہ شجاع کو قید کر کے لاہور بھیج دے مگر محمد تیغ سنگھ نے سکھ مہاراجہ کی اِس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ اُس کے بعد شاہ شجاع کشتواڑ چھوڑ کر چلا گیا۔''

کشتواڑ اور لداخ کے تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے ''تاریخ لداخ'' کے مصنّف گرگن تحریر کرتے ہیں...... ''مشرف بہ اِسلام ہونے کے بعد پوریگ علاقے کے چوؤں (سرداروں) نے اُپنے اِسلامی یا تبّتی نام کے ساتھ ''سلطان'' کا لفظ جوڑ دیا اور اُپنے آپ کو لداخی گیالپو (بادشاہ) کی سرداری سے آزاد کر کے بلتستان اور کشتواڑ کے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ شادی بیاہ کا سلسلہ شروع کیا۔

مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک ضلع اُدھمپور کے جس میں موجودہ ضلع ڈوڈہ بھی شامل تھا، وزیرِ وزارت رہے۔ انہوں نے تاریخ جموں لکھنے کا کام پہلے ہی شروع کیا تھا۔ اُدھمپور میں اپنی تعیناتی کے نتیجے میں، انہیں کشتواڑ کا دورہ کرنے کا موقع ملتا رہا اِس لئے انہوں نے تاریخِ کشتواڑ بھی قلمبند کی جو تاریخِ جموں کا دوسرا حصّہ ہے۔ چنانچہ خان صاحب موصوف نے لکھا ہے۔ ''اُدھمپور سے جب میں کشتواڑ میں دورہ پر گیا ہوں اور وہاں کے حالات سے مجھے واقفیت پیدا ہوئی تو لداخ کے ساتھ اُس علاقہ کا بھی تعلق پایا گیا۔ لہٰذا تاریخ کشتواڑ بھی میں نے شروع کردی لیکن بوجہ اس کے کہ کشتواڑ اُدھمپور سے بہت دُور تھا اور سال میں چندروز سے زیادہ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اپنے تین سال کے زمانۂ تعیناتی اُدھمپور میں، میں اس کو بھی تکمیل کو نہ پہنچا سکا اور مسوّدات بھی مجھے اپنے ساتھ لے جانے پڑے مگر اِس سے فائدہ یہ ہوا کہ وقتاً فوقتاً ہر ایک حصّہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں مجھے خانگی تفکرات میں مبتلا ہونا پڑا اور گھر میں پابند ہوگیا۔ اپنا غم غلط کرنے کی غرض سے میں نے اپنی کتاب کا دفتر میں نے کھولا اور تقریباً ڈیڑھ سال تک شب و روز اس دُھن میں لگا رہا۔ بالآخر تمام یاداشتوں کا مقابلہ کرکے اور تواریخ متعلقہ کے ساتھ مطابقت دے کر انہیں کتاب کی صورت میں مرتّب کردیا۔

وہ سطح مرتفع جس کے اُوپر اِس وقت کشتواڑ اور چند ملحقہ دیہات آباد ہیں، آسمان سے ملے ہوئے پہاڑوں کے درمیان قریب قریب مسطح میدان ہے جس کے شمال اور مغرب ہردوطرف ایک نالہ ہے، جو اِسی سلسلۂ کوہستان سے نکلتا ہے۔ اِس میدان کے شمال مغربی گوشہ پر شمال کی طرف سے

دریائے واڑون، مڑواہ ہے جس میں اِس جگہ سے اُوپر کی طرف کچھ فاصلے پر
دریائے چھاترو بھی شامل ہو جاتا ہے، دَریائے چناب میں گرتا ہے اور غالباً
اتنے بڑے پانی یہی ٹکر اس موقع پر دریائے چناب کے ایسے تنگ زاویہ
پر روگردان ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ اِن دونوں دریاؤں کے موقعۂ اتصال
سطح دریا کی بلندی سطح سمندر سے تقریباً ۳۶۰۰ فٹ اور سطح مرتفع کشتواڑ کی
بلندی تقریباً ۵۴۰۰ فِٹ ہے۔ یہ میدان موجودہ دَریا سے تقریباً دو ہزار فٹ
بلند ہے۔ اس میدان کا طول شمالاً جنوباً تقریباً چھ سات میل اور عرض ڈُوڈھائی
میل کے قریب ہے۔ چناب کی تنگ اور سنگلاخ وادی میں یہ میدان ایک
عجیب وغریب منظر پیدا کرتا ہے اور بڑی پُر فضا جگہ ہے۔

موجودہ ملکی تقسیم کے مطابق وادیٔ چناب میں علاقہ جات پاڈر، ناگ
سین، اوڈیل اور وادیٔ مڑواہ میں دَچھن، مڑواہ اور واڑون علاقہ کشتواڑ
میں شامل ہیں۔ بونجواہ سے نیچے کا علاقہ بھدرواہ کا علاقہ ہے جو سابق زمانہ
میں راج چمبہ کے ساتھ شامل تھا اور بعد میں خودمختار حکومت ہوگئی۔ کشتواڑ سے
نیچے دَریائے چناب کے داہنے کنارے پر تحصیلِ رام بن شروع ہو جاتا ہے
جو تقریباً کل بشمول موجودہ تحصیل ریاسی کی نیابت گلاب گڑھ کے، جس کا
قدیمی نام ڈینگ بٹل تھا، حکومتِ کشتواڑ کے ساتھ شامل رہی ہے۔

"موجودہ پُرامن حکومت میں کشتواڑ کا ملک آباد اور رعایا خوشحال
ہے۔ اقتصادی حالت روز بہ روز بہتر ہو رہی ہے اور آبادی ترقی کر رہی
ہے۔ محمد تیغ سنگھ آخری راجہ کشتواڑ کی حکومت اب قریب قریب دو
تحصیلات، کشتواڑ اور رام بن پر منقسم ہے جن کی مجموعی آبادی مطابقِ شمار

۱۹۳۱ء مسلمان ۸۳،۵۷۳ اور غیر مسلموں ۴۴،۴۲۵ تھی اور تحصیل کشتواڑ کی آبادی ۳۲،۷۰۶ مسلمان اور غیر مسلمان ۳۳،۷۹۰ نفوس تھی۔"

مڑواہ-واڑون کا راجواڑہ کاہن پال کے بیٹے دیپ سین نے بنایا تھا۔ دیپ سین کے بعد اُس کا خاندان بھی کافی دیر تک اِس علاقے پر حکمران رہا۔ دچھن کا پورا علاقہ ہنزل تک مملکت کشتواڑ میں شامل تھا۔ کافی وقت مڑواہ کی سیاسی حالت ایک جیسی رہی اِسی دوران بنگال کا لُطف اللہ خان نامی ایک رئیس مڑواہ آبسا۔ اُسکے خاندان کا ایک فرد مختار ملک المعروف مختہ راجہ حقیقی معنوں میں اُس علاقے کا حکمران بن بیٹھا۔ اُس رئیس زادے نے کشمیر کے گورنروں بالخصوص میر خضر خان (۱۷۹۳ء) کے ساتھ نزدیکی تعلقات پیدا کئے تھے۔ وہ گورنرِ کشمیر کو ہر سال ایک ہزار باز، چار گھوڑے، چار بکریاں اور چوبیس بھیڑیں بطورِ نذرانہ بھیجا کرتا تھا۔ ۱۸۳۲ء میں کنور شیر سنگھ ، کشمیر کا گورنر بنا۔ وسالت سنگھ مالیہ وصول کرنے کے لئے اُس کا معاون تھا۔ وسالت سنگھ کارداروں سے کافی روپے وصول کرتا تھا جس کے نتیجے میں کاردار، کسانوں اور غریب لوگوں کا خون چُوسنے لگے۔ مختہ ملک نے ۱۸۲۹ء سے علاقہ مڑواہ-واڑون کے محاصل وصول کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ وہ بھی غریبوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے میں مشہور تھا۔ لوگوں نے تنگ آکر برخودار ملک ، دائم ملک اور ظفر لون وغیرہ سرکردہ اشخاص کا ایک وفد اوتم پڈیار (کاردار دچھن) کے پاس روانہ کیا۔ اوتم پڈیار کی وساطت سے وہ لوگ جنرل زور آور سنگھ، ناظم کشتواڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے گورنرِ کشتواڑ کو اپنی دَرد بھری کہانی سنانے کے بعد مڑواہ-واڑون کو کشتواڑ

کے ساتھ ملانے کی تجویز دی۔ جنرل زور آور سنگھ پہلے ہی تسخیرِ لداخ کی تیاریاں کرر ہا تھا اُس نے جموں جا کر گلاب سنگھ کو مڑواہ- واڑون اور لداخ کی فتح کے لئے راضی کرلیا۔ کشتواڑ سے لیہہ براستہ مڑواہ- واڑون - سورو ، کرگل ۳۳۶ میل دور ہے۔ راجہ گلاب سنگھ نے اپنی اوّلین فرصت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کر کے مڑواہ- واڑون کو کشتواڑ ہی میں شامل کرنے اور مالیہ کی وصولیابی کے بارے میں منظوری حاصل کی۔ چنانچہ ۳۴-۱۸۳۳ء میں مڑواہ- واڑون اور زانسکار کا سارا علاقہ کشتواڑ کے ساتھ ملا لیا گیا۔

رام چند کاک نے اپنی کتاب ''اینٹی کیوٹیز آف مریو- واڑون'' یا ''قدیم مڑواہ اور واڑون کے قدیم لوگ'' کے صفحہ ۱۷ پر مڑواہ- واڑون کی فتح کا یوں ذکر کیا ہے۔

''جب وزیر زور آور سنگھ کلہوریہ کی حملہ آور فوج ٹھبنیا (ژینجبر) کے نزدیک پہنچی ، جو پیٹھ گام سے صرف تین میل کی دوری پر واقع ہے، تو برخوردار ملک اپنے کیمپ سے بھاگ کر نوگام گیا جہاں اُس نے مختہ راجہ کو مطلع کیا کہ جنرل زوآور سنگھ کلہوریہ اُسے پکڑنے کی غرض سے مڑواہ آیا ہوا ہے۔ مختہ راجہ اپنے گھر والوں کے ہمراہ رات کے اندھیرے میں نکل کر کشمیر بھاگ گیا جو اُس وقت راجہ گلاب سنگھ کے پاس نہیں تھا۔ بعد ازاں برخوردار ملک نے زور آور سنگھ کو ''بھوٹ وتھ'' (بھوٹ کوہل) درّے سے کرگل پہنچنے میں رہنمائی کی۔ اس مہم میں علاقہ مڑواہ- واڑون کے پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل فوجی دستے نے برخوردار کی سربراہی میں نمایاں خدمت انجام دی۔''

بھان رائے ، کشتواڑ کا تقریباً چودھواں راجہ تھا جو کشمیر کے سلطان

نازک شاہ (۱۵۴۱ءتا۱۵۵۲ء) کا ہم عصر تھا۔حکومت سنبھالنے کے بعد راجہ رائے سنگھ نے راج منڈل (موجودہ چھاترو) کے ٹھاکروں کیخلاف مہم شروع کی توسنکپورہ کے قریب راہلتھل کے مقام پر سنگین لڑائی میں ٹھاکروں کوشکست دی گئی۔ اُس کے بعد رائے سنگھ نے راج منڈل کو کشتواڑ کے ساتھ ملا دیا۔اس طرح وہ ماربل سنتھن کے دَرّوں تک کے علاقے کا حکمران بن گیا جوکشمیر کو وادی کے ساتھ ملاتا ہے۔ اَب کشمیر کے شکست خوردہ راجوں، مہاراجوں کوسیدھے کشتواڑ میں پناہ گزیں ہونا پڑا جو اَزیں قبل چنگام اور سنکپورہ کے درمیان کھسالی میں آ چُھپتے تھے۔ایک طرف کشتواڑ میں اُمن و چین کا دَور دَورہ تھا دوسری جانب کشمیر کے حالات کافی پُر آشوب تھے۔چنانچہ ۱۵۴۱ء میں مرزا حیدر کاشغری نے اُپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے دُوبارہ کشمیر پرحملہ کر دیا۔اُس نے شعیہ فرقے سے تعلّق رکھنے والے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔پہلے ہی کی طرح کشتواڑ نے کشمیر کے سَتائے ہوئے لوگوں کو پناہ دی۔ مرزا حیدر کاشغری، کشتواڑیوں کو ایک سبق سکھانے کا خواہشمند تھا تو اُس نے اپنی فوج کا ہَراوّل ڈڈ پیٹھ (چھاترو) کی طرف روانہ کیا اور خود مڑواہ دریا کے اُس پار علاقہ چھاترو میں آ پہنچا۔یہ اطلاع پاتے ہی راجہ رائے سنگھ نے اَپنے وزیروں کے ساتھ صلح مشورہ کرنے کے بعد حملہ آوروں کو روکنے کے لئے نارائن پڈیار کی کمان میں اپنی فوج بھیج دی۔اِس خون ریز لڑائی کا ذکر ''تاریخِ فرشتہ'' میں یوں کیا گیا ہے۔

''۱۵۴۷ء میں مرزا حیدر کشتواڑ کی طرف متوجہ ہوا۔ بندگان کو کا اور محمد ماگرے، مرزا محمد اور یحیٰ رینا کو ہَراوّل کر کے خود موضع چھاترو

میں، جو کشتواڑ سے ایک پڑاؤ کے فاصلے کشمیر کی راہ پر واقع ہے، وارِد ہوا۔
ہراَول، تین روز کا راستہ ایک روز میں طے کر کے موضع ڈوڈ پیٹھ پہنچا جو
دریائے مڑواہ کے ساحل پر واقع ہے۔ کشتواڑ کا لشکر دریا کے اُس پار
تھا۔ تیر و تفنگ کی لڑائی طرفین سے شروع ہوئی۔ کوئی شخص دریا سے عبور نہ
کر سکتا تھا۔ دوسرے دن مرزا حیدر کے سپاہیوں نے راہِ راست سے
انحراف کر کے کوشش کی کہ دوسرے راستہ سے کشتواڑ میں داخل
ہو جائیں جب موضع دھار میں پہنچے تو بہت تیز آندھی آئی اور گرد و غبار
سے جہاں تاریک ہو گیا مُردم دَھار ہجوم کر کے اُن کے سر پر آئے۔
بندگان کوکا جو ایک نہایت قابل اور جنگ آزمودہ سردار تھا، مع پانچ مرد
اہل نبرد کے مقتول ہوا اور بقیہ السیف ہزار محنت اور خرابی کے ساتھ مرزا
حیدر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مرزا حیدر انہیں لے کر چھاترو سے
واپس ہوا۔''

مغلوں کے مُردے جن کی تعداد ہزاروں میں، پنڈت دینا ناتھ نے
لکھی ہے، ایک گڈھے کے اندر موقع جنگ پر دفنائے دیئے گئے۔ اس
مناسبت سے اس جگہ کو مغل مزار کہا جانے لگا۔ جو اَب کثرتِ استعمال سے
مغل میدان ہو گیا ہے۔ محکمہ مال کے ریکارڈ کے مطابق مغل مزار کا رقبہ سولہ
کنال ہے۔ جس سے مزار حیدر کاشغری کے فوجی نقصانات کا اندازہ ہوتا
ہے۔ ''طبقاتِ اکبری'' کا مصنف لکھتا ہے۔ کہ اُن دنوں کشمیر میں چار گروہ
باعزّت سمجھے جاتے ہیں۔ پہلا عیدی رانی ، دوسرا حسن ماگرے، تیسرا
کشتواڑیوں اور چوتھا بیرم چک پر مشتمل ہے۔

راجہ گور سنگھ (۱۶۱۸-۱۶۲۰ء) کے دور میں کشمیر کے عیبہ چک اور گوہر چک

کشتواڑ میں پناہ گزیں تھے۔ مغل بادشاہ جہانگیر کو اُن کی موجودگی ایک متواتر خطرے کی علامت دکھائی دیتی تھی۔ نواب کابلی خان، ہاشم خان، صفدر خان اور احمد بیگ خان یعنی کشمیر کے تین مغل صوبیدار، چک باغیوں کو دَبانے میں بُری طرح ناکام رہے تو ربیع الاول ۱۰۲۹ھ بمطابق مارچ ۱۶۲۰ء میں دِلاور خان صوبیدار کشمیر نے کامیاب حملہ کیا جس کا حال ''تُزکِ جہانگیری'' میں یُوں دَرج کیا گیا ہے...... ''میری (جہانگیر) تخت نشینی کے چودھویں برس الٰہی مہینے کی دس تاریخ کو دِلاور خان نے دس ہزار سوار اور پیادہ فوج کے ساتھ کشتواڑ کی فتح کا اِرادہ کیا۔ اُس نے اُپنے بیٹے حسن خان کو گردِ علی میر بحر کے ساتھ شہر سرینگر کی حفاظت کرنے اور مملکت (کشمیر) کا اِنتظام کرنے کے لئے مقرر کیا۔ چونکہ عیبہ چک، وارث ہونے کے ناطے کشمیر کے دعویدار بنے ہوئے تھے اور کشتواڑ میں اُپنی جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے تھے اور پریشانی اور تباہی کی وادی میں گھوم رہے تھے۔ اُس (دلاور خان) نے اُپنے ایک بھائی ہیبت خان کو احتیاطً دیسو میں کچھ فوج کے ساتھ رکھا جو پیر پنجال کے دامن میں واقع ہے۔ دیسو میں اُس نے اُپنی فوج کو تقسیم کیا۔ وہ خود سنگپور کے راستے روانہ ہوا۔ اُس نے اپنے بیٹے جلال کو نصر اللہ عرب، علی ملک کشمیری اور میرے ملازموں (جہانگیر) کی ایک جماعت کے ساتھ دوسرے راستے سے بھیجا۔ اپنے بڑے بیٹے جمال کو پُر جوش نوجوانوں کی ایک جماعت کے ساتھ اپنی فوج کے آگے آگے ہراوّل کے طور پر بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے دُوا اور فوجی دستے اُپنے لشکر کے دائیں اور بائیں آگے بڑھائے۔ چونکہ سڑک پر گھوڑے نہیں جاسکتے تھے اُس نے احتیاطً کچھ گھوڑے اپنے ہمراہ رکھے اور باقی سب

سوار فوج کشمیر واپس کردی۔ نوجوان نے فرائضِ منصبی کے احساس سے سرشار ہوکر پہاڑ کی چڑھائی پیدل طے کی۔ اِسلام کی فوج کے غازیوں نے اسلام دشمنوں کے ساتھ قدم قدم پر مقابلہ کیا۔ نرکوٹ کے مقام پر دشمن کا زبردست مورچہ تھا۔ عیبہ چک بدنصیب بہت ساتھیوں کے سمیت قتل ہوا۔ عیبہ کے قتل سے راجہ کمزور پڑ گیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ دریا کو عبور کر کے بھنڈار کوٹ میں ٹھہرا جو دَریا کے دوسرے کنارے پر ہے۔ دلاور خان نے بھنڈار کوٹ میں بھی فوجیں پہنچادیں۔ مختصراً تین مہینے اور دَس دن تک دلاور خان ہمت کے ساتھ بھنڈار کوٹ میں ڈٹا رہا اور دَریا کو عبور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دلاور خان کے بیٹے جلال نے میرے دربار میں کچھ ملازموں کے ساتھ افغانوں کی ایک جماعت کے ساتھ، جو تعداد میں دو سو تھے دریا (چناب) پار کیا اور راجہ پر اِس غفلت میں حملہ کیا اور زور سے فتح کی شہنائیاں بجوائیں۔ کشتواڑی لشکر میں ذلت کے ساتھ بھگدڑ مچ گئی۔ اِسی افراتفری میں ایک سپاہی ایک کشتواڑی کو قتل کرنے لگا اور وُہ پکارا...... "میں راجہ ہوں۔ مجھے دِلاور خان کے پاس لے چلو" اُسے گرفتار کرلیا گیا۔ دلاور خان نے دریا (چناب) پار کرلیا اور ا لکہ منڈل میں پہنچا جو راجدھانی تھی اور دریا سے تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ دلاور خان نے راجہ کو اپنے ہمراہ لیا اور میری دہلیز کو بوسہ دینے کے لئے آیا۔ اُس نے کشتواڑ میں ایک فوج کے ساتھ نصر اللہ عرب کو مقرر کیا۔

راجۂ کشتواڑ وجاہت سے خالی نہیں ہے۔ اُس کا لباس ہندوستانیوں ایسا تھا لیکن کشمیری اور ہندی دونوں زبانیں بولتا تھا۔ اس طرف کے دوسرے زمینداروں کے مقابلہ میں شہری جیسا ظاہر ہوتا تھا۔ میں نے حکم دیا کہ وہ قصور

اور غلطی کے باوجود اگر اپنے بیٹے کو دربار میں حاضر رکھے تو اُسے قید کرنے سے نجات دی جائے۔ آئندہ کے لئے چھ آنے فی روپیہ خراج مقرر کیا۔ میں نے دلاور خان کو کشتواڑ کا ایک سال کا خراج انعام کے طور پر مرحمت فرمایا۔"

فریڈرک ڈریو علاقہ پاڈر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں...... "پاڈر کی ریاست پر دوسو سال قبل (۱۶۵۰ء) تک مقامی رانا حکومت کرتے تھے۔ پاڈر کے رانا راجپوت تھے۔ ہر ایک گاؤں یا ہر دو تین گاؤں کا اپنا رانا ہوتا تھا جو اپنے ہمسایہ راناؤں کے ساتھ لڑتا رہتا تھا۔ ضلع پانگی (ہماچل پردیش) میرے خیال میں اِسی ریاست (پاڈر) میں شامل تھا۔ ۱۶۵۰ء میں چمبہ کے راجہ چتر سنگھ نے سب سے پہلے پانگی کو فتح کیا۔ وہاں سے وہ لگ بھگ دوسو سپاہیوں کے ساتھ پاڈر میں داخل ہوا۔ پاڈر کو اپنی سلطنت میں ملانے کے بعد وہاں ایک قلعہ اور قصبہ بنوایا جس کا نام اُس نے اپنے نام پر چتر گڑھ رکھا۔ اس کے آثار ابھی تک اٹھولی کے پار دِکھائی دے رہے ہیں۔ چتر سنگھ کے زمانے سے پاڈر آرام وسکون کے ساتھ راجگان چمبہ کے پانچ سے چھ پشتوں تک کے زیرِ نگین رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۲۰ء یا ۱۸۲۵ء میں پاڈریوں نے زانسکار پر حملہ کیا اور اِس علاقے کو (جو لداخ کے ایک بھوٹ راجہ کے قبضے میں تھا) اپنا باج گذار بنا دیا۔ چنانچہ زانسکار کا یہ راجہ ہر سال مبلغ ایک ہزار روپے، کستور (نافے) اور دیگر تحائف چمبہ کے راجے کو بھیجا کرتا تھا۔ یہ سالانہ باج پاڈر کے ایک چھوٹے زمیندار رتنوٹھا کر کے ذریعے وصول کیا جاتا تھا۔ ایک اور واقعہ کی رُو سے لداخ میں تبدیلی آئی۔ ۱۸۳۴ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے فوجی جرنیل زور آور سنگھ کلہوریہ کی سربراہی میں جموں کی

اَفواج کا لداخ پر حملہ آور ہونا تھا۔ اس حملے کی دلچسپ تفصیل کیننگھم نے اُس مہم میں شامل ہوئے کسی شخص کے بیان پر مبنی درج کی ہے۔ لداخ پر حملہ کرنے کے ایک سال کے اختتام پر زور آور سنگھ نے کشتواڑ کے وزیر لکھپت کو جموں سے لداخ نیا راستہ کھولنے کی غرض سے زانسکار سے پاڈر روانہ کیا۔ تھوڑی سی لڑائی کے بعد لکھپت نے پاڈر میں صرف ایک تھانیدار اور چند آدمی پیچھے رکھے۔ جب وہ چلا گیا تو رتنوٹھا کرنے مقامی لوگوں کو اشتعال دیا۔ انہوں نے ڈوگرہ فوج کو گھیرے میں لیا اور انہیں قیدی بنا کر چمبہ بھیج دیا مگر چمبہ کے راجہ نے اس کی ذمہ داری قبول نہ کرتے ہوئے اُن قیدیوں کو گلاب سنگھ کے پاس جموں بھیج دیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ موسم بہار آتے ہی زور آور سنگھ بذاتِ خود لگ بھگ تین ہزار فوج لے کر پاڈر آیا مگر اُسے چتر گڑھ سے دُور رہنا پڑا۔ اِس دَوران اُس نے دریائے چناب کے بائیں کنارے پر، اس سطح مرتفع کے کونے پر جہاں سے چتر گڑھ نظر آتا تھا، ایک فوجی مورچہ قائم کیا۔ بالآخر کچھ مقامی زمینداروں کی مدد سے ڈوگروں کو چند میل نیچے دریا کو عبور کرنے کے لئے رُسی مل گئی جس کی بدولت وہ دریائے چناب کے دائیں کنارے پر پہنچے اور بھوٹنہ نالہ کو اُس پر لگے ہوئے صحیح وسالم پُل کے ذریعے پار کر کے چتر گڑھ پر دھاوا بول کر قلعے کو آگ لگا دی اور اس قصبے کو تباہ و برباد کر کے پتھروں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ زور آور سنگھ نے کئی لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا اور کئی لوگوں کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اِن اقدامات اور ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے کے نتیجے میں پاڈر میں ڈوگرہ حکومت مستحکم ہوگئی۔ تب سے یہاں امن وسکون ہے۔''

اٹھولی جسے پاڈر کی سب سے بڑی جگہ شمار کیا جاتا ہے، ایک سطح مرتفع ہے جو سطح سمندر سے ۶۳۶۰ فٹ اور دریائے چناب سے ۲۰۰ فٹ بلند ہے۔ اس کے مدِ مقابل دریائے چناب کے دُوسرے کنارے پر ایک چوڑا میدان تقریباً ۴۰ فٹ نیچے ہے۔ بھوٹنہ نالہ اور چناب کے سنگم پر پانی سے صرف چالیس یا پچاس فٹ کی اُونچائی پر ایک کھلونا نما موجودہ قلعہ ہے جس پر دس یا بارہ آدمی مورچہ سنبھالے ہوئے ہیں۔ قلعے کے پیچھے پرانے چتر گڑھ قلعے کے آثار موجود ہیں۔ اِس اُونچی جگہ پر درختوں نے لکڑی کے بنے ہوئے چند مندروں اور تیرتھ اَستھانوں کو گھیر کر رکھا ہے۔ دریائے چناب جو (اٹھولی اور گلاب گڑھ) اِن دونوں اُبھرے ہوئے مقامات کے بیچوں بیچ بہتا ہے، پانگی کی جانب سے ایک سنگلاخ درّے میں سے ایک تنگ ندی کی طرح آتا ہے، اٹھولی کے نیچے سے پھیلتا ہوا بہتا جاتا ہے۔ اِسے یہاں ایک جھولے (رسی والے پُل) سے پار کیا جاتا ہے۔ اِس سے پہلے چند سال یہاں لکڑی کا پُل تھا جسے ۱۸۶۵ء میں سیلاب بہا کر لے گیا تھا۔ پاڈر کا موسم کافی ٹھنڈا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ یہاں تین فٹ برف جمع ہوتی ہے جو چار سے پانچ ماہ تک جمی رہتی ہے۔ یہاں کسی بھی موسم میں برفباری ہو سکتی ہے۔ برطانوی ہند میں ابتداء سے ہی پنجاب میں دیوار کی لکڑی کی زبردست ضرورت رہی ہے۔ لہٰذا تب سے لے کر آج تک اِن مقامات پر موجود دیوار وادیٔ چناب میں گرائے جارہے ہیں اِس لئے اَب یہاں صرف وہی درخت دکھائی دیتے ہیں جن کی موٹائی یا تو کم ہے یا وہ دریا کے کنارے کافی دُور ہیں اور جن کو دَریا تک پہنچانے میں بہت لاگت آنے کا تخمینہ ہوتا ہے۔ میں نے پاڈر میں کئی گلیشروں کے

بارے میں سُنا اور اُن کی اچھی طرح تصدیق بھی کی، جو یہاں مختلف وقتوں میں آئے ہیں۔ یہ جنوبی جانب پہاڑوں کی طرف سے آتے ہیں۔ اِس علاقے کی بلندی پاڈر سے پندرہ سولہ ہزار فٹ ہے۔ اِس اونچائی سے لیکر پاڈر کی وادی تک چھ میل یا نو یا دس ہزار فٹ کی اُترائی (Fall) ہے۔"

کشتواڑ پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مملکتِ کشتواڑ میں کشتواڑ خاص، ناگینی، پاڈر، زانسکار، مڑواہ، واڑون، دچھن، اوڈبل، کونتواڑہ، سروڑ، سرتھل، بونجواہ، ڈوڈہ، سراج (جس میں بانہال، گول، ڈینگ بٹل)، رام بن، پوگل پرستان اور کنڈی کے مواضعات شامل تھے) کے گیارہ بڑے بڑے پرگنے شامل تھے۔ راجہ کاہن پال (۶۳۷ء-۶۶۷ء) سے لیکر راجہ محمد تیغ سنگھ (۱۷۸۵ء-۱۸۲۱ء) تک لگ بھگ ۳۲ مشہور راجاؤں نے کشتواڑ کی ریاست پر حکومت کی تھی جن میں کاہن پال، گندھرب سین، مہاسین، اودت دیو، رائے راج دیو، گوردیو، اگردیو، بوالدردیو، لچھمن دیو، سنگرام سنگھ، بھاگ سنگھ، بہادر سنگھ، پرتاپ سنگھ، گورسنگھ، بھگوان سنگھ، مہاسنگھ، جے سنگھ، محمد کیرت سنگھ، عنایت اللہ سنگھ، گلاب سنگھ اور محمد تیغ سنگھ کے نام خاص طور پر شامل ہیں۔ شاہ شجاع الملک کو کشتواڑ میں پناہ دینے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حوالے نہ کرنے کے نتیجے میں راجہ گلاب سنگھ نے ۲۱-۱۸۲۰ء میں فوج لے کر پیش قدمی کی۔ راستے میں اس نے چھنی کے راجہ دیال چند کو اُپنے ساتھ چلنے پر تیار کیا۔ چنانچہ گلاب سنگھ نے کھیلنی کے پاس دریائے چناب کو کھرولی (جھولاپُل) کے ذریعے پار کر کے بِلا کسی مزاحمت کے قصبہ ڈوڈہ پر قبضہ جمالیا جو تیغ سنگھ

کا سرمائی دارالخلافہ تھا۔ راجہ محمد تیغ سنگھ یہ خبر سن کر ڈوڈہ کی جانب روانہ ہوا۔
محالہ میں اس کی ملاقات گلاب سنگھ کے معتمد آفیسروں سے ہوئی۔ اُس سے
وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ گلاب سنگھ کو سالانہ خراج دے گا تو اُسے اپنی ریاست
واپس دی جائے گی۔ راجہ محمد تیغ سنگھ اِس پیشکش کو ٹھکراتا ہوا ڈوڈہ میں میاں
گلاب سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ غیر مشروط طور پر کشتواڑ کی حکومت سے
دستبردار ہوگیا۔ گلاب سنگھ نے اُسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس لاہور بھیج دیا
جہاں اُسے حراست میں رکھا گیا۔ بالآخر محمد تیغ سنگھ نے ۳۴-۱۸۳۳ء میں
خودکشی کرلی اور لاہور ہی میں شاہ ابولمعالی کے مقبرہ کے صحن میں دفن ہوا۔

ریاست کشتواڑ کو جموں میں شامل کئے جانے کے بعد میاں چین
سنگھ نیلی آنکھوں والا، مہتہ بستی رام اور زور آور سنگھ کلہوریہ نے یکے
بعد دیگرے کشتواڑ کا نظم و نسق سنبھالا۔ زور آور سنگھ نے مڑواہ، واڑون،
زانسکار ور پاڈر کو کشتواڑ میں ملالیا اور لداخ کو بھی کشتواڑ ہی سے فتح کیا۔
ریاست جموں و کشمیر کے تشکیل پذیر ہونے اور مہاراجہ گلاب سنگھ کی حکومت قائم
ہونے کے بعد بھی کشتواڑ کو ایک الگ صوبے کی حیثیت حاصل رہی یہ سلسلہ
۱۸۷۵ء تک جاری رہا جبکہ لالہ سرب دیال اِس علاقے کا آخری گورنر ہوا۔
اس کے بعد کشتواڑ، جموں کا ایک ضلع بن گیا اور دیوان ارجن مل یہاں کا پہلا
وزیرِ وزارت ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں پنڈت شیو جی در کشتواڑ اور بھدرواہ کے
۲ اضلاع کے وزیرِ وزارت تعینات ہوئے جنہوں نے فارسی میں ''تاریخ
کشتواڑ'' قلمبند کی۔ کشتواڑ کم از کم ۱۹۰۹ء تک ضلع رہا اور اس کے بعد اس ضلع
کو کشتواڑ اور رام بن کی دو تحصیلوں میں تقسیم کرکے ضلع اُودھمپور کے ساتھ

مِلا یا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں یہ دونوں تحصیلیں ضلع ڈوڈہ میں شامل کی گئیں۔ اس وقت کشتواڑ کی سابقہ مملکت کا علاقہ کشتواڑ، چھاترو، مڑواہ، پاڈر، ڈوڈہ، رام بن اور بانہال کی سات تحصیلوں میں تقسیم ہوا جبکہ علاقہ ڈینگ بٹل (گول) تحصیل مہور ضلع اُدھمپور کی ایک نیابت ہے۔ وزیر کمیشن رپورٹ میں کشتواڑ کو ایک الگ ضلع بنانے کی سفارش ہوئی تھی۔ اِس لئے نئے اضلاع بنائے جانے کا منصوبہ مرّتب کیا گیا تو اس میں کشتواڑ کا نام سرِفہرست آ گیا۔ لٰہذا کشتواڑ لگ بھگ ۹۷ برس کے بعد دُوبارہ ضلع بن گیا۔

کشتواڑ کو شاعروں کی سرزمین کے نام سے بھی موسوم کیا جارہا ہے کیونکہ یہ علاقہ زمانۂ قدیم سے ہی علم واَدب اور شعر و موسیقی کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ راجگانِ کشتواڑ نہ صرف شعر و موسیقی کے پرستار ہی تھے بلکہ اُن میں سے راجہ مہاجان سنگھ، راجہ محمد کیرت سنگھ، راجہ عنایت اللہ سنگھ اور راجہ تیغ سنگھ خود بھی فارسی اور ہندی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ علاوہ ازیں قاضی نیاز اللہ، مولوی عبدالرسول، نصرالدین ناصر، مولانا ضیاء الدین ضیا، حاجی عطا اللہ اور مولوی حمایت اللہ بھی اُس زمانے کے مشہور علماء فضلاؑ ادباء اور شعراء تھے۔ آخر الذکر مولوی صاحب کو اُپنے علمی تبحّر کی بنیاد پر نواب بھوپال نے اُپنے فرزندِ ارجمند کا اُتالیق مقرر کیا تھا۔ بیسوی صدی کے شروع سے لیکر آج تک یہاں کئی ادبی شخصیات نے جنم لیا۔ جن میں سے پیر غلام محی الدین محی، پیر بہاؤ الدین بھائی، خواجہ غلام رسول کامگار، غلام حیدر قیصر، غلام مصطفٰی عشرت کاشمیری، غلام رسول نشاط، کشمیری لال روپ، غلام محمد اُلفت، غلام قادر بیرواری، فتح جُو فتح، ولی محمد ولی، ہنس راج وزیر، لسہ جُو رانا، بدری ناتھ پلماری،

غلام نبی ڈولوال جانباز، غلام حسن اُرمانؔ، چندر پرکاش چندرؔ، من موہن قیصرؔ، عبدالرشید فداؔ، پرویز ابنِ طیبؔ، محمد اسحاق صیادؔ، روپل سنگھ راناؔ، بشیر احمد متو وغیرہ وغیرہ کئی بزرگ اور نوجوان شاعر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں بزمِ ادب کشتواڑ قائم ہوئی اور غلام حیدر قیصرؔ اُس نے بانی صدر اور عشرت کاشمیریؔ بانی سکریٹری مقرّر ہوئے۔ چنانچہ ''کشیر بالہٕ اَپارِ'' کے فاضل مصنّف پروفیسر مرغوبؔ بانہالی تحریر کرتے ہیں کہ...... کشمیری شاعری کی جو گنگناہٹ تحصیل کشتواڑ میں کانوں میں پڑتی ہے اُس کی کشمیر کے دیہات میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہاں تقریباً سارے لوگ کشمیری شعروں اور کشمیری موسیقی کے ساتھ وابستہ لگتے ہیں۔ وہاں کے شاعروں کا تعارف میں عمر یا درجے کے حساب کے بجائے آزاد طریقے پر پیش کرتا ہوں۔ یہ بات پہلے ہی کہی جا چکی ہے کہ عشرت کاشمیری، ارمانؔ کشتواڑی اور فداؔ کشتواڑی کی کشمیری زبان میں طبع آزمائی کرنے کا کوئی ثبوت دستیاب نہ ہوسکا لہٰذا اُن کے کام اِس فہرست میں شامل نہیں ہے۔ تاہم اگر کسی نوجوان یا بزرگ کشمیری شاعر کا نام رہ جائے تو مجھے اُمید ہے کہ مقامی اَدیب دوست اپنا کوئی اَجتماعی رسالہ شائع کرتے وقت اس کی نشاندہی کریں گے۔

خواجہ غلام نبی ڈولوال کشتواڑ کے کلچر کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ سارا کشمیر اِس فنکار سے پیار کرتا ہے۔ ڈولوالؔ اَدبی میدان میں جانبازؔ کے تخلص سے مشہور ہیں۔ ڈولوال صاحب نے کشمیری موسیقی میں ''چلنت'' کا اضافہ کیا ہے۔ چلنت کِسے کہیں گے؟ دراصل اِس لفظ کا جامع مطلب ابھی تک مقرر نہ ہوسکا۔ لہٰذا ایسے لفظ سے وہ مطلب نکالنا چاہیے جو عوام اِس سے نکالتی ہے۔

یعنی غلام نبی ڈوّالول کی ایک نرالی اور ممتاز لَے ۔ دراصل جو فرق ڈوالول صاحب کے لہجے اور دوسرے کشمیری فنکاروں کے طرزِ موسیقی میں ہے وہی فرق ''چلنت'' اور ''چھکری'' میں ہے۔ ساز مدہم رکھتے ہوئے شاعر کے قیمتی الفاظ ایک اُتار و چڑھاؤ کے ساتھ سمجھانے کی فنکارانہ کوشش ''چلنت'' کی بنیاد ہے۔

☆نوٹ: ٦ جولائی ٢٠٠٦ء کو میں نے دوپہر کے وقت اپنے اِس مضمون کو اختتام تک پہنچایا۔ رات کو ریڈیو کشمیر سرینگر اور دُور درشن کیندر سرینگر سے یہ خوشخبری ملی کہ ریاست کی کابینہ نے ٨ر نئے اضلاع (کشتواڑ، رام بن، ریاسی، سانبہ، کولگام، شوپیان، گاندربل اور بانڈی پورہ) تشکیل دئے جانے کی منظوری دے دی ہے۔ اِس خبر کے سُنتے ہی دوسری جگہوں کی طرح کشتواڑ میں بھی جشن کا سا ماحول نظر آرہا تھا۔ اِس طرح کشتواڑ ضلع آئندہ چند ماہ کے اندر اندر کام کرنا شروع کرے گا جس میں کشتواڑ، چھاترو، پاڈر اور مڑواہ کی چار تحصیلیں شامل ہوں گی۔ یہ ایک تاریخ ساز اِقدام ہے۔

موتی لال ساقیؔ

کشمیر
بودھ، یُونانی اور چینی
تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں

یونانی ماخذ

مشرق اور مغرب کے درمیان تعلقات کی تواریخ اِتنی قدیم ہے جتنی قدیم بذاتِ خود تواریخ ہے۔ یہ سوچنا صحیح نہیں کہ مشرق اور مغرب کے درمیان تمدّنی تعلقات کے دَروازے سکندرِ اعظم کے حملے کے بعد وَا ہوئے۔ مغرب سے ہی دَراوڑ یہاں آئے اور ایک درخشاں تمدّنی روایت کی بنیاد رکھنے کے بعد جنوب کی طرف چلے گئے اور وہیں قرار کیا۔ اِسی راستے سے آریہ بھی آئے جنہوں نے پہلے سپت سندھو کو اپنا مرکز بنایا اور اِسکے بعد پورے مشرق میں پھیل گئے۔ جنگجو کھش بہت سے ملکوں کو تاراج کر کے اور بابل کو تباہ و برباد کر کے مغربی دَروازوں سے نمودار ہوئے اور ہمالیہ کی گود میں کشمیر سے کماؤں اور اس کے آگے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ البتہ اُن کی جنگجو خصلت برس ہا برس تک اُن کے ساتھ چپکی رہی۔ اِس کے بعد کتنے لوگ، قبیلے اور حملہ آور

مغربی راستوں سے ہندوستان آئے اور شمالی علاقوں کو روندتے رہے۔ بہرحال یہ ایک طویل قصّہ ہے۔ سکندر کا مشرق پر حملہ مشرق اور مغرب کے درمیان رابطے کی ابتدا تسلیم کرنا قدیم تمدنی بہاؤ سے انحراف کے مترادف ہے۔ اس امر سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر کے حملے کے بعد مغربی دُنیا اور مشرق کے درمیان تعلقات میں وُسعت اور تیزی آئی۔ آمدرفت بڑے پیمانے پر شروع ہوئی اور لوگوں کو ایک دُوسرے کو جاننے اور تمدّنی زوایات پہنچاننے میں مدد ملی۔ بات کی وضاحت کرتے ہوئے اے۔ کے نرائن لکھتے ہیں۔

''تجویز کیا گیا ہے کہ ہند یونانی وہ لوگ تھے جو ہندوستان کے (اَب پاکستان کے) شمال مغربی سرحدی صوبے کے ساتھ ساتھ سکندر اور اُن کے سلجوقی جانشینوں کے ساتھ آئے یہ اندازہ محدود ہی نہیں بلکہ ایک ایسی وضاحت ہے جو دستیاب شہادتوں کی بنیاد پر غلط ثابت ہوتی ہے۔ سنسکرت گرائمر نویس ''پانِنی'' کا زمانہ اگرچہ ابھی تک پوری طرح متعیّن نہیں کیا جا سکا ہے البتہ اس بات پر عام اتفاق ہے کہ وہ سکندر سے بہت پہلے ٹیکسلا کے قریب سِلوتر میں رہتا تھا۔ ''اَشٹ اَدھیائے'' میں وہ لکھتا ہے کہ ''یوَن'' لفظ کی بنیاد ''یوَنی'' ہے۔ (اگر ''یوَن'' لفظ نہ ہوتا تو وہ کِس طرح اِس کا استعمال کرتا؟) مغربی کلاسیکی ماخذ تصدیق کرتے ہیں۔ کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ یونانی سکندر سے قبل بستے تھے......!''

''یوَن'' راج ترنگنی میں کلہن نے بارہا استعمال کیا ہے۔ اِس کے بعد جو نراج اور شری ور وغیرہ نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''یوَن'' لفظ ''یونان'' کا سنسکرت رُوپ ہے، جو کہ دُرست نہیں......!۔ یوَن بہت بعد میں ہندوستانی یونانیوں کو کہتے تھے اور یہ نام ایک قوم کو دیا گیا

تھا ہندوستانیوں کے کہنے کے مطابق شمال مغربی سرحدوں پر بستی تھی جس کا ذکر منو نے کیا ہے۔ لاسن کی تحقیق کے مطابق اِس قوم کا شمار کمبو، شاکھا، پالو اور کیرتیوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اے وبیر لکھتے ہیں۔

''اِس نام کا تواریخی سرچشمہ دستیاب ہے۔ بعض کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا یونانیوں کے لئے'' یا-اُ-نا کے بغیر کوئی اور نام نہیں تھا۔ ایشیائے کوچک کے'' ایونین '' (Ionian) پہلے یونانی تھے جن کے ساتھ اُن کے تعلقات اُستوار ہوئے اور انہوں نے یونانیوں کو وہی نام دیا۔ ممکن ہے کہ اُس وقت یہ نام ہندوستان، دارا کی فوج میں اُن ہندوستانیوں کے ذریعے آیا ہو جو ناکامی سے بچنے کے لئے بھاگ کر واپس گھر آئے۔''

اِس بات کا تذکرہ لازمی ہے کہ ایونین یونان کا ایک تعمیری طرز ہے اور یونانی طرزِ تعمیر کے دیگر دو رُوپ ڈورِک اور کارنتھی ہیں۔ ڈورِک طرز سب سے قدیم طرز ہے اور ہندوستان میں اِس کی مثالیں صرف کشمیر ہی میں دستیاب ہیں'' ایونین'' طرز نے وسطِ ایشیاء میں مقبولِ عام کا درجہ حاصل کیا۔ اِس سلسلے میں سیف الرحمان ڈار لکھتے ہیں۔

''پاکستان میں تینوں کلاسیکی طرز یعنی ڈورِک ، ایونک اور کارنتھی استعمال ہوتے تھے لیکن اِس وقت دستیاب معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈورک طرز کے تمام آثار آٹھویں صدی عیسوی کے ہیں اور ان میں بھی کہیں کہیں بنیادی باتوں سے انحراف کیا گیا ہے۔ اِن میں سے اکثر آثار کشمیر میں موجود ہیں۔ ٹیکسلا میں اِس طرز کا کوئی نشان نہیں۔ اتنی دیر میں اِس طرز کا سامنے آنا باعثِ حیرانی ہے۔ تاہم اِس طرز کا امکانی

سرچشمہ شمالی شام ہے۔"

ڈار صاحب کو جو چیز حیران کرتی ہے وہ ایک دلچسپ تواریخی حقیقت کی طرف اِشارہ کرتا ہے۔ ڈورِک طرزِ تعمیر، جیسا کہ قبل ازیں اشارہ کیا جاچکا ہے، کلاسیکی طرزِ تعمیر کی سب سے قدیم طرز ہے۔ ٹیکسلا کے آثار میں (جن کا تعلق سیتھین پارتھن اور شاکیہ کے ساتھ ہے) ڈورِک طرزِ تعمیر غائب ہونے اور کشمیر میں اِس طرز کا ہونا اِس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ جب پارتھی، سیتھی وغیرہ یہاں نہیں آئے تھے، یونانیوں کی کوئی جماعت کشمیر' ڈورِک طرزِ تعمیر لے کر آ گئی اور یہ طرز کشمیر کی عام طرز بن گئی۔ یہ ضرور ہے کہ اپنی زمین سے جُدا ہونے کی وجہ سے اس میں تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ کچھ یونانی اور کچھ کشمیری مل کر کشمیری طرزِ تعمیر کا وہ سکول معرضِ وجود میں آیا جسے ہم کشمیری طرزِ تعمیر کہتے ہیں۔ چنانچہ اے۔ جی۔ آر بری یہ کہہ کر اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ کشمیر میں تعمیر کاری کا رحجان مغرب کی طرف تھا لیکن الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے اِس کا قدیم طرزِ تعمیر بھی بحال رہا۔ اَب یہ اَمر تسلیم کیا جاچکا ہے کہ جس جگہ تواریخی حقیقت دستیاب کرانے میں تحریری روائیتیں ناکام رہتی ہیں وہاں قدیم آثار یہ کمی پوری کرتے ہیں۔ اُپنے قدیم آثار پر بات کرتے ہوئے ہمیں تازہ انکشافات کی روشنی میں شاید اَز سرِ نو سوچنا پڑے گا۔ چنانچہ موجودہ سائنسی دَور میں مورّخ پہلے دَور، نیم تواریخی دَور کی تواریخ قدیم آثار کی بنیادوں پر مرتّب کرتے ہیں۔"

یونانیوں سے قریبی تعلّقات ہونے کا نتیجہ ہے کہ بعض یونانی الفاظ کشمیری مول کے بن گئے جن میں گُور (لڑکی) کوگُر (مُرغا) گُون (کونا)

مِیل (سیاہی) اور پیالہ جیسے الفاظ شامل ہیں۔ (پیالہ اگر چہ فارسی لفظ مانا جاتا ہے لیکن اس کا سرچشمہ یونانی ہے اور صورت (Piyala) ہے۔

کشمیر کا سکندر کے حملے سے پہلے اور اس کے بعد بھی یونانیوں سے مَیل جول اور تعلقات قائم رہے۔۔ یہ بات حوصلہ اَفزا ہے کہ اپنی بہت ہی قدیم تواریخ دستیاب ہونے کے باوصف ہمیں غیر ملکی مصنفوں سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا ذکر مقامی تواریخوں میں مفقود ہے۔ مثلاً سری لنکا کی تواریخ مہاوامشس میں دَرج کہ جب پہلی صدی عیسوی میں اَنورادھاپُورَم میں بودھ خانقاہ کا افتتاح کیا گیا اُس وقت کشمیر سے آئے ہوئے یاتریوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ کشمیر کے نام اور اِس کے دائرۂ اقتدار کے متعلق ہمیں یونانی ماخذوں سے بہترین اطلاعات دستیاب ہوتی ہیں۔

وِتستا (جہلم) اور چناب کا ذکر رِگ وید میں بھی آیا ہے۔ مہابھارت اور پوران بھی کشمیر کے بارے میں بہت سی جانکاری فراہم کرتے ہیں۔ کشمیر کی تواریخی جغرافیہ کا سراغ ہمیں جاتکوں سے بھی ملتا ہے۔ گاندھار جاتک میں کہا گیا ہے کہ گاندھار، کشمیر کا حصہ تھا اور اِسی گاندھار کے گردونواح میں یونانی آباد ہو گئے تھے۔ گاندھار جاتک کا وقت مسیح سے قبل تین صدی تسلیم کیا گیا ہے۔ اُس زمانے میں کشمیر کی وُسعت کا جائزہ لینے کے لئے دیکھنا پڑے گا کہ گاندھار نام کے مشہور علاقے کی حُدود کیا تھیں۔ بودھ شاستروں کے مطابق گاندھ سولہ (۱۶) جنَ پدھوں میں ایک جنَ پدھ تھا۔ یہ تین سو جغرافیائی میلوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اِس کا مگدھ علاقے سے کئی راستوں سے رابطہ تھا۔ گاندھار کے دو خاص شہر ٹیکسلا اور پشکلاوتی تھے (یہ شہر پشاور ضلعے میں

گندھرووَں کا مشہور شہر تھا اور پاٹلی پتر سے مغرب کے سفر کا آخری پڑاوٴ تھا۔ یونانی اِسے پیو کولٹس لکھتے تھے اور ہیون سانگ نے اِس کا "پوسی۔کیلو۔پھتی" نام دیا ہے۔ گاندھار کے لوگ اُس فوج میں شامل تھے جس نے مسیح سے قبل چھ سو سال یُونان پر حملہ کیا تھا۔ بہشتان کتبے کے مطابق بھی گاندھار ایک وقت کشمیر کا ایک حصّہ تھا۔

گاندھار کے متعلّق یہ بات دہرانی مناسب ہے کہ یہ علاقے کبھی کشمیر کے ماتحت رہتے تھے اور کبھی ایران کے' جس کی تصدیق چینی تواریخ بھی کرتی ہے۔ مہر گل ، میگواہن اور کارکوٹ ناگ دور تک بھی گاندھار کشمیر کا حصّہ تھا۔

حوالہ جات سے ایک طرف کشمیر کی سلطنت کی وسعت کا پتہ چلتا ہے اور دُوسری طرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہاڑوں سے گھرا کشمیر قدیم زمانے میں بیرونی دُنیا سے الگ تھلگ نہیں تھا بلکہ کشمیریوں نے ہَر دَور میں دُور دَراز علاقوں کا جائزہ لے کر تہذیبی اور تمدّنی سفر جاری رکھا ہے۔ اِتنا کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے زمانے میں کشمیری دیودار لکڑی اور مُشکِ کستور مختلف ممالک کو بھیجتے تھے۔ کشمیریوں کی مہم جوئی کا اَندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ کشمیری شمال مغربی سرحدوں کے لوگوں کے ساتھ ختن اور کاشغر چلے گئے اور وہاں اَپنی نوآبادیاں قائم کیں اور خود کو فخر سے کشمیری کہتے تھے۔

ہیروڈوٹس (۴۲۰-۸۴، ق م) پہلا یونانی مورّخ ہے جس نے کشمیر کے پہاڑوں میں سونا کھودنے والے چیونٹیوں کا ذکر کیا ہے اور اُس کی یہ بات بعد میں آنے والی کئی مورّخوں نے نقل کی ہے۔ اگر چہ بات مبالغہ آرائی کی حدوں تک جا پہنچی لیکن اِس کے باوجود اِس سے بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔

ہیروڈاٹس کی دلیل محض اُس کے تخیّل کی پیداوار نہیں بلکہ اِس کی بنیاد میں ایک صداقت پوشیدہ ہے جس کی طرف اِس مضمون میں آگے بحث کی جائے گی۔

بہر حال اِس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قدیم یونانی کشمیر کے نام اور اس کی جغرافیہ وغیرہ سے بخوبی واقف تھے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلقات کا عندیہ دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تعلقات کی نوعیت کیا رہی ہوگی۔ کشمیر کے متعلق بات کرتے ہوئے یہ دھیان رکھنا ہے کہ کشمیر کی سیاسی اور جغرافیائی صورتِ حال وقتاً فوقتاً بدلتی رہی ہے۔

سونا کھونے والی چیونٹیوں کی بات کا تانا بانا اُٹھاتے ہوئے ہیروڈاٹس لکھتا ہے۔

''ان کے علاوہ وہاں دیگر قبیلوں کے ہندوستانی ہیں جو کشپتر یر میں (کشمیر) اور پکتی کا ملک کی سرحد پر بستے ہیں۔یہ لوگ باقی ہندوستان سے شمال کی طرف رہتے ہیں اوران کا طرزِ بود و باش اُس سے ملتا ہے۔ یہ لوگ دیگر قبیلوں کے مقابلے میں جنگجو ہیں اوراِن ہی میں سے بعض لوگ سونا لانے کے بھیجے جاتے ہیں۔اِسی صحرا میں بڑی چیونٹیاں رہتی ہیں جو کہ کُتے سے ذرا چھوٹی اور لومڑی سے بڑی ہوتی ہیں۔ یہ چیونٹیاں زمین کے اَندر بِل بناتی ہیں اور یونانی چیونٹیوں کی طرح سرنگ بنا کر مٹی کے ڈھیر باہر نکالتی ہیں۔ جو مٹی چیونٹیاں باہر نکالتی ہیں اُس میں سونا ہی سونا ہوتا ہے۔''

ہیروڈاٹس مغالطے کی وجہ سے اُن کان کنوں کو چیونٹیاں کہتا ہے جو سردیوں میں فر (Fur) کے کپڑے پہن کر اِس علاقے میں سونا نکالتے تھے۔ کان کُن، منگول نسل پستہ قد رہے ہوں گے اور Fur کے کپڑے پہن کر

انسانوں سے زیادہ جانور لگتے تھے۔ یہ دلیل اُس وقت یونان میں اتنی مشہور ہوگئی کہ اس نے تمثیل کا رنگ اختیار کیا۔ اِن چیونٹیوں کا ذکر عربی تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے اور سولہ ویں صدی عیسوی میں یہ دلیل تُرکوں میں بھی مشہور تھی۔ اِس بات کا ایک اور پہلو بھی ہے وہ یہ کہ مہابھارت کی جنگ ختم ہونے پر ایک دردَراجہ، یُدھشٹر کو سونا پیش کرتا ہے جس کو پپلکا سونا (یعنی چیونٹیوں کا کھودا ہوا سونا) نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ بعض مؤرخوں اور محققّوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ Fur کے کپڑے پہن کر کان کنوں کا اندازہ صحیح ہوسکتا ہے لیکن چیونٹیوں کے سونا کھود نکالنے کی کوئی بنیاد رہی ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرینِ قیاس ہے کہ وادیٔ سندھ کے کناروں پر بِل کھودنے کے عمل میں مٹی نکالتی ہوں اور اس کے ساتھ سونے کے ذرّات بھی ہوتے ہوں گے اور اِسی سونے کے بعد میں جمع کیا جاتا ہوگا۔

ہیروڈاٹس کشمیریوں کو کسپیوئے اور کشمیر کو کپشیر ہرس لکھتا ہے۔ اُس کے پکتیا آج کے پختون ہیں۔ اِسی طرح وادی سندھ کے بالائی علاقے کی اُس نے بہت صحیح نشاندہی کی ہے۔ وہ واضح طور لکھتا ہے کہ سونا جمع کرنے والے یا نکالنے والے ہندوستانی نہیں بلکہ دیگر نسلوں کے لوگ ہیں جو آج بھی اپنی جگہ دُرست ہے۔ اُس کی ''دَرِتے'' آج کے درد قبیلے کے لوگ ہیں جو دَردستان میں رہتے ہیں۔ پلنی واضح طور کشمیریوں کو کشمیری نام دیتا ہے اور ڈانیوسس لکھتا ہے:

''کپشیر یو ایک قبیلہ ہے جو سارے ہندوستانیوں میں تیز چلنے کی وجہ سے کافی مشہور ہے۔''

یونانی ماخذوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابھیسارہ کے راجہ نے پورروواہ (راجہ پورس) کی اعانت نہیں کی اور یہی مناسب خیال کیا کہ سکندر کو اَپنی وفاداری کا ثبوت دے۔ راجہ کے بھائی کی قیادت میں ایک جماعت تحائف لے کر سکندر کے پاس پہنچی۔ سکندر جب اُن کی وفاداری سے مطمئن ہوگیا۔ اُس نے کشمیر میں ابھیسارہ کے اختیارات میں اضافہ کیا اور اُرچک (ہزارہ) کے راجہ کو حکم دیا کہ وہ اس کی سرداری قبول کرے۔ ہزارہ، یونانیوں کو ارساچس نام سے زیرِنظر تھا۔ اِس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ شہنشاہ اکبر کے وقت میں بھی ہزارہ، کشمیر کا حصّہ تھا جس کا ذکر ابوالفضل نے "اکبر نامہ" میں کیا ہے۔

ابھیسارہ کا حوالہ ایک اور حقیقت کی طرف اِشارہ کرتا ہے۔ خاص طور سے اِس وجہ سے کہ اِس میں کشمیر اور ابھیسارہ کا ذکر اِکٹھے کیا گیا ہے۔

راج ترنگنی میں دَرج ہے کہ کشمیر کا راجہ ابھیمینو چھ مہینوں تک دَرو...... ابھیسارہ اور دیگر جگہوں پر رہتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کا راج موجودہ کشمیر سے باہر دُور دُور تک تھا۔ مہابھارت کے مطابق ابھیسارہ ایک قوم اور ایک ملک کا نام تھا۔ یہ علاقہ چندر بھاگا کا درمیانی علاقہ تھا۔ اِس علاقے میں اِسی ذات کے لوگ رہتے تھے اور یہ علاقہ کشمیر کے مغرب اور جنوب میں تھا۔ مہابھارت کی لڑائی میں اِس علاقے کے لوگوں نے دریودھن کی مدد کی۔ راج ترنگنی بھی اس بیان کی توثیق کرتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام علاقہ کشمیر کے تابع تھا۔ ایک وقت میں اس علاقے میں شوسین نامی راجہ حکومت کرتا تھا۔ اِس کا پتہ ہمیں تانبے کی اُس مہر سے چلتا ہے جو کہ پنجاب میں

دستیاب ہوتی ہے۔ کریٹس لکھتا ہے کہ ٹیکسلا اور ابھی کے حکمران ابھیسارہ واسیوں سے لڑتے رہتے تھے۔ ایرین (Arrian) کہتا ہے کہ یہ اتحادی نہ صرف ٹیکسلا کے خلاف لڑتے تھے بلکہ شُدرکن اور مالوہ کے خلاف بھی۔ سکندر کے حملے کے بعد جونئی سرحدیں اور مملکتیں وجود میں آئیں اُس کا اُثر کشمیر پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ مناندر کے وقت کشیر یا کشمیر اُسی راج کے راج کا ایک حصّہ تھا جس کا واضح حوالہ ڈبلیو، ڈبلیو ٹارن دیتا ہے۔ یونانیوں کی باختری سلطنت قائم ہونے کے بعد امو دریا اور گنگا کی وادی کے درمیان بڑے پیمانے پر تجارت شروع ہوئی جس میں تاجر باختر اور کشمیر کی پیداوار لے کر تجارت کرتے تھے۔ شاید اِسی زمانے میں رُوم کا دینارلیس لفظ دینار بن کر کشمیر پہنچا۔ کشمیریوں نے اِس کا ''ن'' ہضم کیا اور ''دیار'' بن کر کشمیری زبان میں مستعمل ہوگیا۔

کشمیر کے متعلق اگرچہ بہت سے قدیم زمانے کے موّرخوں نے لکھا ہے لیکن ٹالمے بعض ایسی باتوں کا پتہ دیتا ہے جن کی بے پناہ تواریخی اہمیت ہے۔

کلاڈیس ٹالبس یونانی جغرافیہ دان اور ماہر ریاضی تھا۔ وہ مصر کے اسکندریہ شہر میں دوسری صدی عیسوی میں پَروان چڑھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ یونان کے شہر ٹالمس میں پیدا ہوا۔ اُس نے اَپنے فلکیاتی اور جغرافیائی تجربے ۱۳۹ء میں منظرِ عام پر لائے۔ مشرقی ملکوں کے متعلق اُس کا جغرافیہ اس میدان میں اُس کا اہم کارنامہ گردانا جاتا ہے۔ کشمیر کے متعلق بات کرتے ہوئے ٹالمے لکھتا ہے:

"آگے مشرق کا علاقہ کشپیر یو ہے (جو میرے خیال میں کشپیر
رائے ہونا چاہئے) اوراس کے شہر یوں ہیں:
ا) سلاجسا
(۱) اسٹراسس (۲) بوبکلا (۳) بٹ نگری (۴) آری پارا
(۵) اماکتس (۶) اوستابل سٹارا
ب) کشپیریا
(۱) یاسکنا (۲) ڈاے ڈالا (۳) اردون (۴) اند بارا (۵)
لگانیریا (۶) کھونامارگا وغیرہ۔"

کشمیر کے ساتھ یا اس کے تابع علاقوں کا شمار کر کے اگر ٹالمے اس کی وسعت کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن اِس نے جو نام گنائے ہیں اُن کا جائزہ لینا انتہائی مشکل ہے۔ ناموں پر بات کرتے ہوئے سنیٹ مارٹن لکھتا ہے کہ کشپیر اقدرتی طور کشمیر کا صدر مقام ہے۔

ٹالمے نے دَردوں کا ذکر دردرائے نام سے کیا ہے اور معاملہ پیچیدہ بن گیا ہے۔ مہابھارت میں اِن کا ذکر درد نام سے ہی ہوا ہے۔ درد سنسکرت لفظ ہے اوراس کے معنی پہاڑی ہیں۔ یہ علاقے سونا کھودنے والی چونٹیوں کے تذکرے کی وجہ سے کافی مشہور رہا ہے جس کو ہیروڈاٹس نے اور بھی برانگیختہ کیا ہے اوراس کے بعد سٹرابو نے اِسی حکایت کو آگے بڑھایا۔ سٹرابو نے دَردوں کو دِردائے اور پلنی نے دَردَے کہا ہے اور اِن ہی لوگوں کو دردونائے بھی کہا گیا ہے۔ سندھ کے منبع کے اِرد گرد سونا پائے جانے کی وجہ سے سندھ سورگ کے چار دریاؤں میں ایک مان گیا ہے جس کا ذکر Genesu میں کیا گیا ہے۔

ٹالمے کے مطابق اُس وقت کشمیر ایک بڑی سلطنت تھی۔ اس کی سرحدیں جنوب میں وندھیا چل اور مغرب میں گاندھار اِس کا حصّہ تھا۔ ہمالیہ پہاڑ کا اکثر حصّہ اِس کے ماتحت تھا جہاں سے پنجاب کے بڑے بڑے دریا نکلتے ہیں۔ پنجاب، گنگا اور جمنا کا بالائی علاقہ کشمیر کے ماتحت تھا۔ ٹالمے، کشمیر کے حدِ اختیار میں علاقہ چناب (سندبل) رہودِس (راوی) اور وتستا (بڑاسپس) کے منبع مانتا ہے جس سے اُس کی جغرافیہ کے متعلق جانکاری کا پتہ چلتا ہے۔ ٹالمے کا بیان کس حد تک صحیح ہے اِس کا پتہ آنے والے زمانہ ہی دے گا جب زمین کے اندر دفینوں کو عیاں کرنے کی باری آئے گی۔ ٹالمے کے بعد کلہن لکھتا ہے کہ میگواہن جیسے بہادر نے جنوب تک کا علاقہ فتح کیا اور للتادت نے بنگال تک کا علاقہ ہتھیا لیا جب کہ مہرکل نے لنکا تک اپنا ہاتھ بڑھایا۔ للتادتیہ کی فتح مندی کا ثبوت ہمیں اُس وقت بہم ہوا جب مدھیہ پردیش میں اُس کے زمانے کے سِکّے ہاتھ آئے۔ ہرمن گویز جیسا محقّق لکھتا ہے کہ اُس کی بادشاہت میسور تک تھی۔ کشمیریوں کی جائے رہائش کا تذکرہ کرنا ٹالمے بھولا نہیں، لکھتا ہے:

"دردی (درد) سندھ کے منبع پر بستے ہیں اور کشپیر ایائے جہلم کے منبع پر"۔

ٹالمے نے جغرافیہ میں لبکا کوٹ نام لے کر ایک قلعے کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جس کو وِلسن نے لاہور کے ساتھ خلط ملط کیا ہے۔ میک کرنڈل کو یہ قلعہ ہاتھ نہیں آیا ہے۔ آدی وقت میں پنجاب میں اِس قلعے کا زبردست چرچا تھا۔ محمود غزنوی جیسا شخص اِس قلعے کو زیر نہیں کر سکا تھا۔ اِس قلعے کو سرارل

سٹائن نے لوہر کوٹ کے نام سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ جگہ لورہن، لوہر اور لُہہ کوٹ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ کشمیر کی سرحد پر لُوہر کوٹ ایک حفاظتی قلعے کے طور اُسی طرح اہم رہا ہے جس طرح وسطی دَور میں راجستھان کا چتوڑگڑھ قلعہ مشہور رہا ہے۔ ٹالمے کے حوالے سے پہلی بار اِس بات کی تصدیق ہوئی کہ لوہر کوٹ بہت ہی پُرانا قلعہ رہا ہے۔ میک کرنڈل، ٹالمے کے جغرافیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ٹالمے کی جغرافیہ میں درج ایوموسا غالباً جموں ہے جو تواریخی اعتبار سے بہت ہی پُرانا مقام ہے جس کے سردار ایک وقت شمال کے پانچ راجاؤں میں گنے جاتے تھے۔ یہ واقعی اُس شاہراہ پر تھا جو ایک زمانے میں سندھ سے پالی پوترا' پاٹلی پُتر (موجودہ پٹنہ) جاتی تھی۔ جموں اگلے زمانے میں مدر دیش کے ساتھ شامل تھا جس کا صدر مقام ساگلا تھا۔ ٹالمے اِس شہر کا نام ساگلا ہی لکھتا ہے۔ جب کہ ایرین اِسے سانگلا کہتا ہے۔ اِسے انکلا بھی کہا گیا ہے۔ مہابھارت میں اِس کا ذکر بارہا آیا ہے۔ یہ وہی شہر ہے جسے سیالکوٹ کہتے ہیں۔ پروفیسر مونس رضا کہتے ہیں کہ کشمیر کی وادی جہلم کا تحفہ ہے۔ کشمیر کے متعلق بہت سے مؤرخوں نے وتستا کا ذکر کیا ہے۔ ٹالمے نے وتستا کا نام ''بداس پس'' لکھا ہے۔ جو اِس کے سنسکرت نام وتستا کے بہت قریب ہے۔ میک کرنڈل لکھتا ہے کہ ''بدستا'' لفظ کا معنی ''وسیع'' ہے۔ ہوریس نے اِسی وتستا کا نام ''ڈسپس'' لکھا ہے اور ورجن نے اِس کا ذکر ''میڈس ہائے ڈاس پو'' کہہ کے کیا ہے۔ ایک وقت وتستا، پورس یا پوروا کے مغربی سرحد کی نشاندہی کرتی تھی۔ میکھس تھنیز نے بھی وتستا کو ''ہائے ڈاسپس'' لکھا ہے۔

چناب، کشمیر کا ایک اور بڑا دریا ہے جس کا ذکر وتستا کے ساتھ ہی رگ وید میں کیا گیا ہے۔ ٹالمے چناب کو سندھ باگا نام دیتا ہے جو نقل نویس کی غلطی کی وجہ سے سندبل بن گیا ہے۔ ٹالمے کا سندھ باگا پراکرت چندر باگا کا یونانی رُوپ ہے۔ اِسی نام کا ایک اور رُوپ کنتابرا ہے جو پلنی نے دیا ہے۔

یونانی بادشاہ مناندر اور دیگر یونانی بادشاہوں کے کشمیر کے ساتھ تعلقات ہونے کا پتہ اُن سِکّوں سے ملتا ہے جو کشمیر میں دستیاب ہوئے ہیں... اور اِس تعلق کی سمتھن میں ہوئی کھدائی سے تصدیق بھی ہوئی ہے۔ وہاں جو کھُدائی ہوئی ہے وہ شمالی ہندوستان کے موریہ دَور کی مُورتیوں سے مَیل کھاتی ہے۔ سمتھن میں دَریافت بہت سے آثار میں مٹی کی ایک مُورت بھی دستیاب ہوئی ہے جس میں ایک یونانی دیوتا کی شکل بنائی گئی ہے۔ سترالی دَور کے بعض سِکے بھی وہاں دستیاب ہوئے ہیں۔

سمتھن میں موریہ دَور کے آثار دستیاب ہو جانے سے اِس بات کی تصدیق ہوئی ہے کہ کشمیر کسی زمانے میں مَوریہ سلطنت کا حصہ رہا ہو گا جس کا حوالہ پہلے ہیون سانگ اور بعد میں کلہن دیتا ہے۔ بودھ گرنتھوں اور پوتھوں میں یہ بات درج ہے کہ راجہ اشوک نے ممتاز کشمیری بھکشو تیسری بودھ کانفرنس میں شرکت کے لئے پاٹلی پتر بُلائے تھے۔ اَشوک کے کتبے اِس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اُس کی سلطنت افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کا شہباز گڈھی کا کتبہ اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دردستان اُس کی سلطنت میں شامل تھا کیونکہ اِس کتبے میں بعض ایسے الفاظ موجود ہیں جو درد زبان سے وابستہ ہیں۔ اشوک رعایا کے لئے کتبے نصب کرواتا تھا اور درد زبان کے

قریب کی عبارت میں کتبہ نصب کروانا ظاہر کرتا ہے کہ یہ علاقہ اُس کے ماتحت تھا۔ دردؔ علاقہ جب اَشوک کے ماتحت تھا تو کشمیر کس طرح اِس سے الگ رہا ہوگا؟

کشمیر کی تواریخ کے متعلّق بات کرتے ہوئے ہمیں وہ تمام منبعے تلاش کرنے اور اُن کو صحیح سمت دینے کی ضرورت ہے جن میں کشمیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ تحقیق ایک مسلسل عمل ہے اور کوئی بھی بات اس میں حرفِ آخر نہیں ہوسکتی لیکن نئی باتیں سامنے آجانے سے پُرانے پر نئے سرے سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ایک سچا محقّق ہمیشہ کان کُھلے رکھتا ہے اور آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتا۔

چینی ماخذ

کشمیر اور چین کے درمیان رشتوں کا تانا بانا بُرزہامہ میں ملتا ہے جہاں دَستیاب پتھّر کے دَور کے آثار شمالی چین اور وَسطِ ایشیا میں دستیاب پتھر کے دوَر کے آثار سے یکسانیت رکھتے ہیں۔ بُرزہامہ کے آثار کا تعلّق قبل اَز تاریخ دَور سے ہے۔ چین اور کشمیر کے آثار کے درمیان یکسانیت اِس کا اشارہ کرتے ہیں کہ ہمارے رشتوں کی تواریخ نہایت قدیم ہے۔ شاید اِتنی قدیم جہاں تک نظر نہیں جاتی۔ رِشتوں کی نوعیت کیسے بدلتی رہی اور نئی جہتیں اختیار کرتی رہی۔ کوئی تحریری روایت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اِس کی نشاندہی فی الحال ناممکن ہے، ہوسکتا ہے کہ آنے والے زمانے میں ایسی راہوں کی تلاش کی جائے جن سے اِن رشتوں کے منبع تک پہنچا جاسکے۔

وَسطِ ایشیاء اور چین میں جو رَول کشمیری بودھ مبلّغوں نے بدُھ دھرم کی

اشاعت میں کیا اُس کا اَز سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ کشمیر بُدھ دھرم کے مہایان فرقے کا بہت بڑا مرکز تھا اور اِسی لئے اِسے مہایان پریاگ کہتے تھے۔ تبتی مورخ تاراناتھ اور ہیون سانگ کے مطابق پہلی صدی عیسوی میں کنشک کے وقت میں کشمیر میں بودھ کونسل ہوئی جس میں بُدھ دھرم کو ایک منضبط رُوپ دیا گیا۔ ہیون سانگ صرف کشمیر کا نام لے کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے مگر تاراناتھ لکھتا ہے کہ یہ کانفرنس یا تو کشمیر میں کنڈل وَن میں ہوئی یا جالندھر میں۔

تواریخی دَور شروع ہونے کے بعد مختلف چینی کتابوں میں کشمیر اور کشمیر کی تواریخ کی نسبت بہت سے حوالے موجود ہیں۔ اِس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چین میں تواریخ نویسی کی روایت نہایت قدیم ہے۔ بادشاہوں کی خاندانی تواریخ لکھنے کی پہل کرنے والوں میں چینیوں کا نام اوّلین فہرست میں آتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو کلہن کی راج ترنگنی اور چینیوں کی شاہی تواریخ میں کافی مماثلت ہے۔ چین میں لکھی گئی تواریخی کتب کا ابھی دیگر زبانوں میں مکمل ترجمے دستیاب نہیں جس وجہ سے تمام ماخذوں تک رسائی اُبھی ممکن نہیں۔

چین کی قدیم تواریخی کتابوں میں کشمیر کا ذکر کپن (XI-PIN) اور چپن (CHI-PIN) کہہ کے کیا گیا ہے۔ کئی مقامات پر کے-شی-می-لو (KIA-SHI-MI-LO) نام سے کشمیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہیون سانگ کو میں مضمون میں زیرِ بحث نہیں لایا ہے۔ اِس لئے کہ اس کے سفرنامے کا تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اِس سفرنامے میں بہت سی ایسی

باتیں درج ہیں جن سے بہت سے تاریک گوشے منور ہو جاتے ہیں۔ میں نے چین نام پر ''کپن'' نام کو ترجیح دی ہے۔ یونانی شراپ مناندر اور ناگ سین کا ذکر ''ملند پنہا'' کتاب میں بار بار کیا گیا ہے۔ مناندر مسیحؑ سے قبل دوسری اور تیسری صدی کے درمیان شمال مغربی ہندوستان کا حکمران تھا۔ اُس کی ''شاکلہ'' یا ''شے کے'' راجدھانی تھی۔ سیموئیل بیل لکھتا ہے کہ قدیم ''شے کے'' آج کا سیالکوٹ ہے۔ یہ شہر ایک وقت مہر کُل کی راجدھانی تھا اور مناندر کی سلطنت پونچھ علاقے تک پھیلی ہوئی تھی۔ مناندر کے سِکے وغیرہ کشمیر میں بھی دستیاب ہوئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر بھی اُس کی سلطنت میں شامل رہا ہوگا۔

اب تک عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ناگ سین مشرقی بہار کے بالی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ۴۰۰-۳۱۷ء کے درمیان بھکشو ناگ سین کی تصنیفات کے چینی ترجمے ناسین پکھو کنگ (جو کسی نامعلوم ترجمہ کار نے کیا ہے) میں واضح طور کہا گیا ہے کہ ناگ سین ''کپن'' (کشمیر) نام کے ملک میں پیدا ہوا۔ اُس کا اصل نام ''تو-لا'' تھا لیکن اُن کے خاندان کا شاہی ہاتھی بھی اُسی روز پیدا ہوا جب ناگ سین پیدا ہوا جس وجہ سے اُس کا نام ''ناسین'' (یعنی ناگ سین) پڑا کیونکہ ہندوستان میں ہاتھی کو ''ناینا گ'' بھی کہتے ہیں۔ جس کتاب کے ترجمے کا پہلے تذکرہ ہوا وہ کتاب دراصل ''ملند پنہا'' ہے جسے ''ملند پرشنا'' (یعنی ملند کے سوال) بھی کہتے ہیں۔

''ہن شویا'' پلی ہُن تواریخ ۲۴ سے ۲۵ قبل مسیح کے دَور کا احاطہ کرتی ہے۔ اِس کا مصنّف ''پن کو'' (۹۲-۳۲ء) ہے جس نے یہ تواریخ ۸۰ء میں

مکمل کی۔ اِس تواریخ کی بنیاد اُس کے باپ ''پن پیاوَ'' (وفات ۵۴ء) نے ڈالی تھی۔ مصنّف کی وفات کے بعد اُس کی بہن ''پان چاوَ'' (وفات ۱۱۶ء) نے اِس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اِس تواریخ میں درج ہے:

''شہنشاہ وو' (۸۶-۱۴۰ء) کے وقت میں پہلی مرتبہ چینیوں کی کشمیر میں آمدرفت شروع ہوئی۔ یہ ایک دُور دَراز علاقہ تھا اور ہُن فوجوں کی دسترس سے باہر۔ کشمیر کے راجہ وُ-تُو-لاطن ؟ نے چین سے آنے والے بہت سے مسافروں کو قتل کرا دیا لیکن وُتو-لامو مر گیا تو اُس کے بیٹے نے اپنا سفیر خراج لے کر چینی دربار میں بھیجا اور یوں بلا روک ٹوک آمدرفت شروع ہو گئی''۔

تواریخی اعتبار سے یہ معاملہ نہایت اہم ہے۔ کیونکہ کشمیر میں لکھی گئیں تواریخیں اِس معاملے میں خاموش ہیں۔ راج ترنگنی میں ہمیں راجہ جلوک کے وقت میں ملیچھوں کے خلاف طاقت آزمائی کا ذکر ملتا ہے۔ اَرل سٹائین نے اِس شلوک کی کوئی توضیح نہیں کی ہے جس میں ملیچھوں کا ذکر آیا ہے۔ اگر یہ ملیچھ یونانی رہے ہوں گے تو کلہن نے یوَن (Yovana) لفظ کا استعمال کر کے اِشارہ دیا ہوتا۔ لفظ ملیچھ رقم کر کے کلہن نے ایک اور سچائی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ ملیچھ چینی رہے ہوں۔ چینی سے راج اور سانگ راج کشمیر کے کس حصے پر حکمرانی کرتے تھے اُس کی نشاندہی کرنا بہت ہی مشکل ہے کیونکہ کشمیر کا جغرافیہ اکثر بدلتا رہا ہے۔ کبھی یہ وسعت اختیار کر جاتا اور کبھی سِمٹ جاتا۔ ''گاندھار جاتک'' کے مطابق گاندھار (موجودہ قندھار) ۶۰۰ ق-م کشمیر کا حصّہ تھا۔ عربوں کے فتح سندھ کے وقت بھی کشمیر کی عملداری

سیالکوٹ تک تھی جس کی وضاحت ''چچ نامہ'' میں کی گئی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب ہیون سانگ کشمیر آیا اُس وقت بھی قدیم گاندھار کشمیر کا حصّہ تھا۔

کُشان سلطنت کا ذکر کرتے ہوئے ''ہُن شوٗ'' تواریخ کا مصنّف لکھتا ہے:

بڑے کُشانوں کے ملک کا بادشاہ ''چن شی'' شہر میں رہتا ہے جو چنگانہ سے ۱۶۰۰ ارلی دُور ہے۔ اِس پر وسطِ ایشیاء میں چینی گورنر کو کوئی اختیار نہیں۔ اس میں ایک لاکھ چولہے ہیں اور آبادی چار لاکھ ہے جن میں ایک لاکھ بہترین سپاہی ہیں۔ جنوب میں اِس کی سرحد کشمیر سے ملتی ہے''۔

مطلب یہ کہ کُشان بہت پہلے کشمیر کے گردونواح میں پہنچ چکے تھے اور وہ دھیرے دھیرے ثابت قدمی سے پیش رفت کررہے تھے۔ راج ترنگنی کے مطابق کنشک پہلا کُشان راجہ تھا جس کی سلطنت میں کشمیر شامل تھا۔ کلہن کنشک کو صرف کشمیر کا راجہ گردانتا ہے، جو کہ دُرست نہیں۔ کنشک 'وسطِ ایشیاء سے خلیج بنگال تک تمام علاقے پر حکمراں تھا۔ اَلبتہ چینی تواریخ ایک نئے نکتے کی نشاندہی کرتی ہے۔

''ہوہن شوٗ'' یا ہُنوں کی تاریخ خانہ لیہا کی مرتّب کردہ ہے۔ تواریخ میں درَج مغربی خطّے کے واقعات جنرل پان ینگ کی اُس رپورٹ پر مبنی ہیں جو اُس نے شہنشاہ کو ۱۲۵ء میں یا اِس سے ذرا قبل پیش کی تھی۔ ''خان لی'' نے دیگر ماخذوں سے کام لے کر ۱۷۰ء تک کے واقعات درج کیے ہیں۔ اِس میں

بتایا گیا ہے کہ چین کے جنوب مغرب میں ''کاو-پھو'' (کابل) ایک بڑا ملک ہے۔ وہاں کے لوگ کمزور اور آسائش سے زیر ہوتے ہیں۔ تجارت میں اُن کو کمال حاصل ہے اور خاصے دولت مند ہیں۔ یہ ملک ''تین چو'' (ہندوستان) کپن (کشمیر) اور پارتھیا کے زیرِ اقتدار اُس وقت رہا جب وہ طاقت ور تھے۔

ہمیں چینی ماخذوں سے پتہ چلتا ہے کہ مشہور بودھ عالم کُمار جیو پانچویں صدی کی ابتداء میں ہندوستان میں بہت سرگرم تھا۔ اُس نے کشمیر میں بودھ دھرم فلسفہ حاصل کرنے میں بہت سال صرف کیے۔ اِس سے اِس بات کو تقویت ملتی ہے کہ پانچویں صدی تک کشمیر میں بدُھ دھرم کا زبردست اَثر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر بُدھ دھرم خاص طور سے مہایان کا ایک بڑا علمی مرکز تھا اور یہ اعتبار اُسے ساتویں صدی تک حاصل تھا جب ہیون سانگ کشمیر آیا۔ ہیون سانگ نے سری نگر کے چِند روِہار میں ایک بزرگ پنڈت سے شُنیاہ واد کا علم حاصل کیا۔

تانگ خاندان کی تواریخ میں درج ہے کہ دو کشمیری راجاؤں چندر پیڈ اور للتا دت مکتا پیڈ نے اپنے سفیر چین بھیجے۔ تانگ تواریخ میں مو-ہو-تو-مولوانگ کا حوالہ بھی موجود ہے۔ مو-ہو-مومولوانگ، مہاپدم سر یا جھیل وُلر ہے۔ ساتھ ہی کشمیر کی راجدھانی کا محل وقوع بھی صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے۔

اوکانگ ایک اور چینی سیاح ہے جس کے سفرنامے میں کشمیر کے متعلق بہت ہی اچھی معلومات دَرج ہیں۔ اوکانگ ۷۵۹ء میں اُس راستے سے کشمیر

پہنچا جس راستے سے ہیون سانگ آیا تھا۔ اوکانگ لکھتا ہے کہ اُس وقت کشمیر میں تین سو سے زائد بودھ وہار تھے۔ اس کے علاوہ اُس نے بہت سے ستوپوں اور بدھ مورتیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اوکانگ لکھتا ہے کہ کشمیر، پہاڑوں سے گھرا ہے جو اس کے لئے قدرتی فصیل کا کام کرتے ہیں۔ کشمیر میں داخل ہونے کے صرف تین راستے ہیں اور اِن راستوں پر بھی دروازے ہیں۔ مشرق کی طرف کا راستہ ''توپھان'' جاتا ہے۔ شمال کا راستہ ''پولیتھ (بلتستان) جاتا ہے اور جو راستہ مغربی دروازے سے شروع ہوتا ہے وہ ''کپن تو'' یعنی گاندھار پہنچتا ہے۔ یہ تینوں راستے ابھی موجود ہیں۔ پہلا راستہ زوجیلا کے اوپر سے لداخ یا تبت جاتا ہے۔ دوسرا راستہ بانڈی پور سے گلگت کا راستہ ہے جسے شمالی دروازہ بھی کہا گیا ہے۔ اور تیسرا راستہ سری نگر، راولپنڈی روڈ ہے۔ اوکانگ نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے وہ بنیادی طور قلعوں کی طرف اِشارہ ہے جو حفاظتی چوکیوں کا کام کرتے تھے۔

اوکانگ نے چوتھے راستے کا ذکر بھی کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ یہ راستہ ہمیشہ بند رہتا ہے اور اُسی وقت کھُلا چھوڑا جاتا ہے جب وہاں سے شاہی افواج کا گزر ہو۔ اوکانگ، کارکوٹ دَور میں کشمیر آیا اور ممکن ہے کہ سیاسی وجوہات کی بناء پر یہ راستہ جو اگلے وقتوں میں شاہراہِ نمک اور آج کل مغل روڈ کے نام سے جانا جاتا ہے، بند ہی رہتا ہو۔ اوکانگ کا سفرنامہ کلہن کی راج ترنگنی میں درج مختلف تعمیرات کے تذکرے کی پُشت پناہی کرتا ہے۔

کلہن راجہ جلوک کے متعلق لکھتا ہے کہ اُس نے کرِتی آشرم وہار تعمیر کیا اور وہاں کرتیا کی پوجا کی۔ اوکانگ نے اس وہار کا ذکر ''کہ چے'' نام سے

کیا ہے۔ یہ وہار راجہ میگواہن کی رانی اُمرت پر بھا نے غیر ملکی بھکشوؤں کے لئے تعمیر کیا تھا۔ امرت بھون کی موجودہ صورت اُونتہ بھون ہے جو آج بھی سری نگر کا ایک محلّہ ہے۔ اوکا نگ کا چینی نام دراصل اَمرت بھون نام کی چینی پراکرت صورت کا مبدّل ہے اور اوکا نگ نے اکثر پراکرت ناموں کا چینی مبدّل دیا ہے۔

کلہن لکھتا ہے کہ ہشک پورِں اس نیک راجہ نے مکتہ سوامن مندر اور ایک بڑا وہار ستوپ تعمیر کیا۔ اوکا نگ نے اِس وِہار کا ذکر ''مونگتی وہار'' نام سے کیا ہے۔ یہ وہار راجہ للتا دت نے تعمیر کیا تھا۔ اوکا نگ جب مغربی دروازے سے کشمیر آیا اُس کا سامنا سب سے پہلے اِسی وِہار سے ہوا۔ ''بونگتی'' کہہ کر اوکا نگ نے مکتا پیڈ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اُس نے ژھینگ کپن (سپہ سالار) وہار نام سے اُس ستوپا کا ذکر کیا ہے جو للتا دت کے وزیر چنکن نے تعمیر کیا تھا اور کلہن نے جس کا ذکر چنکن ستوپ نام سے کیا۔ چنکن بذاتی طور چینی تھا اور اُس کا اصل نام ''ژھینگ کیا نگ'' تھا۔

اوکا نگ کے بعد بھی بہت سے چینی یاتری کشمیر آئے لیکن یا تو اُنہوں نے سفر نامے نہیں لکھے یا وہ فی الوقت دستیاب نہیں۔ کشمیر کی تواریخ کے متعلق چینی ماخذوں کا ابھی تک بھر پور جائزہ نہیں لیا گیا ہے جسکی سخت ضرورت ہے۔ یہ محققیّن کا فرض ہے کہ وہ اس کام کو آگے بڑھائیں تا کہ بہت سی باتوں کی گرہ کشائی ہو سکے اور سائنسی بنیادی پر کشمیر کی تواریخ مرتّب کرنے کیلئے راستہ ہموار ہو سکے۔

بودھ ماخذ

بودھ ماخذ کا جائزہ لئے بغیر کشمیر کی قدیم تواریخ جاننے کا دعویٰ کرنا ویسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا سایہ دیکھ کر کوئی اجنبی کہے کہ میں نے اُس شخص کا اندرون اور بیرون جان لیا ہے۔

اَجات شترو سنگھ کے زمانے سے (چوتھی صدی ق-م) چھٹی صدی عیسوی تک کشمیر بدھ مذہب کا مرکز رہا۔ کشمیر میں اُس کے زُوال کے بعد بھی بہت دیر تک یہ اِن مستحکم روایات کو سنبھالے رہا۔ مختلف اَدوار میں بودھ وہار اور ستوپا تعمیر ہوتے رہے اور آخری بودھ وہار کشمیری سلطان محمد شاہ (چودھویں-پندرہویں صدی عیسوی) کے دَوران میں تعمیر ہوا۔ یہ آخری تعمیر اُس وقت بجبہاڑہ میں عمل مین لائی گئی۔

زمانۂ قدیم سے پندرہویں صدی عیسوی تک بودھ وِہاروں کا تعمیر ہونا ثابت کرتا ہے کہ بودھ عقیدت ہزاروں برسوں تک کشمیر میں ایک زندہ حقیقت تھی۔ کشمیر میں تہذیب اور تمدّن کی پرداخت اور اِسے مخصوص مزاج عطا کرنے میں بدُھ دھرم کا حصّہ اُتنا ہی اہم ہے جتنا اہم ہندو دھرم اور اِسلام کا حصہ ہے۔ بدُھ دھرم کی دین کا جائزہ لئے بغیر کشمیری تمدنی سفر کا تجزیہ کرنے کی ہر ایک کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔

بدُھ دھرم کی یہ دین نظر اَنداز نہیں کی جاسکتی کہ اِس کے طفیل کشمیر، برِصغیر کے نہایت قریب ہوگیا اور دوسری طرف وسطِ ایشیاء کشمیریوں کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ تہذیبی اور تمدّنی رِشتوں کی اِس وسعت نے ایک طرف ہمارے تجارت اور کاروبار کو فروغ دیا اور دوسری طرف کشمیر ایک تہذیبی سنگم بن گیا۔ یہاں بہت سی تہذیبی لہریں مل مِلا کر وہ سمندر معرضِ وجود میں آیا جس

میں وسعت بھی ہے اور رنگارنگی بھی مگر مزاج خالص کشمیری ہے اور کشمیریوں نے اِس سنگم پر معرضِ وجود میں آنے والے سمندر کو وہ بوقلمونی عطا کی جس کو دیکھ کر پَرائے پن کا کسی بھی طرح کا کوئی گُماں نہیں گزرتا۔

یہ تہذیبی لین دین کا نتیجہ ہے کہ کشمیر میں مختلف ہنروں اور دستکاریوں کو فروغ حاصل ہوا اور مختلف علاقوں کے اُثرات کے تحت علامتوں اور صورتوں کا ایسا مرّقع سامنے آیا جس کے جائزہ سے .... رنگارنگ نقش ہماری آنکھوں کے سامنے رقصاں ہوتے ہیں۔

اِس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ ۱۹۴۷ء تک کشمیر وسطِ ایشیاء اور برِصغیر کے درمیان اہم پڑا تھا۔ کشمیر پیکنگ (بیجنگ) اور رُوم کے درمیان شاہراہِ ابریشم (Silk Route) کے ساتھ تین اُطراف سے جڑا ہُوا ہے۔ ایک راستہ بارہ مولہ سے گاندھار جاتا تھا اور اِسی راستے سے آگے چل کر شاہراہِ اَبریشم سے ملتا تھا جسے مغربی دَروازہ بھی کہا جاتا تھا، دوسرا راستہ گِلگت سے ہوتا ہوا سنکیانگ سے ملتا تھا۔ تیسرا سندھ کی وادی سے ہو کے لداخ پہنچتا تھا اور وہاں سے شاہراہِ ابریشم سے ملتا تھا۔ یہ تینوں راستے کشمیری بودھ راہب زمانۂ قدیم سے روندتے آئے تھے۔ لداخ کا راستہ فاہیان نے روندا لیکن وہ کشمیر نہیں آیا۔ گاندھار کے راستے سے ساتویں صدی عیسوی میں ہیون سانگ کشمیر آیا۔ ۹۲۰ء میں وسطِ ایشیا کے شمالی راستے سے نایَنگ ۲۵ بھکشوؤں کے سمیت کشمیر آیا۔ اِن راستوں سے کشمیری بودھ پرچارکوں کا وسط ایشیاء، تبت، منگولیا اور چین کے ساتھ آنا جانا رہا اور کوریا تک بھی جا پہنچے۔ کشمیر میں لکھے گئے ہُن یان اور مہایان کے گرنتھ مختلف ممالک میں پہنچائے گئے جہاں وہ چینی

ترجموں کی صورت میں محفوظ رہے۔ آج اِن قدیم گرنتھوں اور پوتھیوں کا سُراغ بھی برِصغیر میں نہیں ملتا، چینی زبان میں اِن گرنتھوں کے ترجمے پڑھ کر ہمیں اَپنے ماضی کے بارے میں کتنے ہی سراغ ملتے ہیں۔ مقامی مورّخوں نے اکثر اُن باتوں کا وضاحت کے ساتھ تذکرہ نہیں کیا ہے جن کا تعلّق بدُھ دھرم سے ہے۔ مسلسل تحقیق کے نتیجے میں جو نئی باتیں سامنے آتی ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ پُرانی تقریباً تمام تواریخیں محض بادشاہوں کے تذکرے ہیں اوران سے روزمرّہ کے حالات و واقعات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ یہ تواریخیں مخصوص نکتہ نظر کے لکھی گئیں ہیں۔ چاہے وہ کلہن ہو یا جونراج۔ سنسکرت تواریخوں کے بعد جو فارسی تواریخیں لکھی گئیں اُنہوں نے پچھلے زمانے کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا اور اَپنے عہدے کے بارے میں تفصیلات فراہم کیں۔ جو بودھ عالم اور مُبلّغ چوتھی صدی، پانچویں صدی اور چھٹی صدی عیسوی میں کشمیر سے چین بُدھ مت کا پرچار کرنے گئے اُن کا شمار انہوں نے کلہم طور بودھ پرَچارکوں کے طور کیا ہے جو برِصغیر کے دوسرے حصوں سے وہاں گئے۔ البتہ کسی بھی کشمیری مورّخ نے اس بات کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔ میرے خیال میں یہ قدم دانستہ طور اُٹھایا گیا ہے، نہیں تو اِن اہم تواریخی سنگ میلوں کو کیسے ہٹایا جاسکتا تھا۔ خود کلہن کے وقت اور اس کے بعد چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں بھی بہت سے بودھ بھکشو اور پرَچارک کشمیر چھوڑ کر لداخ اور تبت گئے۔ نہ کلہن نے ان کا تذکرہ کیا ہے، نہ جو نراج یا شری ور نے اور فارسی مورخوں کی کوئی بات ہی نہیں۔

کشمیر۔ چین اور وسط ایشیاء کے درمیان تعلّقات کا اگرچہ برزہامہ سے

تانا بانا ملتا ہے لیکن یہ تعلقات بودھ دَور، خاص کر مہایان کے زمانے میں زیادہ اُستوار ہوئے اور اسلام کشمیر میں آنے کے بعد اِن کو اور بھی استحکام حاصل ہوا۔ اِس لئے ایسی بہت سی چیزیں جو ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہیں اُن کی باقیات ہمیں وسطِ ایشیاء کے مختلف علاقوں میں ملتی ہیں۔ جن میں تبّت، منگولیا، ختن، کاشغر وغیرہ شامل ہیں۔ گاندھار طرزِ تعمیر کشمیر سے ختن گیا۔ کسی زمانے میں اِسی علاقے میں کشمیریوں کی ایک علیٰحدہ بستی تھی۔ چنانچہ کشمیر کے متعلق بہت سی دلچسپ باتوں کا پتہ ہمیں ہیون سانگ کا سفرنامہ پڑھنے سے ملتا ہے جب کہ مقامی تواریخیں اِس معاملے میں بہت حد تک خاموش ہیں۔

بدھ دھرم نے ہمیں بہت کچھ دیا جس میں شرافتِ نفس اور اَمن پسندی نمایاں ہے۔ ہم نے دوسروں سے بہت کچھ حاصل کیا اور انہیں بھی مالا مال کیا۔ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ۱۹۴۷ء تک کشمیر، وَسطِ ایشیاء اور برِصغیر کے درمیان اہم پڑاو تھا جس وجہ سے مختلف علاقوں کے سوداگر اور بیوپاری یہاں خرید و فروخت کی غرض سے آتے تھے۔

کشمیر کی جو چیزیں اور فنون جو اَب ہمیں یہاں دستیاب نہیں ہوتیں اُن میں تواریخی تفصیلات کے علاوہ سنگتراشی اور مصوری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِن ہنروں کے درخشندہ آثار اَب بھی لداخ، زانسکار، گُمج اور تبت میں موجود ہیں۔ اَلچی، گمج اور سمدو وغیرہ بودھ خانقاہوں میں اَب بھی کشمیر چتر کاری اور دیواری تصاویر کے نِگار خانے ہیں جن میں داخل ہو کے اُپنی مصوّری کا تابناک ماضی ہمارے سامنے آجاتا ہے اور تخیّل کی اُس دنیا میں لے جاتا ہے جس کا اب صرف تصوّر ہی کیا جا سکتا ہے۔ کشمیری مصوّری کے جس منفرد

سکول کا ذکر تارا ناتھ نے کیا ہے اُس سکول کے شاہکار اَب صرف بودھ خانقاہوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہ بودھ دھرم اَب بھی اِن علاقوں میں ایک زندہ عقیدہ ہے۔

بودھ ماخذ اِشارہ دیتے ہیں کہ خود بھگوان بدھ بھی کشمیر آئے تھے اور انہوں نے بشارت دی تھی کہ ایک وقت کشمیر بُدھ دُھرم کا بڑا مرکز بنے گا۔ بھگوان بدھ کی بشارت نے اُس وقت حقیقت کا روپ اختیار کیا جب ہُن یان کے بعد کشمیر مہایان کا زبردست مرکز بن گیا۔ جنوبی بُدھ دھرم میں جو مرتبہ پہلے متھرا کے حصّے میں آیا وہ مرتبہ کشمیر کو مہایان دَور میں مِلا اور کشمیر ایسا مرکزِ نُور بن گیا جس کی کرنیں دُور دُور تک کے علاقوں کو منوّر کرتی رہیں۔ ہُن یان کے زمانے میں بھی کشمیر کسی بھی طرح دوسروں سے پیچھے نہیں تھا جس کی تصدیق مختلف تواریخی دستاویز کرتے ہیں۔

کشمیر اور گاندھار تک بُدھ مت کا پیغام مدھیانتک کے ہاتھوں پہنچا۔ یہ وہی شخص ہے جسے پالی زبان میں مجانتک کہا گیا ہے۔ مدھیانتک کا کشمیر پہنچنے کا حوالہ تاراناتھ نے بہت عرصہ گزر جانے کے بعد سترہویں صدی عیسوی میں دیا ہے۔ اِس سے قبل اُس کے کشمیر آنے کا حوالہ مہاوامش میں ملتا ہے جو سری لنکا کی قومی تواریخ ہے اور جس کے مرتّب کرنے کا وقت چھٹی صدی عیسوی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مہاوامش کی خاص بات یہ ہے کہ اِس میں بدھ دھرم خاص کر ہن یان کے متعلق بعض ایسی باتوں کا ذکر ہے جو دیگر کسی بھی کتاب میں نہیں ملتا۔ مہاوامش، مدھیانتکا کو اُشوک کا ہم عصر گردانتا ہے مگر تاراناتھ، چینی اور تبتی ماخذ اِس کو اُجات شترو سنگھ کا ہم عصر مانتے ہیں، جو کہ

قرین قیاس ہے۔ بلیوانل (Blue Annals) کے مطابق اُپ گپت ، مدھیانتکا کے شاگرد شنکواشکا کا ساتھی تھا جس وجہ سے مہاوامش کا مدھیانتک ، اشوک کا ہم عصر گردانا گراں گزرتا ہے۔ اِس بات کی تارا ناتھ بھی تصدیق کرتا ہے اور دیگر تواریخی ذرائع بھی۔ خیر! بات بھگوان بُدھ کے کشمیر آنے کی چل رہی تھی۔ دوسری صدی قبل مسیح میں لکھے گئے اشوک اَودان کے مطابق بھگوان بدھ پہلے متھرا گئے اور وہاں پیشین گوئی کی کہ وہاں ناٹیہ بٹ وِہار بنے گا اور یہ بھی کہا کہ اُپ گپت کتنا باصفت ہوگا۔ اِس کے بعد وہ کشمیر گیا اور پیش گوئی کی کہ مدھیانتک ، کشمیر میں بُدھ دَھرم کا پرُچار کرے گا۔ اِس کتاب میں متھرا کے سفر کا زیادہ تذکرہ ہے اور کشمیر کے سفر کی مختصر سی تفصیل درج ہے۔ مول سروادستودک کے ''وِنے'' میں متھرا کی تفصیل کم وبیش ''اشوک اودان'' جیسی ہے۔ اِس میں کہا گیا ہے کہ آنند ، بھگوان بُدھ کے ساتھ تھا۔ مگر اِس میں بھی پھیر ہے۔ اشوک اَودان میں اُپ گپت کا گرو متھرا کا شن واس ہے جب کہ وِنے گرنتھوں میں اُپ گپت مدھیانتک کا شاگرد بتلایا گیا ہے۔ اشوک اَودان میں بھگوان بدھ ، کشمیر، متھرا کے راستے سے جاتے ہیں۔ جب کہ وِنے کے مطابق بھگوان بدھ پہلے سندھ کے بالائی حصّے کا دَورہ کرتے ہیں۔

اشوک اوَدیان ہو یا دیوی اودان یا وِنے ، تمام تسلیم کرتے ہیں کہ بھگوان بُدھ اپنی حیات میں کشمیر آئے اور تواریخی اعتبار سے یہ بات بہت ہی اہم ہے۔ اشوک اوَدیان میں درج واقعات قدیم ہونے کی وجہ سے زیادہ بااعتبار ہیں۔ کشمیر کے بودھ عالموں نے کم وبیش وہی باتیں درج کی ہیں جو

اشوک اودان میں درج ہیں۔

بھگوان بدھ کا کشمیر آنا ایک ایسی بات ہے جس کا ذکر کسی بھی مقامی مورّخ نے نہیں کیا ہے اور یہی حال مدھیانتک کے کشمیر آنے کا بھی ہے۔ البتہ ہیون سانگ نے واضح طور مدھیانتک کے کشمیر آنے کا ذکر کیا ہے۔ مہاوامش میں اِس کی تفصیل اِس طرح سے درج ہے:

''موگلی پوت نے مجانتک (مدھیانتک) کو کشمیر اور گاندھار بھیجا۔ اُس وقت کشمیر میں جادوگر ناگ راجہ راول پکی فصلوں پر اولوں کی بارش کر رہا تھا اور بڑی بے دردی سے ہر چیز کو سیلاب کی نذر کر رہا تھا۔ مجانتک اُڑتے اُڑتے تیز رفتاری کے ساتھ وہاں گیا اور وہاں کی جھیلوں پر چل کر اور دیگر ایسی ہی باتوں سے چمتکار دکھائے۔ ناگوں نے جب یہ حال دیکھا انہوں نے ناگ راجہ سے اِس کا خلاصہ کیا۔ ناگ راجہ بڑا غضبناک ہوا۔ اُس نے بادو باراں، بجلیاں اور سیلاب سے پورے علاقے میں تباہی مچادی۔ درختوں اور پہاڑوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ خوفناک رُوپ اختیار کر کے ناگوں نے دیکھنے والوں کو لرزہ بَراندام کر دیا۔ ناگ راجہ خود بھی منہ سے دھواں اور آگ اُگلتا رہا۔ لرزے میں شدّت پیدا کرنے کی خاطر بہت سے طریقے استعمال میں لائے گئے۔

مدھیانتک نے جب یہ ساری چیزیں اُپنے چمتکاروں سے بے کار بنا دیئے اور اپنی طاقت کا اندازہ کرانے کے لئے اُس نے ناگ راجہ سے کہا...... اگر دیوتا سمیت پورا سنسار مجھے ڈرانے کے لئے آئے، میں ٹس سے مس نہیں ہونگا۔ ساری کائنات، پہاڑ اور سمندروں کو اگر تُو مجھ پر اُچھال دے اُس سے بھی میں نہیں ڈروں گا۔ اس سے تم خود برباد ہو جاؤ گے۔ تم...... جو ناگوں کا راجہ ہے۔''

یہ باتیں کہہ کر جب اُس نے ناگ راجہ کا غصہ کچھ کم کیا تب اُسے بُدھ دھرم کی تعلیم دی گئی۔ ناگ راجہ نے اِسے قبول کیا۔ اُس کی طرح چوراسی ہزار ناگوں، بہت سے گاندھاریوں، کھشوں اور کمبادکوں نے ہمالیہ میں بُدھ دَھرم کو گلے لگایا۔ یکھش پنڈت، اُس کی بیوی ہرِتا اور اُس کے پانچ سو بیٹوں نے بُدھ دھرم قبول کرنے کا ثواب حاصل کیا۔

''اس کے آگے دُشمنی ختم ہونی چاہیئے فصلوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے۔ کائنات کی تمام مخلوقات کے ساتھ مِل بیٹھ کر رہنا چاہیئے اور ان میں الفت بانٹنی چاہیئے''

مدھیانتک نے اُن کو یہ اُپدیش دیا جس پر انہوں نے عمل کیا۔ ناگ راجہ نے اُس لعل و جواہر سے جڑے سنگھاسن پر بِٹھایا اور خود سنگھاسن کے قریب کھڑے رہ کر اُس کی اِطاعت برداری میں لگ گیا۔ جو کشمیری اور گاندھاری، ناگ راجے کی پوجا کے لئے آئے تھے انہوں نے تسلیم کیا کہ مدھیانتک چمتکاروں میں ناگ راجے سے بَرتر ہے۔ اُس کو پرنام کرکے وہ اس کے سامنے ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ مدھیانتک نے اُن کو اُپدیش دیا۔ اَسی ہزار لوگوں نے بُدھ دھرم قبول کیا۔ اُس روز سے کشمیر گیروے پوشاکوں سے جگمگانے لگی۔''

اس بات کی گلگت مُسوّدوں سے بھی توثیق ہوتی ہے۔ جو روایت مہاوامش میں درج ہے وہی روایت ہیون سانگ نے بھی اُپنے سفرنامے میں درج کی ہے۔ اور اِسی روایت کا اختصار بلیو-انل (The Blue Anals) میں گُس-یو-ژھا-با-زنّو پال (۱۳۹۲-۱۴۸۱ء) یُوں کرتا ہے۔

''میں یہاں ایک ہندوستانی کتاب کے ایک ورق کا ترجمہ پیش

کرتا ہوں جس میں بُدھ مت کی روایات درج ہیں یہ ورق میرے پاس محفوظ ہے............بھگوان بُدھ کی جے جے کار ہو۔ آریہ مدھیانتک (نما-گُمبا) کشمیر گیا اور اُپنی مافوق الفطرت سے ناگ راجہ کو مطلع کیا۔ وارانسی کے لوگوں کے سامنے اُس نے اُپنی طاقتوں کا مظاہرہ کیا اور بعد میں لوٹ کے کشمیر آیا۔ اپنی فطری طاقتوں اور لوگوں کی بڑی جماعت لے کر وہ گنڈ میدان پہاڑ پر گیا۔ اور وہاں کے لوگوں کو بُدھ مت کی تعلیم دی ۔ وہاں سے اُس نے زعفران (گُرگُم) لایا اور کشمیر میں (بُدھ مت) کا پرچار کیا۔ اُس نے پورے ملک کو شہروں، قصبوں، گاؤں اور شاہی محلات سے سجایا۔ اُس نے سبُوں کو سُکھ دیا اور کشمیری راحت سے رہنے لگے"

مہاوامش اور بلیو-انل میں دَرج حوالے بہت ہی اہم اور قابلِ غور ہیں۔ کلہن کہتا ہے کہ کشمیر کا راجہ لنکا تک پہنچ گیا اور ہم اِسے اسطور کہہ کر اُپنی بھوئیں چڑھا لیتے ہیں اور اِسے رُد کرتے ہیں۔ مہاوامش جو بات کرتا ہے اُس کو رُد کرنے کیلئے کیا دلیل ہوسکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ کشمیر کا دورِ قدیم ہی سے دُور دَراز علاقوں سے رابطہ رہا ہے جس میں مختلف علاقوں کی تواریخ لکھنا ہی ثابت کرتا ہے۔ مہاوامش بھی کلہن کے حوالے کی پشت پناہی کرتا ہے کہ ناگ کشمیر کے بسکین تھے اور اس کے ساتھ دیگر ذاتوں کے لوگ بھی اس وادی میں رہتے تھے اور کشمیر میں سب سے پہلے بُدھ مت قبول کرنے والوں میں یکھش بھی شامل تھے۔ اِتنا ہی نہیں بلکہ یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ کمبوج ، کشمیریوں کی ہمسائیگی میں رہتے تھے، جیسا کہ پورانوں میں درج ہے۔ مہاوامش میں کمبادکوں کا جو تذکرہ ہے، وہ وہی لوگ

ہیں جن کا پورانوں میں کمبوج کہا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات کہ ناگ، گاندھارا اور اس کے گردونواح میں رہتے تھے۔ ناگوں کا آسمانی بجلی پیدا کرنا راج ترنگنی میں بھی درج ہے اور مہاوامش بھی اسکی پشت پناہی کرتا ہے۔

بلیو۔انل کی اِس بات کی ہیون سانگ توثیق کرتا ہے کہ زعفران مدھیانتک کے ہاتھوں کشمیر آیا۔ ساتھ ہی اِس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ بُدھ دھرم مدھیانتک کے وقت ہی ہمالیہ کے گِردونواح میں پہنچا۔ اِس کے بعد یہ حوالہ ملتا ہے کہ مہاراج اشوک نے بودھ پرچارک لداخ بھیجے، جس کی متعدد کتبے شہادت پیش کرتے ہیں۔

کشمیر اور لنکا اور اسکے گِردونواح کے علاقوں سے اِسکے بعد بھی تعلقات تھے اُس کی گواہی دیگر ذرائع بھی دیتے ہیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں گن ورمن کشمیر کا راجہ تھا جس کو راجہ بننے کی دعوت دی گئی لیکن اُس نے راجہ بننے کے بجائے بھکشو بننا قبول کیا۔ وہ کشمیر چھوڑ کر لنکا، جاوا اور سماٹرا گیا اور اِن جگہوں پر بُدھ مت کا پرچار کیا۔ اِس کے بعد مشرقی علاقوں کی طرف گیا اور پہنچتے پہنچتے چین پہنچ گیا جہاں کا شہنشاہ اُسکے استقبال کو آیا۔ یہی گُن ورمن مشرقی جاوا کا طرزِ تعمیر لے کر کشمیر واپس آیا جو اِس وقت بھی ریشی آستانوں کی صورت میں ایک زندہ حقیقت ہے۔

مہاوامش میں شاید جان بُوجھ کر کنشک کے کشمیر میں بودھ کانفرنس کے انعقاد کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ بنیادی طور اِس کتاب کا مقصد ہُن یان کو آگے بڑھانا ہے لیکن اِس کتاب میں ایک اور دلچسپ حوالہ موجود ہے جو کشمیر اور لنکا کے درمیان تعلقات کی مزید پُشت پناہی کرتا ہے...... ''انورادھاپورم میں جس

وقت عظیم ستوپ کا افتتاح کیا گیا اُس وقت کشمیر سے اُتین وہاں آیا جس کے ساتھ اسی ہزار بودھ بھکشو تھے“...... یہ ستوپ دت گمن نے ۱۰۱ء سے ۷۷ء ق-م کے درمیان بنایا۔

اِس بات کے بھی حوالے موجود ہیں کہ چندر گپت موریہ کی فوج میں اُس وقت کشمیری بھی موجود تھے جب اُس نے نندراج پر حملہ کیا اور اُسے میطع کرلیا۔ اشوک، ٹیکسلا کا گورنر تھا اور ٹیکسلا اُس وقت جن پد کا ایک گاؤں تھا جس کا ذکر بعض اوقات گاندھار جن پد نام سے اور بعض اوقات فقط گاندھار جن پد کے نام سے ہُوا ہے۔ یہ جن پد مہاراج اشوک کی سلطنت کا ایک اہم حصہ تھا۔ امور دریا کے کنارے اشوک کا کتبہ اِس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اشوک کی سلطنت کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ اشوک کا اقتدار کشمیر پر بھی تھا۔ اُس کا حوالہ راج ترنگنی اور ہیون سانگ کے علاوہ دیگر حوالوں سے بھی ملتا ہے۔ روایات پر یقین کریں تو اشوک دورِ قدیم کے کشمیر کے علاقے ہی میں سرگباش ہوگیا اور کہتے ہیں کہ اُس نے ٹیکسلا اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ ٹیکسلا، کارکوٹ خاندان کے زمانے تک کشمیر کا حصہ تھا۔ اشوک اودیان میں لکھا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اشوک نے مختلف طبقہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے بھکشوؤں کے درمیان صلح صفائی کی کوششیں کی اور ایک بودھ کانفرنس بُلائی جس میں خصوصیت کے ساتھ اُن بودھ بھکشوؤں کو دعوت دی گئی جو کشمیر میں ”تامس وَن“ میں رہتے تھے۔ ہیون سانگ لکھتا ہے کہ اشوک کے دورِ حکومت میں مگدھ میں ایک منفرد ارہت مہادیو تھا جو نام جاننے کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اُس نے افواہ بازی کو ہوا دی۔ اِسی دوران

بعض بھکشو کشمیر آ گئے اور پہاڑوں اور وادیوں میں آباد ہو گئے۔ اشوک نے جب یہ سُنا تو اُسے سخت تکلیف ہوئی اور انہیں واپس جانے کے لئے آمادہ کر لیا لیکن اُن کے انکار کرنے پر اُن کے لئے پانچ سو وِہار بنائے اور کشمیر کو بودھ سنگت کے سپرد کر دیا۔

اشوک اور کشمیر کے درمیان ڈب-تھیر-سنس-پو کتاب میں درج ہے۔

''اُس وقت ایک عظیم چکرورتی راجہ تھا جس کا نام اشوک تھا۔ اُس کو بھگوان بُدھ کی تعلیمات پر زبردست عقیدت تھی۔ آریہ لیش اُس کا گُرو بن گیا جس کا نام کلیان متر بھی ہے۔ راجہ نے ہر ستوپ کو سونے کے زیورات نذر کئے اور اسکے ساتھ ہی اُسکے پیروکاروں میں بھی۔ اِس سے زیادہ اُس نے بودھی درخت کا احترام کیا۔ وہ عطر سے اِس درخت کو نہلاتا۔ یہ عطر، سونے چاندی اور جواہرات کے برتنوں میں ہوتا تھا۔ پانچ سال تک وہ تین لاکھ بودھ بھکشوؤں کو کھِلاتا پِلاتا رہا۔ پہلی بار اُس نے ارہنون کے سامنے تحکّم اور خوُدو نوش رکھا۔ دُوسری بار اُن کی عزت افزائی کی جو سنگ میں شاملِ ہوئے تھے۔ تیسری بار اُس نے نیکوکار بھکشوؤں کو فی کس تین تین پوشاکیں دیں۔ آہستہ آہستہ اُس نے سنگ کو جواہرات اور ۹۶ سونے کی مہریں دیں۔ اُس نے ایسے ہی تحائف بودھ بھکشوؤں کو بھی دیئے۔

اگر کشمیر اُس کے دائرۂ اقتدار میں نہ ہوتا تو کیسے کشمیر کے بودھ بھکشوؤں کو تحایف دیتا؟ کیوں کہ ایک راجے کا دوسرے کے علاقوں میں سے گزرنا اعلانِ جنگ ہوتا تھا اور ہمارے پاس کوئی حوالہ نہیں کہ اُس زمانے میں اشوک نے اس علاقے میں کسی سے جنگ کی ہو یہ مختلف حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ

کشمیر اُشوک کی سلطنت کا حصہ تھا۔

مشرق سے مغرب جاتے ہوئے بدھ مت نے ایک نئی جہت اختیار کی چنانچہ J.PRZYLUSKI لکھتا ہے۔

"بالآخر کشمیر جاتے ہوئے بُدھ دھرم اپنی وُسعت کا ثبوت دیتا ہے اور ہنستے ہوئے غیر ملکیوں کو گلے لگاتا ہے۔ یہ ایک مقامی فرقے سے بالاتر ہو ایک عالمی مذہب بن جاتا ہے اور ایک تیسرا مکتبہِ فکر جنم لیتا ہے۔"

یہ دراصل اُس بُدھ کانفرنس کی طرف اِشارہ ہے جو کنشک کے وقت کشمیر میں ہوئی۔ حوالہ ہیون سانگ بھی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کانفرنس کشمیر میں ہوئی۔ تاراناتھ کانفرنس کا کنڈل وَن وہار میں ہونے کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن وہ مغالطے میں ہے کہ کانفرنس کشمیر میں ہوئی یا جالندھر میں...... تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ جس جالندھر کا تاراناتھ ذکر کرتا ہے وہ آج کا جالندھر نہیں بلکہ کانگڑا ہے۔ تاراناتھ سے قبل بلیو۔ انل تصدیق کرتا ہے کہ کنشک کے وقت بودھ کانفرنس کشمیر میں ہوئی۔ چنانچہ گسلوڑ ھابا، زنو پال معاملے کی وضاحت کرتے لکھتا ہے۔

"راجہ اشوک کے مرنے کے بعد سُدرشن نے کشمیر میں پھر سے جنم لیا، ماں باپ نے اُس کا نام سمہا رکھا۔ بُدھ مت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ارہت کے مرتبے تک پہنچا۔ اُسی دوران سمہا سے ملنے کے لئے اُتر پتھ کا راجہ کنشک آیا۔ آریہ سمہا نے اُسے بُدھ مت کی تعلیم دی۔ اُپدیش حاصل کرنے کے بعد راجہ اُتر پتھ واپس چلا گیا۔ اسکے بعد راجہ کنشک نے چیتیہ بنوایا اور دَھرم کے لئے بہت سے اچھے کام کئے۔ سمہا نے دَھرم کا اُپدیش بھکشوؤں کو

دیا۔ کشمیر میں کارنکاون وہار میں پانچ سو اَرہت جمع ہوئے اور اَبھے دھرم کا پاٹھ کیا۔ یہ سب کچھ بعد میں راجہ نے کشمیر میں سنگ کے حوالے کیا۔

مصنّف آگے لکھتا ہے کہ یہ میں نے ایک ہندوستانی مسوّدے کے اُس واحد وَرق سے حاصل کیا جس میں بُدھ مت کی گُورو پَرم پَرا درج ہے۔

بلیو-انل کی شہادت ظاہر کرتی ہے کہ چودھویں، پندرہویں صدی تک تیسری بودھ کانفرنس کے کشمیر میں ہونے کے تحریری حوالے موجود تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تاراناتھ جس کو کنڈل وَن وہار کا نام دیتا ہے اس کو بلیو- انل کا مصنف کارنکاوَن وِہار کہتا ہے۔ تاراناتھ کا حوالہ سنسکرت کے قریب ہے، جب کہ بلیو- انل کا حوالہ پالی زبان کا حوالہ لگتا ہے۔

کشمیر میں تیسری بودھ کانفرنس کے ہونے میں واسُو بندو کا ذات نامہ بھی بِلا واسطہ تصدیق کرتا ہے۔ اِس کتاب کا ہندوستانی رُوپ دستیاب نہیں لیکن اس کا چینی ترجمہ دستیاب ہے۔ واسو بندو کے ذات نامے کا ترجمہ چن تی نے چھٹی صدی عیسوی میں کیا ہے۔ ذات نامے میں دَرج واقعات یُوں ہیں۔

''بھگوان بُدھ کے نِروان کے بعد پانچویں صدی میں سرواست وادسکو کا کانیتاینی فرزند حیات تھا۔ وہ اور اُس کے رُوحانی مَراتب بُلند تھے۔ وہ ہندوستانی تھا مگر وہ اِسی دَوران کپن آیا جہاں اُس وقت پانچ سو بودھ ستوپا تھے۔ اُس نے سرواست وادسکو کا اَبھے دَھرم لکھنا شروع کیا جس میں آٹھ گرنتھ ہیں۔ چاروں طرف منادی کرادی گئی کہ جس کسی کو بدُھ کے اَبھے

دھرم کے متعلق کوئی جانکاری ہو وہ اس کا خلاصہ کرے۔ اِس پر لوگوں، دیوتاؤں، یکھشوں، اور سورگ میں رہنے والوں نے اِس حقیقت کا خلاصہ کیا جو اُس کو معلوم تھا۔ چاہے وہ شعر تھا، کہاوت تھی یا محاورہ۔ کانتیایئی پتر نے اِس سے ایک مُسوّدہ تیار کیا جس کے آٹھ اَبواب بنائے گئے جس میں پچاس ہزار اَشعار تھے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے بھاشا لکھنی چاہی تا کہ اَبھے دھرم کی وضاحت کی جا سکے۔ اُس وقت اَشوگھوش ہندوستان میں رہتا تھا۔ وہ یو- دی- ڈو علاقے کا تھا جو شراوستی سلطنت میں تھا۔ اُس کو ویاکرن کے آٹھ حصے، چاروں وید، چھ شاستر اور اَٹھارہ سکولوں کی ترِی پٹکا سمجھ میں آتی تھی۔ کانتیایتی پتر نے اَشوگھوش کو لانے کیلئے قاصد بھیجے تا کہ وہ مجوزہ وبھاشا کی دُرستی کرے۔ اَشوگھوش لگاتار بارہ سال تک اس کام کے ساتھ مگن رہا جو کانتیایتی پتر، اَرہتوں اور بودھ ستوؤں نے اُس کے ذمّے رکھا تھا۔ ساری وبھاشا میں دَس لاکھ اَشعار تھے۔ یہ اَشلوک لکھنے کا بعد کانتیایتی پتر نے پتھر پر کندہ کرایا کہ کوئی بھی شخص جو فلسفہ نہ جانتا ہو اِسے کپن کی سرحدوں سے باہر نہ لے جائے۔ اُس نے یہ بھی خیال رکھا کہ مہایان یا دیگر مکتبۂ فکر کے لوگ اِس میں ردّ و بدل نہ کریں۔ اِس حکمنامے کی راجہ نے تصدیق کی۔ کپن کی سَلطنت کے چاروں اَطراف میں پہاڑ ہیں اور طرف ایک طرف داخل ہونے کے لئے دَروازہ ہے۔"

بعض عالم اور محقّق کپن، کابل کو قرار دیتے ہیں جو کہ حقیقت سے بعید ہے۔ ذات نامہ میں جو محل وقوع کپن کا دیا گیا ہے وہ کشمیر کے محل وقوع سے آج بھی ملتا ہے۔ عبارت میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن کا تذکرہ بلیو- انل میں

بھی آیا ہے۔ ہیون سانگ کے سفر نامے میں اور تارا ناتھ کی تواریخ میں بھی کپن کو کابل قرار دینے والے بھُول جاتے ہیں کہ تیسری بودھ کانفرنس کا کابل میں منعقد ہونے کا ذکر آج تک کہیں بھی سامنے نہیں آیا ہے۔ پُرانے زمانے میں چینی، کشمیر کو ہی ,کپن کہتے تھے۔ اِس کی تصدیق مختلف ذرائع سے ہوتی ہے۔ ملند پنہا پہلی اور دوسری صدی کے درمیان لکھی گئی۔ اِس کے چینی ترجمے میں کشمیر کو کپن کہا گیا ہے۔ بُدھ مت کے متعلق کتابوں کو ترجمہ کاروں نے تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں سنسکرت میں کشمیر کا چینی ترجمہ کپن کیا ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی کپسیا، نگر اور گاندھار علاقے بھی شامل تھے۔

آر-سی مجمدار بھی تسلیم کرتے ہیں کہ چینی چوتھی صدی عیسوی تک کشمیر کو کپن کہتے تھے اور بعد میں اِسے کے-شی-می-لو کہا۔ کشمیر بُودھ علوم اور گیانوں کا سرچشمہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اکثر بودھ گرنتھوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرنے والے کشمیری تھے وہاں دیگر ممالک کے لوگ بُدھ مت کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کشمیر آتے تھے۔ شاردا پیٹھ ہونے کا جو دَرجہ ہندو دَور میں کشمیر کو دیا گیا اُس کی ابتداء بُدھ دَور ہی میں ہوئی تھی۔ کشمیر میں سنسکرت کی نشو ونما میں مہایان کا حصّہ ویسا ہی ہے جیسا ہِندو دَھرم کا ہے۔ مہایان کے اِظہار کی زبان سنسکرت تھی جس وجہ سے بودھ بھکشوؤں نے سنسکرت کی آبیاری کی، ہیون سانگ کشمیر آیا اور دُو سال تک بُدھ دَھرم کا علم حاصل کیا۔

بُنیادی بات یہ ہے کہ ہِندو دَور میں بھی کشمیر میں بُدھ مت کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ حالانکہ مقامی تواریخوں میں اِس کا بہت کم تذکرہ ہے۔ دسویں

صدی عیسوی میں مغربی تبت میں بُدھ مت کو عروج عطا کرنے والا بھکشو رینچن
رنگ پو کشمیر آیا۔ پہلی بار وہ چھ سال کشمیر میں رہا اور دوسری بار سات سال۔
اُس کا ذات نامہ اُسکے ساتھی باج-پال-لیی-شِش نے لکھا جس مین کشمیر کی
تواریخ کے متعلق بہت ہی دلچسپ باتیں درَج ہونے کے علاوہ یہ بھی درج ہے
کہ دسویں صدی (۹۷۵ء) میں بُدھ دھرم بہت سے لوگوں کا عقیدہ تھا۔
رینچن رنگ پو خواب میں دیکھتا ہے کہ اُسے یُوں اُپدیش مِلا ہے۔

"جس طرح جالے مکڑی کو اَپنے ساتھ جوڑے رکھتے ہیں اُسی
طرح اَپنی چھوٹی سی دُنیا میں محصور شخص "مار" کا شکار ہوتا ہے۔ جو بھی
نروان اور آنند کی خواہش کرتا ہے وہ شمالی علاقوں میں کشمیر جاتا ہے اور
مقدس کتابوں کا سمندر تبتی زبان میں منتقل کر لیتا ہے۔ مقدس کتابوں کا
یہ سمندر سیلاب کی طرح مشرق سے مغرب تک پھیلا ہے۔"

اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت کشمیر کو بدھ مت اور بُدھ
علوم کا مرکز ہونے کی وجہ سے کتنی شہرت حاصل تھی جس کا ہمیں صرف غیر ملکی
کتابوں سے پتہ چلتا ہے۔ کشمیر کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے "ذات نامہ" کا
مصنّف لکھتا ہے۔"

"اس کے بعد آدھے دِن کا سفر کر کے وہ کشمیر کی سرحدوں تک
پہنچے اور ایک برہمن گاؤں میں آئے جہاں سات گھرانے رہتے تھے۔
مقامی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے وہ اس گاؤں میں ایک مہینے
تک قیام پذیر رہے۔ اِس کے بعد ایک دِن کا سفر طے کر کے وہ ایک
درخت کے تنے کے قریب پہنچے جہاں ایک یوگنی ایک انسانی ہڈی سے
نگاڑہ بجا رہی تھی۔ یوگنی نے تین بار لامے کے سر کے اوپر سے وہ ہڈی پھیری

اور جنگل میں غائب ہوگئی۔ اسکے بعد جو ہم نے سُنا اُسکے مطابق وہ ایک پہنچی ہوئی یوگنی رتن سدی تھی اور وہ اُس وقت ہم پر مہربان ہوگئی تھی۔ لامے کو افسوس ہوا کہ وہ بروقت اُس یوگنی کو پہچان نہیں سکا۔ آگے چل کر ہمارا سامنا ایک بڑے شیر سے ہُوا اور جنگل سے اِنسان کے چلنے کی آواز آئی۔ جب وہ ایک طرف کو چل دیا تو ہماری جان میں جان آئی۔ چلتے چلتے اُن کو سوداگروں کا ایک کارواں مِلا۔ بھیک مانگتے ہوئے اُن کے پاس کافی چاول جمع ہوگئے ۔ اُس روز ہم سوداگروں کے ساتھ رہے اور دوسرے روز پوچھتے پاچھتے ہم دوپہر تک چلتے رہے اور کال چکتی نامی قصبے میں پہنچے۔ پہلے کشمیریوں نے یہ کہہ کر ہمارا مذاق اُڑایا کہ اِن آدمیوں کی طرف دیکھو، نہ اُن کے چہرے پر داڑھی ہے اور نہ اُن کا جسم پیلا ہے۔ ہم نے اُن سے ٹھہرنے کے لئے جگہ مانگی۔ ایک روز جب ہم بھکشا مانگنے گاؤں میں گئے وہاں ہمارا سامنا ایک بزرگ برہمن سے ہُوا جس نے میرا ہاتھ دیکھا اور کچھ کہنے بِنا مکان میں داخل ہوا اسکے بعد اُس کے مجھے چاندی کا ایک اگربتی دان دیا۔ اُس نے میرا دامن پکڑا اور نیازمندی ظاہر کی۔ کہا کہ تم وہ ہو جس نے بہت سے جنم لئے ہیں اور نیک اعمال کئے ہیں۔ تم کو بہت سی مقدس کتابوں کی جانکاری حاصل ہوگی۔ اس جنم میں تم سے بہت لوگوں کو فائدہ حاصل ہوگا۔ اس برہمن کا نام شردھا کرورمن تھا۔ اس کے بعد میں پنڈت گن مترِ سے ملا جو ایک بڑا عالِم تھا۔ وہ اُس وقت پانچ سو طالبعلموں کو دَرس دے رہا تھا۔ اس نے چاندی کا اگربتی دان جو اُسے بزرگ برہمن نے دیا تھا، اُسی کی نذر کیا۔ اُسے پرنام کرنے کے بعد وہ اُس کا طالب علم بن گیا۔ سات مہینوں میں اُس نے گرائمر اور ترجمہ کاری کا فن سیکھا۔ اُس نے کشمیری عالم دھرم شانت کو بھی پرنام کیا جس

سے اُس نے وجرداتو پڑھااور اسکا ترجمہ کیا۔ اس نے ایسی بہت سی کتابیں
پڑھیں اور ان کا ترجمہ بھی کیا۔"

رینچن رنگپو کے کشمیر کے پہلے سفر کی مختصر سی رُوداد اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ کشمیری دسویں صدیٔ عیسوی میں بھی عام لوگوں کی زبان تھی۔ رُوداد میں جس مقامی بولی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کشمیری کے بغیر اور کوئی زبان نہیں ہوسکتی تھی۔ دوسرا نکتہ یوگنی کے متعلق ہے۔ کشمیر میں یوگنی مت زمانۂ قدیم ہی سے بہت زوردار رہا ہے۔ ہمیں اس کے حوالے راج ترنگنی میں بھی ملتے ہیں اور جونراج نے بھی شہاب الدّین کے سلسلے میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ یوگنی مت بُدھ دَور میں بھی قائم رہا ہے اور اس کا اثر دُور، دُور یعنی لداخ اور تبت میں بھی رہا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر جوناتھن اعتراف کرتے ہیں۔

"تبتی بُدھ مت کی بعض خصوصیات ہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کا پرچار کشمیر سے ہوا جس سے اِس میں شومت اور تنتروں کی آمیزش ہے۔ اس میں بون عقیدے کا اثر بھی ہے۔"

بون عقیدے کا ذکر آیا ہے تو اس سلسلے میں عالموں کا نظریہ جاننا ضروری ہے۔ بی چکرورتی اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"جب راجہ ترنگم مرگیا تو کریا کرم اور راجہ کے شریر کی آخری رسومات کے لئے گلگت اور گج سے بون پولائے گئے"......دوسری جگہ چکرورتی لکھتے ہیں۔"

"اُس کی میت دفن کرنی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مقامی پروہت کریا کرم کے اُن طریقوں سے باخبر نہیں تھے جس وجہ سے انہیں تری بون

سے پروہت لانے پڑے۔ ایک کشمیر سے، دوسرا گلگت سے اور تیسرا گج سے لایا گیا۔"

بھوٹان کا تہذیبی تواریخی یہ حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ کشمیر اگرچہ بون عقیدے کا منبع نہیں تھا مگر بون عقیدہ یہاں بھی مروّج تھا۔ آتش پرست بون پو کا حوالہ بھی شاملِ غور ہے اور یہ حوالہ زردشتی عقیدے کے نزدیک کشمیر کے تعلّق کو ظاہر کرتا ہے۔ کشمیر میں سُوریہ (سورج) مندروں کی تعمیر بھی ایک اعتبار سے زردشتی عقیدے کا اظہار ہے۔

ذات نامے کے بیان پر غور کرکے یہ بات واضح ہو جاتی ہے دَسویں صدی عیسوی میں کشمیر میں دست شناسی کا علم مروّج رہا ہے اور اس کے عالم یہاں وہاں نظر آئے تھے۔ اِس سے اہم بات یہ ہے کہ اُس وقت کشمیر بودھ عالموں اور شاستروں سے بھری پڑی تھی اور نوجوانوں کو بُدھ دھرم کی تعلیم دینے کا باقاعدہ سلسلہ مروّج تھا۔ پہلی بار سات سال کشمیر میں رہنے کے بعد رینچن زنگپو دوسری بار مصوّری کے ماہر اور شردھا کرورمن کے پاس رکھی گئی کتابیں لے جانے کے لئے پھر سے کشمیر آیا۔ اس وقت سے ۱۵ نوجوان اُسکے ساتھ تھے۔ اس وقت اُس نے اولوکتیشور کی کانسے کی مورت بھی بنائی۔

لاما کے دوسرے سفر کی رُو داد کافی اہم ہے۔ دوسری بار وہ دسویں صدی عیسوی میں کشمیر کے عہدِ زرّیں میں کشمیر آیا۔ اُس وقت کشمیر میں مصوّری کی روایت عروج پر تھی اور ساتھ ہی کانسے کی مورتیاں بنانے کی ہنر بھی مرّوج تھی۔ یہ دونوں روایتیں چودھویں صدی عیسوی کے بعد یک لخت ختم ہو گئیں..........!

رینچن زنگپو کے ہاتھوں کشمیر اور مغربی تبت کیا پہنچا اُس کے متعلق فرینکی

لکھتا ہے۔

"میں نے ۱۹۰۶ء میں اَلچی لداخ کا جلدی میں دَورہ کیا۔ پہلے دورے کے دوران مجھے تامپر۔ تانگ زد گمپہ لے جایا گیا جو خاص گمپہ ہے۔ سہ منزلہ عمارت دیکھ کر مجھے گیال رپچ تھونگ خانقاہ یاد آئی جس کا تعمیر کار رینچن زنگپو ہے۔ یہ بھی سہ منزلہ ہے۔ اَلچی میں دوسری منزل، پہلی منزل سے چھوٹی ہے اور تیسری منزل دوسری منزل سے چھوٹی، اس طرح گمپے کی طرزِ تعمیر اہرامی سے زیادہ پگوڑا ہے۔ عمارت کے سامنے پہنچ کر مجھے گماں ہوا کہ میں دَورِ قدیم کے کشمیر میں پہنچ گیا ہوں اور وہاں کے وہار بالکل اِسی طرز کے رہے ہوں گے۔ میں نے لکڑی کا دالان اَلچی کے سوا پورے لداخ میں اور کہیں نہیں دیکھا۔ ساری لکڑی خصوصاً ستونوں پر اُسطوری طرز کی کھدائی کی گئی ہے جو کہ اکثر کشمیر میں نظر آتی ہے۔

دَروازے کے اُوپر گنیش کی خوبصورت دیواری تصویر ہے اور اِسکے دائیں طرف مصوّری کے نمونے تھے۔ تصاویر میں بودھ بھکشوؤں کے چتر ہیں۔ اِن میں خاص بات یہ ہے کہ اِن پر کتبے لکھے گئے ہیں۔ کتبوں کا طرزِ تحریر ۱۹۰۰ء اور ۱۲۰۰ء کے درمیان ہے۔ یہ تصویریں تواریخی اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ میرا اَندازہ ہے کہ واپس آ کر رینچن زنگپو نے تبتی بودھ دُھرم کا رُوپ دیکھا جس پر اُس نے کشمیری ملمع چڑھایا۔"

فرینکی کا اندازہ صحیح ہے جو کشمیری طرزِ تعمیر کشمیریوں کے تخلیقی کرداروں سے مختلف اَثرات کے تحت معرضِ وجود میں آیا وہ نہ صرف کشمیر تک ہی محدود رہا بلکہ اِس طرزِ تعمیر نے ہمالیہ کے علاقے میں دُور دُور تک اَپنے اَثرات مرتّب کئے۔ ایک جانب یہ نیپال پہنچا اور دوسری طرف مغربی تبت اور لہاسہ۔

بودھ ماخذوں کا جائزہ لینے سے کشمیر کی تواریخ کی کتنی ہی گتھیاں سُلجھ سکتی ہیں، ان محدود سطور میں اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ کشمیر کے بودھ عالموں نے جو رول بُدھ مت کو دُور دُور تک پھیلانے میں اَدا کیا ہے اگر اِس پر نظر دوڑائی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور اگر بودھ ماخذ زیرِ نظر رکھ کر کشمیر کی تواریخ کے تاریک گوشے منوّر کرنے کی کوشش کی جائے تو کتنی ہی نئی چیزیں سامنے آئیں گی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے اِردگرد مختلف دستاویز کا جائزہ لینا جاری رہا تو ہماری مقامی تواریخوں میں بعض مقامات پر جو خلا پایا جاتا ہے وہ بہت حد تک پورا ہوگا۔ مثال کے طور پر نیتو گن کا حوالہ......راج ترنگنی میں کہیں بھی ہمیں کارکوٹ خاندان سے پہلے کسی بھی شاہی ورمن خاندان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن تبّتی ماخذ ہمیں واضح طور بتاتے ہیں کہ چوتھی صدی عیسوی میں اِس خاندان کا راج کشمیر پر تھا۔ اِسی طرح تبّتی ماخذ ہمیں بعض اور بھی دلچسپ باتیں بتاتے ہیں جن کا اِعادہ یہاں ممکن نہیں۔ لیکن ایک بات کا میں ذکر کرنا چاہوں گا کہ اس کا تعلق کلہن کے قریبی تواریخی زمانے سے ہے
لیکن اس کا ذکر کسی بھی مقامی تواریخ میں نہیں آیا ہے
اِس وقت جب کہ کشمیر میں بُدھ مت روبہ زوال ہوا بہت سے بودھ بکھشوؤں نے مغربی تبّت جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ زانسکار گئے اور کنک وہار (گمپہ) کی بنیاد ڈالی۔ جب اُنہوں نے اِس پر چتر کاری کی اُن کے کئی رنگ ختم ہونے سے بچ گئے انہوں نے ایک اور گمپہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ فاسگنگ سمد ہے اِس کے بعد انہوں نے اَلچی اور مانگیو گمپہ کی بنیاد ڈالی۔

تبتی تواریخ نے اس حوالے پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرینکی لکھتا ہے۔

''یہ تمام گمپے ہم آسانی سے مغربی تبت کے گمپوں سے علیحٰدہ کر سکتے ہیں۔ دروازے اور ان کی محرابیں کشمیری طرز کی ہیں جن پر چوب کاری کی گئی اور صورتیں دیو مالائی ہیں۔ خاص دروازے کے اُوپر دالان ہوتا تھا۔ بنیادی طور دیواروں پر کوئی چتر کاری نہیں ہوتی تھی۔ وہاں موجود کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ کشمیری بھکشو ۶۰۰ ء سے ۱۰۰۰ ء کے درمیان کشمیر سے چلے گئے ہوں۔

کشمیر سے بودھ بھکشوؤں کا چھٹی صدی اور دسویں صدی کے دوران بھاگنا اِس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے ساتھ کشمیر میں مناسب سلوک نہیں کیا گیا تھا۔ اِسکے باوجود پندرہویں صدی عیسوی تک بُدھ مت کشمیر میں ایک زندہ عقیدہ رہا۔

(کشمیری سے ترجمہ)

Bibliography

1. A.K. Narain: Indo-Greeks
2. Bijnatpuri: India in Classical Greek writings.
3. A.G.Arbary: The Heritage of Iran
4. J.W.Macrindlen: Notes on Arrian's India.
5. Sir Thoms Holdich: The Gates of India .
6. R.N.Soletore: Encyclopedia of Indian Culture.
7. Sardari Lal Shali: Recent Advances in Historical Archaelogy of Kashmir.
8. E.F.Rapson: Oxford History of Kashmir.
9. W.W.Tran: Bactrian Greeks and India
10. Moti Chanden: Trade and Trade Routs in Ancient India
11. Frederic Schiern: The Tradition of Gold digging Ants.
12. J.W.Macrindle: Ptolemy's Geography of India
13. Saifur Rehman Dar: Taxila and Hellenism.
14. Govind Chander: Indo-Greek Jewellery.

*

1. B. Chakravarti:A Cultural History of Bhutan.
2. Dr. Jahannes. Noble: Central Asia, The Connecting link between East and west.
3. Yuan chwang: Su-yu-ki
4. Dr. Nali And Dutt- Budhism in Kashmir.
5. R.C Majamdar-The History and Culture of Indian People.
6.R.C Mujamdar- The Ancient India.

7. Moti Chander-Trade and trade routes of India.
8. F. Przyluski- The Legend of Emperor Asoka in Indian texts.
9. George Roerich-The Blue Annals.
10. A.H. Francke-Antiquities of Indian Tibet.
11. A.H. Farncke-History of Ladakh.
12. O.P. Bhardwaj-Studies in The Historical Geography of Ancient India.
13. Herman Goetz- Studies in the History and Art of Kashmir.
14. Wilhelm Geige- Mahawamasha.
15. Dr. B. Chattaopadhay- The age of Kushans.
16. Bhashm- Date of Kanishka.

☆ M.A.Stein: Kalhana's Rajtarangni.
☆ Sylvin Levi: Notes on Indo-Seythians.
☆ A.L.Basha: Papers on the Date of Kanashaka
☆ R.N.Saletore: Encyclopaedia of Indin culture.
☆ A.K.Narain: Indo-Greeks.
☆ Rev.S.Bael: The age and writings of NAGHARJUNA.

سید رسول پونپر

برف مسکن (Abode of Snow)

انڈریو وِلسن کا سفرنامۂ کشمیر

''شاید ہر کوئی فردِ بشر وادیٔ مینو نظیر کا بہ چشمِ خود نظارہ کرنے کی تمنا کریگا۔ شاید ہی دُنیا کا کوئی اور قطعۂ یا خطۂ ارضی تخیل کی آنکھ کا تارا ہو کر فردوسِ بریں کہلاتا ہوگا۔ میرے دل میں بھی کشمیر دیکھنے کی تمنا کروٹیں لیتی تھی اور مجھے بے حد افسوس تھا کہ میں کشمیر دیکھنے کا شرف حاصل نہ کر سکا۔ میں بلا کسی جھجھک کہہ سکتا ہوں کہ وادیٔ کشمیر اپنے فطری حسنِ فراواں میں ممکنہ شاعرانہ خیال آرائیوں اور حسن آفرینیوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دِل لبھانے والی ہے۔ کشمیر کی وادی نا قابلِ عبور فلک بوس و برف پوش پہاڑوں سے گھری ہے۔ سیاح، لوگ یا ہم باز بالعموم بھارت کے میدانی علاقوں سے ہوتے ہوئے چار دَرّوں سے وادیٔ کشمیر میں داخل ہوتے ہیں لیکن میری یہ عادت رہی ہے کہ میں جہاں کہیں بھی جاتا ہوں دُشوار ترین راستے سے جاتا ہوں اور وادیٔ

کشمیر میں وارد ہونے کیلئے میں نے اَب کی بار بھی وہی غیر معمولی راہ اختیار کی۔یعنی بہت ہی کٹھن اور نادیدہ راہ کیونکہ''[1]

زکارِ بستہ میندیش و دِل شکستہ مدار
کہ آب چشمۂ حیوان درونِ تاریکیست

حافظ

یا بقولِ علامہ اقبال ؎

درعمل کوش ومدہ دامن اُمید زدست
دَولتِ ہست کہ یابی سرِراہے گاہے

حُسنِ فطرت جس رُوپ میں بھی ہو، محوِ جستجو اِنسان کے لئے اِبتلائے مسلسل کے سِوا کچھ بھی نہیں، کیونکہ حُسنِ کائنات کا یہی تیکھا انداز اُسے محوِ سفر رکھ کر رہ نوردئ عشق پہ اُکساتا آیا ہے۔ آندریو ولسن (Andrew wilsow) کا لکھا، برف کا مسکن (The Abode of snow) نام کا ۳۸۰ صفحات پر پھیلا سفرنامہ اِس اَمر کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں وہ نامساعد حالات کا مقابلہ اُپنی جان ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کامرانی و سربلندی سے آگے ہی آگے بڑھتا ہے۔ وہ زندگی کے اِس ناتمام سفر میں دِل کا دامن تھامتے ہوئے بھی عقلِ سلیم کو نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیتا۔[1]

---

[1] دیباچہ

Preface to The Abode of snow (Himalaya) By Andrew wilson: New York-Edition1875:Bibliotheca Himalayica series-I: Vol-12 Patna Bhandar Kathmandu -1979 Edited By: H.K.Kuloy.

اچھا ہے جو دِل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے!

کائنات کے حُسنِ پُراسرار حُسنِ فراواں کو بیان کرنے کیلئے ایک بندۂ ناچیز اور کر ہی کیا جاسکتا ہے اِلٰہی جمال (Celestial beauty) جنّتِ اَرضی (Paradise on earth) جیسی ناتمام و نامکمل تراکیب کا سہارا لئے بغیر اللہ تعالیٰ آسمان وزمین اور کائنات کا نُور ہے۔ اِس سے آگے شعور و اِدراک کی پرواز دَم توڑ دیتی ہے ۔

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

چکبستؔ اِس لئے کیا خوب فرما گئے ہیں کہ ۔

جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نورُ خدا کا
سائے میں شجر کے ہے اَثرِ ظلِّ ہُما کا

اقبالؔ حُسنِ بے پایاں کے سرّی پہلوؤں سے یوں نقاب سرکاتے

یہ مختصر سا جائزہ میں نے آندریو ولسن (Andrew wilson) کی کتاب (The Aodeb or Snow جو اُسکے ہمالیائی خطوں کی سیاحت پر مبنی ہے، سے استفادہ کرکے، ترتیب دیا۔ زیرِ نظر سفرنامہ کی پہلے ۱۸۸۵ء میں اشاعت ہوئی۔ اس کا نیویارک ایڈیشن ۱۸۸۶ء چھپا اور تیسری بار، رتنا پستک بھنڈار، کھٹمنڈو نیپال کی جانب سے ۱۹۷۹ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ سب سے پہلے یہ رپورٹ نیویارک کے بلیک وڈ (Black-wood Magazine) میں ۱۸۷۵ء کو چھپی، جسکے ایڈیٹر کا نام بھی بلیک وڈ (Black wood) ہی تھا اور جسکے نیک مشورے وِلسن کیلئے مشعل راہ رہے جس کے لئے وہ اس کا بے حد ممنون تھا۔
(پوپنرؔ)

ہوئے ہمیں نہ صرف دعوتِ نظارہ بلکہ دعوتِ عرفان و آگہی بھی دیتے ہیں ۔

کوہ و دریا و غروب آفتاب
من خدا را دیدم آنجا بے حجاب!

وادیٔ کشمیر اس لئے صدیوں سے خودنگری اور خود آگہی کے ساتھ ساتھ خدا آگہی اور حقیقت مطلق کو پالینے کا محو و مرکز رہی ہے۔

کشمیر شومت (Kashmir Shivsam) کا منفرد مکتبۂ فکر، بُدھ مت پر مبنی اعلیٰ انسانی برادری کا تصوّر اور امن وشانتی کا پیغام ہمیں سے دُور دُور تک پہنچا۔ دینِ اسلام کا آفاقی اور عملی پیغام ہمیں، سماجی اور معاشرتی سر بلندی و سرفرازی سے ہمکنار کرنے میں یہیں پہ نُورِ الٰہی بن کر برسا اور ہماری زندگی کی کایا پلٹ کرر کھ دی۔ نہ کوئی تلوار کھنکی اور نا ہی کوئی زورِ بازو کام آیا جسکی بنا پر وادیٔ کشمیر کو اعلیٰ اقدار پر مبنی ریشیت کا گہوارہ قرار دیا گیا ہے اور شاید اس لئے ہم عصر شاعر طغریٰ مشہدی کے مطابق شہنشاہ جہانگیر نے کشمیر میں ہی جانِ آفرین کو اپنی جان سپرد کرنے اور یہیں کی خاک میں آسودگی پانے کی تمنا کی تھی۔

از شاہِ جہانگیر دم نزع چو جستند
با حسرت دل گفت کہ ''کشمیر'' گرد ہیچ!

اور حُسنِ فطرت کے رُموز کو گرفت میں لانے کیلئے اندریو وِلسن نے فطرت کی نیرنگیوں کے شیدائی شاعر ورڈس ورتھ (Words worth) کی شعری کاوشوں کا بھرپور برمحل اور جی بھر کر استعمال کیا ہے۔ فلک بوس و برف پوش بلندیوں کی جانب اُڑان بھرتے ہوئے آندریو ولسن حُسنِ فطرت کو ہر رنگ میں قوت آزما بھی پاتا ہے اور حوصلہ شکن بھی۔ لیکن وہ کسی بھی

صورت میں پست ہمتی کی آغوش میں نہیں چلا جاتا بلکہ اُس کی بے پناہ وسعتوں میں کھو کر جینے کے سلیقہ کو مشعل راہ بناتا ہے۔

Know'st thou the land where towering cedars rise in graceful magesty to cloudless skies. Where keenest winds from icy summits blow across the deserts of eternal snow? knwo'st thou it not.

oh there! oh there!

My wearied spirit let us flee from care know'st thou the teut, its' cone of snowy drill pitched on the grcensword by the snowfed rill where the white peaks than the marble rise around Andky plough shares pierce the flower-clad ground know'st thou it well?

oh there! oh there!

Scale cliffs and granite avalaucnes dare! know'st thou the land where man scarce knows decy so high the realms of everlasting day; where gleam the splendours of unsullied truth where durga smiles and blooms eternal know'st thou it now? youth?

oh there! oh there!.

To breathe the sweetness of that heavenly (Magnon's song in" Wilhelm Miester)

مسوری ہو یا شملہ، جمنوتری ہو یا گنگوتری، لاہول سپتی ہو یا چینی تبت،

تاتارِ چین ہو یا زانسکار، کرگل ہو یا دَراس، زوجیلا ہو یا بالتل، سونہ مرگ اور پھر وادیٔ کشمیر، اندریو دِلسن، جغرافیائی، ماحولیاتی، معاشی، سیاسی اور معاشرتی جزئیات کی طرف ضرور دھیان دیتے ہیں۔ اندریو وِلسن، برف مسکن، کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اُن کا اِرادہ بس مسّوری اور شملہ کی سیّاحی کا تھا لیکن گنگوتری اور جمنوتری کے سحر آفرین ہمالیائی حُسن و جمال کا جادُو میرے سر چڑھ کے بولا اور میں اَپنے قدم واپس نہ موڑ سکا۔ حالانکہ بَرفیلے ہمالیائی دشتوں کی سیّاحی خطروں سے خالی نہیں تھی، جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ نادیدہ رشتوں کی سیّاحی میرا محبوب شغل ہے۔" اُسے اِس اَمر کی پوری آ گاہی تھی کہ عرب سیاحوں نے ہمالیائی سلسلۂ کوہ اِسکی پُر وحشت و پر تمکنت بر فیلی وادیوں اور گھاٹیوں کو زمین کا سنگین کمر بند (Stony girdle of earth) اور موت کا سایہ (Shadow of death) بھی قرار دیا ہے جس کی تصدیق دوَرانِ سفر اُسے بار بار بچشمِ خود کرنا پڑا اور یہ اُس کا عزم صمیم ہی تھا جو اُسے یہ کٹھن مہم جوئی کا سفر جاری رکھنے کا حوصلہ دیتا رہا۔ کتاب کے مطالعہ سے آندریو وِلسن کے بلند حوصلے، خلوصِ نیّت اور مشفقانہ رَویئے کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ وہ اکثر مقامات پر اَپنے پیشروؤں کے تاثرات اور انکی آراء سے اختلاف کرتے ہوئے اَپنی آزادانہ اور منفرد آراء کا بَرملا اظہار کرتا ہے، شعر و اَدب سے بھی اُس کا شغف نمایاں ہے کیونکہ وہ جا بجا اور بر محل انگریزی اشعار کا اکثر حوالہ دیتا ہے۔ اُس کا اندازہ اِسی مضمون میں درج کی گئی نظم کے اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے جن کا اُردو ترجمہ راقم الحروف وقت کی کمی کی وجہ سے نذرِ قارئین نہیں کر سکتا، جس کے لئے معذرت چاہے بغیر اور کوئی چارہ

نہیں۔ آندریو وِلسن کی زندگی اور اُس کے کارناموں کے بارے میں کہیں کوئی ہلکا اِشارہ بھی نہیں ملتا جو ترتیبیات کے آداب کے برعکس روّیہ ہے جسے رَوا نہیں رکھا جانا چاہیئے تھا۔ اَپنے دیباچہ میں اُس نے صرف اِتنا لکھا ہے کہ اُس نے اَدب وثقافت پر سینکڑوں مضامین لکھے۔ کتاب یا سفرنامے کی مشمولات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تاجِ برطانیہ کا ایک معتبر و مخلص اعلیٰ آفیسر تھا جس کا اَپنا بیدار ضمیر بھی تھا جس کی بناء پر وہ معاہدہ اُمرتسر ۱۸۴۶ء کو بہت ہی سستا اور گھٹیا سودا گردانتا ہے حالانکہ ۱۸۵۷ء میں غدرِ ہند کے موقعہ پر مہاراجہ نے اُن کی حتی المقدور فوجی اور مالی اعانت کی تھی جسکے لئے وہ اس وقت کے تاج برطانیہ کی پتلی مالی حالت ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

آندریو ولسن کی نظریں، جہاں بھی وہ گیا، فطرت کی نیرنگیوں، بلندیوں اور رفعتوں کی طرف ہی اُٹھتی رہیں۔ دریاؤں کی بات جہاں بھی چلی تو مواخذ کی تفصیل ضرور آئی۔ چاہے گنگا، جمنا ہو یا چندر بھاگا۔ نیپال کا ذکر آیا تو یہ کہے بِنا نہیں رہے کہ یورپی نژاد لوگوں کا بھوٹان اور نیپال میں داخلہ ممنوع ہے کانگڑہ کے بارے میں اُسی طرح لہاسا میں بھی یورپی باشندوں کو داخلے سے روکا جاتا ہے۔ تعددِ ازدواج، کا ذکر کیا تو معاشی، معاشرتی اور جغرافیائی اسباب کا جائزہ لیا۔ کانگڑہ کے بارے میں آندریو ولسن کا تاثر یہی ہے کہ یہ ضلع ہندوستان کا خوبصورت ترین ضلع ہے۔ ترائی جس کے لفظی معنی تر یا نمی والی زمین کے ہیں کو موت کا قطعہ (خطہ) قرار دیا جاتا ہے۔ اِسی طرح پامیر کو دنیا کی چھت کہا جاتا ہے۔ زانسکار سے گزرے تو دیگر تفاصیل کے ساتھ اس کے موسم کی بھی بات چھیڑی جو جنوری میں سرد ترین اور جولائی کے مہینے میں گرم

ترین ہوا کرتا ہے۔ کارل ہگل کے بیان کے مطابق ۱۸۳۵ء میں چند گھنٹوں کے وقفے کے سِوا، یہاں ۸۵ (پچاسی) دن بارش ہوتی رہی۔ آندر یو ولسن کا مشاہدہ ہے کہ سیاہ عینک سے آنکھیں نہ صرف برفیلے چکا چوند سے بچتی ہیں بلکہ ریچھ بھی ان سے خوفزدہ ہوتے ہیں جس سے بچاؤ کی ایک اچھی صورت پیدا ہوتی ہے۔ دراس میں ایک دشوار گزار گھاٹی سے گزرتے ہوئے اس کے بیگار مزدوروں اور خادموں کا کاروان گھوڑوں کی دُم پکڑ کر منزل طے کرتا رہا، کیونکہ وہاں پر گھوڑوں پر سوار ہونے کے بجائے وہی انوکھی ترکیب کام آئی۔ یہاں اِس بات کا اعادہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ آندر یو ولسن اور اُس کا کارواں ہر درّہ دِن کو نہیں رات کو عبور کرتا تھا کیونکہ رات کو بَرف جم جاتی تھی اور اس پر سے چلنا آسان ہوتا تھا اور بیس فٹ سے زائد اُونچی بَرف پر چلنا جان کی بازی لگا کر ہی ممکن تھا۔ دَورانِ سفر ایسے مراحل آئے کہ ساتھی مزدور راہِ فراد اختیار کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگے لیکن اندر یو وِلسن تدّبر و حکمت سے اَیسے مواقع ٹالتا رہا۔ ورنہ چھ ماہ کی یہ کٹھن، صبر آزما اور رُوح فرسا مسافت تحمّل و جوانمردی سے طے کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ دراس کو "ہِم باب" (Himbab) یعنی بَرف کا ماخذ کہا جاتا ہے اور یہ خطہ اُپنے جغرافیائی محل وقوع کے حوالے سے دُنیا کی دُوسری سرد ترین جگہ ہے، پہلا سَرد ترین مقام سائبریا کو مانا جاتا ہے۔ آندر یو ولسن کی چھ ماہ کی لمبی سیاحت و مسافت کی معنویت اہمیت کو سمجھنے میں اُس کے مندرجہ ذیل مسافتی تفاصیل سے خاصی مدد مل سکتی ہے۔ جگہوں کے نام وہ پڑاؤ ہیں جہاں اُس نے اُپنے بیگار مزدوروں اور خادموں کے ساتھ راتیں کاٹی ہیں۔

مقام	صوبہ	بلندی	تاریخ
شملہ	اقتدار برطانیہ	70,84فٹ	۲/جون۱۸۷۳ء
فاگو	کیونتل	7000	۳/جون //
تھیوگ	تھیوگ	7000	۴/جون //
مٹسیانا	کمارسین	7000	۵/جون //
نرکنڈا	//	9000	۶/جون //
کوٹ گڈھ	کوٹ گڈھ	6700	۷-۱۱/جون//
نیرتھ	کنوریابُساہر	3000	۱۲/جون //
رامپور	کناوریابُساہر	3000	۱۳/جون //
گورا	کُناور	6023	۱۴/جون //
سیراہن	//	7115	۱۵/جون //
تارندا	//	7000	۱۷/جون //
پونڈا	//	6000	۱۸/جون//
نچار	//	7000	۲۰/جون //
اُورنی	//	9000	۲۱جون //
روگی	//	9000	۲۲/جون //
پنگے	//	9096	۲۳-۲۷/جون۱۸۷۳ء
رارنگ	//	9000	۲۸/جون//
جانگی	//	9000	۲۹/جون //
لپّے	//	9000	۳۰/جون//

شکنام	//	9020	یکم جولائی //
شاسو	کناور	9000	۲-۳ جولائی
پُو	//	10,000	۴/جولائی
ڈوبلنگ	//	10,000	۵/اگست
کھلب	//	10,500	۶/اگست
نمکیہ فیلڈز	//	13000	۷/اگست
شپکی	چینی تبت	10,027	۸-۹ اگست
شپکی فیلڈز	//	13000	۱۰/اگست
نمکیہ فیلڈز	کناور	13000	۱۱/اگست
لیو پور گیل کمپ	ہنگ رنگ	13000	۱۲/اگست
ناکو	//	11975	۱۳-۱۴/اگست
چانگو	//	10215	۱۵/اگست
ٹو-زو-کمپ	تبت	11000	۱۶/اگست
لادی	سپتی	11600	۱۷/اگست
پوئے	//	12000	۱۸/اگست ۱۸۷۳ء
ڈنکر	//	12774	۱۹-۲۰/اگست
کازیہہ	//	12800	۲۱/اگست
مورنگ	//	13000	۲۲/اگست
کیوترو	//	13000	۲۳/اگست
لوسر	//	13395	۲۴/اگست

چندرا کمپ (۱)	//	13500	۲۵راگست
چندرا کمپ (۲)	لاہول	12500	۲۶راگست
چندرا کمپ (۳)	//	12000	۲۷راگست
چندرا کمپ (۴)	//	11500	۲۸راگست
کوکسر	//	10261	۲۹راگست
یُسو	//	9938	۳۰راگست
گاندلا	//	10314	۳۱راگست
کیلنگ	//	10300	۱-۳رستمبر
گوہ مہر	//	10600	۴رستمبر
درچا	//	10844	۵رستمبر
شدکال پی کمپ (۱)	//	12000	۶-۷رستمبر
شدکال پی کمپ (۲)	//	15000	۸رستمبر
شدکال پی کمپ (۳)	زانسکار	15500	۹رستمبر
کھرجک	//	13670	۱۰رستمبر
تھیسر	//	13000	۱۱رستمبر۱۸۷۳ء
مُسلے پائین کمپ	//	12000	۱۲رستمبر
مُنّے	//	12500	۱۳رستمبر
پدَم	//	11873	۱۴رستمبر
سینی گمپا	//	12000	۱۵رستمبر
پھے	//	12500	۱۶-۱۷رستمبر

پینسی پاس کمپ (۱)	//	13000	۱۸ر ستمبر
پینسی پاس کمپ (۲)	سُورُو	13000	۱۹ر ستمبر
رنگ ڈوم	//	12500	۲۰ر ستمبر
گُل مٹونگو	//	12000	۲۱ ستمبر
پرکنٹرے	//	12000	۲۲ر ستمبر
سُورُو	//	10624	۲۳ر ستمبر
سانکو	//	10,000	۲۴ر ستمبر
دراس کے چھوٹی متصل بستی	دراس	10'500	۲۵ر ستمبر
دراس	//	10144	۲۶ر ستمبر
مٹان	//	10500	۲۷ر ستمبر
بالتل	کشمیر	9500	۲۸ر ستمبر
سونہ مرگ	//	8700	۲۹ر ستمبر
گونڈ	//	7700	۳۰ر ستمبر
کنگن	//	7000	یکم اکتوبر ۱۸۷۳ء
گاندربل	//	6500	۲ر اکتوبر
سرینگر	//	5235	۳-۱۲ر اکتوبر
اونتی پورہ	//	5400	۱۳ر اکتوبر
بجبہاڑہ	//	5500	۱۴ر اکتوبر
بھون	//	5896	۱۵ر اکتوبر

اچھبل	//	5900	۱۶/اکتوبر
ویرناگ	//	6000	۱۷/اکتوبر
روزلو	//	65000	۱۸/اکتوبر
بذریعہ جہلم (وِتھ)	//	5400	۱۹/اکتوبر
سرینگر	//	5235	۲۰-۲۱/اکتوبر
بذریعہ جہلم (وِتھ)	//	5200	۲۲/اکتوبر
وُلر جھیل	//	5187	۲۳/اکتوبر
بارہمولہ	//	ان مقامات کی سطح سمندر سے بلندی بتدریج کم ہوتی ہوئی دیکھی گئی	۲۴-۲۵/اکتوبر
اُورن بواہ	//		۲۶/اکتوبر
اُوڑی	//		۲۷/اکتوبر
چکوٹی	//		۲۸/اکتوبر
وہٹی	//		۲۹/اکتوبر
گھرو	//		۳۰/اکتوبر
تنالی	//		۳۱/اکتوبر-یکم نومبر
مظفرآباد	//	2470	۲/نومبر ۱۸۷۳ء
گھڑی ہبلی	ہزارہ	4500	۳/نومبر
من سیرا	//	4200	۴/نومبر
ایبٹ آباد	ہزارہ	4166	۵-۱۱/نومبر
ہری پور	//	3000	۱۲-۱۳/نومبر
تربیلا	//	2500	۱۴/نومبر

پُہر	یُوسف زئی	2600	۱۵رنومبر
سوابی	//	2000	۱۷رنومبر
شاباشی گھڑی	//	15000	۱۸رنومبر
ہٹی مَردان	//	12000	۱۹رنومبر

اس سیاحتی پروگرام کے مطابق آندریو وِلسن ۲۷ ستمبر ۱۸۷۳ء کو لداخ کے راستہ سے واردِ کشمیر ہوا۔ بال تل سونہ مرگ ہوتے ہوئے چھ پڑاو کا یہ سفر طے کر کے ۳راکتوبر ۱۸۷۳ء کو سرینگر پہنچا اور ۲ نومبر ۱۸۷۳ء کو بارہمولہ کے راستے سے مظفرآباد پہنچا، جہاں سے وہ افغان سرحد پار کر کے واپس لوٹا۔ وادیٔ کشمیر کی دُو جھیلوں کا ذکر وہ "افغان سرحد" کے آخری باب کے ساتھ جوڑتے ہوئے لکھتا ہے کہ :-

"کشمیر سے رخصت ہوتے ہوئے، اس کی دُو مشہور جھیلوں مانسبل اور وُلر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ یہ جھلیں کشمیر بارہمولہ سے چھوڑتے ہوئے، بعد میں اور آتے ہوئے، پہلے ہی آتی ہیں۔ سبھی مہم جُو سیاح، انہیں دیکھنے یہاں ضرور پہنچ جاتے ہیں۔"

سب سے خوبصورت، مناظر قدرت سے آراستہ مانسبل جھیل ہے۔ یہ جنوب مغرب میں دَریائے جہلم (وِبتھ) کے قریب ہی واقع ہے اور کشتی رانی کے لئے ایک میل لمبی نہر سے اِس سے جُڑی ہوئی ہے۔ اِس کے کنارے پُرسکون اور تنہائی سے لبریز ہیں، دیدۂ بینا کے منتظر۔ اِنگلستان کی گراسمیر (Grasmere) جھیل سے مقابلہ کرتے ہوئے اُس کا کہنا ہے کہ یہ خوبصورت اور دلکش جھیل اُس سے بڑی نہیں لیکن اس وادیٔ گلپوش کے جھیل

معمولاً خاموش ہیں۔ اِسکے گرد گرد فلک بوس پہاڑوں کی برف سے اَدھ ڈھکی چوٹیاں ہیں جن کی چکا چُوند بر فیلی روشنی سے آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں اور آسماں کا رنگ بھی ٹھنڈا گہرا نیلا ہے۔ میں ورڈ سورتھ سے معذرت کے ساتھ یہی عرض کر سکتا ہوں ۔

"Ever pure and mirror bright and even life admist the immortals glides away; Moons are waning, generations changing, their celestial life blooms everlasting, changeless mid a ruined worlds decay."

"The visible scene

May enter unawares into the mind with all its soluiun imagery its woods, its snow and that divinest heaven recived into bosom of the placid lake."

وہ یہاں کے بے مثال فطری مناظر کے پیشِ نظر وادیٔ کشمیر ''ابدی، غیر مبدّل اور مقدس زندگی'' کا مکمل سحر آفرین پیکر مانتے ہیں، مولانا رومیؔ تبھی بجا طور فرما گئے ہیں ۔

یک نگاہِ اوگشاید صد گرہ
خیز و تیرش رابدل راہے بدہ

بارہ میل لمبی اور دس میل چوڑی سب سے بڑی جھیل کا وہ جنیوا کی لیمان جھیل (Lake Leman) سے مقابلہ کرتے ہوئے، اِسکی بے مثال دِلکشی کا معترف ہے، اسکی اوسط گہرائی بارہ فٹ سے اور اِس بات کا قوی امکان ہے

کہ اِس کی گہرائی کنارے سکڑنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جائیگی۔ وہ جھیلِ ڈل اور جھیلِ وُلر کا ذکر کرتے ہوئے سنگھاڑوں اور نَدرُو کی پیداوار کو نہیں بھولتے۔ سنگھاڑے شمالی کشمیر کی بالخصوص خاصی جنس مانی جاتی تھی اور ایک غذا کے طور استعمال ہوتی تھی۔ اِس بات کا اعادہ کرنا یہاں دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ یارقند کے فرمانرَوا کا ایک ایلچی استنبول(Contantionple) سے[1] واپسی پر انہی دِنوں دراس آنے والا تھا کیونکہ اُس کے استقبال کے لئے ساری تیاریاں مکمل کرلی گئی تھیں۔ سارے راستے پر کشمیری بیگار مزدور لگادیئے گئے تھے تا کہ خریدی ہوئی یورپی اشیاء لیہہ لداخ پہنچادی جائیں۔

گاندربل پہنچ کر آرندر یو وِلسن نے ایک تناوَر چنار کے نیچے خیمہ گاڑ دیئے۔ رات کو موسلا دھار بارش ہوئی اور تیز ہوائیں بھی چلیں۔ فطرت نے اِن دونوں کرمفرماؤں کی گستاخیوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے اِن کو مہمانوں کی طرح بچائے رکھا۔

سادگی و پُرکاری بے خودی وہشیاری
حُسن کو ہر رنگ میں قوّت آزما پایا

سرینگر، کشمیر، جہاں اُس نے پندرہ دن قیام کیا، وہ تاجِ برطانیہ کے ریذیڈنٹ لے پوئیر وینے (lepoer wynne) کے خاص مہمان تھے جس کی وجہ سے سرینگر کے اِردگرد سیاحتی مقامات کی سیاحت آسان سے آسان تر ہوئی۔ اِس طرح اُسے کشمیر کے سیاسی حالات سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ زیادہ تر اِس کی یعنی کشمیر کی ماحولیاتی اور جغرافیائی

---

[1] تُرکی کے پرانے دارالخلافہ "قسطنطنیہ" کا قدیم نام جو اصل میں "اسلامبول" تھا

خصائص کی نقاب کُشائی کرتے ہیں۔ وہ نشاط، شالیمار، دیکھ کر مغل بادشاہوں کی جمال پرستی اور کشمیر کی حُسن فطرت کی نیرنگیوں کی جی بھر کر داد دیتے ہیں۔ وہ اسلام آباد (اننت ناگ)، اُچھ وَل، مارتنڈ اور ویرناگ بھی جاتے ہیں۔ یہاں کے تا اَبد اُبلتے چشموں مرغزاروں، سرو صنوبر، چناروں اور بلندیوں سے چھُوتے سفیدے کے درختوں، پھولوں اور پھلوں کو دیکھ کر حیرتی آئینہ ہو جاتے ہیں ؎

مُنہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

آندر یو ولسن نے کشمیر کے اُس وقت کے مہاراجہ رنبیر سنگھ سے مل کر اَپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ دُنیا کے خوبصورت ترین ممالک جن کی سیاحت کا شرف اُسے حاصل ہوا ہے، برطانیہ، اٹلی، جاپان اور کشمیر ہیں۔ ہندوستان کے تپتے ریگزاروں، تبت کی بنجر بے آب گیاہ زمینوں، بے انت وحشت زَدہ ہمالیائی پہاڑوں اور افغانستان کے مقابلہ میں وادیٔ کشمیر اَپنی فطری خوبصورتی سے اِتنی آراستہ ہے کہ دیدۂ بینا دنگ رَہ جاتی ہے۔ کشمیر ایک فطری بیضوی تھیٹر کی حیثیت سے دُنیا میں منفرد ہے اور اِس کے فلک بوس پہاڑ اِس کی محفوظ گیلریاں ہیں۔ وادیٔ سندھ کے ساتھ وِتھ (جہلم) کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ وادیٔ کشمیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ یہ اس کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور یہ دَریا اُس کے بیچوں بیچ بہتے ہوئے اس کی شناخت کا رُوپ دَھار چکا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ یورپ کا کوئی ملک ایسا نہیں جس کے بیچوں بیچ اس طرح خوبصورتی سے دریا بہتا ہو۔ آندر یو ولسن کا تاثر یہ بھی ہے لفٹنٹ تھورپ، ڈاکٹر المزنی اور ہیوارڈ (Lieutenant

Thorpe, Dr. Elmslie and Mr. Hayward) سرینگر مشکوک حالات میں وفات پا گئے کیونکہ تینوں کشمیر میں اِنتظامی بَدنظمی اور بَدانِتظامی کے بَرملا شاکی تھے۔ اُسکے کچھ یورپ نثراد پیش رَوسیاح کشمیری خواتین کے حُسن وجمال کے معترف نہ تھے۔ اُن کی رائے میں کشمیری عورتوں کی حسین وجمیل آنکھوں کی تعریف مشرق تک محدود ہے۔ آندریو ولسن کی اِس کے برعکس یہ رائے ہے کہ فلاکت زدگی اور مفلسی ومعاشی اور سیاسی اَبتری کی وجہ سے نسائی حُسن وجمال کونِکھرنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا اور یہ کہ وہ نِکھرنے سے پہلے ہی اِنسانی ہوس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ فاہیان بھی کشمیری خواتین کے بارے میں اَچھی رائے نہیں رکھتا ہے۔ آندریو ولسن کے مطابق وادیٔ کشمیر کے لوگوں کی مالی معاشرتی اور سیاسی بدَحالی کی اصل وجہ صدیوں کی غلامی ہے جس سے اُن کی فطری ذکاوت وذہانت پنپ نہ سکی ورنہ۔

نہ ہو نومید اے اقبالؔ اُپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

وِلسن کے بیان کے مطابق جہاں مہاراجہ کے سپاہی عام لوگوں کو زدوکوب کرنا اُپنا حق سمجھتے تھے وہاں اُن کے ساتھ بے گار مزدور بھی میری نظر سے بچتے ہوئے اَپنے ساتھیوں سے اُس سے بُرابر تاؤ کرتے تھے۔ کوئی بھی برطانوی باشندہ چھوٹا یا بڑا، مہاراجہ کے حکم کے مطابق زمین کا ایک ٹکرا خرید نہیں سکتا اور نا ہی اُسے یہاں مستقل رہائش اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ حالانکہ وہ برطانوی اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرتا ہے پھر بھی ہر یورپی سیاح کے لئے شہر سرینگر سے باہر مفت رہائش فراہم کی جاتی تھی۔ کوئی برطانوی آفیسر مہاراجہ کی رعایا

میں سے کسی بھی آدمی کو بلا اِجازت کام پہ نہیں لگا سکتا تھا اور نا ہی ساتھ لے سکتا تھا۔ تحفے اور نذرانے وغیرہ قبول کرنا بھی اُن کے لئے ممنوع تھے۔ آندر یو ولسن ایک انوکھے واقعہ کا ذکر کرتا ہے جس میں ایک کشمیری خاتون کو ٹوکری میں بھر کر چوری چھپے اشیائے ضروریہ کی صورت ساتھ لیا جا رہا تھا لیکن مہاراجہ کارندوں نے ایسا ہونے نہیں دیا۔

مسئلہ آواگون Transmigration of soul کا ذکر کرتے ہوئے آندر یو وِلسن کا کہنا ہے کہ برہمنوں اور پروہتوں نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دِل میں یہ بات بِٹھا دی کہ اُس کے باپ مہاراجہ گلاب سنگھ کی آتما مچھلی کے رُوپ میں آئی ہے تو اُس نے مچھلی پکڑنے اور اُس کے کھانے پر پابندی عائد کر دی۔ یہ خبر اُن دنوں قومی اخبارات میں بھی آئی۔ بعد میں یہ پابندی اُٹھا بھی دی گئی، یہ جاننے پر کہ اَب اُن کے باپ کی آتما کوئی دُوسرا رُوپ اختیار کر چکی ہے۔

آندر یو وِلسن کا کہنا ہے کہ مہاراجہ کے عہد حکومت میں ریشم صنعت کے فروغ کیلئے بہت کوششیں کی گئیں اور پہلی بار برہمن ذات کے بچوں کو بھی ریشم سازی کی صنعت میں کام پہ لگا دیا گیا۔ اُس وقت کے بنگال نژاد چیف جسٹس جو محکمہ ابریشم کے سربراہ بھی تھے، نے بھی اِس ضمن میں بڑا اہم رول اَدا کیا حالانکہ کشمیری کاریگر اور مزدور کی حالت وہی کی وہی رہی اور اُسے تن ڈھانپنا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

آندریو ولسن کے اندازے کے مطابق اسی فیصدی کشمیری شال فرانس برآمد کئے جاتے تھے اور ہر فرنگی (فرانسیسی) دُلہن کی آرائشِ جمال اِسکے بغیر اَدھوری تھی۔ پشمینہ شال کے لئے خام مال لداخ کے علاوہ تُر فان (Turfan) یا رقند سے آتا تھا۔ آج کا کشمیری یہ جانکر حیران ہوگا کہ وِلسن کے یہاں قیام کے وقت یہاں کشتی رانی اِتنی آسان تھی کہ کہیں بھی آنے جانے کے لئے کشتی کا سفر راحت زا اور رُوح افزا خیال کیا جاتا تھا۔

ہمالہ کے چشمے اُبلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے!

اقبال ناتھ بٹ

ڈاکٹر مِس گُومری
کشمیری کی انگریز شاعرہ

ڈاکٹر مِس گومری اور اس کی کشمیری شاعری کے متعلق کوئی بات تب تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک ہم اس ''چرچ مشین سوسائٹی'' جسے مختصر اُسی-ایم-ایس-این کہتے ہیں، کے متعلق کچھ لکھیں جس نے ڈاکٹر مِس گومری کو رفاعِ عامہّ کے لئے کشمیر بھیجا تھا۔ یہ سوسائٹی قریب سَوا سَو سال پُرانی ہے اور اس نے طبّی سہولیات اور تعلیم کے میدان میں اتنا کام کیا ہے کہ جس کے تذکرے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی وسعتیں درکار ہیں۔ یہ سوسائٹی کیسے معرضِ وجود میں آئی، یہ بات اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے ہمیں آج سے تقریباً سَوا سَو سال قبل کے اُس لامثال قحط کو یاد کرنا پڑے گا جسے ''رنبیر سنگھ کا قحط'' کہتے ہیں۔ یہ قحط بہت ہی بھیانک تھا اور کہا جاتا ہے کہ اِس قحط کے دَوران کشمیر میں ہر گیارہ گاؤں میں ایک گاؤں، گیارہ گھرانوں میں ایک گھر اور گیارہ اُفراد میں ایک فرد باقی رہا۔ اِس قحط نے کشمیر کی بنیادیں تک ہِلا دیں۔ بہت سے کشمیری

خاندان کشمیر چھوڑ کر صوبہ سرحد اور پنجاب میں جا بسے جہاں اُن کی اُولادیں آج بھی آباد ہیں۔ بہت سے کشمیری بھاگ کر وہیں پناہ گزیں ہو گئے جہاں اُنہیں کھانے کے نام پر کچھ ہاتھ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ اِس قحط میں مُردہ انسانوں اور جانوروں کا گوشت کھا کر جسم کا رشتہ رُوح سے قائم رکھنے کی کوششیں کی گئیں۔

اُس وقت بیعنامہ اَمرتسر ہوئے بہت کم عرصہ گذرا تھا اور انگریزوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ کر وہ بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہو چکے تھے اور وہ کسی بھی طرح اِس عہدنامے کو ختم کرنے کی تاک میں تھے لیکن گلاب سنگھ اور اُس کا بیٹا رنبیر سنگھ اِن چالوں سے بخوبی آگاہ تھے اور اُنہوں نے انگریزوں کو یہ عہدنامہ ختم کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔ انگریز حکام یہ چاہتے تھے کہ انہیں یہ حق دیا جاسکے کہ وہ کشمیر کے اَندرونی معاملات میں مداخلت کر سکیں اور کشمیر کے مہاراجہ کے اِختیارات کم سے کم کر سکیں لیکن مناسب موقعہ اُن کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ اِسی تگ ودَو میں کئی برس گذر گئے۔ انجام کار کشمیر کے بھیانک قحط اور ہلاکتوں نے اُنہیں یہ موقعہ فراہم کر ہی دیا۔ اِس دَوران بہت سے انگریز سیاح کشمیر آ چکے تھے۔ قحط کے اُیام کے دوران بھی یہاں بہت سے سیاح آئے اور اُن میں سے اکثر انگریز حکومت کے خفیہ ایلچی ہوتے تھے۔ یہ لوگ قحط سالی کی خوفناک تصویر پیش کرتے تھے کہ اُنہوں نے اَپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قحط زَدہ لوگوں کو مختلف علاقوں سے جمع کر کے جھیل وُلر میں ڈبویا گیا۔ بہت سے انگریز اَفسروں اور سیاحوں نے کوششیں کی کہ یہ قحط بغاوت کی صورت اختیار کر لے مگر یہ کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ لیکن اس سے بعض خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے کہ کشمیر سے باہر کے لوگوں کو اس بات

کا پتہ چل گیا کہ کشمیری کتنے مفلوک الحال اور بے بس ہیں۔اِس دوران بعض انگریزوں نے یہاں سی۔ایم۔ایس نام کی سوسائٹی بنا ڈالی۔انہوں نے ملک اور ملک سے باہر رقومات جمع کیں اور کشمیریوں کیلئے فلاحی کاموں کا وسیع سِلسلہ شروع کر دیا۔اِس سوسائٹی نے کشمیر میں بعض شفا خانے اور مدرسے کھولے جنہوں نے قرارِ واقعی قابلِ ذکر کام کیا۔اِن ہی شفا خانوں میں اَننت ناگ کا وہ شفا خانہ بھی ہے جو خواتین اور بچوں کے علاج کے لئے کھولا گیا اور آج بھی فعال ہے۔اِس شفا خانے میں ڈاکٹر مِس گومری نے قریب ۴۰ سال دِن رات مریضوں کی خدمت کی۔

سوسائٹی کے اَغراض و مقاصد میں فلاحی کاموں کے علاوہ عیسائیت کی تبلیغ بھی شامل تھی۔اِن شفا خانوں میں کام کرنے والے عیسائی مشنری کے ڈاکٹر اور دیگر عملہ علاج کے ساتھ ساتھ عیسائیت کا بھی پرچار کرتے۔البتہ اِس بات میں کوئی شُبہ نہیں کہ انہوں نے دونوں کام کُھلے دِل اور شوق سے کئے۔ان شفا خانوں میں داخل ہو کر مریضوں کو پہلی بار محسوس ہوتا کہ وہ بھی انسان میں اور اُن کے جسم کی قدر و قیمت ہے۔اِن شفا خانوں میں کام کرنے والوں کا چہرہ دیکھ کر ہی مریضوں کی دُنیا بدل جاتی تھی کیونکہ وہاں اُن کی ایسی بے لاگ خدمت کی جاتی تھی جو کہ اُن کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتی۔اِن ہی اِیّام میں انجیلِ مقدّس کا کشمیری ترجمہ بھی کیا گیا۔یہ پنجاب میں ایک کرسچین اِدارے نے ۱۵۸۶ء میں شائع کیا اور اس کا آج بھی مستند ترجمے کی حیثیت سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

کشمیر واسیوں کے علاج معالجے اور ان میں عیسائی مذہب کے پرچار

کے لئے لازمی تھا کہ یہ انگریز ڈاکٹر اور مشنری کشمیری زبان سے واقفیت حاصل کرلیں تا کہ وہ عام لوگوں سے میل جول بڑھا سکیں۔ اِسی لئے یہ لوگ کشمیری زبان کی بھرپور واقفیت حاصل کرلیتے اوراس میں بات چیت بھی کرلیتے۔

ڈاکٹر مِس گومری کناڈا میں پیدا ہوئی اور وہیں طِب کی اعلیٰ تعلیم یعنی ایم۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اِس کے بعد اُس نے اپنے آپ کو عیسائی مذہب کے لئے وقف کردیا۔ ہندوستان پہنچ کرسی۔ایم۔ایس جماعت نے اِسے اننت ناگ اسپتال بھیج دیا۔ اُس نے جی جان سے اِس اسپتال میں مریضوں کی خدمت کی اور اپنی جوانی بلکہ بڑھاپا بھی اِس کی نذر کردیا۔ یہ ایک فرشتہ صفت خاتون تھی جس کے سامنے قریب المرگ مریضوں کے اندر زندگی کی نئی رمق پیدا ہو جاتی تھی۔ گرد ونواح کے سینکڑوں دیہات کی مریض خواتین اُس کے پاس علاج کے لئے آیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر گومری دِن کے چوبیس گھنٹے، ہفتے کے ساتوں اَیام اور سال کے ۳۶۵ اَیام کسی تردّد کے بغیر علاج معالجے میں مگن رہتیں بلکہ ذاتی خرچے سے مریضوں کے لئے اَدویات کا انتظام بھی کرتی۔ جب وہ چالیس سال کی سروس کے بعد ریٹائر ہوگئی تو اُس کے پاس صرف کناڈا واپس جانے کا سفر خرچہ موجود تھا۔ لیکن کناڈا واپس جانے کے بجائے وہ کشمیر کے ہی دیگر اسپتالوں سے منسلک ہوگئی اور بلا اُجرتِ معاوضہ اَپنی خدمات انجام دیتی رہی۔ آخر جب اُس کی صحت بالکل جواب دے گئی تو وہ واپس کناڈا چلی گئی اور صرف چند مہینوں کے بعد فوت ہوگئی۔

جتنا اُسے علاج ومعالجے کا شوق تھا اُتنا ہی شوق اُسے وعظ وتبلیغ کا بھی تھا۔ شفاخانے میں وہ دِن میں ضرور ایک بار تمام مریضوں کو یک جا کرتی اور

انجیل مقدّس کے آیات سُناتی اور کشمیری زبان میں یسوع مسیح کی حیات کے واقعات سُناتی اور خدا کی حمد وثناء سے اُنہیں بہرہ وَر کراتیں۔ اننت ناگ کے مِشن ہائی سکول میں ہفتے میں ایک بار آتیں اور لڑکیوں کو انجیل پڑھاتی یا انجیل کے قصےّ اور کہانیاں سُناتی۔ کہیں کہیں ''میجک لینٹرن'' شو بھی دِکھاتی اور تبلیغ کے اِسی جوش نے آہستہ آہستہ کشمیری میں شاعری کی ترغیب دی وہ اَپنے کشمیری گیت اُس والہانہ انداز میں لڑکیوں یا مریضوں کے بیچ اَپنی سُریلی آواز سے اَدا کرتی کہ وہ سیدھے دِل میں اُتر جاتے۔

۱۹۳۰ء میں اُس نے اَپنے کئی کشمیری گیت رُومن سکرپٹ میں چھپوائے اور اِسکے بعد ایک مجموعہ فارسی رسم الخط میں۔ ایک کا نام ''پوشہ مال'' (پھولوں کا ہار) اور دوسرے کا نام ''پُرون اَحوال'' (قدیم احوال) ۱۹۴۳ء میں دونوں کتابوں کو اِکٹھے چھپوایا جس کا نام اُس نے ''کاشرِ گیوَنچ پوشہِ مال'' (کشمیری گیتوں کے پھولوں کا ہار) رکھا۔ یہ کتاب آج بھی مِشن اسپتال کے سکول میں پڑھی جاتی ہے اور اس گِرجا گھر کی عمارت بھی اُس نے بنوائی۔ اس کتاب میں ۴۶ نظمیں ہیں جو کہ زیادہ تر انجیل مقدّس پر مبنی ہیں۔ کئی مراٹھی گیتوں کا کشمیری ترجمہ بھی اِس میں ہے۔ اِن گیتوں کے متعلق ایک خاص بات یہ ہے کہ ان گیتوں کی لَے یا بحر کشمیری نہیں جس سے یہ گماں ہوتا ہے کہ یہ کتابیں منظوم نہیں، نثر میں ہیں لیکن یہ دُرست نہیں۔ ان گیتوں کا مزاج انگریزی بلینک ورس ہے۔ بہر حال اِن طرزوں پر کشمیری گیت لکھ کر گومری نے کشمیری اَدب کی تواریخی خدمت کی ہے اور کشمیری میں آزاد شاعری کی بنیاد اِسی خاتون کی مرہونِ منّت ہے۔ مذہبی شاعری کے ساتھ ساتھ اُس نے حفظانِ صحت

کے موضوع پر بھی نظمیں لکھیں جن کا نام ''قاعدۂ صحت'' ہے۔ یہ اُس نے فارسی رسم الخط میں الگ سے چھاپی۔ اس کے بعد اُس نے ''زُواوزِتہ جان اوز'' (جاں سلامت ہے تو جہاں سلامت ہے) کے نام سے ایک اور کتابچہ بھی چھاپا۔

گومری کی کشمیری شاعری کے نمونے یوں ہیں۔

کاشرِ گیونچہِ پوشہِ الہِ منزِ	کشمیری گیتوں کے پھولوں کے ہار سے
پاک یسوعؑ مسیح سِندِ پاسہٕ کر	پاک یسوع مسیح کے طفیل کر
میون دل تہِ پاک کمال	میرے دل کو بھی پاک کمال
یُتھ کرٕ ہا موحبتھ چون	تا کہ تم سے محبت کر سکوں
تہٕ وُچھہٕ ہا چون جمال	اور تمہارا دیکھ سکوں جمال

.... ☆ ....

جہاں چھُ سخت لاچار	جہاں ہے بہت لاچار
زَن مرنس چھُ تیار	جیسے مرنے کو ہے تیار
صرف چاأنۍ قودرتھ ہیکہِ	صرف تمہاری قدرت کر سکتی ہے
بیٚیہِ بخشِتھ تَس قرار	اُسے پھر سے بخش سکتی ہے قرار
بیٚیہِ یَتھ دُنۍ یاہس منز	اور اِس دُنیا میں
موحبتھ ظاأہر کر	محبت ظاہر کر
یُتھ پنُن غرض ترأوِتھ اُسۍ	تا کہ اپنا غرض چھوڑ کر ہم
چون ماَنو سراسر	آپ کا مانیں سراسر

............☆............

خودایا اَسہِ پَنُن بوکتر گَنڈ
آیوو نا تِمن دوہن
سُہ نیک عجیب انسان
پۆز ہَتہِ بُدی وٗری گنذرِتھ
وأڑووُنا بیاکھ زمان
أخر اوس یسوع زامُت
تہِ نور اوس تَمی رأژ
آسمانہِ پیٹھ پربزلیومُت
تہِ پوہل وُچھِتھ کھوٗژ

خدایا ہمیں اپنا بکتر باندھ
اُن دِنوں آیا تھا
وہ عجب نیک انسان
ہاں، سینکڑوں سال گذر کر
ایک اور زمانہ آیا
آخر میں یسوع پیدا ہوا
اور اُسی رات کو نور
آسمان سے چمک اُٹھا تھا
جس کو دیکھ کر گڈریا خوفزدہ ہوگیا

.... ☆ ....

کِلی ٹھُکِتھ اَتھن کھوٗرن
بند اوس مارِ کوٗرُس پیٹھ
تہِ خلقتھ أسِس وُچھان
پکأنی وَتہِ پیٹھ
کانْہہ کانْہہ اوس ٹھٹھہِ کران
دَپان أسی ''یہ انسان
بچین اوس بچراوان
بچأوِن پنُن پان

ہاتھ پاؤں میں کیل ٹھونکے
بندھا تھا صلیب پر
اور خلقت اُسے دیکھ رہی تھی
راستے سے چلتے ہوئے
کوئی کوئی مذاق کررہا تھا
کہتے تھے ''یہ انسان
اوروں کو بچاتا تھا
اَب اپنے آپ کو بچائے''

.... ☆ ....

قاعدہ صحت

کشمیری	اردو
یِتھہٕ پأٹھۍ گریوس چھُ فصل یژھان	جیسے کسان فصلیں چاہتا ہے
بیول چُھ ووان ، پَچھ چھ کڈان	بیج بوتا ہے، فالتو گھاس نکالتا ہے
تِتھہٕ پأٹھۍ آستہٕ صحتھ یژھان	اِسی طرح سے صحت کی چاہ کر
صحتُکۍ قأعدٕ مان	صحت کے قاعدے مان
پنُن تہٕ بێین ہُنڈ صحت بچاوٗ	اَپنی اور دوسروں کی صحت بچاوٗ
بێین کُن دھیان کر موحبتہ سان	دوسروں کی طرف دھیان کر محبت سے
اکہِ ہنڈِ دادٕ ستۍ چھُ داریہن نوقصان	ایک کے درد سے بہتوں کو نقصان ہے

.... ☆ ....

کشمیری	اردو
عادتن رسمن پیٹھ کر دھیان	عادتوں اور رسموں پر کر دھیان
کُس کُس ناکارٕ چھُ تہٕ کُس کُس چھُ جان	کون کون نا کارا ہے اور کون اچھا ہے
زان زِ خوداہ چھُ سون صحت یژھان	جان کہ خدا ہماری صحت چاہتا ہے
حُکم نوقصانک سُہ چُھنہٕ دِوان	حکم نقصان کا وہ نہیں دیتا
شُربن ہند صحت چھُ ملکس بکار	بچوں کی صحت ملک کو درکار ہے
ژھار تمن رچھنس کیٛت گأبہٕ جار	اُن کی پرورش پورے دھیان سے کر
کھاندر مہ کری یوکھ یلہٕ وأنسہِ چھ کم	کم عمری میں اُن کی شادی نہ کرو
یُتھ کمزور اولاد ستۍ ہکھ نہٕ غم	تاکہ کمزور اولادوں سے وہ غمگین نہ ہوں
آبس مہ کھوژ ، زِ ما گوھم شہجار	پانی سے نہ ڈر کہ کہیں بھیگ نہ جاؤں
آب گوھ زانن بوڈ مدد گار	پانی کو بڑا مدد گار جان
سکلی ہزیش چینہٕ ستۍ جسم صاف تھاو	سویرے پانی پی کر جسم کو رکھ صاف

اِس مضمون کے لئے مواد کی فراہمی کے لئے اننت ناگ مشن اسپتال کے کارکنوں نے میری مدد کی۔ انہوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے پُرانے ریکارڈ میں سے میری لئے مواد ڈھونڈ نکالا۔ اُن کے اخلاق اور برتاؤ سے میں انتہائی متاثر ہوا۔ اگر ہم انسان ہیں تو وہ انسانوں کی شکل میں فرشتے ہیں۔

عبدالاحد رفیق

سرزمینِ کشمیر کی فوجی روایات

کشمیر علم وادب، فن اور ہُنر وکسب کے علاوہ اپنی فوجی روایات کے لحاظ سے بھی مشہور رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کشمیریوں نے محاذِ جنگ پر ہر وقت جان توڑ کر لڑا ہے۔ جب کبھی کسی غیر ملکی حملہ آور کشمیر پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس کو مُنہ کی کھانی پڑی۔ عہدِ قدیم سے ہی کشمیریوں نے طاقت اور فوجی قوّت کے بل بوتے پر ہندوستان افغانستان اور چین کے بعض علاقوں کو اپنے تسلط میں لے لیا تھا ان میں جذبہ حُبّ الوطنی ابتدائ سے ہی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

بعض یورپین سیاحوں نے کشمیریوں کے بُزدل اور ڈرپوک ہونے کا ذِکر کیا ہے لیکن اِن یورپین سیاحوں نے اوّل تو خود کشمیر میں قلیل عرصہ رہنے کی وجہ سے صحیح اور دُرست حالات کا جائزہ نہیں لیا ہے دوئم اُن کے عقائد میں ہیون سانگ کا بیان بھی شامل ہے جس کی وجہ سے انہیں مغالطہ ہوا ہے۔ ہیون سانگ نے جس سوسائٹی میں زیادہ اوقات بسر کئے ہیں وہ برہمنوں کا سماج تھا۔ برہمن لوگ عالم تھے۔ انہیں علم وادب کیساتھ گہرا رشتہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو

علمِ وفن میں ماہر ہوں وہ میدانِ جنگ سے اکثر دُور ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ہیون سانگ خود اُن کے علم واَدب کا مداح رہا ہے۔

یورپین سیاحوں نے اُنیسویں صدی میں کشمیر میں قدم رکھا۔ یہ دَور تاریخ کشمیر میں تعطّل اور جمود کے لحاظ سے بہت ہی زَبوں حالی کا دَور رہا ہے۔ کشمیری عوام بے دست و پا تھے۔ ملک میں اَمن وسلامتی کا فقدان تھا۔ جبر واِستبداد نے کشمیریوں کے ضمیر تک کو بدل دیا تھا۔ فوجی ملازمت تو دَر کنار، اِنہیں زندہ رہنے کا حق بھی نہ تھا۔ ہر کشمیری کو آج بھی سِکھا شاہی کا نام لرزہ بَر اندام کرتا ہے۔

کشمیر کے نامور اور اُولوالعزم بادشاہوں میں مکتا پیڈ اور للتا دتیہ کے نام ہمیشہ سُنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ اُن کے فوجی کارنامے بلند اور عظیم رہے ہیں۔ وہ جنگی اُمور کے بڑے ماہر اور شجاع تھے۔ جب محمد قاسمؒ ایک عرب فاتح نے راجہ داہر سے للتا دتیہ کے بارے میں کھوج لگائی اور پوچھ گچھ کی تو راجہ مذکورہ نے محمد قاسم کو ذیل کا پیغام بھیجا:

> ''قہر کندۂ روئے زمین است وانتقام کشندہ جباراں زماں وحسب ونسب راہباں کہ در ملک کشمیر صاحب چتر ونوبت علم ورایت کہ آیاں برآستانہ دولت اونہادہ اند۔ وجملہ ہندو۔ سندھ در تخت از فرماں شد۔ بداد مکراں وتوران امرا خود قلادہ کردہ صاحب صد زنجیر پیل است وراکب پیل سفید است کہ نہ اسب اومقابل تو اندونہ مرد بادے تواند افشرد۔ اجازت کردے تا شمارا سپرد کردے۔ کہ تا العرام عالم ہیچ لشکرے را محال نبودے کہ پیراموں حسدور او بگزشتے۔''

للتا دتیہ کا پوتا جیا پیڈ (۷۶۴ سے ۷۹۷ء) ایک بہت بڑا فاتح ہو گزرا

ہے۔ اُس نے ایک بھاری لشکر کی ترتیب اور تنظیم انجام دی اور کشمیر کی حُدود کو اِلٰہ آباد تک بڑھایا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے راجے کا اُس کے نام کانپ اُٹھتے تھے۔ عظیم الشان بادشاہوں کے کلیجے سن ہو جاتے تھے۔ دَولت کی فراوانی اور جاہ وحشمت کے لحاظ سے بھی وہ بہت ہی بلند تھا۔ چنانچہ ۹۹۹۹۹ گھوڑے خیرات کر دئے وہ ہمیشہ اپنے پایہ تخت سے دُور مقبوضات کو بڑھاوا دینے میں مصروف رہتا تھا۔ وطن میں کبھی چین سے نہ بیٹھتا تھا۔

پنجاب اور ہندوستان کے کچھ علاقوں کو محمود غزنوی نے آن کی آن میں فتح کر لیا تھا۔ اُس کا لشکر تجربہ کار بہادر جواں مَردوں پر مشتمل تھا۔ بخارا، سمرقند، افغانستان میں اُس کی فوج نے بہادروں کے چھکے چھڑا دئے تھے اور وہ ہندوستان کے ہر حملے میں کامیاب رہا۔ اگرچہ اُس کے مقابلے میں ہندوستان کے مشہور اور معروف راجے جن میں اجمیر، دہلی، قنوج اور لاہور کے حکمران بھی شامل تھے، اُس کے آگے نہ ٹھہر سکے۔ مگر جب یہی محمود غزنوی کشمیر پر چار بار حملہ آور ہوتا ہے تو اس کے بہادر جرنیل میدانِ جنگ میں کام آتے ہیں اور وہ ہر بار بُری طرح شکست کھا کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ محمود کا گیارھواں حملہ ۱۰۱۵ھ میں کشمیر پر ہوا تھا۔ اُس وقت یہاں ایک ہندو خاتون حکمران تھی جس کا نام دِدا رانی تھا۔ محمود شکست کھا کر پونچھ اور راولاکوٹ چلا جاتا ہے اور یہاں کے راجہ کے ساتھ جو قلعہ میں تھا، لڑنے لگتا ہے۔ مگر یہاں بھی محمود کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ محمود غزنوی نے دوسری بار ۱۰۲۱ء میں کشمیر پر یورش کی مگر اس وقت بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۳۳۹ء میں کشمیر مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ کشمیر کے اکثر مسلمان باہر کے

رہنے والے نہیں تھے بلکہ انہوں نے اِسلام قبول کرلیا تھا۔ کشمیری سُلاطین میں شہابُ الدّین بادشاہ کا نام فوجی طاقت کے لحاظ سے بہت ہی اہم ہے۔ وہ فتوحات کرتا گیا۔ چنانچہ اُس کے دورِ حکومت میں تبتّ، نیپال، چین کے بعض علاقے، اُفغانستان، سرہند وغیرہ کشمیر کی سلطنت میں شامل تھے۔ سارا ایشیا اُس کے دَبدبے سے کانپ اُٹھتا تھا۔ وہ اُس دن کو اُپنی عمر کا اچھا دِن شمار نہیں کرتا جس دِن اُس کو کسی نہ کسی جگہ کی فتح کی خوشخبری نہیں ملتی تھی۔ وہ علم واَدب اور حسُن وفن کا بھی بڑا مشتاق تھا۔ وہ کشمیر کا سکندرِ اعظم بھی کہلاتا تھا۔ اِسی دَوران میں فیروز شاہ تغلق نے کشمیر پر دَھاوا بول دیا۔ یہ بات عیاں ہے کہ سارے تغلق بادشاہوں میں فیروز شاہ تغلق کی فوجی طاقت مستحکم تھی۔ مگر یہاں اُس کو شکست ہوئی۔ اگر حضرت سیّد علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ صلح اور صفائی نہ کرواتے تو دہلی کا تخت بھی کشمیریوں کے قبضے میں آجاتا۔ فیروز شاہ تغلق نے اُپنی لڑکی کشمیر کے سلطان کے نکاح میں دے دی۔ سلطان قطب الدّین اور سلطان بُت سکندر دونوں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں ۔

خاکِ مادِ گر شہاب الدین نزاد

تیموؔر جس نے تمام دنیا میں اُپنی عظمت اور بہادری کا سِکّہ بٹھایا تھا، کشمیر پر حملہ کرنے میں تردد کرنے لگتا ہے اور کشمیر کے سُلطان کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ جموں کی سرحد پر اُمیر تیمور جموں کے راجہ کے ساتھ لڑائی کرتا ہے تو شرف الدّین یزدانی کے قول کے مطابق جموں کی سرحد پر مضبوط، بہادر اور شجاع ہندو آباد تھے۔ انہوں نے اُمیر تیمور کا شدید طور مقابلہ کیا اور امیر تیمور نے لڑائی کا خیال چھوڑ دیا کیونکہ امیر تیمور کی فوج کو یہاں بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔

سلطان زین العابدین بڈشاہ کے عہدِ حکومت میں جب اُسکردو اور تبت کے راجوں نے سلطان کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کیا تو بڈشاہ خود اِن باغیوں کی سَرکوبی کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ دونوں تبتوں کو سَر کر لیتا ہے بلکہ بعض علاقے جن میں چترال، یاسین اور کوہِ ہندوکش کا علاقہ بھی شامل ہے، فتح کر لیتا ہے۔ بڈشاہ نہ صرف یہ کہ ایک عظیم فاتح تھا بلکہ اُس نے ملکی اُمور کا انصرام نہایت ہی خوش اُسلوبی سے انجام دیا۔ رعایا کی خوش حالی اور فارغ البالی کا ہر وقت اُس کو دھیان رہا کرتا تھا۔ وہ علم و اَدب کا بڑا مشتاق تھا۔ اُس کے دَربار میں بڑے بڑے علماء، شاعر اور حکیم تھے۔ اُس کے بہادر فوجی جرنیل، جن میں محمد ماگرے، ملک مسعود ٹھاکر، ہلمت رینہ، احمد رینہ اور اُکڑ رینہ نے مشرق بعید میں دشمنوں کے چھکے چھڑائے تھے۔ معرکہ، کاشغر کے بارے میں خواجہ محمد اعظم دیدہ مری رقمطراز ہے:

> ''اخر الام بتاید الٰہی ہمزعیت بہ کاشغریاں لاحق شدہ۔ رو بہ فرار آوردند۔ وسلطان بہ فتح فیروزی دارالامان کشمیر مراجعت نمود۔''

جب پنجاب کا علاقہ دہلی سے چھوٹ گیا اور یہاں کھوکھر بھائیوں کی حکومت تھی تو معمولی سی یورش سے پنجاب کا علاقہ بڈشاہ نے اُپنے قبضے میں لایا۔

> ''جرت کھوکھر گھگھر بہ قوتِ سلطان اگر چہ تو انست دہلی نمود اما تمام پنجاب رادر تصرف آورد۔''

بڈشاہ نے ایک بھاری فوج جموں کے راجہ جسرت کو پنجاب اور دہلی فتح کرنے کے لئے بھیج دی۔ ان دِنوں دہلی کے تخت پر بہلول لودھی حکمران تھا۔ اگر چہ راجہ، دہلی کو اپنے قبضہ میں نہ لا سکا مگر پھر بھی اس نے پنجاب کو فتح کر لیا۔

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ بڈشاہ نہ صرف کشمیر کا سلطان تھا بلکہ وہ پنجاب، سرہند، پشاور، اسکردو، تبت، گلگت، کاشغر، ہزارہ، چترال کا بھی حکمران تھا۔ ان علاقوں کے باشندے بڑے بہادر اور جواں مرد تھے مگر کشمیریوں کے مقابلے میں وہ ہمیشہ نکمّے ثابت ہوئے۔

سُلطان حسنؔ بڈشاہ کے پوتے کے عہد حکومت میں تاتار خان پنجاب کے گورنر نے جموں پر چڑھائی کی۔ اُن دِنوں جموں کا راجہ، راجہ اجیہ دیو تھا۔ اس نے سلطان سے کمک کی درخواست کی اور بادشاہ نے تازی بٹ کی کمان میں فوج بھیج دی۔ تازی بٹ نے راجوری اور جموں دونوں علاقوں میں تاتار خان کی دھجیاں اُڑا دیں۔ پھر تازی بٹ نے سیالکوٹ پر حملہ کیا اور اِس علاقے کو فتح کر کے جموں کے ساتھ مِلا دیا۔ تازی بٹ خانقاہ معلّٰی میں مدفون ہیں۔ یہ وہ دَور تھا جب کہ خانہ جنگی کی وجہ سے کشمیریوں کی فوجی طاقت ختم ہو چکی تھی لیکن کشمیریوں کی عظمت کا سکہ اطراف و جوانب میں بیٹھا ہوا تھا۔

سُلطان حسن ۱۸۸۷ء میں وفات پا گئے۔ ان کی جگہ کا بیٹا محمد شاہ جو صرف سات سال کا تھا، تخت نشین ہوا۔ اُمرا اور وُزرا نے تحفے اور تحائف پیش کئے۔ مگر سات سالہ بچہ صرف تلوار کی طرف ہاتھ لے جاتا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر ہمسایہ حکمرانوں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ بچہ صرف فوجی سپرٹ اپنے دل میں رکھتا ہے اور وہ رُوپے، سونا اور دیگر سامان عیش و عشرت کی طرف مائل نہیں ہوتا ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں کشمیر میں طوائف الملوکی تھی۔ ملک میں بدنظمی

اور گھر گھر راج جاری تھا۔ بادشاہ اُمرا کے ہاتھوں کٹھ پُتلی بنے ہوئے تھے۔ یہاں تک کے ۱۸۴۰ء میں مرزا حیدر نے کشمیر پر حملہ کیا اور دس سال تک حکومت کی مگر خطبہ اور سکّہ ہمایوں کے نام پر جاری تھا۔ شاہمیری خاندان سے لڑائی کے بعد قتل ہوتا ہے۔ غازی خان، غازی شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا ہے اور ایک نئے خاندان' چک' خاندان کی حکومت شروع ہوتی ہے۔

غازی خان نے کشمیری خون میں ایک نیا وَلولہ اور جوش پیدا کیا اور علاقے جو کشمیر کی حکومت سے الگ ہوئے تھے، پھر اُپنے تصّرف میں لانے کی کوشش کی اور اکثر علاقوں کو فتح بھی کر لیا اور زین العابدّین کی حکومت کے بعد کشمیر میں دُوبارہ فوجی سرگرمیاں تیز ہونے لگیں۔ تاریخِ حسن میں مذکور ہے:

"غازی خان درمدتِ سلطنت خود تمام کوہستان ہند را مسخر ساخت ویاگلی وبہتر تصّرف درآورد و دختر کمال خان گکر بعقد آورد ہ ہموجا فوجدار تعین نمود۔ دہر دو تبت وکشتواڑ دارودِ گلگت ویکبلیِ راازاحکام انجا قلع نمود"

غازی خان نے کشمیر میں ایک مضبوط اور قومی حکومت قائم کی اور بَدنظمی کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ایک قابل ناظم اور فوجی جرنیل تھا اور ربط وضبط اور ڈسپلن کا بہت سخت تھا۔ اُس کی سزائیں شدید قسم کی ہوا کرتی تھیں۔ اس کے عہدِ حکومت میں ملک شمس الدّین' ہمایوں کے پاس اُس کے خلاف فوجی امداد حاصل کرنے کی غرض سے چلا۔ اُن دنوں ہمایوں مسجد کے چھت سے گرِ کر مر گیا تھا۔ تاہم ملک شمس ابوالمعالی کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اُمرا کی

ایک بڑی تعداد اُس کے ساتھ تھی کیونکہ وہ غازی شاہ کے بُرے بُرتاؤ سے تنگ آچکے تھے۔ دُشمن کی فوج پونچھ کی جانب کوچ کر گئی تھی اور اچانک پٹن کے علاقے میں داخل ہوگئی۔ ایک دن گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ بادشاہ غازی شاہ نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ دشمن کی فوج جان توڑ کر لڑی مگر کشمیری فوج کے مقابلے میں ان کی ایک نہ چلی اور شکست کھائی۔ مغلوں کے سترہ سو (۱۷۰۰) آدمی قید کر لئے گئے اور باقی مر گئے۔ بادشاہ شان کے ساتھ سرینگر میں داخل ہوا۔ لوگوں نے استقبال کیا اور خوشی کے نعرے بلند کئے۔

کشمیری اُمرا نے پھر ایک بار سازش کی ٹھان لی۔ ملک محمد ناجی، حاجی بانڈے اور یوسف چک کی سرگردگی میں ایک بھاری فوج جمع کر لی گئی اور قرہ بہادر مرزا حیدر کے بھتیجے سے ۱۲ ہزار جوانوں کی کمک حاصل کر کے راجوری پر قبضہ جمالیا گیا۔ غازی خان نے چند جرنیلوں کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ دشمن نے تھنہ منڈی پر بھی تسلّط جمالیا تھا مگر غازی خان نے بہادرانہ مقابلہ کیا اور مغلوں کی صفوں کو دَرہم وبَرہم کر دیا۔ بہادر بادشاہ نے کشمیری فوجیوں سے کہا کہ ہر فوجی کو ایک مغل فوجی کے مارنے کے لئے ایک ایک اشرفی دی جائیگی۔ اِس طرح مغلوں کی فوج پر وہ ٹوٹ پڑے۔ مورّخوں کے مطابق مغلوں کے بہت کم افراد اپنے آپ کو بچا سکے۔ بڑے بڑے مغل سردار اِس لڑائی میں کام آئے۔

یوسف شاہ غازی خان کا بھتیجا ۱۵۷۹ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ وہ اگر چہ بہادر اور قابل حکمران تھا مگر عیش وعشرت کی زندگی کا دِل دادہ ہونے کی وجہ سے وہ کمزور اور نکمّا بن گیا تھا اِس کے عہد میں اکبر بادشاہ کی نظریں کشمیر پر

پڑی تھیں اور اس نے متعدد بار کشمیر پر حملہ کیا مگر ہر بار اُس کی فوج کو ہار ہوئی۔ بد قسمتی سے چند کشمیری اُمرا کو یوسف شاہ چک سے اختلاف ہوا اور انہوں نے اکبر بادشاہ کو کشمیر پر حملہ کرنے کی دعوت دی مگر اکبر بادشاہ نے نہیں مانا۔ کشمیری امراء کی اس ناکامی کے بعد انہوں نے اکبر بادشاہ کی خدمت میں قصیدے پیش کئے۔ ان قصیدوں کا بھی بادشا ہ کے دِل پر کوئی اُثر نہ ہوا۔ تاہم راجہ مان سنگھ نے اکبر کو مجبور کیا کہ کشمیر کو فتح کرنا آسان ہے۔ چنانچہ راجہ مان سنگھ نے ایک جرار لشکر کے ساتھ حملہ کیا۔ اُوڑی کے مقام پر کشمیریوں نے اِس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ راجہ مان سنگھ نے جب دیکھا کہ کشمیریوں کی فوجی پوزیشن مضبوط ہے تو وہ بہانے اور حیلے کر کے یوسف شاہ کے ساتھ صلح وصفائی کر کے فریب ومکر کے نرغے میں پھنساتا ہے۔ رات کے وقت بے ہوشی کے عالم میں قید کر کے دہلی روانہ کر کے آسانی سے کشمیر کو فتح کرلیتا ہے۔ پھر بھی کشمیریوں نے اُس وقت جذبۂ حُب الوطنی کے تحت خوب مقابلہ کیا مگر ایک قابل لیڈر شپ نہ ہونے کی وجہ سے وہ شکست کھا گئے۔

کشمیر تو اکبر نے فتح کرلیا مگر پھر بھی اکبر کا دِل کشمیریوں سے خائف تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ بڑے بہادر اور لڑاکو ہیں۔ چنانچہ وہ خود کشمیریوں کے بارے میں کہتا ہے: کشمیر بہشتیت لیکن پُر از دوزخیاں!''

اکبر نے کشمیریوں کو فوجی ملازمت سے محروم رکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اُن کے ہاتھوں کسی وقت زُک پہنچنے کا احتمال ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ مغلوں کے وقت میں یہاں آرٹ اور ادَب کو کافی عروج حاصل ہوا۔ لوگ خوش حال اور فارغ البال تھے۔ صنعت وحرفت کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

بیروزگاری کا خاتمہ ہوا۔ رعایا کی بہبودی اور خوش حال کا سامان ہر طرف وافر تھا پھر بھی چند کشمیری ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ اُن کی قابلیت اور صلاحیت کا ہر مغل بادشاہ کو اعتراف رہا ہے۔ فارسی زبان و اَدب کے یہاں جتنے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور انشا پرداز کشمیر میں پیدا ہوئے، اس کی نظیر محال ہے۔ یہاں علم و اَدب کی بڑی بڑی دانش گاہیں تھیں جہاں ہزاروں کی تعداد میں تشنگانِ علوم و فنون اَپنی پیاس بجھاتے تھے۔ غرض اہلِ کشمیر ہر فن میں یکتائے روزگار تھے!

غلام نبی آتش ☆

ماریان ڈاوٹی کا سفرنامۂ کشمیر

''کچھ ممالک اپنی شان وشوکت، کچھ حسنِ فطرت اور کچھ غیر معروف علاقوں کی سیاحت کی کافی گنجائش کی وجہ سے متاثر کرتے ہیں۔ کشمیر میں ان چیزوں کے علاوہ بڑے بامروت باشندے ہیں اور نہایت خوشگوار آب وہوا بھی ہے۔''

کشمیر اور کشمیریوں کے بارے میں تاثرات، مناظرِ فطرت کی شیدائی ایک نرم دِل مگر باحوصلہ برطانوی ماریان ڈاوٹی (Marion Doughty) نے اپنے سفرنامۂ کشمیر موسوم بہ ''اے فوٹ، تھرو دِ کشمیر ویلیز (A Foot Through The Kashmir Valleys) میں درج کئے ہیں۔ ڈاوٹی مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں راولپنڈی سے اُوڑی اور اُوڑی سے بارہمولہ آئی تھی۔ بارہمولہ سے جہلم ویلی روڑ کے ذریعے سرینگر چلی گئی۔ وہ ماہرِ نباتات بھی تھی اور حُسنِ فطرت کی دِلدادہ بھی۔ یہ حوصلہ منداور باصلاحیت خاتون تنِ تنہا ایک سال تک کشمیر کی وادیوں

☆ نائب امتی ناگ کشمیر

اور پہاڑی سیر گاہوں میں گھومتی پھرتی رہی۔ اُس نے لکھا ہے کہ اُس موسم میں وہ واحد خاتون سیاح تھی جو دُور دراز پہاڑی سیر گاہوں تک پہنچ گئی، ایک بورھی فرہنگن بھی تھی، جس کو ڈانڈی میں اِدھر اُدھر لیجایا جاتا تھا۔ کشمیر کی سیاحت کے دوران ڈاوٹی نے جو کچھ دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا، وہ اُپنے مخصوص انداز میں قلمبند کرتی رہی۔ آخر اِن تحریروں کو کتابی شکل دنے کر ''اے فوٹ تھرو دِ کشمیر ویلیز'' کے نام سے شائع کر دیا۔ ۲۷۶ صفحات پر محیط اِس انگریزی کتاب کا پہلا ایڈیشن کب اور کہاں شائع ہوا تھا، اِس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، تاہم اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں ''ساگر پبلیکیشنز، نیو جنپتھ مارکیٹ، نئی دلی'' کے اہتمام سے شائع ہوا ہے، اور یہی کتاب راقم الحروف کے زیرِ مطالعہ ہے۔ کتاب میں چالیس نادر و نایاب تصویریں بھی موجود ہیں۔ ڈاوٹی نے ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ ملاقاتیں کی اور اُن کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔ عام غیر ملکی سیاحوں کے مقابلے میں اس نے کشمیریوں کے بارے میں خرافات لکھنے سے گریز کیا۔ وہ جس زمانے میں کشمیر آئی جہلم ویلی روڑ کی تعمیر قریب قریب مکمل ہو چکی تھی۔ سر والٹر لارنس نے بھی بندوبستِ اَراضی کا کام تکمیل کو پہنچایا تھا۔

پھُولوں کی شیدائی

ڈاوٹی جہاں جاتی، پھولوں اور پوَدوں کا مشاہدہ کرنے لگتی تھی۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر، میَدانوں میں، چَراگاہوں میں اور باغوں میں پھول اور پودے دیکھ کر مچلنے لگتی۔ جان جوکھم میں ڈال کر پھول اور پودے جمع کرتی رہی، کئی بار پہاڑی ڈھلوانوں پر پھول جمع کرنے کے دوران اُس کے پاؤں میں چھالے

پڑ گئیے، وہ کسک اور ٹیسیں برداشت کرتی رہی۔ اُس نے لکھا ہے کہ پھولوں کی کاشت کشمیر کے لئے واقعی ایسی صنعت بن سکتی ہے جو کشمیریوں کے لئے خوشحال لاسکتی ہے۔ گلمرگ، ویری ناگ، اچھ بل، بال تل، کنگن، مغل باغات اور دیگر مقامات سے پھولوں اور پودوں کے نمونے لاکر اُس کے اُن کی ایک لمبی فہرست ترتیب دی ہے، جو اِس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ پھولوں کے حوالے سے اُس نے لکھا ہے کہ کشمیر ساری دنیا میں قدرتی پھولوں کا واحد باغ ہے، جہاں آنکھوں کو خیرہ کرنے والے طرح طرح کے پھول دعوتِ نظارہ دیتے ہیں لیکن عام کشمیری اِن کی اہمیت سے بے بہرہ دِکھتا ہے۔

جھیلوں اور چشموں کے بارے میں

ٹانگے میں سوار ہو کر سرینگر کی اور چل پڑی۔ سرینگر پہنچ کر دوسرے دن ڈلر جھیل دیکھنے گئی۔ اس نے لکھا ہے کہ ولر میں ان کی کشتی دوپہر کو پہنچ گئی۔ وہاں اُس وقت لوگوں کی بھیڑ نہیں تھی۔ عجیب وغریب، بے مرّوت اور ملنساری کے جذبے سے خالی کچھ لوگ کشمیر کی اِس عظیم جھیل میں سے سنگھاڑے جمع کرر ہے تھے۔ ڈلر ہندوستان کی سب سے بڑی جھیل ہے، تقریباً پندرہ میلوں پر محیط اس جھیل کے بارے میں کشتی بان کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جھیل کی گہرائیوں میں پانی کے نتیجے ایک بڑا شہر اور اس کے بدقسمت اور بدکردار لوگ دفن ہو چکے ہیں۔ کشتی بان باتونی لوگ ہیں، اُن کی اپنی مخصوص بولی ہے۔

ڈل نہایت خوبصورت جھیل ہے، جس نے سرینگر کی خوبصورتی کو دُوبالا کر دیا ہے۔ ڈل میں تیرتے کھیت میرے لئے حیرت کا باعث تھے، لیکن بہت جلد میں نے ان کے بنائے جانے کی ترکیب جان لی۔ یہ کھیت کئی طرح سے بنائے

جاتے ہیں، تاہم یہ ڈل کے لئے نقصان دَہ ہیں لیکن جو لوگ ان کھیتوں میں طرح طرح کی سبزیاں اُگاتے ہیں، وہ کافی پیسہ کماتے ہیں۔ اِن عجیب کھیتوں کو مالک جہاں چاہے تیرا کر لے جاسکتا ہے۔ ڈل سے وُلر کی طرح سبزیوں اور پھولوں کی وافر مقدار حاصل ہوتی ہے۔ کنول کا پھول بہت خوبصورت ہے، ہندو اسے مُقدس مانتے ہیں۔ اِس پھول کے پودے کی جَڑیں اور تنّے بھی کھائے جاتے ہیں۔ ڈل سے چٹائیوں، کھڑکیوں کے پَردوں اور ہمچو قسم اشیأ کے بُنے جانے کیلئے خام مال بھی مِلتا ہے۔ ڈل میں طرح طرح کی کشتیاں تیرتی رہتی ہیں۔ اِسی جھیل کے اَطراف میں مشہور مغل باغات ہیں۔ سونہ لنک اور چار چناری کی سیر کے دَوران ڈاوَٹی کو کشتی بانوں سے معلوم ہوا تھا کہ یہ چھوٹا سا جزیرہ بنانے کیلئے ظلم سے کام لیا گیا تھا۔ کسی خوبصورت ملکہ نے جھیل کے درمیان ایک ایسی جگہ بنائے جانے کی خواہش جتائی تھی جہاں سے ساری جھیل کا جی بھر کر نظارہ کیا جاسکے۔ مظلوم جھیل واسیوں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا، لوگ جمع ہوگئے تو حُکم ملا کہ اَپنی کشتیوں میں پتھّر اور ریت بھر لیں اور اس جگہ پانی کے نیچے ڈبو دیں۔ اِن کشتیوں پر چونکہ اُن کی روزی روٹی کا دار مدار تھا، وہ جانتے تھے کہ اُن کے بغیر وہ اَپنے بال بچوں کو زندہ نہیں رکھ پائیں گے، اس لئے خود بھی کشتیوں کے ساتھ گہرائیوں میں ڈُوب کر خودکشی کر لی۔ اِن کشتیوں کے ڈھیر پر بھرائی کروا کر زمین تیار کی گئی اور اِس پر سونہ لنک کا خوبصورت چھوٹا سا قطعۂ راضی بنوایا گیا۔

اسلام آباد (اننت ناگ) سے ویری ناگ تک بیس میل کی مسافت طے کرنے کے دوران اس جُرأت مند عورت نے سخت گرمی اور راستے کی

ناہمواری کی خاصی صعوبتیں برداشت کرلی تھیں۔ اُس نے لکھا ہے۔ تپتی ہوئی دھوپ میں چڑھتے ہوئے ناہموار راستے کو سایہ دار درختوں کی حیرت انگیز حد تک غیر موجودگی میں طے کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، اِس سفر میں اُس کے قُلی بہت پیچھے رہ جاتے تھے۔ تاہم اُس نے سرد پانی کی دوڑتی بھاگتی ندیاں اور ویری ناگ باغ میں سایہ دار درخت دیکھ کر راستے کی اذیتوں کو یکسر بھلا دیا۔ اس نے دیکھا کہ معمولی ترمیم کے ساتھ پُرانا محل خانہ اصلی حالت میں کھڑا ہے، یہ کوئی تین سو سال پہلے جہانگیر اور اس کی حسین بیگمات نے، ہندوستان کے میدانی علاقوں کی ناقابلِ برداشت گرمی سے تنگ آ کر، یہاں آرام فرمانے کی غرض سے تعمیر کروایا تھا۔ جہانگیر نے یہاں بیگمات کے لئے غسل خانے، ضیافت خانے اور بارہ دریاں بنوائی تھیں۔ پہاڑی چٹانوں میں سے اَن گنت چشمے پھوٹتے ہیں جہانگیر نے اُن کے پانی کے اِردگرد پتھروں کے غسلخانے تعمیر کروائے ہیں۔ اِسی پانی سے باغ میں پھوارے پھوٹتے ہیں۔ چشمہء ویری ناگ اصل میں ایک ہندو اُستھاپن ہے، اِس کا پانی صاف وشفاف اور نیلگوں ہے۔ ویری ناگ سے واپسی پر ڈاوٹی اَچھ بل میں ٹھہری۔ وہ رقمطراز ہیں کہ اصل میں میرے پاؤں چلنے کے قابل نہیں رہے تھے، میری ٹانگوں میں درد ہو رہا تھا، تھکن سے میں چُور چُور ہو چکی تھی، مگر فطرت کی رعنائیاں مجھے ایک سے ایک خوبصورت جگہ کی اور کھینچی جارہی تھیں۔ اَچھ بل مغلوں کی ایک اور سیر گاہ ہے۔ یہاں بھی پہاڑ کے دامن سے کئی چشمے پھوٹتے ہیں۔ باغ میں اِس طرح سے بالا دریاں بنوائی گئی ہیں کہ کڑاکے ایک دھوپ میں مستورات ٹھنڈی ہواؤں اور بہتے جھرنوں کے ساز سے راحت وسرور محسوس کر سکیں۔ اچھ بل پہنچ کر

میں نے زبردست چہل پہل دیکھی، گویا قدیم حکمرانوں کا کوئی وارث پھر سے اچھ بل پہنچ گیا ہو۔ سینکڑوں قلی، کہار، شکاری اور چپراسی باغ میں اُمڈ آئے تھے، لمبردار بھی تھے اور چوکیدار تھے۔ بے شمار خچر بھی لائے گئے تھے۔ دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ بڑے صاحب اور شہزادے یہاں تشریف فرما ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا اِٹلی کے بادشاہ کا بھتیجا باغ کی سیر کے لئے آیا تھا۔ اچھ بل، اسلام آباد سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ یہاں مغل تعمیرات کی باقیات صحیح حالت میں ہیں۔

مانسبل جھیل کی خوبصورتی کو ڈاوَٹی نے اَچھوتے انداز میں بیان کیا ہے لکھا ہے کہ نہایت پُرسکون جگہ ہے۔ یہاں بھی مغلوں کی تعمیروں کے باقیات موجود ہیں لیکن ویری ناگ اور اَچھ بل کی طرح تعمیرات کی شان باقی نہیں رہی ہے۔ جھیل تقریباً ۲ دو میلوں پر محیط ہے۔ آنچار سر اور نگین جھیل کے بارے میں بھی اُس نے اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ اننت ناگ اور بھون (مٹن) کے چشموں کے کناروں پر بھی کچھ وقت گذارا ہے۔

کچھ فقیروں کے بارے میں

ڈاوَٹی سخت جان عورت تھی، وہ کبھی کبھی بیس تک میل تک کا سفر پیدل طے کرتی تھی، سب سے لمبی مسافت جو اُس نے پیدل طے کی ہے وہ مانسبل سے گاندربل تک تھی، چوبیس گھنٹوں کے دوران ۲۷ میل کا سفر طے کیا تھا، رات کو معمولی ستانے کے بعد چاند کی روپہلی روشنی میں سفر جاری رکھا تھا۔ مانسبل میں اُس کی ملاقات ایک فقیر کے ساتھ ہوئی، جس کی تفصیلات یُوں بیان کرتی ہے کہ مانسبل جھیل کے ایک طرف بیٹھ کر میں رام چڑیا کو اُڑان

بھرتے دیکھ رہی تھی کہ اچانک ایک لڑکا ہاتھوں میں میووں سے بھری ٹوکری لئے، جس میں تازہ میوے گلاس اور اخروٹ تھے، نمودار ہوا، سلام صاحب، سلام صاحب، کہتے ہوئے میووں سے بھری ٹوکری اور ایک گُلدستہ میرے سامنے رکھا۔ "یہ تحفہ میرے مالک نے بھیجا ہے، وہ چاہتا ہے کہ آپ اُس کے ساتھ ملاقات کرنے کی غرض سے تشریف لائیں" لڑکا بولنے لگا۔ میرے قُلی پاس کے گاؤں میں حقّہ نوشی کے لئے چلے گئے تھے، میں بھوکی تھی، میوے کھانے لگی اور میوے بھیجنے والے کے پاس چلی گئی۔ وہ ایک شاندار بوڑھا آدمی تھا۔ جھیل کے پاس ایک گہری گپھا میں رہتا تھا" گپھا کے آر پار ایک اچھا باغ بنوایا تھا۔ وہ بہت خوش اور ملنسار دِکھتا تھا۔ اُسے غیر ملکیوں سے ملنے کی عادت تھی۔ میں نے چند سوالات پوچھے، وہ بولا" میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، بہت کچھ جانا ہے، میں گوشہ نشین تھا اور خاموش۔ اب بھگوان شِو کو جاننے اور پہچاننے کا وقت قریب آیا ہے، میں اِس دُنیا کو اچھی طرح جاننے کی تلاش میں ہُوں، دُنیا میں رہنے والوں کو جاننے کی تلاش میں ہوں، میں سیاحوں کے ساتھ اُن کے ملکوں کے بارے میں بات چیت کرتا ہوں، ہوسکتا ہے اِس طرح میرا دماغ اِس بُڑھاپے میں جوانی کے زمانے کی طرح کام کرنے لگے۔ پڑھو، سوچو اور سیکھو، مگر معاوضہ اور فائدہ اُن کو ملتا ہے جو گہرائی کے ساتھ تحقیق، تلاش اور فکر کرتے ہیں۔ اکثریت کے لئے کام کاج کے بدلے میں عہدے اور دولت مناسب ہیں۔" فقیر کی آنکھوں سے روشنی چھلکتی تھی، وہ اپنے انداز میں نہایت پُرسکون اور قانع تھا۔ میں نصیحت سُن کر واپس چلی آئی۔

ڈاوٹی نے لکھا ہے کہ کھنہ بل میں ایک عجیب وغریب فقیر کو دیکھا۔ جس

کے بارے میں لوگوں نے بتایا کہ بہت سال پہلے نیم مُردہ حالت میں برف میں سے اُٹھایا گیا تھا۔ اُس نے کبھی بات نہیں کی ہے، کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا ہے، یہ مُہر بہ لب فقیر دن رات اَپنے چھوٹے سے خیمے میں، جو معتقدوں نے اُس کے لئے گاڑھ رکھا ہے، ایک شال اُوڑھے بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے، اُس کا مقصد کیا ہے۔ وہ پانی پیتا ہے اور کبھی کبھی، جب اس کا چیلا اَناج کے چند دانے اُس کے مُنہ میں ڈال دیتا ہے، وہ کھا لیتا ہے۔ رات کے وقت اپنے ٹیڑھے اور پیچدار گھٹنوں میں رَسی باندھ کر، ایک عصائے پیری کا سہارا لے کر، اَپنے بدن کو نیچے کی اور لٹکائے رَکھتا ہے۔ مدت تک وہ سہارے کے بغیر ہی جسم لٹکائے رکھتا تھا۔ یہ شخص مرگی کا مریض نہیں تھا۔ میں نے اُس کے برتن میں تانبے کا سِکہ ڈال دیا تو وہ غور سے دیکھتا رہا۔ میں حیران و پریشان ہو گئی، کیا اُس نے کچھ عجیب راز جان لئے ہوں جو سائنس کے ذریعے نہیں جانے جا سکتے ہوں۔ اُس کی زندگی برداشت کی عجیب مثال ہے۔ ہندو اور مسلمان سب اُس کی عزّت کرتے ہیں۔ وہ مذہبی رَسوم اَدا نہیں کرتا، وہ عام طرح کی عبادت نہیں کرتا ہے، پھر بھی لوگ اُس کو دَرویش، بزرگ فقیر مانتے ہیں۔

ویری ناگ میں ایک گرُوجی نے چاہا کہ ڈاوَٹی بھی اُس کی عبادت میں شامل رہے، وہ ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کیا کرتا تھا، سیاحوں کو میوے بطورِ تحفہ دیا کرتا تھا۔ شام کو ایک بڑا شنکھ بجا کر پوجا کرنے کے وقت کی اطلاع دیا کرتا تھا۔ سیاحوں سے کاغذ پر اَپنے ایڈریس لکھواتا اور دستخط کرواتا۔ وقت وقت پر مچھلیوں کو سلام کرتا اور دانہ ڈالتا تھا۔ ڈاوَٹی عبادت کے وقت اُس کے پاس

خاموش بیٹھی رہی اور بعد میں گرو جی بخشالیش کا تقاضا کرنے لگے، ڈاوٹی نے ماچس کی ایک ڈبیا سے کام چلایا اور سلام کر کے چلی گئی۔

لوگ

کشمیر میں ۹۵ فیصد مسلمان رہتے ہیں، اُن میں گوجر بھی شامل ہیں۔ اِن لوگوں کی جِسمانی بناوٹ یہودِیوں جیسی لگتی ہے۔ یہ بارکش اور محنتی لوگ ہیں۔ آبادی کا پانچ فیصد حصہ ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ بہت کم تعداد میں سِکھ بھی ہیں، ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مقدّس مقامات کی یکساں عزت کرتے ہیں۔ کشمیر صبر و برداشت رکھنے والوں کا مَسکن ہے۔ مسلمانوں میں ہندوانہ اَثرات بھی موجود ہے۔ عبادت کا طریقہ بدل گیا ہے، مسلمان اِسلام کی تعلیمات پر کاربند نہیں ہیں۔ ناگ مت کے اُثرات ہندوں اور مسلمانوں میں برابر پائے جاتے ہیں۔ بُدھ مت ماننے والے اَب اِس ملک میں نہیں رہتے ہیں۔ مسلمان حلال گوشت کھاتے ہیں جبکہ سِکھ جھٹکہ اور ہندو دونوں طرح کا گوشت کھانے کے عادی ہیں۔ کشمیر کے لوگ مہمان نواز اور بامُروّت ہیں۔ غیر ملکیوں کو، خاص کر جبکہ کوئی سیاح خاتون نظر آئے، دیکھتے ہی خیر و خبر پوچھتے ہیں، کہاں جانا ہے، کہاں سے آئے ہو، ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ یہ عام سوالات ہیں۔ وہ لوگ غیر ملکی تسلّط کی وجہ سے کچھ سہمے سہمے لگتے ہیں، صدیوں سے اُن کو ظلم برداشت کرنے کی عادت پڑی ہے۔ انگریزوں کو وہ اُپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے ہیں۔ تاہم بات بات پر بخشائش کا تقاضا کرتے ہیں، تھوڑی سی نسوار بطور بخشائش لے کر کشمیری مزدور بھاری بوجھ اُٹھا کر خوشی خوشی میلوں کا سفر طے کرتا ہے۔ کشمیری کشتی بان باتونی تو ہیں مگر ڈرپوک بھی ہیں۔

ہندوں، مسلمانوں، سکھوں اور گوجروں کے پہناوے میں خاصا فرق موجود ہے۔ لباس چہرے بشرے اور جسمانی خدوخال کے حوالے سے ان لوگوں کو دُور سے پہچانا جاسکتا ہے۔ ہندوُ، جو کہ موجودہ حکمران ڈوگرہ ہندوُں کی ذات سے ملتے ہیں، پہاڑی قبائیلوں کے جیسے جسمانی خدوخال رکھتے ہیں۔ وہ خوبصورت ہیں اور اُن کی عورتیں خوبصورت تر، ہندو عورتیں مسلمان عورتوں کے مقابلے میں پہناوے، بناؤ سنگار اور زیورات پر زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ پنڈتانیاں رنگدار پھیرن پہنتی ہیں۔ مسلمان عورتیں بے رنگ پٹو کا پھرن پہنتی ہیں۔ سرینگر میں زیادہ جسمانی محنت نہیں کرنا پڑتی ہے، اس لئے وہاں کی عورتیں زیادہ خوبصورت ہیں، کچھ ہندو عورتیں حُسن میں یکتا دِکھتی ہیں۔ ہندو مرد اور مسلمان مرد سَر پر پگڑیاں باندھتے ہیں لیکن ہندو اپنی پگڑی کی نوک ایک طرف اور مسلمان دوسری طرف رکھتے ہیں۔ ہندو کو مذہبی رَسموں کے لامتناہی سلسلے کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ کشمیری مرد ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ مہربان اور شفیق ہیں۔ کشمیری بچہ دیکھ کر سنگدل آدمی بھی نرم پڑسکتا ہے۔ یہ بچے پیارے اور خوبصورت لگتے ہیں۔ مائیں اُن کو نہلاتی ہیں وہ روتے ہیں، چیختے ہیں، میں نے اَکثر ایسے خوش کن واقعات دیکھے ہیں۔ ہندو عورتیں بچوں کی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ کشمیری ناخواندہ ہیں، اُن کو بیرونی دُنیا اور نئے تجربات کا علم نہیں ہے مگر وہ محنتی ہیں۔ وہ تجربہ کار کوہ پیما ہیں، تجربہ کار لکڑہارے ہیں، شکاری ہیں، محنت کش اور تجربہ کار کاشتکار ہیں، وہ حوصلہ مند اور صابر ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ کشمیر کو اپنی خوبصورتی کی بھاری قیمت چُکانا پڑی ہے۔ بار بار کے بیرونی حملوں نے اس زرخیز قطعہ

اَرض کو نقصان پہنچایا ہے، اَپنے اور اُپنے آقاؤں کے لئے اس قطعۂ ارض کو فرودگاہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ مظلوم لوگ سَر جُھکائے تعظیم و تسلیم کا عمل پورا کر دیتے ہیں۔ شاید اَب بھی کشمیریوں میں کافی جذبۂ غیرت اور جنگی صلاحیت موجود ہے، جو کسی طاقتور محرّک اور شوق و رغبت کی مدد سے اُجاگر کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ دَورانِ جنگ و جدل اُن کے گھروں کو مسمار نہ کیا جائے۔ جب وقتِ ضرورت کشمیری سپاہیوں کو برطانوی شاہی فوج میں بھرتی کیا گیا تو اُنہوں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ شاید یہ پُرانی کہانی صحیح ہے کہ غیر ملکی حملہ آوروں نے اُن کا حوصلہ ہمت اور پھرتیلا پن زائل کرنے کے لئے اُن کو عورتوں کے فراک کی طرح کا لباس، جسے پھیرن کہتے ہیں، جبراً پہنایا ہو۔

دیہی عورتیں بالوں کو چٹیا کر دیتی ہیں اور شانوں کے اُوپر سے کمر تک لٹکا کر ایک گرہ میں باندھ لیتی ہیں۔ چھوٹے بچوں کو بھی فرہنگی پر کافی بھروسہ ہے، کچھ خشک پھل اور ٹاپس Tops دکھا کر بچے آن کی آن میں جمع ہو جاتے ہیں بڑے بچے قدرے چھوٹے بچوں کو پیٹھ پر لاد کر دوڑتے چلے آتے ہیں۔ یہ چھوٹے بچے دن بھر اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔ میوے پکتے ہیں تو اُن کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ قدرے بڑے بچے مویشیوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔ گھروں میں چھوٹے چھوٹے کام بھی کرتے ہیں۔

سرینگر میں مکانات دریا کے دونوں کناروں پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ اکثر مکانات اینٹ اور مٹی کے ہیں۔ بڑے تاجروں اور ہندو ملازموں کے پاس پختہ مکانات ہیں۔ مکانوں کی چھتیں ڈھلوان ہیں، کئی مکانوں کی چھتوں پر مٹی ڈال دی گئی ہے اور خوبصورت پھول اُگائے گئے ہیں۔ جن مکانوں میں

کھڑکیاں ہیں وہ ہَوادار ہیں جبکہ اکثر مکان ہَوادار نہیں ہیں۔ سردیوں کے موسم میں کھڑکیوں پر کاغذ چپکا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ روشندانوں اور کھڑکیوں میں شیشے لگانے کا رواج نہیں ہے۔ شہر میں کچھ پُرانے مندر ہیں، جو فنکاری کی اچھی مثال ہیں۔ مسجدیں بہت زیادہ ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں بڑے بڑے چناروں اور اَخروٹ کے دَرختوں کی اَوٹ میں ہیں۔ دیہاتوں میں لوگ غریب ہیں۔

پیداوار

کشمیر ایک زَرخیز علاقہ ہے، یہاں طرح طرح کے پھل، پھول، اَناج اور دَرخت اُگتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں گندم، مکئی اور باجرہ وغیرہ اُگایا جاتا ہے جبکہ میدانی علاقوں میں دَھان کی کاشتکاری عام ہے۔ دَھان کشمیریوں کی اصلی خوراک ہے۔ دَھان کوٹ کر چاول تیار کئے جاتے ہیں اور چاول پکا کر کھاتے ہیں۔ کشمیری چاول کھائے بغیر زندہ رہنے کی سوچ بھی نہیں سکتے۔ گوجر اور پہاڑی علاقوں کے لوگ مکی کی روٹی کھاتے ہیں لیکن میدانی علاقوں میں چاول کھائے جاتے ہیں۔ دَھان کی فصل اُگانے کا عمل طویل بھی ہے اور محنت طلب بھی ــــ پہلے زمین پر ہَل چلایا جاتا ہے، پھر زمین تیار کر کے اس میں پانی بھر دیتے ہیں۔ شالی کے دانے بوئے جاتے ہیں۔ چند دِنوں کے بعد نکائی شروع ہو جاتی ہے، بے چارہ کسان مہینوں شالی کے پودوں کے اِرد گرد ہاتھوں سے مٹی اور کیچڑ کرُید کرُید خودرو مضر گھاس الگ کر دیتا ہے۔ شالی کے پودوں کی لگاتار رَکھوالی کرنا پڑتی ہے۔ بے چارے کشمیری کسان کی پوست واٹر پروف اور ہیٹ پروف (Water proof and heat

(proof ہونا چاہئے کیونکہ برہنہ بدَن کِسان کو تپتی دُھوپ اور برَستی بارش دونوں صورتوں میں کھیت میں کام کرنا پڑتا ہے۔ بڑی احتیاط اور محنت کے بعد بھی یہ توَقع نہیں کہ فصل اَچھی ہو کیونکہ اکثر فصل ایک بیماری کا شکار ہو جاتی ہے، جس کو ''رَے'' کہتے ہیں۔ کسان فصل کی اِس بیماری سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔ یہ بیماری اُن کی سال بھر کی سخت محنت کو رائیگاں کر دیتی ہے۔ ایک بار میں ایک چنار کی چھاؤں میں بیٹھی، اَپنی ہیٹ ہاتھ میں تھامے، دُور دُور تک دھان کے کھیتوں کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھی تھی۔ ایک مقامی شخص سامنے کھڑا ہو گیا، اُس نے پوچھا، کیا آپ اکیلی ہیں؟ اُس کے سوال کا حقیقی مقصد نہ سمجھتے ہوئے میں نے فوراً جواب دیا، نہیں، گویا میں اَپنے گھر میں تھی۔ میرا کیمپ نزدیک ہی ہے، میں پولیس مین کا انتظار کر رہی ہوں۔ سوال کرنے والے کا اُترا ہوا چہرہ چمکنے لگا، نہیں، میرا مطلب تھا، کیا میم صاحب کا خاوند بھی اُس کے ساتھ ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ سوال پوچھنے والے نے کہا، میں نے حضور کو ہیٹ ہاتھ میں تھامے اکیلے دیکھ کر خیال کیا کہ شاید آپ بیوہ ہیں۔ ٹھیک اِس سے ہم کو بہت فائدہ ہوا ہوگا کہ ہیٹ اُتار کر ہمارے کھیتوں میں سے چل کر آپ نے دیکھا ہوگا کہ ''رَے'' نے ہماری دھان کی فصل تباہ کی ہے، جس سے ہماری زندگی تباہ ہو گئی۔ مجھ کو اُس غریب پر بہت رحم آیا مگر میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔

کشمیری کسان دَھان اُگانے میں بڑے ماہر ہیں۔ دَھان کے چھوٹے پودوں میں سے وہ مختلف قسموں کی شناخت کر سکتے ہیں۔ کشمیر میں دھان کی ساٹھ اَقسام رائج ہیں۔ وہ اپنے لئے اچھی قسم کی دھان کا انتخاب کرتے ہیں۔

سُرخ رنگ والی دھان کی قسمیں دِکھنے میں خوبصورت ہیں مگر سفید رنگ والی قسموں کی طرح مزے دار نہیں ہیں۔ دھان کے علاوہ یہاں سَرسُوں بھی اُگایا جاتا ہے۔ لوگ مویشی پالتے ہیں، دیہاتوں میں ہر گھر میں گائے پالی جاتی ہے۔ یہ گائیں کم دُودھ دیتی ہیں۔ بکر وال اور گوجر گائیں اور بھینس پال کر دُودھ کی پیداوار بڑھاتے ہیں۔

کشمیر میں کثرت سے میوے اُگتے ہیں۔ سیب، ناشپاتی، اَخروٹ، بادام، خوبانی، آڑو، شفتالو اور گِلاس کے درختوں کے اُگانے کے لئے یہاں کی زمین نہایت مناسب ہے۔ یہاں میوہ صنعت کی ترقی کے زبردست امکانات ہیں۔ لوگ میوؤں کو سکھانے اور محفوظ رکھنے میں ماہر ہیں۔ مقامی میوے دار درختوں کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی درخت بھی اُگائے جانے لگے ہیں۔ کاش آمدورفت کے وسائل بڑھا دیئے جاتے تو کشمیر ایک بڑا باغ بن کر اُبھرتا اور سارے پنجاب اور وسطی صوبہ جات کو میوے مہیا کر کے ترقی کی اور گامزن ہو جاتا۔ ایک زمانے میں یہاں معیاری انگوروں کی خاصی پیداوار ہوتی تھی۔ لوگوں کی غفلت اور سستی کی وجہ سے یا سرکاری کاندروں کے بے جا استحصال کی وجہ سے اس میوے کی کاشت تُرک کردی گئی۔ صرف وحشی خودرو انگور کے پودے کہیں کہیں اُونچے سفیدوں کو بانہوں سے پکڑ کر یا دیواروں پر پھیل کر اِدھر اُدھر نظر آتے ہیں۔ کشمیر شراب نوشی کے عادی نہیں ہیں بلکہ اُن کو شراب سے نفرت ہے، تاہم غیر ملکی سیاحوں کے لئے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے فرانس اور امریکہ سے لائی گئی شراب کو رواج دیا ہے۔ آج کل کشمیر میں شراب کی دکانیں ایک شخص کے ہاتھ میں ہیں۔ کشمیر میں ہاپس (Hops) بھی

اُگائی جاتی ہے جس سے شراب بنائی جاتی ہے۔ سیب اور گلاس سے بھی برانڈی بنتی ہے۔ کشمیر کے اَخروٹ عمدہ ہیں۔ یہاں توُت کے بے شُمار درخت ہیں، ان کے پتوں پر ریشم صنعت کا دارمدار ہے۔ یہاں بیشمار پرندے ہیں۔ کئی پرندوں کا شِکار کیا جاتا ہے۔ جنگلوں میں طرح طرح کے وحشی حیوانات ہیں جن کا شِکار کرنے کیلئے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔

میم صاحبہ سرینگر میں

میریان ڈاوٹی نے سرینگر میں رہ کر ڈل کا نظارہ کرنے کے علاوہ نگین اور آنچار سیر کی سیر کی، وہ پری محل دیکھنے گئی۔ کوہِ ماراں، ہاری پربت اور پری محل دیکھنے کے بعد پاندریٹھن کا قدیم مندر دیکھا۔ نالہ مار کا نظارہ کیا۔ اُس نے سرینگر میں مخصوص طرز کے پُل دیکھے، ۱۸۹۳ء کے تباہ کن سیلاب نے کئی پُل تباہ کئے تھے۔ ڈاوٹی نے ایک پُل کو دُوبارہ تعمیر کرتے ہوئے دیکھا۔ ڈاوٹی نے لِکھا ہے کہ سرینگر میں خرید وفروخت کا ایک عجیب وغریب رواج ہے۔ بیوپاری، انگریز سیاحوں کے ٹھکانوں پر مال کا نمونہ لے کر آتے ہیں اور بڑی چالاکی اور چابکدستی کا مظاہرہ کر کے خریداروں کو شیشے میں اُتار لیتے ہیں۔ میں نے پہلے پہل اس طرح خریداری کرنے سے گریز کیا، آخر سرینگر کی سیر مکمل کر کے بیوپاریوں کو اَندر آنے اور مال کے نمائش کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ لوگ ایکدوسرے پر سبقت پانے کے زبردست کوشش کرتے ہیں۔ بعض خریدار آڈر دیتے ہیں، مال وقت پر نہیں پہنچایا جاتا ہے اور جب سرینگر سے نِکلنے کا وقت آجاتا ہے تو جلدی میں جو مال بیوپاری ہاتھ میں تھما دیتا ہے، مجبور ہو کر وہ اُٹھانا پڑتا ہے۔ حالانکہ جس کوالٹی کے لئے آڈر دِیا ہوتا تھا وہ کوالٹی دیکھنے کو نہیں ملتی۔

اسلام آباد جانے سے پہلے میں نے دُو نمدوں کے لئے آڈر دیا تھا، دونوں وقت پر پہنچائے گئے۔ بڑے خوبصورت نمدے تھے۔ اِس کے علاوہ میں نے کچھ اور چیزیں بھی خرید لیں۔ اِس سَودا کے بعد پشمینہ سے بُنے شال دیکھے جو اِتنے مہین تھے کہ جوز کے چھلکے میں لپیٹے جا سکتے تھے۔ پٹّو، فی گز ایک آنہ کے حساب سے بِکتا ہے۔ یہ نرم بھی ہے اور گرم بھی۔ کشمیری یہ پٹّو بھیڑوں کی اُون کو موسم سَرما کی طویل راتوں کے دوَران کات کات کر اور بُن کر تیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک کشتی میں سَوار ہو کر ایک خوب رُولڑ کا نیلا کوٹ پہنے حاضر ہو گیا، وہ تانبے اور چاندی کا سامان بَنانے اور بیچنے والے بیوپاری کا بیٹا تھا۔ اس نے تانبے اور چاندی کی کئی چیزیں نمونے کے طور پر لائی تھیں۔ اُس نے مجھے دعوت دی، اُس کی کارگاہ دیکھنے کے لئے وہ بولا، آجایئے، ہمارے ساتھ چائے پی لیجئے، اور ہمارے کچھ ماہر کارکنوں کو دیکھ لیجئے۔ میں نے مان لیا۔ تانبے اور چاندی کی چیزیں دُوبارہ پیک Pack کی جانے لگیں۔ عینِ اُسی وقت قالینوں کا ایک بیوپاری اپنی کشتی میں آن پہنچا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اُس کے ساتھ جا کر اُس کی کارگاہ کا مشاہدہ کر لوں۔ اُس نے زیادہ ضد کی تو میں اُس کے ساتھ چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر سینکڑوں کارکنوں کو قطاروں میں پایا، ہر ایک کرگھے کے آگے بیٹھا تھا۔ استعمال کیا جانے والا اُون کشمیری بھیڑوں سے حاصل کیا جاتا ہے، قالین بافی کی صنعت کشمیریوں کے لئے منفعت بخش ہے۔ اِس صنعت سے مَردوں، عورتوں، بچوں اور بڑوں بوڑھوں کو کام ملتا ہے۔ یہ کام بچپن میں بہت پہلے سے سیکھنا پڑتا ہے۔ ڈاوَٹی نے قالین بافی کے تمام مراحل کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور وضاحت کے ساتھ اس

بارے میں لکھا ہے۔ کچھ لوگ جوزَبردست ماہر ہوتے ہیں، خاموشی کے ساتھ بند کمرے میں قالینوں کے ڈیزائن تخلیق کرتے ہیں، وہ کاغذ کی پرچیوں پر عجیب خط میں کچھ نشانات لگادیتے ہیں جو کہ قالین کی ہر لائن کے لئے رنگ اور نقشہ مشخص کرتے ہیں۔ اِس کو عرفِ عام میں ''تعلیم'' کہتے ہیں، سب لوگ اِس کو پڑھ نہیں پاتے ہیں، اس کے لئے چند کارکنوں کو تربیت دی جاتی ہے اور وہ کرگھے کے پاس کاغذ کی پرچی سے پڑھتے رہتے ہیں ''تین سبز، چار اُٹھاؤ، دُو سیاہ، پانچ نیلے، بارہ سبز، چھ اُٹھاو وغیرہ وغیرہ۔ بڑی محنت کے بعد قالین تیار ہوجاتے ہیں۔ ساٹھ فٹ لمبے اور تیس فٹ چوڑے ایک اچھی کوالٹی کے قالین کی قیمت سولہ سے نوّے روپے فی فٹ ہوسکتی ہے، کبھی زیادہ اُچھی کوالٹی والا قالین سو سے ایک سو ساٹھ روپے فی فٹ کے حساب سے بھی بکتا ہے۔ چند آنوں کی معمولی اُجرت پر کام کرنے والے یہ کشمیری فنکار واقعی زرخیز دماغوں کے مالک ہیں۔ شالبافی کی صنعت کو جنگ فرانس کی وجہ سے بھاری دُھچکا لگا ہے، بے شمار شالباف، قالین بافی کرنے لگے ہیں۔

میں اپنی کشتی کی اور جانے والی ہی تھی کہ دھوکہ دے کر مجھ کو کوفت کاری اور میناکاری کی ایک چھوٹی سی کارگاہ کے اندر لے جایا گیا۔ چالاک سمجھانے اور پھنسانے والا شخص زنانہ کِردار کا مالک تھا، اُس نے کوئی چیز دکھانے سے پہلے مجھ کو اچھی کوالٹی کی چائے پینے کے لئے مجبور کردیا، شاید اس لئے کہ مُروّت دیکھ کر میں کوئی بڑا آڈر دے دوں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی وہ زیادہ پیسوں کا خواہاں نہیں تھا۔ معمولی آڑر دے کر بھی وہ مطمئن ہوجاتا۔ اُس نے مجھ کو کچھ بہترین چیزیں دِکھائیں۔ پتھروں، جواہرات اور دیگر دُھاتوں کو کاٹ

کر، شکست ریخت کے بعد اور چھانٹ کر خوبصورت چیزیں بنانا سچ مچ کمال کی فنکاری ہے ۔ اُس نے مجھے ایسی چیزیں بھی دکھائیں جن کے لئے مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے آرڈر دیا تھا، وہ چیزیں پیرس اور لندن کے لئے خریدی جارہی تھیں۔ کوفت کاری اور مینا کاری کی یہ صنعت بیرونی اثرات سے ابھی پوری طرح محفوظ رہی ہے۔ اِس صنعت میں چاندی اور تانبے سے بھی چیزیں بنتی ہیں جن پر گلٹ چڑھایا جاتا ہے۔

اِسی طرح ڈاوٹی نے پیپر ماشی اور چاندی اور تانبے کی خوبصورت چیزیں دیکھنے کیلئے ان کارگاہوں میں کام کاج کا پوری طرح مطالعہ کیا اور اُپنے تاثرات قلمبند کئے۔ چاندی اور تانبے کی چیزیں بنانے اور بیچنے والے دُو بیوپاریوں کے درمیان جھگڑے کا حال بھی اُس نے دَرج کیا ہے۔ جھگڑا اِسی بات پر ہوا تھا کہ ڈاوٹی ایک کارگاہ کے مشاہدے کے لئے جارہی تھی کہ دوسرا بیوپاری دعویٰ کرنے لگا کہ یہ میری گاہک ہے۔ سرینگر میں ڈاوٹی نے گُپکار، مہاراجہ کا محل، پتھر مسجد اور جامع مسجد اور رام منشی باغ جیسی جگہیں اور عمارات بھی دیکھی ہیں۔ اَپنی کتاب میں اُن کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

چند قدیم منادِر کا ذکر

اَچھابل سے میریان ڈاوٹی سیدھے مارتنڈ مندر دیکھنے گئی تھی، مارتنڈ جاتے ہوئے وہ کریوہ پر چڑھ کر گھاس کے میدانوں اور کھیتوں کے درمیان میں سے چل کر مارتنڈ مندر کے پاس پہنچی ۔ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ ایک اکیلی میم صاحبہ کو عام راستہ چھوڑ کر کھیتوں اور میدانوں کے درمیان چلتے دیکھ کر چلاتے تھے، بُلاتے تھے اور عام راہ پر چلنے کی ہدایت دیتے تھے لیکن

انہیں کیا معلوم کہ ڈاوَٹی کو اِس شاندار مندر کو بہت جلد دیکھنے کا کتنا شوق تھا، جس کی تصویر ڈِیڑھ سال پہلے اُس نے دیکھی تھی۔ مندر دیکھ کر اُس نے لکھا ہے کہ یہ عمارت ماہر آثارِ قدیمہ کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اِس دیو قامت مندر کی تعمیر کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ راجا رانا دتیہ اور اس کی بیوی اُمر تا پر بھا نے تعمیر کروایا ہے۔ للتادت نے اِس میں مزید اضافہ کیا، عام لوگ اِن باتوں کی اور زیادہ دھیان نہیں دیتے، وہ ایسی عمارتوں کو ''پانڈوں کے مکان'' مانتے ہیں۔ ڈاوَٹی نے اِس مندر کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ یہاں سے نکلتے وقت اِس سُور یہ مندر پر آخری نگاہ ڈالنے کے لئے وہ ایک پتّھر پر بیٹھ گئی۔ وہ دُور دُور تک دیکھتی رہی، ایک مقامی عورت، جو پھیرن پہنے ہوئے تھی، نے قریب آ کر پوچھا، میم صاحبہ، آپ لوگ اِن ویران پتھروں میں کیا دیکھنے آتے ہیں، یہاں پتّھر ہی پتّھر ہیں، ان کھنڈروں میں کیا رکھا ہے؟ شہر میں بڑے خوبصورت مندر ہیں، میں کبھی وہاں جاتی ہوں تو وہ خوبصورت مَندر دیکھتی ہوں وہ کھنڈرات نہیں ہیں۔ ڈاوَٹی نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا، تاہم وہ اِس بات چیت سے خوش ہو گئی۔

مارتنڈ مندر دیکھنے کے بعد انگریز خاتون سیاح بمہ زُوہ کے غار دیکھنے گئی۔ وہاں سے اَونتی پورہ چلی گئی، وہاں کے مندروں کے بارے میں لکھا ہے کہ لوگ اِن مندروں کو پانڈوں کے مکان بتاتے ہیں۔ روایت ہے کہ نوّیں صدی عیسوی میں راجا اَونتی ورمن نے، یہاں دو عظیم وِشنو مندر تعمیر کروائے تھے جن کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں، مندروں کا کچھ حصہ برابر ایستادہ ہے۔ مارتنڈ کی طرح یہاں بھی بڑے بڑے پتھروں پر کھدائی کر کے تصویریں بنائی گئی ہیں

شاید بڑے زلزلے، سیلاب یا کسی اور حادثے سے مندروں کے کچھ حصے زمین میں دَب گئے ہیں، یہاں کھدائی کا تھوڑا بہت کام ہوا ہے تاہم کام کو اُدھورا چھوڑا گیا ہے۔ اِن مندروں پر یُونانی طرزِ تعمیر کا خاصا اثر دِکھتا ہے۔ اَونتی پورہ سے چند میل کے فاصلے پر لَدو میں کچھ مندر صحیح وسالم حالت میں ہیں۔ نارستان میں بھی اسی قسم کا چھوٹا مندر ہے۔

اِس ملک میں بُدھ مت نے بہت کم آثار چھوڑے ہیں۔ کبھی کبھی زمین کھودنے پر مہاتما بدھ کی مورتیاں برآمد ہو جاتی ہیں۔ ویسے تو بودھ راہبوں کی تعلیمات کا سارا اثر زائل ہو چکا ہے۔ سانپوں کی پُوجا (ناگ مت) کا اثر اب بھی باقی ہے۔ لوگوں کی مذہبی رسموں کا نصف حصہ ناگ پُوجا کے ساتھ جُڑا ہُوا ہے۔ بہت کم مندر ہیں جن کے اِرد گرد خندقیں نہ کھودی گئیں ہوں یا ناگ دیوتا کی عقیدت کے طور آنگن میں پانی کا حوض نہ ہو۔ شاید ناگ دیوتا، اِسی عقیدت کے سبب زہریلا نہیں۔ یہاں سانپ کا کاٹا جان لیوا نہیں ہوتا۔ پاندرٹھن کے مندر کے گرد سب سے بڑی خندق ہے۔ یہ کشمیری فنِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ کنینگھم کے خیال میں یہ مندر پارتھ نے ۹۳۰ء میں تعمیر کروایا تھا۔ مجھے اِس مندر تک پہنچنے میں کافی دِقت پیش آئی۔ سرینگر اور بارہمولہ کے درمیان پٹن نامی گاؤں میں بھی دو خوبصورت مندروں کی باقیات ہیں۔ سرینگر میں تختِ سلیمان[1] پر ایک قدیم مندر ہے، جہاں لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ میں اس مندر کو دیکھنے کے لئے کئی بار مختلف راستوں سے وہاں تک پہنچی۔

غیر ملکی سیاحوں کے لئے

---

[1] سفرنامے میں اِسے تختِ سلیمان ہی کہا گیا ہے اور کہیں بھی شنکر آچاریہ نہیں لکھا گیا ہے۔

کشمیر میں موسم اور آب وہوا معقول اور مناسب ہے۔ یہاں سردی کا موسم خشک ہوتا ہے۔ مرطوب آب وہوا گرمی کے مہینوں میں راحت پہنچاتی ہے۔ زیادہ بارش والے حصّوں سے خشک علاقوں کی طرف بھی جا سکتے ہیں۔ یہاں کی آب وہوا تپ دِق اور عارضہٴ قلب میں مُبتلا مریضوں کے لئے فائدہ مند ہے۔ یہ اُن کے لئے بحالیٴ صحّت کا کام کرتی ہے۔ ملیریا یہاں عام نہیں' مچھّر اور مکھیاں ہیں مگر یہ ملیریا کا بخُار پھیلانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو جاتے ہیں۔ کچھ بیماریوں کے جراثیم باہر سے آنے والے مریض یہاں پھیلاتے ہیں' بچے یہاں اِس طرح پنپ سکتے ہیں جس طرح انگلینڈ میں۔ ان کے چہرے سُرخ وسفید اور ہشاش بشاش ہوں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کو کبھی گھر بھیجا جائے تعلیم اور کالجوں میں دی جانے والی تربیّت کے بارے میں جان لینا چاہئے کہ جو فرنگی یہ صلاحیت رکھتے ہیں، وہ یہاں سکولوں کے سربراہوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اگر وہ فرنگی بچوں کو پڑھائیں تو ان کے لئے فائدہ بخش کام ہوگا۔ لڑکیوں کیلئے زیادہ مُشکلات نہیں ہیں۔ کئی نوجوان عورتوں کے لئے، جو کھیتوں میں گھومنے اور آلو کاشت کرنے کی شوقین ہوں، گھر پر تعلیم کی نقد قیمت دے کر دوسروں کے ساتھ مقابلہ آرائی سے تنگ آچکی ہوں، باہر جانے میں خوشی محسوس کریں گی، وہ اُپنا پیشہ ایسے ملک میں جاری رکھ سکیں گی جہاں "آتون جی" کے بے کیف اور اُداس کرنے والے انداز کو سدھارنے کیلئے بہت کچھ کیا گیا ہے۔

مشاغل اور دِل بہلائی کے لئے یہاں کافی گنجائش ہے۔ میں نے کئی باغ دیکھے جہاں انگلستان کے پھول اُگائے گئے ہیں۔ یہاں زرخیز مٹی ہے، پانی کی فراوانی ہے، سَستے مزدور ہیں، اُچھی دھوپ ہے اور خاصی بارش۔ باغبانی کا

معمولی شوق رکھنے والا بھی اچھے سے اچھا باغ لگا سکتا ہے۔قدرتی پیداوار کو جمع کرنے کی بھی یہاں کافی گنجائش ہے۔معدنیات اور پھول، سکّے اور ٹکٹیں جمع کرنا اچھے مشغلوں میں شامل ہیں۔ یہاں کے مقامی لوگوں سے کندہ کاری، کوفت کاری، پینٹنگ، کشتی رانی، تیراکی، سکیٹنگ اور سردیوں میں برف پر کھیل کود کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔گالف اور ٹینس کو بڑھاوا دیا جاسکتا ہے۔پولو کھیلا جاسکتا ہے، کرکٹ اور والی بال مردوں کے لئے دلچسپ کھیل رہیں گے۔ پہاڑوں پر چڑھنا اور میدانوں کی سیر کرنا، بہت اچھے مشغلے ہیں۔گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہوکر اونچائیوں تک جانا بہت خوشگوار لگتا ہے۔ کشمیر میں مہم جوئی اور کوہ پیمائی کے کافی امکانات ہیں۔آرٹسٹ کے لئے یہاں ہر قسم کی خوبصورتی موجود ہے۔ ہر قسم کے ساز بجانے کے لئے موسم مناسب اور معقول ہیں۔کشمیر میں لوہا موجود ہونے کی خبریں بھی آرہی ہیں۔یہاں قیمتی پتھر کثرت سے دستیاب ہیں۔کارخانوں کے لئے اچھا خام مال دیستاب ہے۔ مثلاً کپڑوں، قالینوں اور ریشم کے لئے۔میووں، سبزیوں اور دیگر فصلوں کی ترّقی کے لئے ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔مہاراجہ کے قلمرو میں ریل لانے کے لئے بے شمار وسائل اور رقومات کی ضرورت پڑے گی، تاہم موجودہ سڑک کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر سردیوں کے دَوران سڑک کو آمدورفت کے قابل بنائے رکھنے کیلئے کوئی جدید لائحہ عمل تیار کیا جاسکے اور دیکھ بال کرنے والے ملازم لگائے جائیں تو کشمیر ہندوستان کو سبزیاں، خشک میوے اور دیگر چیزیں سپلائی کرتا رہے گا اور کافی زرِ مبادلہ حاصل کرتا رہے گا۔پھر بھی موجودہ حالات میں میوے کی صنعت کشمیر

میں کافی منافع بخش ہے، کاش یہاں میوہ جات محفوظ کرنے، رَس نکالنے اور JAM بنانے کے لئے انتظامات کئے جاسکیں۔ کھانڈ اور ٹین کے ڈبوں کی قلّت اور یورپی ماہر کی عدم دستیابی سے اِس صنعت کو نقصان ہورہا ہے۔ غیر ملکیوں کے لئے شراب کی فراہمی بھی فائدہ مند کام ہے۔

بہت سے فرنگی سڑکوں کے ٹھیکیداروں، تعمیر کاروں، انجینئروں اور ٹیکنیکی ماہرین کی حیثیت سے روزگار حاصل کرتے ہیں۔

آخر بات

ڈاوُٹی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، پھر بھی چند سُنی سُنائی باتیں بھی لکھی ہیں، کچھ دستیاب تواریخی کُتب کا مطالعہ کرکے بادشاہوں کے بارے میں لکھا ہے۔ کشمیر کی تواریخ، کوہ پیمائی اور دریاؤں کے بارے میں ڈاوُٹی نے سطحی باتیں تحریر کی ہیں۔ اُس نے تمام پہاڑی سیر گاہیں نہیں دیکھی ہیں۔ اصل میں وہ حُسنِ فطرت، پھولوں اور پودوں کا نظارہ کرنے کیلئے آئی تھی۔ اُس کی کتاب پڑھ کر بعض اُوقات کسی خوبصورت رُومانوی ناول کا گمان ہوجاتا ہے۔ وہ جن لوگوں سے ملی ہے، اُن کی نفسیات جاننے کی کوشش کی ہے۔ اِنسانوں، عمارتوں اور جھیلوں کو دیکھ کر اَپنے تاثرات اُچھوتے ڈھنگ سے بیان کئے ہیں۔ اُس نے کئی مقامی گیتوں کے ترجمے بھی اُپنی کتاب میں شامل کئے ہیں۔ ڈاوُٹی نے زعفران کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مچھلیوں کے شکار کی بات بھی نہیں کی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ چیزوں کے دام زیادہ نہیں ہیں، ایک روپے میں پانچ مُرغے خریدے جاسکتے ہیں، دّو آنوں میں ایک دَرجن انڈے اور ایک روپے میں ۲۲ سیر دُودھ ملتا ہے۔

-*-

سیوا سنگھ

گورو ہری رائے صاحب کشمیر میں ......ایک انکشاف

گوُرو نانک دیو جی، سِکھ مذہب کے بانی اور چھٹے گورو، گورُو ہر گوبند صاحب جی کی کشمیر آوری کے سِلسلے میں تاریخی حوالے ملتے ہیں لیکن ساتویں گورُو جی، گورو ہری رائے صاحب کی کشمیر میں آنے کے بارے میں تواریخی حوالے نہیں ملتے تھے۔ سِکھ تاریخ دانوں نے بھی اِس کے بارے میں خاموشی اِختیار کی لیکن ہمارے ایک بزرگ محقق بھائی اَمرَاٹل سنگھ نہنگ، جو کشمیر کے ہی باشندے تھے، نے اِسے اَپنی اَنتھک محنت سے اِس حقیقت کو آشکارہ کیا اور گورو ہری رائے صاحب کی کشمیر میں آمد کا پتہ لگالیا۔ آپ نے اِس سلسلے میں دیوی آنگن میں چاہِ گورو ہری رائے صاحب کی نشاندہی کر کے اِس کے بارے میں تحقیق کا آغاز کیا۔

اَمرَاٹل سنگھ نہنگ کے اَپنے ایک مضمون "ستگورو ہری رائے دی کشمیر پھیری" جو پنجابی ساہت سبھا، سرینگر کے جریدے "ہیمال" کے نمبر ۸ میں

۱۹۷۰ء میں شائع ہُوا، کے بارے میں اِنکشاف کیا گیا ہے۔ نہنگ صاحب اُپنی تحقیق کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چاہِ گورو ہری رائے (جو قلعہ ہری پَربت دیوی آنگن، سرینگر) جو گورو ہر گوبند صاحب کے استھان ہی چند ہی فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے، کے بارے میں کچھ ٹھوس ثبوت پیش کرتے ہیں آپ رقمطراز ہیں۔ ''اِس گوردوارے کے بارے میں خاصے اور مکمل ثبوت ملتے ہیں، جو تاریخِ کلاں میں ہیں۔ (یہ تاریخ سکھ راج میں کرنل میاں سنگھ نے لکھوائی اور اَب پٹیالہ میں موجود ہے۔) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دَور میں اِس گوردوارے کے ساتھ ایک بڑی جاگیر منسلک کی تھی اور اِس گوردوارے کو ''چاہِ گورو ہری رائے'' کہا جاتا تھا۔ کیونکہ یہاں ایک کنواں بھی ہوتا تھا۔''
(رسالہ ہیمال صفحہ ۴۰ اِنک نمبر ۲)

آپ آگے لکھتے ہیں۔ ''سری گورو ہری رائے صاحب کے کشمیر آنے کا ذکر گیانی گرجا سنگھ کے غیر شائع شدہ مسوّدے ''راشٹری گورو گوبند سنگھ وِچ'' جو پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی لائبریری میں موجود ہے، سے ملتا ہے۔ ایک مسوّدے میں ایک اور جگہ ''گورو دِیاں ساکھیاں'' کے حوالے بھی ملتے ہیں۔''

نہنگ صاحب گیانی گرجا سنگھ موضع خراج پورہ تحصیل راج پورہ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ''فیروز پور میں دَب والی ملکہ دِی منڈی میں سنت گور دَت سنگھ کے پاس ایک مخطوطہ ''گورو دِیاں ساکھیاں'' ہے۔ گیانی گرجا سنگھ کے مطابق، سُروپ سنگھ نے یہ سموت ۱۸۴۷ بکرمی میں لکھا ہے۔ اِسی مسوّدے میں لکھا ہوا ہے کہ ''گورو ہری رائے ۱۷۱۷ بکرمی میں کشمیر چلے گئے اور ۱۷۱۸ بکرمی میں کیرت پور آ گئے۔'' میں نے فیروز پور کے سنت گور دِت سنگھ سے

موخرالذکر مسوّدے کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن کوئی پتہ نہ چلا۔ سنت گوردت سنگھ کے مطابق جس مسوّدے کا ذکر ہو رہا ہے، گیانی گرجا سنگھ کے پاس ہی ہونا چاہیئے۔" (رسالہ ہیمال صفحہ ۱۴۰-اِشاعت نمبر۴)۔

تاریخِ کلاں میں گوردوارہ سِری گوروہری رائے یا چاہِ گوروہری رائے کا ذکر ―――――― اِس طرح درج ――― ہے:-

اُراضی والاہ=۲۱۲

پرگنہ آرون=۲۱۳

دیہات چیتی ہائے بروبست.......... موضع کاوُدرکوو-زمینی پچان پورہ باسم دیوان سنگھ گرنتھی چاہِ گوروہری رائے۔

پاچن پورہ-آبی ۲۱ کنال	خشکی ۲ کنال
کاوُ کرر کے-آبی ۴۵ کنال	خشکی ۴۰ کنال
کر کے گاؤں-آبی ۱۰۰ اکنال	خشکی ۶۰ کنال/۴۴ کنال

آگے چل کر نہنگ صاحب لکھتے ہیں کہ کشمیر میں سِکھ راج کے خاتمہ کے بعد ڈوگروں نے حکومت سنبھالتے ہی سِکھوں کی جاگیریں ضبط کرلیں۔ اُنہیں دیہات کی جانب بھگا دیا' شہروں سے نکال دیا اور بے اَنداز سختیاں کیں۔ اِس کے نتیجے میں گوردوارہ ہذا کے گرنتھی صاحبان بھی بھاگ گئے۔ بھائی دیوان سِنگھ گرنتھی کو بھی بھگا دیا گیا۔ اُن ہی دِنوں ضلع ہوشیار پور، پنجاب سے آئے دو تاجر بھوانی رائے اور سمانی رائے یہاں آباد ہوگئے۔ بھوانی رائے کے لڑکے حاکم رائے نے گوردوارے میں ڈیرہ جمالیا اور اس جگہ کا نام چاہِ گوروہری رائے سے بدل کر ہاک بازار رکھ دیا، جو اَب تک بھی رائج ہے۔

حاکم رائے کی اُولاد کا نہنگ جی نے ذات نامہ بھی دیا ہے جن کی اُولاد سکھ بن گئیں، ہری سنگھ منشی، سنت سنگھ اور موجودہ اُولاد سے بھاگ سنگھ قابل ذکر ہیں۔ چاہِ گوردہری رائے کے ساتھ لگی ہوئی جائیداد پر حاکم رائے کی اُولاد کا قبضہ ہے۔ منشی سنت سنگھ کو شالی سٹور کے لئے سنگاڑوں کے ٹھیکے میں گھاٹا ہو جانے پر اُس کی تمام جائیداد قرق کر کے نیلام کی گئی جسے ہری پربت کے داروغہ کرم چند پنجابی نے نیلامی میں خرید لیا۔ کرم چند نے گوردوارے کی چھت اُکھاڑ کر اِس جگہ پانی کی پکی ٹینکی بنوادی اور منشی سنت سنگھ کے مکان میں خود رہنے لگا۔ منشی، شارکا دیوی کے احاطے میں جا ٹھہرا اور ''چاہِ گوردہری رائے'' اور گرنتھ صاحب کا مخطوطہ اپنے ساتھ لے گیا۔ آج تک یہ جِلد بھاگ سنگھ کے پاس ہے۔ (ستگوروہری رائے دی کشمیر پھیری ہمیال اَنک-۴، صفحہ ۴۴)

''بعد ازاں بعد نرائن سنگھ، عطر سنگھ (ہری سنگھ کے بیٹے اور حاکم رائے کے پوتے) نے مقدمہ کر کے اپنا حصہ، ۸ کنال ۱۶ مرلے زمین واپس لے لی۔ تو ایسے میں چاہِ گوروہری رائے عطر سنگھ کے حصہ میں چلا گیا اور گوردوارہ کرم چند کے پاس ہی رہا۔

''۱۹۳۱ء کے مسلم کانفرنس کی طرف سے چلائی گئی تحریک میں گلنسی کمیشن بٹھایا کیا گیا۔ اُن ہی دنوں میں سکھوں کی جانب سے ضبط شدہ جاگیروں کو واپس دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ گورنر عطر سنگھ کی سرکردگی میں قائم کی گئی کمیٹی کی رپورٹ جو سردار موہن سنگھ نرمان کے کتابچہ ''ہمارا کشمیر اور آوازِ حق'' کے مطابق حسب ذیل کاروائی کا ذکر ملتا ہے:۔

''گوردوارہ ہری گوروہری رائے جی! ہری پربت

۱۔تحصیلدار کے ریمارکس = کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔

۲۔گورنر کے ریمارکس = پٹہ جات جو سِکھوں نے پیش کئے ہیں ـــــــ ـــــــ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکھوں کو ۳۶۰ روپے جو کہ موجود (اُس وقت کے سِکّہ کے مطابق ۲۲۴ کے برابر ہیں، موضع کا وُڈارہ تحصیل کولگام کا مالیہ بطور معافی ملتے ہیں جو کہ اَب بھی ملنے چاہئیں اِس کے علاوہ گوردوارہ مذکورہ کے ساتھ پاتشاہی باغ جو کہ اَب بھی محکمہ ایگریکلچر کے قبضہ میں ہے۔ لال منڈی کے پاس جہاں سلک فیکٹری اور ایگریکلچر باغ ہے (ستگورو ہری رائے کی کشمیر پھیری ہیمال اِشاعت نمبر ۴ صفحہ ۴۴)"

اِس فیصلے کے مطابق کسی بھی گوردوارہ کمیٹی نے گوردوارہ کے ساتھ منسلک زمین و جائیداد اور چاہِ گووہری رائے کے یادگاری گوردوارے کو حاصل کرنے یا اس کی تعمیر وغیرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

بھائی اَمرِاٹل سنگھ نہنگ کی تحقیق قابلِ ستائش ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بھی آپ نے جو ریسرچ کی اُس کی تعریف ـــــ لازمی ہے۔ جس مسوّدے کو حاصل کرنے کے لئے آپ نے ایک لمبا سفر کیا وہ اَب چھپ کر ہمارے سامنے ہے۔ اِسے بھائی سروپ سنگھ نے کوششوں سے حاصل کیا جس میں سکھ گوروؤں صاحبان کی سوانح حیات کا ذکر ملتا ہے۔ اِس تحریر کو ۱۹۹۰ء میں شائع کیا گیا جسے پروفیسر پیارا سنگھ پدمؔ نے ایڈٹ کیا اور سنگھ برادرز اُمرتسر نے شائع کیا۔ اس تاریخ کو بھٹ ہی کھاتہ سے لیا گیا ہے۔ یہ تحریریں گورو صاحبان کی زندگی کے بارے میں ہم عصر واقعات پر مبنی ہیں اور صحیح واقعات پیش کرنے کے دعویدار ہیں۔ "گوروکیاں ساکھیاں" اُٹھارہویں صدی کے

آخیر میں موضع بھادسوں، ضلع تھانیسر کے باشندے بھائی کیسر سنگھ کے عالِم بیٹے سروپ سنگھ کوشش نے اُپنے باپ دادا کے خزانے بھٹ بہی کھاتوں کی بنا پر ''گوروکیاں ساکھیاں'' ۱۹۹۰میں ترتیب دی۔

اِسی تصنیف میں ہمیں گوروہری رائے کے کشمیر میں وارد ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ گوروصاحبان نے کشمیر میں سکھ مذہب کی تبلیغ کی طرف کافی دھیان دیا ہے۔ گورواَرجن دیو جی کے وقت بہت سے نامور مبلّغ کشمیر میں پرچار کے لئے روانہ کئے گئے جن میں بھائی گورداس بھائی گھڑیا۔ بھوئی مادھوسوڈی وغیرہ مشہور ہیں۔

''گوروکی ساکھیاں'' کتاب سے گوروہری رائے صاحب کی کشمیر کی یاترا کے بنیادی مضمون کا حوالہ دیکر ہم اِس مضمون کا اختتام کرینگے۔

''ساکھی نمبر۶۔ گوروجی جلال پور جٹاں سے وارد ہوئے کشمیر دیس جانے کو۔

''.......... برس ۱۷۱۷سموت کو بیساکھی کا تیوہار راجہ شل کی نگری، شول کوٹ میں جائے منایا۔ بھائی نندلال اُپنے دونوں بچوں بھاگ مل کو ساتھ لیکر گوروجی کے چرن چھوئے۔ ستگورجی نے کچھ دِن شل کوٹ میں نواس کرکے آگے جانے کی تیاری کی۔

بھائی مکھن شاہ، جو گوروکا سکھ تھا اِس کا ٹانڈا کشمیر دیس میں جا رہا تھا۔ ستگورجی اِس کے ٹانڈے میں شامل ہوئے سرینگر جائے پر ویش کیا۔ (نوٹ = گوروہررائے جی کا ساتواں بٹیا بابا گوردِتا جی سموت ستر ہ سوستر ہ کرشنا پکھ جیٹھ مہینے کی پانچویں کے دِن سرینگر آئے۔ کشمیر دیس میں کئی سکھ مکھن شاہ کے ٹانڈے میں چار مہینے کشمیر دیس میں رہے) صفحہ ۴۴-۴۵ (گورہری رائے جی، گوروہرگوبند صاحب کے پوتے تھے اور آپ کے بڑے

بیٹے بابا گور دِتا جی کے فرزند تھے)

بھائی داسا، بھائی اَڑو رام وغیرہ سکھوں کے ساتھ سری نگر سے چل کر مٹن، مارتنڈ تیرتھوں کی یاترا کر کے بھائی مکھن شاہ کی نگری موٹے ٹانڈے میں جا ٹھہرے۔ خدا کی مرضی مکھن شاہ کا باپ بھائی راسا موتے ٹانڈے میں گور پُری مین سد مار گیا تھا۔ بھائی مکھن شاہ سے وِدائیگی لے کے کشمیر دیس کا دورہ کر کے واپسی میں اَکھنور اور دیگر مقامات سے ہوتے ہوئے سری رام جی کے ارنن بھگت سری جامہ ونت کی نگری جموں میں آ کر پرویش کیا۔ گورو جی جموں آنے کا سُن کر بھائی کا ناہ علاقے کی سکھ سنگتوں کا پروانہ لے کر درشن پانے آیا"

(صفحہ ۴۵-۴۴ گورو کیاں ساکھیاں)

بھاٹ لوگوں کے بہی کھاتے کا حوالہ دینا اِس لئے ضروری تھا تا کہ گورو ہری رائے سکھوں کے ساتویں گورو جی کی کشمیر میں آمد کے بارے میں کوئی شک وشکوک نہ رہیں۔ جہاں بھی گورو صاحبان تشریف لے گئے وہ جگہ پاک اور پوتر ہوگئی۔ چوتھے گورو جی فرماتے ہیں "جتھے جائے بہے میرا ستگورو، سوتھان سہاوا رام راجے۔"

گور سکھی سوتھان بھا کیا۔ لے دھوڑ مکھ لاواں رام راجے (آسا چھنت سے)

تشریح۔ (جہاں میرے ستگورو کے پاک قدم پڑے وہ جگہ پاک ہوگئی۔ گورو جی کے سکھوں نے اُس مقام کو ڈھونڈ لیا اور ہمارا ماتھا اُس دُھول سے پاک پوتر ہوگیا۔ لیکن افسوس ہے کہ کشمیر کی سکھ سنگت نے اس جگہ کی پاکیزگی کو جانتے ہوئے بھی اِسے نظر انداز کر دیا اور مالکان نے چاہِ گورو ہرائے کو فروخت کر دیا!۔

☆★☆

محمد اقبال نازکی☆

الیکزنڈرزوماڈی کراس-لداخ میں

ہنگری کی موجودہ نسل نوّیں صدی عیسوی میں مشرق سے آکر ہنگری میں آباد ہوئی۔ اُن میں اَپنے آباواَجداد کے بارے میں جاننے اوراَپنے ماضی سے روشناس ہونے کی زبردست خواہش ہے اوریہی اُن کی مشرق میں دلچسپی لینے کی سب سے بڑی وجہ بنی۔ تیرھویں صدی عیسوی سے ہی اُن کے محققّین اَپنے بچھڑے ہوئے ہم نسل لوگوں کی تلاش میں ایشیاء کی طرف روانہ ہوئے۔ الیکزنڈرزوڈی کراس نے اِسی جذبے کے تحت مشرق کا رُخ کیا۔

الیکونڈرٹرانسلو ینیا ہنگری کے ایک غریب لیکن معزّز خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان ''ژیکلے'' نام سے جانا جاتا تھا اوراِس خاندان کا آبائی پیشہ سپاہ گری تھا۔ اُس نے گوٹینگن کی مشہور یونیورسٹی میں سرکاری وظیفے پر تعلیم حاصل کی تھی۔ روایات کے مطابق ''ژیکلے'' اورہنگری کے دُوسرے لوگ ہُنوں کی اولاد تھے۔ ہُنوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چوتھی صدی

☆ کواپریٹو کالونی-پیرباغ سرینگر

عیسوی میں انہوں نے اٹِلا کی سر براہی میں چینیوں اور رُومیوں کا مقابلہ کیا تھا۔چینی اُنہیں ''ہگنو'' نام سے جانتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹِلا کی سلطنت کا مرکز ہنگری تھا۔اٹِلا کے بارے میں مشہور ہے کہ اُس کی میت لوہے، چاندی اور سونے کے تین تابوتوں میں ٹسزا دریا میں زیرِ آب دفن ہے۔

۱۷۰۴ءاور ۱۷۱۱ء کے درمیان 'رکوکزی'' کی سر براہی میں ہنگری کی تحریکِ آزادی کو بڑی سختی کے ساتھ دُبایا گیا تھا۔اِس کے تقریباً ایک صدی بعد اُنیسویں صدی کے اُوائل میں ہنگری دُوبارہ خوابِ غفلت سے بیدار ہورہا تھا۔ یہ سخت مفلسی کا زمانہ تھا، لیکن ایسے موقعوں پر قومی تشخص' دال روٹی سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور قومی تشخص قائم رکھنے کے لئے ایک شاندار ماضی کا ہونا لازمی ہے۔اِسی جذبے کے تحت الیکزینڈر نے اُپنے اَسلاف کی کھوج کا بیڑ ا اُٹھایا۔ اَپنے آباو اَجد اد کو پہچاننے کے لئے وہ اُن ''ہنوں'' یا 'ہنگریوں'' کی تلاش میں تھا جنہوں نے نقلِ وطن نہیں کیا تھا اور اَب تک ایشیاء میں ہی سکونت پذیر تھے۔لِسانی مطالعے اور تواریخی شواہد کی بنیاد پر وہ نقلِ مکانی کے روائتی مفرد ضے کو ایک سائنٹفک بنیاد فراہم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اُنیسویں صدی کے اِبتدائی برسوں میں وَسطِ ایشیاء کے عظیم سفر پر روانہ ہوا، اس طرح سے اس نے ہنگری میں مطالعۂ ہند کے اِمام کا درجہ حاصل کرلیا۔ الیکزنڈر بالکل بے یارومددگار تھا، کوئی ایسی سرکار نہ تھی جو اُس کی اعانت کرتی۔ اُس کے پاس پاسپورٹ تک بھی نہ تھا، سوائے ایک اِجازت نامے کے 'جس پر وہ بُکاریسٹ تک جاسکتا تھا۔اُس کی ذاتی صلاحیتیں ہی اُس کا بہت بڑا سرمایہ تھیں۔اُسے کئی غیر ملکی زبانوں پر عبور تھا، جیسے عربی، فارسی، روسی، تُرکی اور

انگریزی۔ یہ زبانیں اُس نے بیتھالن کالج وار گوٹینگن میں سیکھ لی تھیں، جہاں اُس نے برطانوی وظیفے پر دوسال تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اُس زمانے میں ''بیتھلین'' کے ضرورت مند طلباء کو وظیفے باقاعدگی سے مِلا کرتے تھے۔ الیکزنڈر کی دُوسری اہم خوبی تھی کہ وہ لمبی مسافتیں پیدل طے کرسکتا تھا۔ اُس کی ذاتی ضرورتیں بہت مختصر تھیں۔ وہ بغیر پلنگ اور بستر کے سوسکتا تھا۔ غذا کے معاملے میں بھی وہ بے نیاز تھا۔ اُسے جو کچھ ملتا اور جتنا ملتا، زندہ رہنے کے لئے کھالیتا تھا۔ اُسے غریب اور سادہ لوح لوگوں کی صحبت پسند تھی۔

تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ وہ قسطنطینہ پہنچا لیکن وَبا کی وجہ سے تُرکی عبور نہ کرسکا اور اِس لئے اسکندریہ، دمشق اور تہران سے ہوتا ہُوا بُخارا پہنچا۔ وہاں سے وہ جنگی اَفواہوں کی وجہ سے جنوب مشرق کی طرف روانہ ہوسکا۔ ایک دفعہ اور اُسے اپنی سِمت تبدیل کرنا پڑی اور کابل، لاہور اور سرینگر سے ہوتے ہوئے قراقرم کے راستے وسطِ ایشیاء میں داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن اُسے لداخ کے صدر مقام لیہہ سے آگے جانے کی اجازت نہیں ملی۔

الیکزنڈر لداخ میں:-

الیکزنڈر جیسے ماہرِ لسانیات کے لئے لداخ کوئی نامناسب جگہ نہیں تھی۔ لداخ کے قدیم وِہاروں میں بیش بہا خزانے چھُپے ہوئے تھے۔ اِن سے کسی نے فائدہ نہیں اُٹھایا تھا۔ اوّل تو اِن کتب خانوں تک رسائی نہیں تھی، دوسرے کوئی بھی یورپی، اِن کتابوں کی زبان سے واقف نہیں تھا۔ الیکزنڈر اِن مخطوطات کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ کہیں نہ کہیں اُسے اُپنے اُن پیشروؤں کا سُراغ ملے گا، جن کی تلاش میں وہ سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اُن دِنوں انگریز سیاح

وِلیم مُور کرافٹ بھی لداخ میں تھا۔ الیکزنڈر نے ''مُور کرافٹ'' کی طرف سے اِمداد کی پیش کش خوشی خوشی قبول کرلی، اور لداخ میں رہ کر تبتّی زبان کا گرائمر اور لغت ترتیب دینے میں مصروف ہوگیا۔

الیکزنڈر زوماڈی کراس کو لداخ میں اپنی منزل نہیں ملی، یعنی وہ اپنے آباواَجداد کے بارے میں کوئی سُراغ حاصل نہ کرسکا، البتہ ایک قیمتی خزانہ اُس کے ہاتھ لگا۔ سنسکرت زبان کی ایسی تصانیف اُسے ملیں جو صدیوں پہلے ہندوستان سے نابود ہوچکی تھیں۔

الیکزنڈر نے سوچا تھا کہ گرائمر اور لغت مکمل کرکے وہ سال بھر کے بعد وسطِ ایشیا کے سفر پر نکل جائے گا، لیکن قسمت کو یہ منظور نہ تھا۔ اپنی دریافت نے اُسے جکڑ کے رکھا جو بودھی علم وحکمت کا ایک خزانہ تھا۔ اِس طرح سے اُس نے پہلے تبتّی اور سنسکرت اور بعد میں بنگالی اور سنسکرت کے بودھی اَدب پر کئی برس تک کام کیا۔

لداخ اور کناور کے وِہار برف پوش چٹانوں میں ہیں، جہاں تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ الیکزنڈر نے پہلے آٹھ سال اِنہی وِہاروں میں گزُارے۔ قسمت نے بھی یہاں اُس کا ساتھ دیا، اُس کی ملاقات ایک سچے گُرُو پھنزوکھ سے ہوئی۔ پھنزوکھ مختلف علوم کے اہم مآخذ سے واقف تھا اور الیکزنڈر کی مدد کرنے کیلئے آمادہ ہوا۔ اُس نے الیکزنڈر کے بیان کو متعارف کرایا جو نہ صرف یورپیوں کے لئے بلکہ ہندوستانیوں کے لئے بھی چھُپے ہوئے خزانے تھے۔ الیکزنڈر کے بیان کے مطابق زانسکار کے لاماژھنگے پھنزوکھ کا تعلق سُرخ لباس والے ملک سے تھا۔ وہ طب، فلکیات اور نجوم میں پیشہ ورانہ مہارت رکھتا تھا۔ وہ گرائمر،

خوش نویسی، شاعری، فصاحت و بلاغت، فنِ مناظر اور ریاضی میں کمال حاصل کر چکا تھا۔ مذہب کے مکمل نظام سے وہ پوری طرح واقف تھا اور کتابی علم کے علاوہ سماجی رسم و رواج، عادات و اطوار، اقتصادیات، تاریخ اور تبتی ممالک کی جغرافیہ پر بھی گہری نظر رکھتا تھا۔ اپنے شاگرد الیکزنڈر زوماڈی کراس کو وہ گروشِ روایات کے مطابق تربیّت دیتا رہا۔ ضرورت پڑنے پر وہ اُس کے لئے چھوٹے چھوٹے مقالے بھی لکھا کرتا تھا۔ جب کبھی اُسے محسوس ہوتا تھا کہ شاگرد مطمئن نہیں ہوا، تو وہ زانسکار کے دُوسرے مشہور لاماؤں کی طرف رجوع کرتا تھا تا کہ اُس کے فرنگی طالبِ علم کی پیاس بجُھ سکے۔ سوال و جواب پر مشتمل چند کتابیں اَب بھی لداخ کے وِہاروں میں محفوظ ہیں۔ مطالعۂ تبّت کے عظیم عالم اے، ایچ فرینکی نے الیکزنڈر زوماڈی کراس کے اِس میراث کا ''ملنڈ اپنا'' کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ ہنگری کی اکیڈمی آف سائینسز کی لائبریری میں محفوظ الیکزنڈر کی ذاتی استعمال کی کتابوں کا سیٹ ۱۹۷۷ء میں انٹرنیشنل اکیڈمی آف اِنڈین کلچر کے تعاوّن سے دِلی سے شائع ہوا۔

الیکزنڈر زوماڈی کراس اور ایشیا ٹیک سوسائٹی آف بنگال:-

۱۸۲۴ء سے الیکزنڈر کی سوسائٹی کی طرف سے ۵۰ روپے ماہوار وظیفہ مِلا کرتا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اُس نے بنگال جا کر اپنی تحقیق سے متعلق کاغذات سوسائٹی کے سامنے پیش کئے۔

الیکزنڈر زوماڈی کراس کی دُو مشہور کتابیں تبتی لغت اور گرائمر ۱۸۳۴ء میں شائع ہوئیں۔ اُس کی قبر پر سوسائٹی نے جو کتبہ نصب کرایا تھا اُس کے مطابق دُو کتابیں اُس کی شاہکار ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد کے مصنفّین نے بھی

اِنہی کتابوں کو بنیاد بنا کر پیش رفت کی ہے۔ تبّتی لغت اور گرامر کی تصنیف میں آئی جی شمٹ، ایس چندر اداس، ایچ اے جاسکی وغیرہ دوسرے کئی علماء نے اِن سے استفادہ کیا ہے۔ یہ تصنیفات اُنیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں کئی مرتبہ ہندوستان اور انگلستان سے شائع ہوئیں ہیں اور برابر اَب تک استعمال کی جاتی ہیں۔

گو اِس کی دو اور کتابیں زیادہ مشہور نہیں ہیں، لیکن اِن کی اہمیت بودھی اور سنسکرت مطالعے کے لئے اوّل الذکر سے کچھ کم نہیں۔ پہلی تصنیف، پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی ''مہاویتپتی،، لغت کا انگریزی ترجمہ ہے، جو بُدھ مذہب سے متعلق سنسکرت اور تبّتی اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ دُوسری کتاب کا تعلق تبّتی زبان میں بودھی ترپٹیکا کے مضامین اور اُن کے جائزے سے ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۸۳۴ء میں ایشیاٹیک ریسرچز میں شائع ہوئی اور ۱۸۸۱ء میں اِس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہُوا۔ اِس کتاب سے سنسکرت زبان میں بودھی اَدب کے مختلف پہلوؤں کا اَندازہ ہوتا ہے۔ اُس وقت تک یہ اَدب بڑی حد تک ہندوستان سے مفقود ہو چکا تھا۔

اُس زمانے کے جرنل آف ایشیاٹیک سوسائٹی آف بنگال کے تقریباً ہر شمارے میں کہیں نہ کہیں الیگزنڈر وماڈی کراس کی تحریر ملتی ہے۔ یہ تمام تحریریں بودھی فلسفے، اَدب، تاریخ، گرائمر کے مسائل، لغات اور دیگر مضامین میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اِن میں سے بیشتر مقالے ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے دوبارہ شائع ہوئے اور ایک چھوٹا مجموعہ ۱۹۵۷ء میں کلکتہ سے ہی شائع ہوا۔ اِن مضامین کا خلاصہ ڈکا نے الیگزنڈر کی سوانح حیات میں شامل کر دیا ہے، جو ۱۹۸۵ء میں ہنگری اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔

الیکزنڈرز وماڈی کراس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لوکیش چندر لکھتا ہے کہ "اس نے تبتی زبان میں چھُپے ہوئے خزانوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اِن خزانوں کے نوادرات میں ہندوستانی آرٹ، فلسفہ، ادَب، گرائمر، لغات، طِب، دھات سازی، فلکیات، کیمسٹری اور دوسرے علوم شامل ہیں۔ اِس طرح سے الیکزنڈر نے ہندوستانی تاریخ کا ایک تاریک باب روشن کیا ہے۔ الیکزنڈر ایشیاٹِک سوسائٹی کے اعزازی ممبر اور ہنگری کی اکیڈمی آف سائنس کے ممبر چُنے گئے تھے۔ یہ کامیابیاں اِس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ اِن سے اُس کی زندگی اور اُس کے معمولات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اُس نے وہی زندگی بسر کی جس کا وہ ہمالیہ کے پہاڑوں میں عادی ہو چکا تھا۔ وہ تھوڑے سے اُبلے ہوئے سادہ چاول کھاتا تھا اور چائے پیتا تھا جو اُس کا من پسند مشروب تھا۔ شراب یا اُس قسم کی دوسری اشیاء کا اُس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ چٹائی بچھا کر فرش پر بیٹھتا تھا اور اُس کے چاروں طرف کتابوں کے صندوق ہوتے تھے۔ اِسی چٹائی پر سوتا بھی تھا اور پڑھتا لکھتا بھی۔ دن کے وقت وہ شاذ و نادِر ہی باہر جاتا تھا اور رات کو ہمیشہ لباس پہنے ہوئے ہوتا تھا۔

الیکزنڈر نے ہندوستانیوں سے ایک خاص قسم کا رشتہ قائم کیا تھا لیکن اُس کے سوانح نگاروں نے اِس رشتے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اِس رشتے کی وجہ سے انگریزی افسر نہ صرف اُس کا مذاق اُڑاتے تھے بلکہ ہندوستانیوں کے تئیں اُس کے جذبے کو بیوقوفی سے تعبیر کرتے تھے۔ الیکزنڈر نے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا ہے، ہاں البتہ برطانوی افسروں کے بیانات سے

اُس کے ہندوستانیوں کے تئیں رویئے کا اظہار ہوتا ہے۔

اُس کے بارے میں کیپٹن کینڈی نے لکھا ہے کہ وہ یورپیوں کی توجہ کا محتاج نہیں تھا، بلکہ وہ اُن کی صحبت سے کتراتا تھا، اس کی ضرورتیں بہت ہی مختصر تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ہی اعتدال پسند تھا۔ وہ تھوڑے سے اُبلے ہوئے چاول کھاتا تھا اور چائے شوق سے پیتا تھا۔ اُس کے خورد و نوش کا خرچہ کسی بھی مقامی دیہاتی کے خرچ سے زیادہ نہ تھا۔ شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں سے وہ ہمیشہ پرہیز کرتا تھا۔

۱۸۳۵ء سے ۱۸۳۷ء تک وہ بنگال کے ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھا اِس دَوران میجر لائیڈ نے اُس کو اپنے گھر میں رکھنا چاہا تھا، لیکن ایسی پیش کش اُس کو منظور نہ تھی جس سے مُقامی لوگوں کی صحبت اور رُفاقت سے محروم ہو جاتا۔ وہ روزمرّہ کی زندگی میں اُن کے ساتھ اور گہرے مراسم کا خواہشمند تھا۔ لائیڈ کا کہنا ہے کہ میں نے پھر اُس کے لئے ایک عام سی کٹیا کا انتظام کیا اور اُسے حتی المقدور اُس کے لئے آرام دہ بنانے کی کوشش کی لیکن وہ اُس سے بیزار ہی نظر آتا تھا۔ میں نے اُس کے لئے ایک ملازم کا بھی انتظام کیا جس کو وہ تین چار رُوپے ماہوار تنخواہ دیتا تھا۔ اس کے دیگر اخراجات بھی چار رُوپے سے کچھ زیادہ نہ تھے۔

الیکزنڈر کے روّیے پر کیپٹن کینڈی اور میجر لائیڈ کی حیرانگی ہمارے لئے کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں۔ (لائیڈ وہی صاحب ہیں جنہوں نے بہت جوش و خروش سے دارجلنگ بسایا تھا) یہ دونوں حضرات ایک بالکل مختلف پسِ منظر میں ہندوستان آئے تھے جبکہ الیکزنڈر کا مقصد کچھ اور تھا، وہ کوئی فوجی یا تاجر

نہیں تھا۔ اُس کا تجسس کوئی رئیسانہ اَدا نہیں تھا۔ وہ ایک دوست تھا جو دوستوں کے درمیان اَپنے اَسلاف کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ ایشیا کی شان اور عظمت کا قائل اور ماضی کا مدّاح تھا۔

الیکزنڈر زوماڈی کراس کی کاوَشوں اور کارناموں کے رپورٹ عصری پریس میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ ابتداء میں یہ رپورٹ اُس کے ہم وطنوں کی مایوسی کا باعث بنے۔ اَپنے شاندار ماضی کا سراغ نہ پانے کی وجہ سے الیکزنڈر خود بھی اَپنے کام سے مطمئن نہ تھا۔ ہنگری اکیڈمی نے جو رقم اُس کے لئے عوام سے اکٹھا کی تھی، وہ بھی اُس نے یہ کہہ کو لوٹا دی تھی کہ "میں ابھی تک اَپنی قوم کے لئے کچھ نہ کر سکا" اس کے باوجود اُس کی مہم جوئی اور عظیم کارناموں نے اُس کے ہم وطنوں کا دِل موہ لیا تھا۔

اُس کی زندگی اور کارناموں کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اُپنے بارے میں غلط رائے قائم کی تھی۔ اُس کی موت کے بعد بھی اُس مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ لوگ اِس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اِس ملک کے ایک سپوت نے اپنا بڑا کام کیا ہے۔ انہیں ناز ہے کہ اُس نے لداخ اور وسطِ ایشیا کے ورثے اور تمدّن کو بہتر طور پر سمجھنے میں اَپنا حصّہ اَدا کیا ہے۔ الیکزنڈر زوماڈی کراس کی شخصیّت دوستی کی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور ہنگری کے درمیان رابطے کی بھی ایک مثال ہے۔

ماخوذ از: انڈیا ان ہنگرین لرننگ اینڈ لٹریچر
مصنّف: گیزا بیتھلنوی

☆★☆

کشمیر کا ذِکر۔ قدیم کتابوں میں

کشمیر کو اِس خطے کی سب سے قدیم مملکت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر چہ اِس کی قدامت کا حتمی تعینّ ممکن نہیں اَلبتہ روایات میں بتایا گیا ہے کہ ایک روز جب کہ سندی مان یا حضرت سلیمانؑ نے ایک اُڑاتی ہوئی شہد کی مکھی سے استفسار کیا کہ اس وقت تمہاری عمر کیا ہوگی تو اُس نے جواباً کہا۔

کونسر . کانسر ستی سر
سُتی پری، ستی سر، سَتھ سَر

مطلبَ یہ کہ مجھے وہ دِن یاد آتا ہے کہ کونسر ناگ (کُن سَرناگ) اور گنگہ بل جیسی جھلیں ایک دوسرے کے قریب تھیں (یاد رہے کہ اِس وقت دونوں کے مابین ایک سو سے زیادہ میل کا فاصلہ ہے) میں نے ستی سَر میں سات بار جنم لیا ہے۔ اگر چہ اِس وقت دونوں جھیلوں کا وجودَ الگ الگ ہے لیکن یہاں پر ذہنوں میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ جب یہ دونوں ایک دوسرے کے

قریب تھیں تب سے آج تک کتنا وقت گزرا ہے اور اُس وقت کشمیر کی جغرافیائی حالت کیا رہی ہوگی؟ اِس پر حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ بات یہ ہے کہ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حالات بھی بدلتے ہیں۔ کوئی ایسا علاقہ جو طول و عرض میں چھوٹا تھا' سماجی' سیاسی اور سیاسی حالات بدلنے کی وجہ سے اُس میں وُسعتیں پیدا ہوگئیں یا کوئی ایسا علاقہ جو طول و عرض میں بڑا تھا اِن ہی حالات کی بناء پر چھوٹے سے چھوٹا ہوتا گیا۔ زبان، ثقافت اور سیاست وہ بنیادی چیزیں ہیں جو کسی علاقے میں وقت کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حالات پر اَثر انداز ہوتی ہیں۔ اِس وجہ سے جگہوں کے قدیم نام بھی اَپنا چولا بدلتے رہتے ہیں۔ کشمیر کا نام، اِس کا طول و عرض اور خاص طور اس کا ذِکر قدیم تصنیفات میں تلاش کرنا صبر آزما کام ہے۔ بعض تذکروں اور تصنیفات میں وقتاً فوقتاً اِس کا ذکر ہوتا رہا ہے جس کو ذیل میں اختصار کیساتھ سپردِ قلم کیا جاتا ہے۔

پُرانوں میں سارے ہندوستان کو پانچ حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ جن کے نام یُوں ہیں۔ مدھیہ بھارت (آج کل مدھیہ پردیش) اُترا پتھ (ہمالیہ سلسلہ ہائے کوہ کا سامنے کا حصّہ) پراچیہ (بھارت کا مشرقی علاقہ) دُکھشنا پتھ (وندھیہ پہاڑ کا جنوبی علاقہ، اُپرانت (بھارت کا وسطی حصّہ)۔ جہاں تک ہمالیہ پہاڑ کے سامنے والے حصّے کا تعلق ہے اِس میں ہندوستان کا سارا شمالی علاقہ آتا ہے۔ سنسکرت کی قدیم تصنیفات میں اِس علاقے کی بعض مملکتوں کا ذکر ملتا ہے جس میں ''بالھیک'' بھی ایک ریاست رہی ہے اور وہاں ''بالھیک'' زبان رائج تھی۔ بھرت مُنی اِسی بالھیک زبان کو پیشاچی کہتا ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ کشمیری زبان کا منبع یہی پیشاچی زبان ہے۔ یہ بھی کہا

جاتا ہے کہ آج جس جگہ کو کشمیر کہا جاتا ہے کہ اُسے کسی زمانے میں ''بالہیک پردیش'' بھی کہا جاتا تھا۔ اُس وقت پونچھ اور راجوری علاقوں کا ابھیسارہ کہا جاتا تھا اور اِن علاقوں کے اِس وقت کشمیر سے گہرے تعلقات تھے۔[1]

ہندوستان کا سب سے قدیم اَدب ویدک ساہتیہ مانا جاتا ہے۔ اِس اَدب کے تحت سارے اُپنشد اور چاروں برہمن گرنتھ آتے ہیں۔ رِگ وید کے ''ندی سوُکھت'' یا باب میں اُن ساتوں دریاؤں کا ذکر ہے جن کا نام سِندو (سندھ) ستودری، وتستا، وِپاشا، اسونی، پرونی اور مرودرا ہیں۔[2] اِن میں سندھ اور وتستا کشمیر ہی میں بہتے ہیں آخری یعنی مَرودرا کو ''مرووردھن'' بھی کہتے ہیں جو وادی کے شمال سے جنوب کی طرف بہتے ہوئے آخر میں کشتواڑ کے قریب چناب سے جا مِلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب آریہ کشمیر میں داخل ہوئے وہ پہلے اِسی دَریا کے کناروں پر آباد ہوئے۔[3]

اِس دَریا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ وہی دریا ہے جو جموں کے ایک دُور دَراز علاقے مڑواہ میں بہتا ہے اور جس کی مناسبت سے اس کا نام مڑواہ پڑ گیا۔ رِگ وید میں ایک اور باب ''پرؤت سوکھت'' ہے جن میں ہندوستان کے تمام پہاڑوں میں ایک ایسے پہاڑ کا نام بھی درج ہے جس کو کمبوج کہتے ہیں۔ آج کل اِسے پامیر بھی کہتے ہیں جو کشمیر کے شمال میں واقع ہے۔ اِس جگہ چین اور رُوس کی سرحدیں ملتی ہیں۔ گزشتہ زمانے میں ہندوستان اور پامیر کے

---

[1] ہمارا ساہتیہ (ہندی) چھاپ، جموں و کشمیر کلچرل اکادمی۔ سال ۱۹۶۵ء

[2] رِگ وید۔۱۰، ۷۵۔۵۔

[3] Studies in Indin Antiquities-Page-51

درمیان کا راستہ ایک اہم قومی شاہراہ تھی۔ کشمیر کا وہ حصّہ جسے آج کل درد یا دردستان بھی کہتے ہیں، اِسی راستے سے ہو کے گزرتے ہیں۔

اَتھر وید میں ہمیں بعض اِنسانی ذاتوں کا ذکر یوں ملتا ہے۔ نام ہیں، بالھیک، مہاورس، گاندھاری اور منجاوری[1]۔ یہ وثوق سے نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں کوئی قوم کشمیر میں بھی رہتی تھی۔ لیکن یہ بات عیاں ہے کہ اِن کا آریوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ''برہمن شت پتھ'' اور اپنشدوں میں بھی بعض اِنسانی ذاتوں کا نام اور تذکرہ ہے مثلاً کیکئی، گاندھاری وغیرہ۔[2] جہاں تک کشمیر کے مشرق اور مغرب کا سوال ہے وہاں ایسی کوئی قوم نہیں رہتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایسی کوئی قوم یہاں رہتی ہو جن کا ناگوں کے ساتھ تعلّق رہا ہو۔

''چھند وگیہ اُپنشد'' اور ''برہمن شت پتھ'' نام کی تصنیفات میں ہمیں کشمیر کی سَرحدوں کا ذکر ملتا ہے اور لِکھا ہے کہ یہاں کہ سرحدیں کافی دُور دُور تک پھیلی ہیں جن کی حفاظت آسمان سے باتیں کرتے ہوئے کوہستان کرتے ہیں۔[3] اسکے علاوہ رِگ وید میں ایک بدیشی لوک ذات ''تروشی'' کے ہاتھوں راوی، چناب اور وتستا کو پار کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اِس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قوم کشمیر میں بھی داخل ہوئی ہوگی کیونکہ وتستا صرف وادی ہی میں بہتا ہے۔[4]

---

[1] Macdonal and keith-"vedic Index II" , Page 135-136.

[2] اَتھر وید ۵،۲۲،۱۴،۹۵۶ ۔شت پتھ برہمن ۔۱۰،۹،۱۲

[3] چھند وگیہ اُپنشد ۔۵،۱۱

[4] رِگ وید ۔۷،۱۸

کشمیر کی تواریخ عیسیٰ سے قبل پانچ ہزار سال پُرانی تسلیم کی جاتی ہے۔
کہا جاتا ہے کہ رام چندر جی یہاں کے پہلے راجہ رہے ہیں۔ اگر چہ یہ بات کہیں بھی درج نہیں لیکن رامائن عہد کی یہ زندہ وجاوید روایت ہے کہ گوتم کی اہلیہ جب اپنے خاوند کی بددُعا سے گلمرگ[1] کی جنوبی وادی عالی پتھر[2] میں پتھر بن گئی، وہاں رام چندر جی کے پاؤں پڑ جانے سے وہ پتھر سے پھر انسان بن گئی۔
والمیکی کی رامائن میں کشمیر کا ذکر صاف اور واضح ہے۔ سیتا کو جب راوَن اغوا کر کے لے جاتا ہے اور رام کو اس بات کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ جنگل میں رہنے والے بندروں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ کشمیر جاؤ اور وہاں سیتا کو تلاش کرو۔ اِسی رامائن میں ایک جگہ کیکیَ دیش درج ہے۔[3] اس جگہ راجہ دشرتھ کی تیسری بیوی کیکیَ کا مائکہ بتایا جاتا ہے اور رام چندر جی کے سوتیلے بھائی بھرت کا ننھیال، دشرتھ کے اِس عالم سے رُخصت ہو جانے کے بعد جو یہ خبر لے کر بھرت کے پاس کیکیَ دیش جاتا ہے وہ بالہیک[4] پردیش سے ہوتے ہوئے وہاں تک پہنچ پاتا ہے۔ پُرانوں میں درج ہے کہ کیکیَ دیش کا پھیلاؤ

---

[1] پچھلے زمانے میں گلمرگ کو گوری مرگ کہتے تھے۔ یہاں ایک چشمہ ہے جس میں بھگوتی گوری کی استھاپنا ہے۔ ۱۵۸۰ء میں جب یوسف شاہ چک وہاں آیا تو اس نے اس کا نام گلمرگ رکھا۔

[2] عالی پتھر دو لفظوں سے مل کر بنا ہے جس کا مطلب مقدّس پتھر ہے۔

[3] رامائن، ایودھیا کانڈ، سرگ ۶۸ اور ۷۶۔

[4] پنجاب کے بہت سے نام رہے ہیں جن میں بالہیک بھی ایک ہے۔

بیاس دریا سے جنوب میں گاندھار[1] تک اور شمال میں کشمیر کی سرحدوں تک تھا۔

مہابھارت میں کشمیر کے متعلق صاف اور واضح ذکر ہے۔ بلکہ کلہن پنڈت بھی اپنی راج ترنگنی مہا بھارت میں دیئے گئے حوالوں سے شروع کرتا ہے، خصوصاً اس کے ایسے حصوں کا حوالہ جو اِسکے "یدھ پَرو" یا جنگ نامے کے ساتھ وابستہ ہیں۔[2] مجھے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں میں اس کا تذکرہ کروں کیوں کہ اس کا مفصّل ذکر راج ترنگنی میں موجود ہے۔

..........★..........

کشمیر کی فلک بوس چوٹیوں، نالوں اور ندیوں کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں ہمیں ہر پُران میں ملتا ہے۔ مارکنڈے پُران، متسیہ پُران، وامن پُران، کالیکاپُران، ویشنوپُران وغیرہ میں اِس کے جستہ جستہ اقتباسات ملتے ہیں لیکن اِن پُرانوں میں کشمیر کے متعلق جو ٹھوس اور مکمل جانکاری ہمیں دستیاب ہوتی ہے اُس میں نیل مت پُران کو خصوصی اِمتیاز حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے

---

[1] دوسری صدی عیسوی سے کشمیر کے کابل اور پشاور کے ساتھ بہت اچھے ثقافتی اور تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ یہ بات بھی یہاں ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں کشان خاندان سے وابستہ راجہ کنشک نے کشمیر پر راج پاٹھ کیا اُس کے اس عالم سے رخصت ہو جانے کے بعد کشمیر کے سیاسی، سماجی اور خصوصاً ثقافتی تعلقات ہندوستان کے اس شمال حصے کے ساتھ برابر قائم ودائم رہے۔ پُرانے زمانے میں ہندستان کے اسی حصے کو گاندھار کہتے تھے۔ اِس وقت اِس حصّے کے تحت پاکستان ہندوستان اور ایران جیسے ممالک آتے ہیں۔

[2] مہابھارت ا، ۲۷، ۱۷، یدھ پَرو۔

کہ اس پُران کی تشکیل کشپ ریشی کے بیٹے نیل نے کی ہے[1] اس میں کشمیر کے متعلق خاص طور سے دو شلوکوں میں ایسا تذکرہ ہے جس سے اس کی صراحت مختلف اندازوں سے ہوتی ہے۔

(ا) یہ بھومی یا زمین پر جاپتی اور کشپ ہی پرجاپتی ہے جس نے اِسے آباد کر کے اس کا نام کشمیر رکھا (۲۹۱) اِسی پُران میں ایک اور جگہ لکھا گیا ہے۔

(ب) 'کم' لفظ کا مطلب پانی ہے۔ سارا پانی نکل کے یا دُور ہو کے جو زمین آباد ہوگئی اس کا نام کشمیر پڑ گیا۔ اِن دونوں شلوکوں کے معانی مطالب میں فرق پایا جاتا ہے۔ پہلے شلوک میں کشمیر کا ایسی جگہ بنایا گیا ہے جس کو آباد کرنے کا آغاز کشپ نے کیا اور دوسرے شلوک میں اُس جگہ کو کہا گیا ہے جسے پانی خشک کر کے آباد کیا گیا ہے۔

..........☆..........

بھارتی عالموں نے جو ذکر اپنی تصنیفات میں اس جگہ کے متعلق کیا ہے اُن میں پانِنی اور وراہ متر سرِ فہرست ہیں۔ پانِنی سنسکرت کے عالم ہونے کے علاوہ اس کے گرائمر کے ترتیب کار بھی مانے جاتے ہیں۔

اُس نے اپنی تخلیق ''اُناوی سوتر'' میں کشمیر کو ایسی جگہ کہا ہے جو ساری دُنیا میں ایک پاک اور پوِتر جگہ گنی جاتی ہے۔[2] وراہ متر جو پانچویں صدی

---

[1] نیل مت کے تخلیق کار کے متعلق عالموں میں اختلافات رائے ہے۔ ہرگوپال خستہ، گلدستہ کشمیر میں نیل مت کے تخلیق کار کا نام چندر آچاریہ کہتا ہے کہ برگش سمہتہ نیل مت ہے جس کا تخلیق کار برنگی بٹ ہے۔ وہ سرینگر سے ۲۴ کلو میٹر دور ساگام گاؤں میں رہتا تھا۔ بعض لوگ یہ کہتے کہ بزم پُران ہی نیل مت ہے کیونکہ دونوں پُرانوں کے شلوکوں میں یکسانیت ملتی ہے۔

[2] اشٹادھیائی گرنتھ، حصہ ۴، ۲

عیسوی کا وِدھوان مانا جاتا ہے، اپنی مشہور تخلیق ''ورہت سمہتا'' میں کشمیر کو بھارت کا ایک ایسا حصہ مانتا ہے جس میں ابھیسارہ، ڈاوڑ، کھش اور کر جیسے قبیلے رہتے ہیں[1] مہابھارت کی جنگ میں ابھیسارہ اور دراوہش جیسے قبیلوں کے حوالے واضح طور ملتے ہیں[2] کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں یہ قومیں پونچھ اور راجوری میں رہتی تھیں۔ البتہ کھش اور کِر ذاتوں کا حوالہ ہمیں اَب تک کسی اور ذریعے سے نہیں ملا ہے۔ کلہن، راج ترنگنی میں لکھتا ہے کہ کِر ایک ایسی لوک ذات تھی جو نیچ یا اَدنیٰ مانی جاتی تھی[3] بعض عالِم اِسکے متعلق یہ بھی کہتے ہیں کہ بنیادی طور اِس لوک ذات کے لوگ تبت اور برما میں رہتے تھے۔

بعض عالِم کشمیر کو وہ واحد پاک اور پوتّر جگہ ''ایدس'' مانتے ہیں جہاں نیک اور بزرگ فقیر اور خدادوست اپنی عبادت سے آغاز یا رُوح کے میل کو دُور کرسکتے ہیں۔ کسی نامعلوم عالِم نے کشمیر کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے عالِم اور فاضل اپنے علم کے نُور سے ساری دُنیا کو منوّر کرتے ہیں۔ کشمیر کو کسی زمانے میں کشمیر پُورم اور کاشمیراج بھی کہا جاتا تھا یعنی وہ سرزمین جہاں زعفران پیدا ہوتا ہے۔

............★............

جو بعض تصنیفات کشمیر سے باہر دیگر جگہوں پر رقم کی گئیں ہیں اُن میں اِس رنگارنگ وادی کا ذکر براہِ راست کیا گیا ہے۔ ٹالمے اپنی جغرافیہ میں اس

[1] ورہت سمتہہ ۱۰،۹،۲،

[2] مہابھارت-حصہ ۸،۹،۱۴۳

[3] راج ترنگنی، ترنگ ۳، شلوک ۳۱۰

وادی کو "کشپرا" کہہ کر دو حصوں میں بانٹتا ہے جس حصے میں وتستا بہتی ہے اُسے وہ مشرقی کشمیر کہتا ہے اور جس حصّے میں راوی اور چناب بہتے ہیں وہ اُسے جنوبی کشمیر گردانتا ہے[1]۔ یہاں کشمیر کی سرحد، پنجاب کے سرحدوں سے ملتی ہے کیونکہ چناب اور راوی جموّں اور پنجاب میں بہتے ہیں۔ اِس طرح ٹالمے اپنے جغرافیہ میں کشمیر کے ساتھ جموں اور پنجاب کو ملاتا ہے۔

یورپ سے پہلے پہل جو سیاح یہاں آئے ہیں اُن کے نام فادر جرمی اور ونسٹ ڈی گوسا بتائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں یہاں شہنشاہ اکبر کے ساتھ سولہویں صدی کے آخر میں آئے اور اَپنے قیام کے دوران یہاں بہت سی جگہیں دیکھیں۔ جب وہ واپس دِلی چلے گئے تو انہوں نے اپنی یادداشتیں تحریر کیں جو بعد میں یورپ کے مختلف ملکوں میں شائع کی گئیں۔ اِسی طرح یورپی سیاحوں، فوجی ماہرین اور جراحوں کی ایک اور جماعت ۱۶۶۰ء میں اَورنگ زیب کیساتھ کشمیر آئی جس میں برنیر بھی شامل تھا۔ انہوں نے اَپنے سفرناموں میں اُن سارے سنگلاخ راستوں کا ذکر کیا جن سے گزر کر وہ کشمیر میں داخل ہوئے۔ اِس کے علاوہ انہوں نے دہلی اور کشمیر کے درمیان تعلّقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جو دیگر یورپی سیاح اِبتدا میں یہاں آئے اور اَپنے سفرناموں میں اس گل پوش وادی کا ذکر کیا اُن میں جیسٹ پریسٹ، اٹلی کے ہپالیٹ، پروٹوریا کے ڈیسی ڈاری اور مارکو پولو خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں مارکو پولو لکھتا ہے کہ کشمیر میں بہت سے گاؤں قصبے ہیں اور سرسبز چراگاہیں ہیں۔ یہاں سلسلہ وار پہاڑی راستے اور دّرے موجود ہیں۔ یہاں بہت سے مندر، مٹھ

---

[1] Greeks in Bactaria and India-P231

اور بودھ وِہار ہیں۔ یہاں کے مونگ کی بیرونی منڈیوں میں کافی مانگ ہے۔[1]

★

یہ سبھوں کو معلوم ہے کہ دورِ قدیم میں کشمیر اور چین کے درمیان گہرے اور دیرینہ تعلقات رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ۵۴۱ء میں کشمیر کا پہلا وفد چین گیا ہے۔ اُس وقت چین پر تانگ خاندان کا کوئی راجہ حکومت کر رہا تھا۔ اُس وقت کا یہ راجہ اپنی یادشتوں میں لکھتا ہے کہ کشمیر کا یہ وفد یہاں ہند کی اُس جگہ سے آیا ہے جہاں چپّے چپّے پر جنگل، پہاڑ اور شالی کے کھیت ہیں۔[2] نان بگ، جو اُس وقت کے ایک بڑے عالم تھے، نے کشمیر کو شی می کہا ہے۔ چینی زبان میں ''شی می'' اُس جگہ کو کہتے ہیں جو بہت ٹھنڈی ہوا اور جہاں سال کے چھ مہینوں تک برف باری ہوتی ہو۔ چین میں تانگ خاندان کے ایک اور حوالے کے مطابق ۷۱۳ء میں وہاں سے ۲ وفود کشمیر آئے جن کی راہنمائی لو۔پی۔لو۔اور کو۔پی۔تو کر رہے تھے۔ یہ وہ دوٗ راجے ہیں جن کو چندر پیڈ اور للتادتیہ مکتا پیڈ کہتے تھے اور جن کی شہرت کا مینارہ نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستان میں فروزاں تھا۔[3]

کشمیر کے متعلق جو بعض دیگر دلچسپ اور غور طلب حوالے ہمیں ملتے ہیں اُن کا سرچشمہ ہیون سانگ کا سفر نامہ ہے۔ ہیون سانگ نے یہاں اپنی زندگی

---

[1] Travels of Marco Polo- Translated By Tule, Page I,Page 166

[2] راج ترنگنی، ترنگ ۳، شلوک ۶۹۔

[3] Life of Yuanchang by Baalson, vol I, P. 261

کا بہت سا حصہ گذار کے اِس کا بھر پور جائزہ لیا۔ ۶۳۳ء میں وہ توسہ میدان سے پونچھ آیا اور بعد میں بہرام گلہ سے یہاں آئے اُپنے سفرنامے میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

''کشمیر گولائی ۱۴۰۰ میل ہے اور چاروں طرف رُوپیلے پہاڑوں سے گھری ہے اس کے بیچ میں ایک دریا بہتا ہے جو دس میل لمبا اور دو میل چوڑا ہے۔ بودھ وہاروں کی گنتی ایک سو سے اُوپر ہے جن میں ایک وِہار میں بُدھ کی قدِ آدم مورت بھی ہے۔''

اس کے علاوہ ہیون سانگ نے اُن تمام پڑاؤں کا ذکر کیا ہے جن سے گزر کر وہ یہاں آیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ مجھے یہاں آنے کے لئے ہیبت ناک پہاڑوں، کالے[1] پہاڑوں رَسی کے جُھولتے ہوئے پُلوں سے گزرنا پڑا۔ اِس طرح یہاں ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ لکڑی اور اس کے پُل بنانے کا رواج کشمیر میں دَورِ قدیم ہی سے تھا۔ آخر پر وہ لکھتا ہے کہ سندھ دریا کے دونوں کناروں پر بہت ہی ہیبت ناک گپھائیں تھیں جن میں زہریلے سانپ اور موذی جانور رہتے تھے۔

ہیون سانگ کشمیر میں بُدھ دھرم کے عروج سے بہت متاثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے یہاں شاردا پیٹھ نام کی یونیورسٹی میں خود بُدھ دَھرم وابستہ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اُن کے بعد چین سے اور بھی سیاح یہاں آئے جن میں اونگا گن کا نام قابلِ ذکر ہے۔ اُپنے سفرنامے میں وہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے

---

[1] کالے پہاڑ دراصل کوہِ قراقرم ہے۔ یہ کشمیر کا سب سے بلند اور بڑا پہاڑ مانا جاتا ہے۔ سطح سمندر سے یہ ۲۷۲۵۰ فٹ اونچا ہے۔ اسکے دامن میں گلگت، اُسکردو اور دیگر مقامات آتے ہیں۔

لکھتا ہے کہ میں نے ہندوستان کی اُس جگہ کا سفر کیا ہے جہاں انسان کی رُوح کو سکون ملتا ہے۔ اِن کے علاوہ جو چینی سیاح یہاں آئے اُن کے نام یوں ہیں۔ آمنگ ، وسو بندو ، بدھ بدر ، چی مان اور فاھیان وغیرہ اِن تمام نے اَپنے سفرناموں اور یادداشتوں میں کشمیر کی بے اِنتہا تعریفیں کی ہیں۔

★

کشمیر کے متعلق ٹھوس جانکاری جس عربی عالم نے ہمیں دی ہے اُس کا نام البیرونی ہے۔ اُسے محمود غزنوی کے دَربار میں ایک اہم رُتبہ حاصل تھا۔ اُن کی مشہور تصنیف ''کتاب الہند'' ہے۔ کشمیر کے متعلق وہ اَپنی تصنیف میں لکھتا ہے۔

''کشمیر کے لوگ عام طور پر پیدل سفر کرتے ہیں۔ صرف صاحبِ اقتدار اور بعض نیک بزرگ پالکیوں میں اِدھر اُدھر پھرتے ہیں۔ کشمیر میں داخل ہونے کا راستہ ہزارا ہے۔ یہ راستہ بلورا گاؤں سے ہو کے گزُرتا ہے۔ وادی کا کل رقبہ چار فرسخ ہے۔ اِس کے بیچوں بیچ جہلم بہتا ہے جس پر لکڑی کے بہت سے پُل ہیں۔ تیرتھ اَستھاپنوں میں کشمیر کو وہی مقام حاصل ہے جو ہندوستان میں کروکشیتر یا بنارس کو حاصل ہے۔ چیت کے پہلے روز کو کشمیری اکدوس[1] کہتے ہیں۔ یہ دن کشمیری بڑے ذوق وشوق سے مناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِس روز راجہ مُنی نے ترکوں پر فتح حاصل کی۔''

اِس کے علاوہ اَلبیرونی نے اَپنی تصنیف میں یہاں کے بعض سرحدی راستوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں خاص طور پر بولر (آج کا بلتستان) گلگت، آسوبرا اور شلٹارس (آج کل کے گلگت، اسٹور اور چلاس) شامل ہیں۔ آخر

[1] اکدوس کا مطلب نیا سال ہے جو پنڈت یہاں ''نورِیہہ'' کے طور مناتے ہیں۔ بکرمی سنہ کے مطابق اِسی روز نیا سال شروع ہوتا ہے۔

پر وہ رجاوری (سنسکرت راج پوری اور آج کا راجوری) کا ذکر بھی کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہندو دُور میں ایک پہاڑی ریاست کی راجدھانی تھی۔ وہ اس علاقے کا دُور دراز علاقہ کہہ کے تذکرہ کرتا ہے۔

دسویں صدی عیسوی کے بعض ایسی تصنیفات معرضِ وجود میں آتی ہیں جن کے تخلیق کار کشمیری بھی تھے اور باہر کے لوگ بھی ان تخلیقات سے ہمیں اِس گلستان کے متعلق بہت کسی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان تخلیقات کے نام کھیمندر کا نر پاولی، دیش اُپدیش ، دش اوتار چرت ، سمے ماتریکا اور ورہت کھتامنجری وغیرہ ہیں اِن میں لکھنے والوں نے اُس وقت کے سیاسی، سماجی اقتصادی اور ثقافتی حالات کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔کھیمندر کے بعد سوم دیو کی تھاسرت ساگر قابلِ ذکر ہے۔اِس میں کشمیر میں ہمالیہ پربت کے ایک جنوبی علاقے کا جائزہ لیا ہے جہاں سے وتستا جنم لیتی ہے۔اِس کے علاوہ اس میں بعض دیگر مقامات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس میں وجشیور یا بجبہارہ، نند کی شیور، وراہہ کھیتر ، یا بارہمولہ اور ہرینہ پوری قابل ذکر ہیں۔ ایک اور اہم نام کلہن پنڈت کا ہے۔ انہوں نے پوران کال سے بارہویں صدی عیسوی تک کی ہزاروں سال کی توریخ سنسکرت میں رقم کی۔اِسے دُنیا کی عظیم ترین تواریخوں میں اہم مرتبہ حاصل ہے۔ آخر میں اِس دَور کے دُو شاعروں جن کا نام منکھ اور بلہن ہے کا خصوصیت سے تذکرہ لازمی ہے جنہوں نے دُو عالمی سطح کی تخلیقات کو جنم دیا ہے ان کا نام ”سری کنٹھ چرت “ اور وکرمادیو چرتم ہے۔ان میں کشمیر کے متعلق بہت ہی اَچھی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔

★

سُلطان اور مغل دَور میں بھی یہاں بہت سی تخلیقات نے جنم دیا جن کے تخلیق کار دونوں ہندو اور مسلمان تھے۔ ان میں سے پہلی تخلیق شریف الدّین کی ''صغر نامہ'' ہے۔ شریف الدین، تیمور کے نجی صلاح کار تھے اور اِس کتاب سے ہمیں تیمور اور کشمیر کے سلطان سکندر (بُت شکن) کے درمیان قریبی روابط کا پتہ چلتا ہے۔ اِس کی تخلیق کا وقت چودھویں صدی عیسوی ہے۔ اِس کے بعد مرزا حیدر دوغلات کی ''تاریخِ رشیدی'' قابلِ ذکر ہے۔ ایک اور تخلیق نظام الدّین کی طبقاتِ اکبری ہے جن میں کشمیر میں مغل دَور کے متعلق مفید جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ فرشتہ کی ''تاریخ فرشتہ'' عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ ہے ان میں تخلیق کاروں نے کشمیر کے متعلق بے بہا جانکاریاں فراہم کی ہیں۔

مغل دَور میں جن کشمیری قلم کاروں کے ہاتھوں نئی تخلیقات معرضِ وجود میں آئیں اُن میں پراجیہ بٹ کی راج ترنگنی، ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخ کشمیر ۱۷۷۱ء میں نرائن کول عاجز کی رقم کردہ تواریخ خاص طور قابل ذکر ہیں۔ اُٹھارہویں صدی کے آخر میں حسن کھو یہامی کی ''تاریخ حسن'' اور اُنیسویں صدی میں بیربل کاچرو کی تاریخ کشمیر اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ گذشتہ صدی میں پنڈت ہرگوپال خستہ نے گلدستۂ کشمیر نام کی تاریخ کشمیر رقم کی۔

۱۸۴۷ء سے ۱۹۴۷ تک کشمیر پر بے شمار کتابیں لکھیں گئیں۔ اس دور میں پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا اور یورپی سیاحوں کی بھاری تعداد وارِدِ کشمیر ہوگئی۔ اِن بدیشی عالموں کی کتابوں کے موضوعات اگرچہ جُدا جُدا تھے لیکن وہ کوئی گوشہ نہیں جس کو انہوں نے منوّر نہ کیا ہو۔

(کشمیری سے ترجمہ)

کے-ڈی-مینی ☆

اُوڑی، تاریخ کے اَوراق میں

(کھکھ اور ہتمال پہاڑی قبائل کا علاقہ)

علاقہ دَچھنہ کے بالمقابل دَریائے جہلم کے بائیں کنارے کے ساتھ اُوڑی، کھادرہ، کچیلی اور چیکار کے علاقے پڑتے ہیں جہاں صدیوں تک پہاڑی قبائل کے کھکھ اور ہتمال راجاؤں اور سرداروں کی عملداری رہی ہے۔ اسے کھاوَرہ بھی کہا جاتا ہے۔ اِس سے پہلے کہ کھکھ اور ہتمال راجاؤں کے علاقوں کے بارے میں بات کی جائے، یہ ضروری ہے کہ آزادی سے پہلے کی اُوڑی تحصیل پر ایک نظر دَوڑائی جائے جس میں دَریائے جہلم کے داہنے کنارے کی جاگیریں کٹھالی اور دوپٹہ کے علاقے بھی شامل تھے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے اُوڑی، ضلع مظفرآباد کی ایک تحصیل ہوتی تھی جس کا صدر مقام اُوڑی قصبہ تھا۔ اوڑی کا قصبہ مظفرآباد سے ۴۹ اور بارہمولہ سے ۲۳ میل کے فاصلہ پر جہلم ویلی روڑ پر واقع تھا، جو سڑک مظفرآباد سے گزر

☆ پونچھ

کر کوہِ مری کی طرف جاتی تھی۔ پوری تحصیل پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ جناب سی، ای بیٹس نے اِس تحصیل کو خوبصورت پہاڑوں کا مرّکب بتایا ہے جن کا نظارہ قابلِ دید ہے۔ شمال میں دبردون اور قاضی ناگ اِسے کرناہ اور مظفر آباد سے جُدا کرتے ہیں۔ جو بالترتیب ۱۱۵۵۳ اور ۱۳۴۳۷ اِ سطح سمندر سے بلند ہے۔ جنوب کی طرف نیل کنٹھ (۱۲۳۳۰) کی اُونچی پہاڑی ہے...... اور درہَ حاجی پیر (۸۵۰۰) اِسے علاقہ پونچھ سے الگ کرتا ہے۔ علاقَہ اُوڑی کی سطح سمندر سے بلندی ۲۸۰۰ فِٹ سے لیکر ۱۸۳۳۰ فِٹ کے دَرمیان ہے۔ بارش اوَسطاً ۵۰ ِکے لگ بھگ ہوتی ہے۔ موسم بڑا سہانا رہتا ہے پہاڑوں پر زبردست برف باری ہوتی ہے مگر برف، کشمیر کے مقابلہ میں جَلد پگھل جاتی ہے جہلم ویلی روڑ کے علاوہ اُوڑی کا حاجی پیر درہ کے راستے پونچھ سے بھی سڑک کا رابطہ قائم تھا اور ۴۸ میل لمبا یہ سفر چار گھنٹے میں طے ہُوا کرتا تھا۔ سڑک کے علاوہ کشتی رانی کے ذریعے سفر بھی کیا جاتا تھا۔ چندن واڑی ، رام پور ، مہورہ ، اُوڑی اور نیلی کے مقام پر پُل تعمیر کیٔے گیٔے تھے اَوڑی اور رام پور میں مسافروں کے لیٔے پڑاوٴ بھی بنائے گیٔے تھے۔ اُوڑی ایک بارونق قصبہ ہوتا تھا جہاں پونچھ، مظفر آباد اور سرینگر سے ہر وَقت گاڑیاں چلتی رہتی تھیں اِس طرح اُوڑی کو وہی مقام حاصل تھا جو آج کل جموں سرینگر شاہراہ پر واقع قصبہ بٹوٹ کو ہے۔[1]

اوڑی کے پہلے بندوبست کے مطابق تحصیل کا رقبہ ۲۱۳ مربع میل تھا

1. Assessment Report Uri Tehsil, Samvat 1986(B) By Pt. Prem Nath B.A.

جس میں سے ۴۳۱۵۱ ایکٹر رقبہ قابلِ کاشت تھا۔ ضلع مظفر آباد کی یہ تحصیل ۲۷۸ گاؤں پر مشتمل تھی اور اِس میں کچیلی، چیکار اور کھادرہ کے علاوہ کٹھالی اور دوپٹہ کی جاگیریں بھی شامل تھیں۔ اِس تحصیل کی لمبائی چالیس میل اور چوڑائی ۲۱ میل ہُوا کرتی تھی۔ پہلے بندوبست میں مقامی راجاؤں، سُلطانوں اور سَرداروں کی جاگیروں اور علاقوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علاقے کو دَس سرکلوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یعنی دچھنہ، کٹھالی، سنگر دچھنہ کٹھالی، بونیار روڑ، سنگر بونہار روڑ، کلیانہ، نول چیکار، درمیانی چیکار اور سنگر چیکار وغیرہ یہاں ۷۰ فیصد پہاڑی آباد تھے جن کی ماں بولی پہاڑی تھی۔ اُوڑی سے لکڑی، گھی، اُون گچھیاں، شہد، لوئیاں، اَخروٹ اور کٹھ برآمد کی جاتی تھی جبکہ نمک گڑ، چائے، چینی، نسوار اور مٹی کا تیل درآمد کیا جاتا ہے۔[1]

نام کی وجہ تسمیہ[2]

راجہ نذر بونہاروی اَپنے ایک مضمون ''اُوڑی تاریخ کے آئینے میں'' جو رسالہ ''شمس بری'' کے تیسرے شمارے میں شائع ہوا، میں لکھتے ہیں کہ اُوڑی کو کشمیر کا دَروازہ مانا جاتا تھا۔ اس کا راج ترنگنی میں ذکر نہیں ملتا۔ روایت ہے کہ اُوڑی نام بنگال کے ایک سادھو کی دین ہے جس نے اِس علاقہ میں قیام کیا تھا۔ اُوڑی، اَوڑی لفظ سے نکلتا ہے جس کے معنی گائے کے تھنوں والے حصّے کے ہوتے ہیں۔ جس جگہ آجکل اُوڑی کا قصبہ قائم ہے اُسے پرستان بھی کہا

---

1. Assessment Report of Uri, Samvat1968 By Pt. Prem Nath

۲۔ راجہ نذر بونہاروی، ایک مضمون

جاتا ہے۔ آزادی سے پہلے بارہ مولا سے نیچے کا تمام پہاڑی علاقہ دُو حصوں میں تقسیم تھا جو مظفر آباد کے بمبہ سلطانوں کے عہد میں تقسیم ہوا تھا۔ اِس طرح جہلم کے دائیں حصے والے علاقہ کو دچھنہ پارہ کہا جاتا تھا اور جہلم کے بائیں طرف کے علاقہ کو کھادرہ پارہ کہا جاتا تھا (دچھنہ کشمیری زبان میں دائیں کو اور کھوور، بائیں کو کہتے ہیں جبکہ پارہ پہاڑی زبان کے لفظ پاڑہ سے نکلا ہے جس کے حصے زمین کا حصہ ہوتے ہیں) دچھنہ کا صدر مقام کٹھالی تھا جبکہ کھادرا کا صدر مقام اُوڑی ہُوا کرتا تھا۔

راجہ نذر کو بونہاروی لکھتے ہیں کہ اُوڑی سے دُو شاہراہیں، یعنی جہلم ویلی روڑ اور حاجی پیر (۸۵۰۰) پونچھ رُوڑ گزرتی تھیں اور یہ قصبہ بڑا بارونق ہوتا تھا۔ کھادرا کے علاقے میں بونہار اور مہورہ میں منادر کے آثار ملتے ہیں۔ بونہار، بھون ہار کا بگڑا ہوا رُوپ ہے۔ اسی طرح راج ترنگنی میں درج مقام ویرانک کو آج کل ویرن کہا جاتا ہے اور بولیاسک دراصل بلیاس ہے جو کھادرا میں پڑتا ہے۔ دیار گل کو پار کر کے کنس ہوم (کچ ہامہ) آتا ہے جہاں بدھوں کا قدیم معبد کرتیا آشرم ہوا کرتا ہے۔

پرانی تحصیل

اُوڑی وزرات پہاڑ (مظفر آباد) کی سب سے بڑی تحصیل تھی۔ اِس کی حدیں مشرق میں درنگ بل، کھادن یار مغرب میں لِساں شریف جنوب میں بھنڈی ڈوبہ، حاجی پیر اور شمال میں ہٹیاں بنی حافظہ تک پھیلی ہوئی تھیں اور ۱۹۴۷ء میں اِس تحصیل کی آبادی ۵۵ ہزار تھی جن میں پہاڑی اکثریت میں تھے۔ تحصیل میں آباد اقوام میں کھکھے، بمبے، راٹھی، بدخشاں، ہتمال، سیّد،

پُرانا اوڑی پُل

قصبۂ اوڑی

چک، بیگ، گکھڑ، راٹھور، ٹھکر، ڈھونڈ، اعوان، مغل، سکھ، گجر، بکروال، کھتری، کشمیری، ترک، پٹھان یوسف زئی اعوان، خٹک اور منگرال شامل تھے۔ چونکہ پہاڑی کھکھے اور ہتمال قبایل نے اِس علاقے پر ایک عرصے تک حکومت کی اِس لئے اُن کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔

کھکھ اور ہتمال سَردار

اُوڑی کچیلی اور چیکار کے علاقوں پر صدیوں تک پہاڑی قبائل کا راج رہا ہے۔ جہاں کھکھا اور ہتمال پہاری راجاؤں نے ایک عرصے تک اپنی سرداری برقرار رکھی۔ کھکھا اور ہتمال قبائل کا مورثِ اعلیٰ ایک ہی تھا جنہوں نے اپنی طاقت اور بل بوتے پر اپنے اپنے علاقوں میں نیم آزاد اور خود مختار حکومتیں چلائیں۔ بارہمولہ سے نیچے درّے، جہلم کے بائیں کنارے پر یہ پہاڑی راجے۔ سُلطان اور خان بڑی آزاد، بے ساختہ اور سرکش زندگی گزارتے رہے لیکن اُن کی جواں مَردی، بہادری اور باغیانہ طبیعت اکثر اُن قبائل کے لئے مسائل کا سبب بنی ہے اور بے پناہ غرور تکبر اور گھمنڈ کے باعث یہ راجے اپنے ہمسایہ راجاؤں کو نیچا دکھانے کیلئے ایک دُوسرے کے دَرپے بھی رہے اور سازشوں میں بھی ملوّث رہے۔ دُوسروں کو نیچا دِکھانے کی آرزو میں پہاڑی قبائل اپنی آزادی اور تشخص کھو بیٹھے۔ جب ہری سنگھ نلوے نے ۱۸۲۳ء میں اِن راجاؤں کی سَرداری ایک ایک کر کے ختم کردی اور جو باقی بچے تھے انہیں ایسا روندا، دَبایا اور کُچلا کہ وہ سَر اُٹھانے کے قابل نہ رہے۔ دِن بدِن غربت اور پسماندگی کی عمیق گہرائیوں میں اُترتے چلے گئے۔

جناب بی سی ہیگل جو ۴۲-۱۹۴۱ء میں اُوڑی تک آئے تھے اُپنی کتاب

''پنجاب اینڈ کشمیر'' میں لکھتے ہیں کہ کھکھا اور ہتمال قبائیل کا تمام علاقہ چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں، پٹہ داروں اور زیلداروں میں بٹا ہوا ہے جو اگرچہ اپنے آپ کو راجہ کہتے ہیں اور خان کا لقب اختیار کرتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ علاقہ مفلس اور اڑیل سرداروں میں بٹا ہوا ہے جو آپسی رنجشوں کے باعث ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ہیں اور اپنوں کا ہی خون بہا رہے ہیں۔ یہ ناخوش اور غمگین راجے، جو کچھ بھی اُن کے پاس ہے اُسی پر قناعت کئے بیٹھے ہیں۔

۱۸۴۶ء میں جب ریاست جموں وکشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ نے خریدی تو علاقہ اُوڑی میں ایک ڈوگی کا مالیہ چالیس رُوپے ہری سنگھی مقرر ہوا جو بعد میں ایک سو روپیہ ڈوگی کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے کاشتکار اور زمین دار علاقہ اُوڑی کو خیر باد کہہ کر پونچھ اور پنجاب چلے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں پنڈت مہانند جُو، بندوبست کے آفیسر مقرر ہو کر آئے تو انہوں نے دوپٹہ اور کٹھالی کو چھوڑ کر اُوڑی کے علاقہ میں زمینوں کا مالیہ ۱۹ روپے سے ۶۸ روپے ڈوگی کے درمیان مقرر کر دیا۔ مالیئے کو وصول کرنے کیلئے مقامی راجاؤں نے زمینداروں پر شکنجہ اور زیادہ کس دیا اور راسامیوں کو دوبارہ پریشانی کا سامنا ہوا اور ڈوگرہ عہد حکومت میں ایک عرصے تک کاشتکار مصائب اور استحصال کا شکار رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سرینگر میں ۱۹۳۱ء میں شخصی حکومت کیخلاف جدوجہد شروع ہوئی تو اُوڑی میں اِس تحریک کو پوری حمایت ملی۔ کئی لوگ سرینگر میں سنٹرل جیل کے باہر درجنوں افراد کو ہلاک کرنے کے واقعے کیخلاف احتجاج کرتے ہوئے مارے گئے یا گرفتار ہوئے۔ اُس وقت علی گوہر خان اور عبداللہ ترمذی نے اہم

رَول اَدا کیا۔ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے میں بھی اُوڑی کے زعما کا بڑا حصّہ رہا ہے۔ ۱۹۴۷ کے واقعات سے عین پہلے بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کا اُوڑی میں استقبال کیا گیا تھا۔ تحریک حریت کشمیر کے دَوران اُوڑی والوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی افسوسناک حالات میں میز بانی بھی کی جب مہاراجہ ہری سنگھ نے انہیں گرفتار کر کے اُوڑی کے ڈاک بنگلے میں نظر بند کر دیا تھا جن کی ضمانت اور وَکالت کے لئے خان عبدالغفار خان، مولانا آزاد اور آصف علی دہلی سے براستہ کوہ مری اُوڑی آئے تھے۔[1]

اُوڑی کی تاریخ کے اَوراق تشنہ رہیں گے اگر ہم ۱۹۴۷ء کے واقعات کا ذکر نہ کریں جن کے باعث حد متصارقہ نے اُوڑی کے پہاڑی قبائل کو بانٹ کے رکھ دیا اور آج تک سرحد کے اُس پار اور اس کے پہاڑی ایک دوسرے کی دید کیلئے ترس رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے واقعات اور اُوڑی[2]

اُوڑی چونکہ جہلم ویلی روڑ پر واقع تھا اِس لئے پہلے ہلے میں ہی یہ علاقہ قبائلی یلغار کا نشانہ بنا۔ ۲۲؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قبائلی سردار خورشید انور نے مہاراجہ کے باغی فوجیوں سے مل کر جب مظفر آباد پر قبضہ کرلیا تو قبائلی دو سو گاڑیوں پر سوار اَسلحہ بارُود سے لیس ۲۳؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اُوڑی کی طرف بڑھے۔ اُدھر قبائلی سرداروں کے مختلف گروہ پونچھ، کوہالہ اور مظفر آباد کے دوسرے علاقوں میں پھیل گئے ان حالات میں بہت سے لوگ ۲۲؍اکتوبر کی رات کو مظفر آباد سے

---

[1] راجہ نذر بونہاروی – ایک تحریر

[2] کشمیر – ایک ان کہی داستان – مصنف چونی لعل شرما

نکل کر رام پورہ میں فوج کی پناہ میں آ گئے تھے۔ دوسری طرف قبائیلوں کے ہتھیار بند لشکر نے گھوڑی اور دو پٹہ پر قبضہ کیا۔

اُوڑی کا سقوط[1]

اُدھر ۲۲ اکتوبر کو دُومیل میں ریاستی بٹالین کے کمانڈر کرنل نارائن سنگھ نے اپنی بٹالین کے ہی ایک باغی میجر کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے پہلے وائرلیس کے ذریعے سرینگر ہیڈ کوارٹر میں پاکستان کی پُشت پناہی والے قبائلی حملے کے بارے میں تفصیل دے دی تھی۔ چنانچہ ریاستی حکومت نے دُومیل پر دُوبارہ قبضہ کرنے کیلئے کمک بھیجنے کا فیصلہ کیا لیکن سرینگر میں فوج ہی نہ تھی۔ ریاستی فوج کی ریز رو ۹ - جے کے رائفل کی بٹالین پہلے ہی پونچھ تعینات کی جا چکی تھی۔ بڑی مشکل سے ۱۵۰ فوجی اِدھر اُدھر سے اکٹھا کئے گئے اور بریگیڈئر راجندر سنگھ (جو اُس وقت ریاستی فوج کے قائم مقام سربراہ بھی تھے) کی قیادت میں بھیجے گئے۔ بریگیڈئر راجندر سنگھ ۲۲ اکتوبر کی رات اُوڑی پہنچا اور ۲۳ اکتوبر کی صبح کو کپتین پرتھی سنگھ کی قیادت میں ایک فوجی دستہ گڑھی کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ ۴ کشمیر انفنٹر بٹالین کے ساتھ رابطہ قائم کیا جا سکے۔ چکوٹھی کے مقام پر کپٹن پرتھی سنگھ کو ۴ کشمیر انفنٹری کے کچھ جوان ملے جنہوں نے اُسے دُومیل اور بارہمولہ کے سقوط کی اطلاع دی۔ اُس وقت چکوٹھی میں سینکڑوں ریفوجی گاڑیوں میں اور پیدل کشمیر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد گڑھی میں کپٹن پرتھی سنگھ کے دستے پر قبائیلوں نے حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا زودار تھا کہ کپٹن اُسی وقت پلاٹون کے ساتھ پسپا ہو کر اُوڑی آ گیا۔

---

[1] Operalion in Jammu and Kashmir 1947-48

۲۴ اکتوبر کی صبح کو سرینگر سے ایک پلاٹون اور بریگیڈیر راجندر سنگھ کی مدد کے لئے روانہ کی گئی جو ایم ایم جی اور تین اِنچ مارٹر سے لیس تھی۔ اَب بریگیڈیر راجندر سنگھ نے آگے پیش رفت کرنے کے بجائے اُوڑی میں دفاعی پوزیشن اختیار کرلی اور مورچے بنالئے لیکن ۲۳ر اکتوبر کو ہی قبائیلوں نے اُوڑی پر حملہ کردیا وہ ایک حملے کے بعد دوسرا حملہ کرتے گئے۔ یہ حملہ ایل ایم جی اور ایم ایم جی ہتھیاروں کی مدد سے ہورہا تھا۔ کئی گھنٹے کی لڑائی کے بعد اُوڑی کو اَپنے قبضے میں رکھنا مشکل ہوگیا کیونکہ تقریباً آٹھ ہزار ہتھیار بند قبائیلی میجر اَسلم کی نگرانی اور قبائیلی سردار خورشید انور کی قیادت میں (جو کبھی ہندوستانی فوج میں میجر ہوتا تھا اور جس نے ۱۹۴۶ء میں فوج سے ریٹائرمنٹ لی تھی) یہ حملہ بڑا منظّم ہمہ گیر اور چوطرفہ تھا۔ اُدھر بریگیڈیر راجندر سنگھ کے ڈیڑھ سو جوانوں میں سے بہت سے مارے گئے یا زخمی ہوگئے۔ ان حالات میں بریگیڈیر راجندر سنگھ بچّے کچھّے فوجی جوان لے کر اُوڑی سے مہورہ آگیا۔ اِس طرح ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام کو قبائیلی اُوڑی میں داخل ہوگئے۔ پھر قبائیلوں نے راجندر سنگھ کے فوجی دستے کا تعاقب شروع کردیا۔

۲۴/۲۵ اکتوبر کی رات اور ۲۵ر اکتوبر پورا دن مہورہ میں بریگیڈیر راجندر سنگھ کے ریاستی دستے اور قبائیلوں کے درمیان لڑائی جاری رہی۔ لیکن ۲۶ر اکتوبر کو قبائیلوں نے اَپنے حملے کو دُوگنا کردیا اور چاروں طرف سے مہورہ کی طرف بڑھنا شروع کیا اور ریاستی دستے سے ۴۵ گز کے فاصلے تک آگئے لیکن سارا دِن بریگیڈیر راجندر سنگھ اور اُس کے فوجی لڑتے رہے اور پیش رفت کو رُوکے رکھا۔ اَب اِس چھوٹے سے ریاستی دستے کے پاس گولہ بارود ختم ہورہا تھا

اور بریگیڈئیر راجندر سنگھ کو گھیرے میں آجانے کا بھی خطرہ تھا۔ اِس کے باوجود اُس نے مقابلہ جاری رکھا اور آخر کار ایک ایک سپاہی ختم ہو گیا اور بریگیڈئیر راجندر سنگھ بھی ہلاک ہو گیا۔ ۲۶/ اکتوبر کی رات کو قبائیلوں نے مہورہ پر قبضہ کیا اور پھر بارہمولہ میں بھی داخل ہو گئے جہاں اُن کے مقابلہ کے لئے کوئی نہ تھا۔

اِسی دَوران ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے کشمیر کا اِلحاق ہندوستان سے کر دیا اور ستائیس اکتوبر کی صبح ہندوستانی فوج کا پہلا دستہ بڈگام ہوائی اڈے پر اُترا۔ اِس کے ساتھ ہی پاکستانی فوجی افسران کی قیادت والا قبائیلی حملہ جو ''آپریشن گلمرگ'' کے نام سے شروع ہوا تھا اُس کا مقابلہ شروع ہو گیا سرینگر میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد ہندوستانی فوج نے اُوڑی کا رُخ کیا اور اِس سلسلے کی پہلی کڑی کے طور پر ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کو بارہمولہ قبائیلوں سے خالی کرالیا گیا۔ پھر بریگیڈیر سین سنگھ اور فوجی دستے لیکر اُوڑی کی طرف بڑھا اور ۱۱ نومبر کو مہورہ قبائیلوں سے خالی کرالیا۔ اِسی دَوران اِطلاح ملی کہ اُوڑی میں چار ہزار قبائیلی لشکر مورچہ بند ہے جس پر ہوائی حملے شروع کئے گئے۔ ۱۲ نومبر کو فوج کی پیش رفت کو رام پور کے مقام پر قبائیلوں کے ہراوّل دستے نے روک دیا۔ یہاں بھی ہوائی حملے ہوئے اور قبائیلوں کے پاؤں اُکھڑ گئے چنانچہ ۱۳ نومبر ۱۹۴۷ء کو اُوڑی پر دُوبارہ قبضہ کرلیا گیا۔ میجر جنرل اکبر خان ''رَیڈرس اِن کشمیر'' میں لکھتے ہیں کہ اُوڑی میں سرحدی قبائیلوں کے حوصلے بہت پست ہو چکے تھے اور بقول میجر جنرل اکبر خان انہوں نے خورشید انور اور میجر اسلم کو لڑائی کرنے کے لئے بہت کہا لیکن خورشید اُنور نے ایک نہ مانی۔ اَپنے قبائیلی دستوں کو لے کر سرحد کی طرف واپس روانہ ہوا۔ اس طرح اُوڑی

پرڈوبارہ قبضے کے ساتھ ہی وادیٔ کشمیر کا تمام علاقہ قبائیلوں سے خالی کرالیا گیا۔
لیکن ۱۹۴۷ء کے واقعات کے بعد اُوڑی کا آدھا حصہّ حدِ متصارقہ کے پار رہ گیا اور اَب اُوڑی ایک طرف نوشہرہ ، شمال میں اُڑوسہ ، جنوب میں سلی کوٹ اور مغرب میں اس کی حدود بٹ گراں تک سمٹ گئی ہیں جبکہ تحصیل کا کافی حصہّ جو سرحد کے اُس پار ہے ، تحصیل ہٹیاں بالا کے نام ہے جاتا ہے۔

بقول راجہ نذر بونہاروئ اِس قصبے کی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے نئ نویلی دُلہن کو بیچ سڑک کے بے آبرُو کر دیا گیا ہو۔ موجودہ تحصیل اُوڑی کو دُو ترقیاتی بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی بونہار اور اُوڑی اور یہ تحصیل ۲۱ پنچایتوں پر مشتمل ہے۔ ۵۵ فیصدی پہاڑی بولنے والے لوگ آباد ہیں۔ 1981ء کی مُردم شماری کے مطابق تحصیل کی آبادی ۶۹۸۰۰ نفوس تھی۔ ۱۹۹۷ء کے سروے کے مطابق خواندگی کی شرح مَردوں میں ۳۲ فیصد اور عورتوں میں ۷ فیصد۔ اَب یہ علاقہ ترقی کی شاہراہ پر چل نکلا ہے۔ ریاست کے دو بڑے پن بجلی پروجیکٹ یعنی لوئر جہلم پرنگل' اور اُوڑی پرُوجیکٹ راجرونی چالو ہو چکے ہیں جس سے مقامی لوگوں کی اقتصادی حالت پر بڑے مثبت اَثرات رونما ہوئے ہیں۔
مشہور شاعر مولانا چراغ حسن حسرتؔ مصنف ڈاکٹر محی الدین صوفی، راجہ فیروز الدین خان، جاگیر دار نامله سابق وزیر اُمورِ لدخ، مسلم کانفرنس کے پہلے رہنما علی گوہر خان، مفتی اعظم مولوی مرتضیٰ بیگ صاحب، رُوحانی بزرگ حافظ میاں محمد یونس ، راجہ محمد افضل خان ریاستی قانون سازیہ میں اُوڑی کے پہلے نمائندے اور جناب محمد شفیع (اُوڑی) اِس علاقے کی خاص شخصیات ہیں۔

مختصر تصارف کے بعد اَب ہم اُوڑی کے تاریخی واقعات پر ایک نظر

ڈالتے ہیں۔

کھکھ اور ہتمال کون تھے۔حسب نسب

جناب حشمت اللہ خان لکھنوی، تاریخِ جموں و کشمیر میں لکھتے ہیں کہ کھکھ اور ہتمال پہاڑی قبائل بارہمولہ سے نیچے دریائے جہلم کے بائیں کنارے کھادرہ چیلی، چیکار وغیرہ میں آباد تھے اور ان کے راجے ہی اِس پہاڑی علاقے پر حکومت کرتے تھے۔یہ پہاڑی قبائل جو ہر دَور اور ہر حال میں سَرکش بہادر اور جنگجو رہے اِن کے حسب نسب کے بارے میں مختلف رائے ملتی ہیں۔

جناب لارنس نے اپنی کتاب "ویلی آف کشمیر" میں کھکھا اور ہتمال کے بارے میں لکھا ہے کہ قدیم سنسکرت کی کتابوں میں اس قوم کا نام کھش تھا جو ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے میں بہت بڑے حصے پر آباد تھی۔لیکن راج ترنگنی کا انگریزی میں ترجمہ کرنے والے سٹین صاحب نے کھشوں کا علاقہ دریائے جہلم اور چناب کے درمیان کا پہاڑی علاقہ بتایا ہے جس میں بدھل اور راجوری خاص طور سے کھشوں کا مرکز رہے ہیں راجوری کے حکمران دسویں صدی عیسوی میں کھش راجہ کہلاتے تھے۔اُن کی فوج میں بھی اِسی قوم کے لوگ آباد تھے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دریائے جہلم کی وہ وادی جو بارہمولہ سے نیچے کی طرف واقع ہے کھش قوم کا مسکن تھی۔اِس وادی کا قدیم نام دہ اروتی تھا۔ جو بعد میں بدل کر دوار بدی ہو گیا یہ وادی کٹھالی اور مظفر آباد کے درمیان وادی جہلم کا ایک حصہ تھی۔

مذکورہ بالا حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوم جس کا نام پُرانے زمانہ

میں کھش تھا آج کل کھکھ کہلاتی ہے۔ جنوبی کشمیر میں بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اور عام رعایا کا کچھ حصہ اِس قوم میں سے ہے۔ احد شاہ، لب التواریخ میں لکھتا ہے کہ بارہمولہ سے نیچے جہلم کے بائیں کنارہ پر کھکھوں اور ہتمال قوم کا ملک ہے جس کا نام چیکار اور کھادرہ ہے۔ حسن شاہ تاریخِ کشمیر میں لکھتے ہیں کہ راجگانِ کھکھا اور ہتمال کی حقیقت تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ روایت ہے کہ یہاں دو بھائی کھکھو اور ہاتھو رہتے تھے جو بڑے بہادر اور جنگجو تھے اور قوم راجپوت سے تھے۔ بعد میں کھکھو کے نام پر کھکھ اور ہاتھو کے نام پر ہتمال قبائیل مشہور ہوئے۔ یہ دونوں کشمیر میں آکر سُلطان زین العابدین کے پاس ملازم ہو گئے اور اعلیٰ خدمات انجام دینے کے باعث خوشنودی حاصل کی اور سند جاگیر لکھوائی۔ اِس سند کے تحت علاقہ کھادرہ سے چند گاؤں انہیں بطور جاگیر ملے۔ وہاں انہوں نے قوّت حاصل کی اور پھر سارے علاقہ پر چھا گئے۔ اُس زمانے سے وارثانِ کھکھے خان کو کھکھ اور وارثان حاتم خان کو ہتمال کہا جانے لگا۔ عہدِ افاغنہ میں انہیں کھادرہ جاگیر کے علاوہ پرگنہ کروہن میں ۲۰ ہزار روپے کی جاگیر بھی عطا ہوئی۔[1]

---

[1] تاریخ اقوامِ پونچھ میں کھکھا اور ہتمال قوم کے بارے میں درج ہے کہ کھکھا، ہتمال اور تیزال خاندان کا ایک موسِّ اعلیٰ تھا جس کا نام راجہ مل خان تھا۔ کھکھ قوم کے بیان کے مطابق سب سے پہلے راجہ سری پت راٹھور ہوا جو راجہ مل خان کا دادا تھا۔ وہ قنوج سے پنجاب آیا۔ سر لیپل گریفن کے مطابق خود راجہ مل راٹھور تھا اور پانڈوؤں کی اولاد سے تھا۔ وہ ۹۸۰ء میں قنوج سے اس طرف آیا۔ محمد دین فوق کے مطابق مل راجہ غوری اور غزنوی سلطانوں کے عروج کے دَور میں ہوا ہے اور یہ راجہ متھرا میں رہتا تھا لیکن اپنی قوم سے نااتفاقی کے باعث اپنے ساتھیوں کے ساتھ جہلم کے پہاڑی علاقوں میں آ گیا۔ غزنوؤں کے زوال کے باعث یہ علاقہ طوایف ﴿بقیہ اگلے صفحے پر﴾

ان روایتوں سے حسن شاہ کی روایت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے

﴿باقی صفحہ﴾ الکولی کا شکار تھا۔ راجہ مل نے رفتہ رفتہ حکمت عملی سے علاقے میں اپنا رسوخ قائم کیا اور علاقے کا سردار ہو گیا پھر اچھی خاصی جمعیت بھی بنائی یہاں تک کہ شہاب الدین غوری نے جب لاہور میں غزنوی خاندان کے آخر بادشاہ کو ختم کرنا چاہا تو اُس کی مڈبھیڑ راجہ مل خان سے ہوئی اِن ہی دِنوں راجہ مل۔ نے کسی مسلمان فقیر کی کرامت دیکھ کر اِسلام قبول کر لیا تھا۔ سر لیپل گریفن کے مطابق راجہ مل نے اپنی کھوئی ہوئی ریاست کو دُوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے اِسلام قبول کیا تھا۔ راجہ مل خان کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے ایک بیٹے کا نام کھکھ خان تھا جو ایک معمولی سی فوج لے کر کشمیر کے پہاڑوں میں آ گیا اور مظفر آباد کے مقام چھتر کلاس میں وہاں کے حاکم سے لڑائی کر کے فتحیاب ہوا اور پھر علاقہ سوتر ڈنہ کچیلی کو فتح کیا۔ پھر کوٹ دہریال داو غیرہ کو اپنے قبضہ میں لیا اور سارے علاقہ پر اُپنا سِکّہ بٹھادیا اور کھکھا راجہ کہلانے لگا۔ اُس نے اپنا دارالحکومت ناگنی ڈھیری کو بنایا جو آزادی سے پہلے پڑاؤ دلائی کے قریب تھا راجہ کھکھ خان کے دو لڑکے تھے یعنی راجہ سنگی خان اور راجہ منگی خان ، یہ دونوں تو یہیں رہے لیکن خود راجہ کھکھ خان اَپنے چھوٹے لڑکے علی خان کے ساتھ تبّت کی طرف چلا گیا اور وہیں فوت ہوا۔ اُس کا بیٹا علی خان بھی واپس نہ آ سکا۔

راجہ سنگی خان کھکھ کے بیٹے کا نام حاتم خان تھا۔ حاتم خان کی نسل سے ہتمال راجے اور جاگیر دار ہوئے جو کشمیر کے علاقہ اُوڑی میں پھیلے ہوئے ہیں حاتم خان کے نام کے باعث ہی ہتمال کہلاتے ہیں جبکہ منگی خان اور اُس کی اولاد کھکھ ہی کہلاتی رہی اور اُن کی نسل سے جتنے بھی خاندان ہوئے وہ کھکھ کہلائے۔ منگی خان کی اَولاد کثرت سے پھیلی اور اُوڑی کے علاوہ پونچھ اور مظفر آباد میں بھی اِس خاندان کے افراد آباد ہوئے۔ جو قوم کھکھ سے مشہور ہوئے۔ منگی خان کے بیٹے کا نام علی شیر خان تھا اور پوتے کا نام پنجہ خان، پنجہ خان کے دو بیٹے تھے یعنی گوند خان اور ڈھونڈ خان عرف تیز خان جو کھکھ اُوڑی اور کشمیر میں آباد ہیں اَپنے آپ کو گوند خان کی اَولاد بتاتے ہیں جبکہ ڈھونڈ خان عرف تیز خان کی اَولاد علاقہ پونچھ کے جنوب میں آباد تھی اور ڈھونڈ اور تیزال بھی کہلاتے تھے۔

اُدھر کتاب ہری سنگھ نلوے کا مصنف کھکھ قوم کو کھتری قوم کا حصہ بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ علاقہ پہاڑ میں جن کھتری ہندوؤں نے اسلام قبول کیا وہ کھکھ کہلائے۔

گو کہ زین العابدین کے دور میں کھکھے خان اور خاتم خان کا کہیں ذکر نہیں اس لئے اس اندارج کو ایک روایت سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کھکھا اور ہتمال اصل میں نو مسلم راجپوت ہیں جن کے بزرگ پنجاب سے نقلِ مکانی کر کے اُوڑی میں آباد ہوئے اور اُن کے وارثان علاقہ کے حکمران کہلائے۔

تاریخ کشمیر میں پہلی دفعہ اِس قوم کا ذکر احمد شاہ ابدالی کے دَور میں ہوا ہے۔

بیرہ خان کھکھا کی مدد سے سُکھ جیون مل کا افغان فوج کو پسپا کرنا

۱۷۵۲ء میں افغان صوبے دار عبداللہ خان الیشک قاضی منصب، کشمیر کی صوبے داری عبداللہ خان کابلی کو اور منصب صاحب کاری سُکھ جیون مل کو دے کر واپس کابل چلا گیا تو اُس کے چار ماہ بعد سُکھ جیون مل نے عبداللہ خان کابلی کا قتل کر دیا اور خود ناظم کشمیر بن گیا۔ بعد میں کابل کے بادشاہ نے اُسے کشمیر کا ناظم قبول کر لیا لیکن کچھ عرصہ بعد سُکھ جیون مل نے کابل کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور خراج دینا بند کر دیا۔ جب افغان لشکر مقابلہ پر نکلا تو سُکھ جیون مل نے اُسے شکست دے دی اِس پر احمد شاہ ابدالی نے عبداللہ خان الیشک قاضی کو ۳۰ ہزار فوج دے کر سُکھ جیون مل کو گوشمالی کے لئے کشمیر روانہ کیا لیکن سُکھ جیون مل نے کھادرہ کے کھکھ راجہ بیرہ خان کی مدد سے حیدر آباد کے مقام پر افغان لشکر کو تتر بتر کر دیا اور دوبارہ کشمیر کا صوبیدار بن گیا۔ اِس موقع پر سُکھ جیون مل نے بیرہ خان کھکھا کو انعام واکرام سے نوازا اور راجہ کا خطاب عطا کیا۔ یہ واقعہ ۱۷۵۴ء کا ہے۔

افغان ناظم امیر خان کا بیرہ خان کھکھا کی لڑکی سے شادی کرنا[1]

---

[1] جموں و کشمیر۔ مصنف مولوی حشمت اللہ خان۔

۱۷۷۲ء میں کابل کے بادشاہ تیمور شاہ نے امیر خان جواں شیر کو کشمیر کا ناظم بنا کر بھیجا۔ امیر خان نے ۱۷۷۴ء میں کابل کے شاہ کیخلاف بغاوت کردی اور خود کشمیر کا حاکمِ اعلیٰ بن گیا۔ بادشاہ تیمور شاہ نے علی اکبر خان کو فوج دے کر کشمیر روانہ کیا تا کہ امیر خان کی بغاوت کو کچلا جا سکے۔ لیکن امیر خان نے مظفر آباد کے بمبہ سلطان محمود خان اور کھادرہ کے کھکھا راجہ بیرہ خان کو اپنا ہم نوا بنالیا اور جب علی اکبر خان پٹھانوں کی فوج لیکر مظفر آباد پہنچا تو محمود خان اور بیرہ خان کے پہاڑی لشکر نے انہیں آگے نہیں بڑھنے دیا اور مجبوراً علی اکبر خان واپس کابل چلا گیا پہاڑی سرداروں کا احسان چکانے کے لئے امیر خان سوپور آیا جہاں اُس نے سلطان محمود خان بمبہ اور بیرہ خان کھکھا سے ملاقات کر کے اُن کا شکریہ اَدا کیا اور اُس کے ساتھ ہی بمبہ اور بیرہ خان کھکھا کی لڑکیوں سے شادی بھی کر لی جس سے علاقہ کوہستان کے پہاڑی قبائل بمبہ اور کھکھا سے اُس کے مراسم اور گہرے ہو گئے اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں اُوڑی کھادرہ کے کھکھا سردار کتنے طاقت وَر تھے۔ کشمیر کے حاکم سے دوستی کے باعث بیرہ خان کھکھا چیکار تک سب راجگان اُس کے تابع تھے۔

بیرہ خان کھکھا کی گرفتاری اور اُس کا قتل

۱۷۸۱ء میں بادشاہ کابل کے حکم پر حاجی کریم دار خان، صوبیدار کشمیر نے مظفر آباد کے سلطان محمود خان کے علاقہ پر فوج کشی کے لئے کھادرہ اُوڑی کٹھالی اور مظفر آباد کی طرف بڑھا حاجی کریم دار بارہمولہ پہنچا تو اُس نے گورس بوئے کے مقام پر قیام کیا۔ جہاں حکمت عملی سے بیرہ خان کھکھا کو اَپنے پاس بُلایا اور پھر گرفتار کر کے سرینگر بھیج دیا اور اُس کے لڑکے بہادر خان کو

زنجیریں پہنا کر اَپنے ساتھ مظفر آباد لے گیا۔ محمود خان موقع کی نزاکت دیکھ کر اَپنے دار الحکومت سے فرار ہو گیا لیکن اُس کے بہت ساتھی گرفتار ہو گئے۔ واپسی پر حاجی کریم خان جب کٹھالی پہنچا تو بہادر خان کھکھا غسل کے بہانے دریائے جہلم پر گیا لیکن تیر کر دریا پار ہو گیا اور کریم دار کے چنگل سے بچ نکلا۔ جہلم کے پار اُس کا اپنا علاقہ تھا اس لئے اُسی رات بہادر خان نے پچاس ساٹھ پہاڑی جنگجوؤں کا دستہ بنایا اور حاجی کریم خان کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ اُس نے بہت سے افغان سپاہی مار دیئے اور خود بحفاظت واپس اَپنے علاقہ میں چلا گیا۔ اِس لڑائی میں حاجی کریم دار خان کا ایک افسر دیوان سنگھ بھی مارا گیا اور حاجی کریم خان صرف سات سواروں کے ساتھ کٹھالی سے گورس بوئی واپس آ گیا۔ دوسرے دن سرینگر پہنچا تو اُسی دن انتقام کی آگ سرد کرنے کے لئے کھادرہ اُوڑی کے پہاڑی راجہ بیرہ خان کھکھا کو صحنِ شیر گڑھی میں قتل کر دیا اور اُس کی لاش کو سیّد منصور کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔

بہادر خان کھکھا اور سَر بُلند خان کھکھا[1]

۱۷۸۲ء میں آزاد خان صوبے دار کشمیر جب زالڈ گر سرینگر میں نواب مدد خان سے ہزیمت کھا کر فرار ہُوا تو آگے جا کر اُس کے سپاہیوں کے ہاتھ جا لگا۔ اِس پر آزاد خان نے یہ کہہ کہ اَپنی جان چھڑائی کہ وہ شاہ ولی خان کا حجام ہے۔ اِن حالات میں کھادرہ اُوڑی کے راجہ بہادر خان کھکھا نے آزاد خان کی مدد کی اور اُس کو اپنے علاقوں سے گزار کر پونچھ پہنچایا۔

۱۷۹۳ء میں میر ہزار خان نائب صوبہ کشمیر جب علاقہ کمراج میں

1.C.E.Bates, The Gazzetter of Kashmir.

دَورے پر نکلا تو اُس نے راجہ سر بلند خان کھکھا راجہ کھادرہ کو دوسرے پہاڑی قبائل کے سرداروں کے ساتھ خلعتِ فاخرہ سے نوازا۔

۱۷۹۵ء میں جب کشمیر پر اُفغان سردار عبداللہ خان الکزئی صوبیدار تھا تو کھادرہ کے راجہ سُربلند خان کھکھا نے کامراج کے سلطان صفدر علی خان سے مل کر بغاوت کردی اور علاقہ میں لوٹ مار مچادی۔ نائبِ ناظم کشمیر گلستان خان اُن کے مقابلہ پر نکلا لیکن اُس کی فوج کے اُفسر سردار مثل باران خان و مومن خان وغیرہ مارے گئے اور کچھ آدمی گرفتار کر لئے گئے۔ گلستان خان، راجہ سر بلند خان کھکھا سے شکست کھا کر واپس چلا گیا۔

راجہ غلام علی خان کھکھا[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کیا تو اُس زمانہ میں کھکھوں کا راجہ غلام علی خان کھکھا تھے تو خالصہ سرکار سے مطمئن نہ تھے اور انہوں نے اُپنے علاقہ میں شورش برپا کی ہوئی تھی چنانچہ اس شورش پر قابو پانے کیلئے مہارجہ رنجیت سنگھ نے ایک سخت گیر جرنیل سردار ہری سنگھ نلوے کو ۱۸۲۱ء میں کشمیر کا حاکم اعلیٰ بنا کر بھیجا، ہری سنگھ نلوے کو سب سے پہلے علاقہ کوہستان کے پہاڑی قبائیل سے سامنا ہوا۔ اُس نے لوگوں کو دَبانے اور مقامی سرداروں کو کچلنے کے لئے نہایت سخت گیر پالیسی اُپنالی۔ اُس وقت اُوڑی میں مقامی راجے حکومت کرتے تھے اور سکھوں کے کشمیر پر قبضہ کے بعد گدی کے تین دعویدار تھے یعنی غلام علی کھکھا، سرور خان کھکھا اور اُن کا بھتیجا سربلند خان کھکھا، غلام علی نے بغاوت کردی ہری سنگھ نلوے نے علاقے میں ظلم

1.C.B- Hugel;The Kashmir and Punjab.

وجبر کا دُور شروع کر دیا۔ بات مہاراجہ رنجیت سنگھ تک پہنچی ۔مہاراجہ نے اس کا بُرا منایا اور ہری سنگھ نلوے کو لکھا کہ میرے حکم کے بغیر اُوڑی کے راجہ پر کیوں حملہ کیا گیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ چِٹھی سرینگر پہنچتی راجہ سَربُلند خان کھکھا کا بیٹا مظفر خان ہری سنگھ نلوے سے جا مِلا اور خالصہ فوج کی کمان میں اُس نے اُوڑی پر چڑھائی کر دی۔ مظفر خان کی نشاندہی پر اُس کا چاچا راجہ غلام علی کھکھا گرفتار کر لیا گیا اور مظفر خان کا دوسرا چاچا سرفراز خان جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ غلام علی خان کو گرفتار کرنے کے بعد ہری سنگھ نلوے نے مہاراجہ کو لکھا کہ غلام علی خان کھکھا جو ہر وقت خالصہ فوج کے خلاف برسرِ پیکار رہتا تھا اور کسی صورت میں بھی اطاعت قبول نہیں کرتا تھا، اَب گرفتار کر لیا گیا ہے اور کھادرہ علاقہ میں بغاوت کو دَبا لیا گیا ہے۔ اِس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خوشی کا اظہار گیا اور ہری سنگھ نلوے کو حکم دیا کہ غلام الدین کھکھا کو پہرا چوکی کے ساتھ پوری عزت سے ہماری دَربار میں پیش کیا جائے لیکن تاریخ جموں وکشمیر کے مصنّف مولوی حشمت اللہ خان لکھتے ہیں کہ غلام الدین کھکھا کا بعد میں شیر گڈھی کے قید خانہ میں کام تمام کر دیا گیا تھا اور سرفراز خان کھکھا کو جو راجگانِ کھادرہ کا سرکردہ تھا لاہور بھیج دیا گیا تھا اور کُل علاقہ کھادرہ بونیار سے لے کر چیکار تک ہری سنگھ نلوے نے اپنے قبضہ میں لے لیا تھا ہر ایک جگہ قلعے تعمیر ہوئے جہاں خالصہ فوج متعین کر دی گئی۔ غرض کہ راجگانِ کھادرہ کی آزادی یا نیم آزادی جو کچھ بھی تھی ہری سنگھ نلوہ کے زمانہ کے بعد ختم ہو گئی اور چھوٹی چھوٹی جاگیریں راجگانِ کھکھا کی کچیلی وچیکار اور راجگان ہتمال کی اوڑی کھلیانہ، نالمہ، اور بونیار رہ گئیں جن کے علیحدہ کوئی بڑے کارنامے نہیں اور جن کے راجاؤں کی حیثیت

محض علاقہ داروں یا قبائیل کے سرداروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔

راجہ مظفر خان کھکھا[1]

جناب سی.ای.بٹیس "دی گزیٹر آف کشمیر" میں لکھتے ہیں کہ جب مظفر خان نے اَپنے تمام حمائیتوں کے ساتھ ہری سنگھ نلوے کی مدد کر۔ کے اُسے اُوڑی پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور اَپنے چاچا راجہ غلام علی خان کھکھا کو گرفتار کروا دیا تو ہری سنگھ نلوہ نے مظفر خان کی وفاداری اور خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُسے اوڑی کے راجے کے خطاب سے نوازا اور راجہ غلام علی خان کھکھا کی جگہ گدّی نشین کیا۔ مگر سارے علاقے میں خالصہ فوج متعیّن تھی اور مظفر خان فقط نام نہاد راجہ تھا۔ اُس پر یہ بھی لازم تھا کہ وہ چار ہزار روپے سالانہ خالصہ دَربار کو نذر کے طور پر پیش کیا کریگا جس میں تین ہزار اُس کی جاگیر کے خرچے کے لئے تھے۔

راجہ عطا محمد خان کھکھا کی بغاوت

راجہ مظفر خان کھکھا کے تین بیٹے تھے یعنی عطا محمد خان، نواب خان اور جواہر خان۔ آخری دو بیٹے ایک ہی ماں سے تھے۔ چنانچہ چھوٹی بیگم نے راجہ مظفر خان کھکھا پر اَپنے دو بیٹوں میں سے کسی ایک کو راجہ بنانے اور بڑے بیٹے عطا محمد خان کو راج سے دُور رکھنے کے لئے کہا۔ اِس طرح راجہ مظفر خان کھکھا اور اُس کے بڑے بیٹے عطا محمد کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ عطا محمد خان نے اَپنے باپ کے خلاف بغاوت کردی اور سرینگر آ کر شیخ امام الدّین ناظم کشمیر ۱۸۴۶ء سے سازش کر کے اپنے والد کو گدّی سے اُتارنے کی کوشش کی

1.C.E.Bats, The Gazzetter of Kashmir.

اور اپنے راجہ ہونے کا دعویٰ پیش کیا۔ اِس سازش کا اُوڑی کے راجہ مظفر خان کو عِلم ہُوا تو گھر میں نفاق پیدا ہوگیا اور وہ خود بھی شیخ اِمام دین سے مِل گیا اور ۱۸۴۶ء میں جب شیخ امام الدّین ناظمِ کشمیر اور ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے درمیان ٹھن گئی تو راجہ مظفر خان شیخ امام الدین سے مل کر ڈوگروں سے لڑ رہا تھا تا کہ اَپنے بیٹے عطا محمد خان کو اپنی راجگی سے دُور رکھ سکے۔

۱۸۴۱ء میں جناب بی سی ہیگل کی اُوڑی میں آمد اور اُن کا بیان

مشہور سیاح بی سی ہیگل کشمیر جاتے ہوئے ۱۸۴۱ء میں اُوڑی علاقہ سے گزرے تھے۔ اُن کے سَفر نامے پنجاب اور کشمیر میں اُوڑی کے بارے میں بڑی اہم معلومات ملتی ہیں جن سے اُس دُور کے علاقہ کھاورہ کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بارہمولہ سے دُو میل کے فاصلہ پر علاقہ اُوڑی میں بدُھ وہار کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اُس کے آگے اُوڑی تک تین چھوٹے قلعے ہیں۔ یعنی قلعہ اٹل گڈھ، قلعہ شنکر گڈھ اور قلعہ مسیکر بونیار کے پاس ایک بدُھ مندر اچھی حالت میں موجود ہے۔ اَفغانوں کے زمانہ میں بارہمولہ سے مظفر آباد تک کا سارا علاقہ چھ لاکھ روپے کی جاگیر ہوتی تھی لیکن ڈوگرہ عہد حکومت میں اس علاقہ کی آمدن بہت گھٹ گئی ہے۔ یہ تمام علاقہ چھوٹی چھوٹی جاگیروں پٹہ داروں زیلداروں نمبرداروں اور زمین داروں میں بٹ چکا ہے جن کے مالک اگرچہ اپنے آپ کو راجہ کہتے ہیں اور خان کا لقب بھی اختیار کرتے ہیں لیکن یہ بڑے مفلس قناعت پسند اور اڑیل سردار ہیں۔ جو کچھ بھی

---

[1] جناب حشمت اللہ خان مصنف کے مطابق تاریخ جموں و کشمیر سرفراز خان ۱۸۲۱ء میں گرفتار ہو کر لاہور چلا گیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ بعد میں اُس نے بھی اطاعت قبول کر کے رہائی حاصل کر لی تھی۔

ان کے پاس ہے اُسی پر اللہ کا شکر بجالاتے ہیں۔

ان میں سے ایک راجہ سرفراز خان کھکھا ہے جس کی مملکت جہلم کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ واقع ہے جو مسیکر کے قلعے میں رہتا ہے اور اپنے آپ کو راجہ مسیکر (Messe.cru) کہتا ہے ـــــــ ایک اور راجہ دُوشینہ ہے جس کا نام زبردست خان کنلیال ہے اس کا علاقہ جیم پورہ سے شروع ہوتا ہے۔ زبردست خان ابھی بچّہ ہی تھا کہ اُسے یرغمال کے طور پر کشمیر بھیج دیا گیا تھا۔ علاقے کی دیکھ ریکھ اُس کی ماں کرتی تھی جو کہ گنگل (Ginghal) میں رہتی تھی۔ اُوڑی میں ایک سرائے ہے جو قصبے سے دُور پُل کے درمیان میں واقع ہے یہاں سے پونچھ کی طرف سڑک جاتی ہے۔ اُوڑی ایک چھا خاصہ قصبہ ہے۔ یہ مقام 74.5^{o} عرض بلد اور 34.5^{o} طول بلند میں واقع ہے۔ یہاں ایک قلعہ ہے اور سیلانیوں کے لئے ڈاک بنگلہ بنایا گیا ہے۔"

رام چندر در

کشمیر کے قدیم کتب خانے
تذکروں کی روشنی میں

کشمیر زمانۂ قدیم سے علم واَدب کا گہوارہ رہا ہے۔اِس نے ایسے عالم اور فاضل، عارف اور مجذوب صوفی اور سالک، سادھو اور سنیاسی پیدا کئے کہ دُنیا کے کسی بھی ملک میں اس کی مثال نہیں ملتی ۔اِس علاقے کے تواریخ دانوں کا شمار دُنیا کے بڑے بڑے مورّخوں میں ہوتا ہے ۔ اِس کی مرّتب کی ہوئی تواریخوں میں یہ پیغام بھی درج ہے کہ اِس ملک میں پُرانے زمانے میں عظیم الشان کُتب خانے قائم تھے۔اِن میں کچھ سرکاری اور کچھ نجی طور قائم تھے۔

موجودہ زمانے میں کتب خانوں کا کوئی شمار نہیں لیکن کشمیر میں کُتب خانے قائم کرنے اور اُن کی دیکھ ریکھ کا کیا اِنتظام تھا اس بارے میں ہمیں مقامی تواریخوں میں دَرج ذیل جستہ جستہ اِقتباسات ملتے ہیں۔

ہندو دَور میں یہ کتب خانے بڑے بڑے مندروں اور دَھرم شالاؤں

سے مُلحق ہوا کرتے تھے جہاں رَاج دربار کے علاوہ عام لوگ اِن کتب خانوں سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ تواریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ کہ ہندو بادشاہوں کے دوَر میں یہ کتب خانے سرینگر کے علاوہ بجبہاڑہ ، کاکہ پورہ ، پرہاسپورہ ، بارہمولہ، اِندرکوٹ ،سوپور اور شاردا میں قائم تھے۔ اِن کتب خانوں کا ثبوت ہمیں اس بات سے بھی ملتا ہے کہ ایک مشہور ومعروف عربی عالم ابوریحان محمد البیرونی جب شمالی پنجاب پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنی مشہورِ عالم تصنیف ''کتاب الہند'' مکمل کرنے کے لئے کشمیر کے ہندو وِدھوانوں کی کتابیں کشمیر کے مختلف کتُب خانوں سے منگواتا ہے اور اِن کتابوں سے استفادہ کرکے اُس نے اپنی معرکتہ آراء تصنیف مکمل کی۔

اِس کے بعد کشمیر میں مُسلم عہد حکومت ۱۳۲۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ مسلمان بادشاہ طور وطریقوں اور رَسوم ورِواج اور نشست وبرخاست میں پوری طرح کشمیری تھے اگرچہ وہ کشمیر کے اصلی باشندے نہ تھے۔ اس میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے فوری طور سنسکرت / شاردا رزبان ترک نہیں کی جو کہ ہندو دور میں دفتری زبان تھی۔ یہی زبان بہت عرصے تک مسلمان عہدِ حکومت میں سرکاری زبان رہی۔ ساتھ ہی اس عہد میں بہت سی سنسکرت کتابیں بھی لکھی گئیں۔

حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ جب وارِدِ کشمیر ہوئے تو اُن کے فرزند حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ نے ۷۹۸ء میں ایک خانقاہ تعمیر کی جس کے ساتھ انہوں نے ایک بہت بڑا کتُب خانہ بھی قائم کیا لیکن خانقاہ وقتاً فوقتاً نذرِ آتش ہوجانے کی وجہ سے یہ اَنمول سرمایہ بتدریج ضائع ہوگیا۔

شاہ ہمدانؒ کے دَور کے قریب ہی سلطان سکندر کشمیر کا حکمران بن گیا اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کٹر مذہبی خیالات کا پیروکار تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ اُس نے بہت سے مندر مسمار کر دیئے جس وجہ سے اس کا نام سکندر بُت شکن پڑ گیا۔ ساتھ ہی اُس نے بہت سے کتب خانے نذرِ آتش کرا دیئے جو اُن مندروں اور دَھرم شالاؤں سے وابستہ تھے۔

کشمیر کے بادشاہوں میں سلطان زین العابدین علم دوست اور عالموں کا قدر دان تھا۔ کشمیر کے لوگ اسے پیار سے بڈشاہ بلکہ کشمیری پنڈت ''بٹہ شاہ'' کہتے تھے۔ اُس نے مُلکِ کشمیر میں علمی رِوائتیں قائم کیں۔ جگہ جگہ مدرسے قائم کرائے۔ خاص طور سے سرینگر کی جامع مسجد میں ۸۰۱ہجری میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا جس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا۔ فتح کدل سرینگر میں عروۃ الوثقیٰ نام سے ایک یونیورسٹی قائم کی جس کی نسبت سے اِس علاقے کا نام ''آروٹ'' پڑا جو آج بھی رائج ہے۔ اِس یونیورسٹی میں نادر الوجود کتُب خانہ بھی تھا۔ تواریخ میں دَرج ہے کہ چکوّں کے وقت یہ کتب خانہ' خانہ جنگیوں کا شِکار ہوا جس وجہ سے بعض کتابیں چُرائی گئیں، کئی کتابیں جل گئیں اور کچھ مغل بادشاہوں کے ہاتھ لگیں جو چکوّں کے بعد کشمیر پر قابض ہو گئے۔ روایت ہے کہ اس کتب خانے میں قریب تیں ہزار کتابیں جمع کی گئیں تھیں۔ خیال رہے کہ اِس زمانے میں تیں ہزار کتابیں جمع کرنا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ چھاپ خانوں کا وجود نہ تھا اور نہ پڑھنا لکھنا ہی عام تھا۔

بڈشاہ نے حکم دے رکھا تھا کہ اُس کے کتب خانے میں کوئی بھی کتاب

جلد بندی کے بغیر نہ ہو جس کے لئے بادشاہ نے کتب خانے کے قریب ہی جِلد سازوں کا محلّہ بسایا تھا یہ محلّہ اَب بھی جلد گر محلّہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب خانے سے جو کتاب بادشاہ کے زیرِ مطالعہ رہتی اُس پر وہ مہر ثبت کر کے یا دستخط کر کے یہ تصدیق کرتا کہ اُس نے یہ کتاب پڑھی ہے۔

بادشاہ کو کتابیں جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ جب وہ سُنتا تھا کہ دُنیا کے کسی بھی کونے میں کسی نایاب یا مفید کتاب کا نسخہ موجود ہے تو اُس کی نقل یا اصل حاصل کرنے کیلئے وہ کوئی بھی قیمت اَدا کرنے کیلئے تیار رہتے۔ اِس کی دُو مثالیں تواریخ سے معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ بادشاہ نے سُنا تھا کہ اُتھر وید کا صحیح نسخہ شمالی ہندوستان میں کہیں بھی دستیاب نہیں۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اُسے کہا گیا کہ یہ نسخہ مہاراشٹر میں کسی جگہ موجود ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ نے اَپنے وقت کے مشہور سنسکرت عالمِ یودھ بٹ کو اِس کی نقل حاصل کرنے کیلئے سرکاری لاگت پر وہاں روانہ کیا۔ یہ نقل بعد میں پورے ہندوستان میں مستند مانی گئی۔ حال ہی میں پنڈت شنکر پانڈرنگ نے جو اُتھر وید چھپوایا ہے وہ بڈشاہ کے حاصل کردہ نقل پر مبنی ہے کیونکہ یہ نقل صحیح اور دُرست ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ بڈشاہ نے کہیں سے سُنا کہ قرآن شریف کی ایک مشہور تفسیر جسے تفسیرِ کشاف کہتے ہیں اور جسکے مصنّف علامہؔ جار اللہ ہیں، مکہ معظّمہ میں موجود ہے۔ یہ سُن کر بڈشاہ نے اِس کی نقل حاصل کرنے کیلئے سرکاری لاگت پر ایک اَچھے خطاط کو مکہ معظّمہ بھیجا جس نے وہاں جا کر اُس کی نقل حاصل کی۔ بادشاہ نے اِس کی نقرئی جلد کروائی اور اِسے جامع مسجد کے کتب خانے میں رکھوایا۔ یہ نقل مرزا حیدر کاشغری کے دَورِ اقتدار تک وہاں

موجود تھی لیکن اسکے بعد کتبِ تواریخ میں مرقوم ہے کہ مرزا حیدرِ کے قتل ہو جانے کے بعد کوئی شخص یہ نسخہ لے کر کاشغر بھاگ گیا۔

اِن دو مثالوں سے صاف مظاہر ہوتا ہے کہ پُرانے زمانے میں کشمیر کے بادشاہوں کو کتابیں جمع کرنے کا کتنا شوق تھا۔ خاص کر سُلطان زین العابدین، جس نے سرینگر میں جگہ جگہ کاغذ بنانے اور جلد بندی کے کارخانے قائم کروائے اور فنِ خوشنویسی کی سرپرستی کر کے کتابوں کی تیاری کو ممکن بنایا۔ اس سے قبل کتابیں بھوج پتر پر لکھی جاتی تھیں جو بہت جلد خراب ہو جاتی تھیں۔

چک بادشاہوں میں حسین شاہ، اُس کا بھائی علی شاہ اور علی شاہ کا بیٹا یوسف شاہ علم دوست بادشاہ گزرے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے زمانے میں کئی اور کتب خانے قائم کرائے۔ اُس زمانے میں فارسی کو اور زیادہ عروج حاصل ہوا اور فارسی کتابیں بہت عام ہوگئیں۔

یوسف شاہ کے بعد اُس کا بیٹا یعقوب شاہ چک کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ لیکن یہ اَپنے اَسلاف جیسا علم دوست نہیں تھا۔ اس کے زمانے میں کشمیر میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اُسی بادشاہ کے زمانے میں صدیوں سے جمع کئے ہوئے کتب خانے تباہ و بَرباد ہو گئے۔

اَب تک یہ شاہی سرپرستی میں کتب خانے قائم کرنے کی رُوداد تھی، نجی طور بھی لوگ ایسے نیک کاموں سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ ملک میں جو بڑے بڑے علمی خاندان اور اس زمانے کے اہل اللہ بزرگ تھے وہ کتب خانے قائم کرنے میں بے حد دلچسپی لیتے۔ چنانچہ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے ایک مشہور اہل اللہ بزرگ حضرت بابا اسماعیل زاہد نے ایک نجی کتب خانہ قائم

کرر کھا تھا جو عوام کیلیئے وقف تھا۔ بابا اسماعیل زاہد نے ۹۱۶ھ میں اِس دنیا سے نقل فرمایا لیکن اُن کے انتقال کے بعد بہت عرصے تک یہ کتب خانہ عام لوگوں کو فیض پہنچاتا رہا۔ یہ کتب خانہ، بابا صاحب کی خانقاہ میں شامل تھا جو ہاری پربت کی پہاڑی کے پیچھے اَمدا کدل محلے میں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اِس کتب خانے میں ہزاروں کتابیں تھیں لیکن ۱۰۹۰ھ میں اَورنگ زیب کے دَورِ حکومت میں یہ خانقاہ نذرِ آتش ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کتب خانے کا وجود بھی ختم ہو گیا۔

جڈی بل محلے میں میر شمس الدّین عراقی کی خانقاہ کے ساتھ ہی ۹۱۰ھ ہیں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا۔ اگر چہ اس کتاب خانے میں زیادہ تعداد مذہبی کتب کی تھی لیکن دیگر موضوعات پر بھی کتابیں دستیاب تھیں۔ میر شمس الدین عراقی نے کوشش کی کہ ایران اور اس کے گرد ونواح میں جو کتابیں ملتی ہیں اُن کی نقل، مذکورہ کتب خانے میں رکھی جائے۔ لیکن بَدقسمتی سے یہ کتب خانہ ۹۵۷ھ میں خانہ جنگی کی نذر ہو گیا۔

ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جموں میں ایک دارالترجمہ اور کتب خانہ قائم کرایا جس میں نادر و نایاب کتابیں جمع کی گئیں اور اِس کی باقیات اس وقت بھی ریسرچ لائبریری کی صورت میں موجود ہیں۔

نقل عہد نامہ لداخ

چوں دریں زمانِ فرخندہ عنوان بتاریخ دوئم ماہ اسوج ۱۸۹۹ء
مایان افسران لاسہ یئے قلون سوکان والہ دوئیم بخشی سیجوہ افسر افواج
خاقان چین و از طرف سری مہاراجہ صاحب راجہ راجگان راجہ صاحب
بہادر۔ راجہ گلاب سنگھ جی دو افسر یکے صاحب مختار الدولہ دیوان
ہری چند دوئیم وزارت پناہ وزیر رتنون در مجلس صلح و عہد پیمان
باتفاق ہمدیگر نشستہ و طریقہ و سررشتہ دوستی و واحد خانگی بصافی باطنی
جانبین واقسام قسمہائے تو نحق صاحب یاد کردہ چنیں قرار داد مقرر
شدہ کہ رابطہ صلح و صلاح و واحد خانگی سری مہاراج صاحب بہادر
راجہ گلاب سنگھ جی و خاقان چین و لامہ گورو صاحب لاسہ والا از روئے
صفائی باطنی ابتدائی حال تا ابد الدہر مستحکم و مربوط خواہد بود و بحضور
تو نحق صاحب بوجہی من الوجوہ عدول و فرق و قصور نخواہد شد و آنچہ

مہاراجہ گلاب سنگھ اور لہ کے درمیان طے پائے معاہدۂ لداخ کا عکس

کہ حدود حدود ملک لداخ معہ اطراف از قدیم الایام مقرر است
ہمراہ آں گاہی واسطہ وغرض اصلاً ومطلقاً نیست و نخواہم کرد و
اجرائے پشم شال وچائے موجب آئین قدیم سال بسال از راہ لداخ
نخواہم ساخت واگر کسے از مخالفان سری راجہ صاحب بہادر در
اطراف وملک ہائے مایان وارد شود سخن ہائے مخالفان مذکورہ را
پذیرائے نمے کنم ومشارالیہ ہا را در ملک خود جائے نمے دہم وآنکہ
سوداگران لداخ در اطراف ہائے ما مے آیند آنہاں را مزاحمت
نخواہد شد واینکہ در صدر قرار داد محکمی ودوستی دو احد خانگی ومقرری
حد حدود ملک لداخ وجاری گذاشتن راہ پشم شال وچائے نوشتہ
دادیم سر موئے خلاف نمے سازیم. برین عہد وقول قونحق صاحب
وکاتری ولپسی + وژوہ میان خوشحال چوہ گواہ اند تحریر عہد نامہ
دوئم ماہ

اسوج سنہ ۱۸۹۹ء

در این وقت فرخنده رخصت از راهِ تفقدات و تلطفات راج
ملک چکلۂ جموں کہ از آبائے و اجدائے ملک موروثی و ملکیت
بزرگان او جلدیدار نرمل بندۂ مقرب بارگاہِ سلطانی خیرخواہ بلااشتباہ
راجہ گلاب سنگھ واو جلدیدار نرمل بندۂ مقرب بارگاہ سلطانی میان
دھیان سنگھ و راجہ سوچیت سنگھ بود و از خورد سالگی کہ قریب دہ
دوازدہ سال عمر مشار الیہان بود کہ در جناب فیض مآب شرفیاب
گردیدہ اند و ہم آباؤ اجداد مومی الیہان از قدیم الایام پشت در
پشت در بجا آوری حسن خدمات سنگھ صاحب فیاض سرگباشی
ابوی صاحب ام مہان سنگھ جیو از صدق دل حاضر ماندہ بودند و ہم
ہر سہ او جلدیداران غاشیۂ عبودیت و فرمانبرداری و خیرخواہی
و خیراندیشی و حاضرباشی بر دوش جان کشیدہ دقیقہ از دقائق نمکحلالی
و جانفشانی و نوکری فروگذاشت نکردہ در ہر جنگ و معرکہ مثل افتتاح
ملتان و کشمیر و اقتتال مفسدانِ بداندیش آں روئے آب دریائے
سندھ و افواج آمد کابل و پشاور وغیرہ از سرگذشتگی و جان نثاری
و مردانگی فرق و تفاوت بمیان نیاوردہ لہٰذا ملک چکلہ مذکور در وجہ
راجۂ موصوف نسلاً بعد نسلاً عطا و مرحمت شدہ و قشقۂ راج مذکور
از دستِ مبارک بہ او جلدیدار نرمل بُد مقرب بارگاہ خیرخواہ بلااشتباہ

راجہ گلاب سنگھ مبرہن فرمودہ و از راہ کمال توجہات و مہربانی و بجا آوری حسن خدمات سرکار والا قشقہ راج تلک بندر اللہ در وجہ او جلدیدار نرل بدہ راجہ سوچیت سنگھ جیو از حضور فیض گنجور عطا و مرحمت شدہ کہ حاصلات آں را در مایحتاج خود آوردہ نسلاً بعد نسلاً اسمے نوردہ باشند و بخدمات و خیر خواہی و نمک حلالی سرکار والا سرگرم باشند کہ بفضل سری اکال پورکھ جیو ہر کس کہ از خاندان عالی شان سرکار فیض آثار خواہد بود۔ بموجب ہمیں پروانۂ حضور انور بعمل آوردہ وجہی فرق و تفاوت نخواہد ساخت و ہر کس کہ از پشت راجہ ہائے ومیان موصوف بودہ باشد کمر ہمت بستہ در نوکری و خیر خواہی و فرمانبرداری و نمکحلالی سرکار فیض آثار حاضر و رجوع باشند۔ لہذا پروانۂ والا بصحیح و پنجۂ زعفرانی بدست مبارک مزین فرمودہ عطا شد۔ تحریر تاریخ چہارم ماہ ہاڑ سنہ ۱۸۷۹ پروانگی حضور

منظور احمد دایک☆

کشمیر میں یُوروپیوں کی آمد اور مقاصد — قدیم تذکروں میں —

دَورِ قدیم ہی سے کشمیر کے مختلف ممالک کے ساتھ تجارتی، سفارتی اور ثقافتی تعلقات رہے ہیں۔ جدید تحقیق نے ثابت کر دکھایا ہے کہ عام سوچ کے برعکس یہ خطہ اپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کے باوجود بھی کبھی الگ تھلگ نہیں رہا۔ چین، یونان، وسط ایشیاء ہندوستان اور عرب وغیرہ کے ساتھ اِس کے گہرے تعلقات تو تھے ہی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ دَورِ قدیم میں یہاں بہت سے یورپی اور انگریز سیاح، مبلّغ، راہب وغیرہ بھی آتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیق و تجسّس کے بعد روز نتً نئی باتیں سامنے آرہی ہیں۔ محققین مختلف شواہد اور خیالات پیش کر رہے ہیں۔ اِس بات کو قطعی طور ثابت کرنا انتہائی مشکل ہے کہ یہاں آنے والے یورپی، خصوصاً انگریز باشندے کون

☆ کشمیر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ برین سرینگر

تھے۔ لیکن خود عیسائی مشنری کے معتبر ریکارڈ کے مطابق مغل شہنشاہ اکبر کے وقت میں ۱۵۹۸ء میں دو عیسائی پادری F.R. Serome xavier اور Brother Benediet اکبر کے ساتھ وارِدِ کشمیر ہوئے۔ اکبر کو مختلف مذاہب کے علماء اور مبلغ اپنے دربار میں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ اس نے ۱۵۷۹ء میں گوا میں عیسائی مشن کے پاس نمائندے بھیج کر وہاں عیسائی عالموں کو دعوت دے کر اپنے دربار میں بلوایا۔ دیگر مذاہب کے عالموں کی طرح یہ لوگ بھی اکبر کے ہمرکاب ہوتے اور اکبر اُن سے مختلف مذاہب اور ان کی تعلیمات پر بحث و مباحثہ کرتا، تاکہ وہ اپنے دینِ الٰہی کی تشکیل کر سکے۔

عیسائی مشنری کے ریکارڈ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اِس سے قبل بنگال سے دو عیسائی مبلّغ کشمیر آئے تھے لیکن اُن کے نام اور آمد کا سال درج نہیں کیا گیا ہے۔ ریکارڈ میں یہ بات درج ہے کہ اُن دو عیسائی مبلّغوں نے کشمیر میں بے اِنتہا غریبی کا مشاہدہ کیا تھا اور لوگ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دُرختوں کے پتّے کھایا کرتے تھے۔ بہر حال دو اور یورپی عیسائی پادری شہنشاہ اکبر کے ساتھ ۱۶۲۷ء میں کشمیر آئے ان کے نام Father cossi اور Father Decosta بتائے گئے ہیں۔ اِن میں سے Father Decosta اکبر کے دَربار کے ساتھ وابستہ تھا۔ جہانگیر کے ایک یورپی عیسائی درباری Father Bosi کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کشمیر آیا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے وقت بہت سے یورپی کشمیر آئے جن میں اُس کا درباری معالج فرانکولیس برنیر سرِفہرست ہے جس نے بعد میں اپنا سفرنامہ بھی لکھا۔ اِس کے علاوہ دو عیسائی پادریوں Father Azevedo اور

C.Oliveisa نے ۱۶۶۵ء میں تبّت سے ہوتے ہوئے لداخ کا دَورہ کیا اور واپس آگرہ چلے گئے ۔ بعد میں ۱۶۸۰ء میں پادری Father Desidey کے بھی تبّت پہنچنے کا تذکرہ ہے۔ کشمیر میں بھی ۱۷۱۵ء میں عیسائی مِشن قائم کرنے کا ذکر ہے اور یہ کام دُو عیسائی کی مبلغوں FR. Desideri اور FR. Appoltte کی وساطت انجام پایا۔ ان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اُنہوں نے تبّتی اور کشمیری زبان کی اچھی خاصی دسترس حاصل کی تھی۔ ۱۸۲۲ء میں ہنگری کا ایک اور پادری Cosma Sendor کشمیر آکر لداخ چلا گیا۔ ۱۸۵۴ء میں Rev. Robery Clark، جو اَمرتسر کرسچن مِشن کا نگراں تھا، کو کشمیر اور لداخ میں عیسائیت کے پرَچار کا چارج بھی دیا گیا۔ رابرٹ کلارک، مہاراجہ گلاب سنگھ کے دَورِ حکومت میں راجوری اور پونچھ سے ہوتے ہوئے مغل رُوٹ سے کشمیر آن پہنچا۔

۱۸۶۲ء میں لیفٹننٹ گورنر، سر رابرٹ منٹگمری نے مرّی (Muree) میں تحریر کردہ حکم نامے کے مطابق پورے پنجاب، جموں وکشمیر اور دیگر ملحقہ علاقوں میں کرسچن مشن قائم کرنے کو کہا جس پر سر ڈونالڈ میکلورڈ، سر رابرٹ ایڈوڑ، جنرل لیک، سر آر-این-کسٹ، مسٹر-ای-اے-پرنسپ-سر ڈوگلس فورلیتھ اور علاقے میں مختلف ریاستوں میں تعینات برطانوی ریذیڈنٹس نے جو قرارداد پاس کی اِس کا خلاصہ یوں ہے۔

"ہم اپنی دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس اَمر سے بھی بخوبی آگاہ ہیں جو ہم پر بطور عیسائی ہونے کے عاید ہوتی ہیں۔ ہم اِس سرزمین پر یسوع مسیح کا انسانیت کا پیغام عام کرنے والوں کو ممکنہ سہولیات فراہم

کرنے کے وعدہ بند ہیں۔ ہم گذارش کرتے ہیں کہ کشمیر میں بھی مستقل طور پر کرسچن مشنری قائم کی جائے اور اس مقصد کے لئے عطیہ جات اور چندہ جمع کرنے کے ترغیب دی جائے۔ اِس موقع پر سر منٹگمری نے مبلغ ایک لاکھ روپے بطور چندہ دیا اور دیگر دوستوں نے کشمیر میں کرسچن مشن قائم کرنے کیلئے مبلغ چودہ ہزار روپے پیش کئے۔[1]

کشمیر میں اِن برطانویوں کا مقصد تاج برطانیہ کے سیاسی اور توسیع پسندانہ مفادات کے ساتھ ساتھ عیسائیت کا پرچار اور رفاعِ عامّہ کے کام تھے۔ اور اِس میں شک نہیں کہ کشمیر میں یورپی علوم وفنون، خصوصاً میڈیکل سائنس متعارف کرانے میں ان کے رَول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اِس مقصد کے لئے انہوں نے اَپنے اقتدار کا بھرپور استعمال کیا۔ پنجاب میں عیسائیت کے پرچار نے برٹش ریذیڈنٹوں کو کشمیر کی طرف بھی متوجہ کیا اور اِس کے لئے مہاراجہ گلاب سنگھ اور اُس کے جانشینوں نے اُن کے ہر ممکن رعایتیں بھی دیں۔ چنانچہ اِس سلسلے میں برٹش ریذیڈنٹ کرنل ہنری کلارک اَپنے آقاؤں کو لکھتا ہے۔

" The Establishment of a permanent mission in Cashmere will be looked upon as marking the first subtle step of British in the path of anneation."

اِس کے بعد برطانوی ریذیڈنٹ رابرٹ کلارک نے کشمیر میں عیسائی مِشن کے ذریعے مختلف تعلیمی اِداروں کا وَجود عمل میں لانے کی اہمیت پر سخت زور دیا تا کہ انگریزی زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں کو

---

[1] Christanity in Kashmir by Hippolytus Kunnakl.

عیسائیوں کی مذہبی کتب کے مطالعے کا بھی موقعہ بھی حاصل ہو اور یہی طریقہ عام لوگوں کو عیسائیوں سے ملنے جلنے کا موقعہ فراہم کرسکتا تھا۔

مئی ۱۸۹۱ء میں فادر وِنکلے اور کننگھم، فادر بوور کی سربراہی میں بارہمولہ آئے اور مہاراجہ کشمیر نے اُن کا گرم جوشی سے اِستقبال کیا۔ اُنہوں نے مہاراجہ کو پوپ لیو XIII کے تحفوں سے نوازا اور مہاراجہ نے اِن پادریوں کو اپنے درباریوں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کی اِجازت دے دی۔

۱۸۹۲ء میں انہوں نے بارہمولہ میں زمین حاصل کر کے مِشن کی عمارت تعمیر کی۔ ۱۸۹۴ء میں فادر وِنکلے سِرینگر آئے اور بعد میں مہاراجہ نے اُن کو سرینگر میں درگجن اور دیگر جگہوں پر چرچ تعمیر کرنے کے لئے زمین عطا کی۔

۱۹۰۳ء فادر سمنز نے بارہمولہ میں مِشنری سکول کھولا۔

اِن پادریوں نے کشمیری زبان میں اچھی خاصی اِستعداد حاصل کی تاکہ یہاں کے عوام سے اُن کی زبان میں بات کرسکیں لیکن کشمیر میں وہ بہر حال اَپنے اِرادوں میں کامیاب نہیں ہوسکے کیوں کہ یہ وہ وقت تھا جب بین الاقوامی سطح پر رسل وَرسائل میں ترقی اور صنعتی انقلاب آچکا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ انگریزوں کا حکمران طبقہ عام لوگوں سے براہِ راست تعلق پیدا نہ کرسکا بلکہ برٹش دفاتر اور اُن کی بستیوں میں اِن لوگوں کو داخلے کی اجازت تک نہیں تھی جس میں گلمرگ کا برٹش کلب اور نگین کلب بطورِ مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ موجودہ ایمپوریم گارڈن ۱۹۴۷ء تک برٹش ریذیڈنٹ کی رہائش گاہ تھی اور موجودہ پولو گراؤنڈ، جسے اُس زمانے میں میدانِ مائسمہ کہا جاتا تھا میں شہر کی اچھی خاصی آبادی تھی، جس کو برطانوی افسروں نے وہاں

سے زبردستی خالی کرایا دیا تا کہ وہاں برطانوی باشندوں کے لئے پولوگراؤنڈ اور گالف کلب قائم کیا جا سکے۔ وہاں سے جن لوگوں کو نکالا گیا اُن کو موجودہ سونہ وار میں بسایا گیا۔ ایک مشہور پادری آرتھر برنک مین جنہوں نے کشمیر میں کئی سال گزارے اپنی کتاب "The Wrongs of Kashmir" اِشاعت لندن، دسمبر ۱۸۶۷ء میں یوں رقمطراز ہیں۔

"کشمیر میں زبانوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ سرکاری اہلکاروں اور فوجیوں سے عام لوگ بہت خوف کھاتے ہیں۔ مجھے میری مرضی کے مطابق عام لوگوں سے ملنے نہیں دیا جاتا۔ میں کشمیر کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں لیکن یہ کسی طور ممکن نہیں ہو رہا ہے۔"

چونکہ عیسائی مذہب کے مختلف فرقے ہیں اور کشمیر میں دورانِ تبلیغ اُن کے یہ اختلافات منظرِ عام پر آئے اور صرف دو فرقے کتھولک اور ہولی فیملی ہی یہاں کسی قدر قدم جما پائے۔ اِن دو فرقوں سے تعلق رکھنے والوں نے ۱۸۹۱ء میں لیپر سی ہسپتال، در جن کا چسٹ ڈیزیز، بسکو سکول امیرا کدل، سی ایم ایس گرلز سکول فتحکدل اور بارہمولہ، پہلگام اور گلمرگ وغیرہ میں چرچ اور سکول قائم کرائے۔

۱۹۱۰ء میں عالمی عیسائی پادریوں کا جو اِجلاس ڈاکٹر دف (Dr. Duff) کی سربراہی میں منعقد ہوا اُس میں یہ بات صاف طور تسلیم کی گئی۔

" The objectives of missionary education is conversion of individul puplis to the cheristian faith"

کشمیر میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کے بارے میں Arthur Brinckman لکھتے ہیں۔

''کشمیر میں جس شخص نے سب سے پہلے عیسائیت قبول کی اُس کو مقامی لوگوں نے زنجیروں سے جکڑ کر ایک لوہے سے باندھ دیا۔ اُس کو بڑی مشکل سے تَب چھڑایا جاسکا جب مہاراجہ کے سپاہیوں نے برطانوی افسروں کی ایماء پر مداخلت کی۔ عیسائی مشنری باقاعدہ طور اَپنے ساتھ ڈوگرہ سپاہی رکھتے ہیں۔ البتہ غربت اور مفلوک الحالی کی وجہ سے لوگ علاج معالجے کے لئے اِن پادریوں کے پاس آتے ہیں۔ کشمیر میں ہر سال ہزاروں اَفراد قحط اور بھوک کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ عوامی شکایات کا ازالہ کرنے کے لئے کوئی کاروائی نہیں کی جاتی کیونکہ انہیں خریدا گیا ہے۔ اگر کشمیر میں ان غلطیوں سے اجتناب نہیں کیا گیا تو ہماری نیک نامی پر دَھبہ لگ جائے گا اور ہم اَپنے مقاصد میں قطعاً کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔''

کشمیری زبان میں ۱۸۲۱ء شاردا رسمُ الخط میں بائبل کا ترجمہ کیا گیا اور ۱۸۳۲ء میں سری رام مشن نے اِس کا دوبارہ ترجمہ کرایا۔ ۱۸۸۰ء میں T.R.Wade نے، جو کِرسچن مشنری سکول میں ملازم تھے، نے شاردا رسم الخط میں بائبل کا ایک اور ترجمہ شائع کرایا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ بعض مقامی پنڈتوں نے اس پر نظرِ ثانی کی تھی۔ ڈوگری زبان میں بائبل کا ترجمہ سب سے پہلے ۱۸۲۰ء اور بعد میں ۱۸۲۶ء میں شائع کیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں بلتی زبان میں، زانسکاری زبان میں ۱۹۳۰ء، لداخی میں ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۷ء میں بائبل کے ترجمے مختلف رسوم الخط میں شائع کرائے گئے۔

کشمیر کئی وجوہات کی بناء پر عیسائیوں کے لئے خاص توجّہ کا مرکز رہا کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ کے کشمیر آنے کا چرچا پُورے یورپ میں تھا اور اِس سلسلے میں بذاتِ خود کشمیر آکر حقیقت کا پتہ لگانے کیلئے بہت سے عیسائی کشمیر آئے اور ان کے تجربات اور مشاہدات وقتاً فوقتاً سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

-*-

منظور احمد دایک☆

کشمیر میں برطانوی ریذیڈنٹ اور اُن کی سرگرمیاں

مشہورِ زمانہ بیعہ نامہ اَمرت سر جو ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۶۲ھ، مطابق ۱۶، ماہ مارچ ۱۸۴۶ء، انگریزوں اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان طے پایا، کی شق نمبر ۱۰ میں درج کیا گیا ہے کہ:-

"Maharaja Gulab Singh a-cknowled-ges the supermacy of the Britsh Govt. and will in token of such supermacy present annually to the British Govt. one horse, twelve perfect shawal Goats of approved breed (six Male and six female), and three pairs of cashmere shawls"

اِس کے ساتھ ساتھ برٹش سرکار پورے جموں و کشمیر میں اپنے نمائندگان کو تاجِ برطانیہ کے مفادات کے تحفظ اور اپنے وسائل کے فروغ کے لئے مقرر

☆ کشمیر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ برین سرینگر

گلمرگ گالف چمپین شپ (۱۹۰۸ء)

گلمرگ میں انگریز گالف کھلاڑیوں کی ایک یادگار تصویر
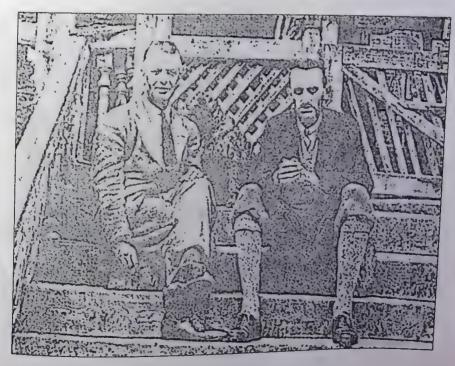
گلمرگ گالف چمپین شپ (۱۹۰۸ء)
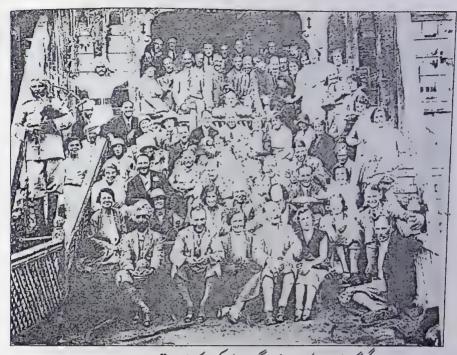
گلمرگ گالف کلب کے انگریز اراکین کی ایک تصویر (۱۹۰۵ء)
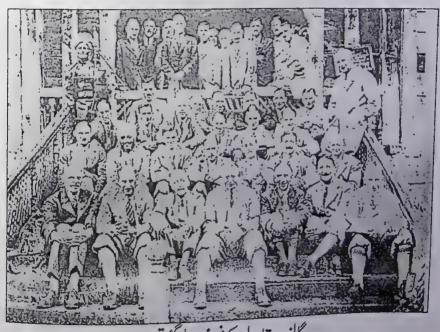
گالف مقابلے کے فوراً بعد لی گئی تصویر

لیڈیز گالف چمپین شپ کی فاتح اراکین (گلمرگ ۱۹۰۵ء)

ریذیڈنٹس ٹرافی کے فاتح اراکین (گلمرگ ۱۹۰۵ء)
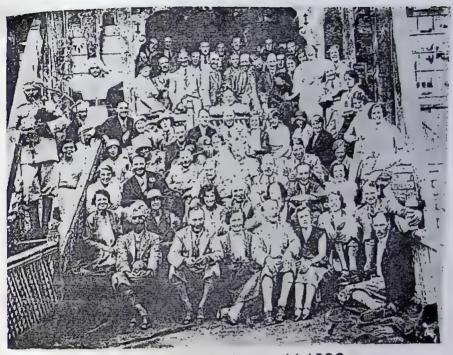
Scotland V. The world 1932
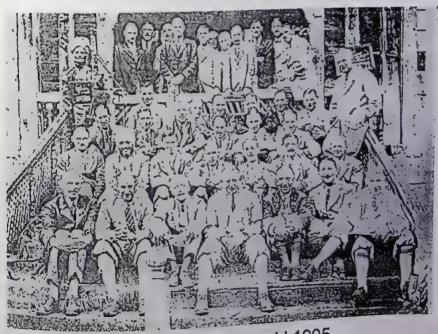
Scotland V. The world 1905

گلمرگ میں انگریز گالف کھلاڑیوں کی یادگار تصاویر
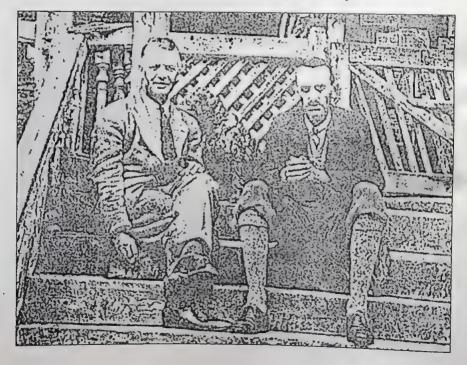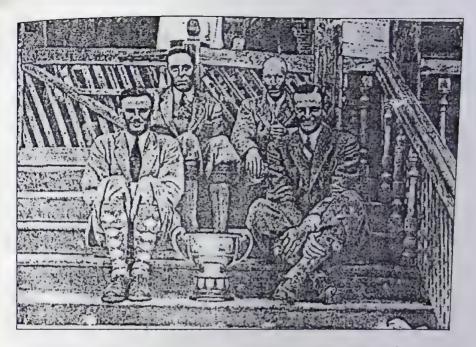
گلمرگ کلب کے باہر انگریز سیاحوں کی یادگار تصاویر (۱۹۰۸ء)

کرتی رہی ۔ اِس کے ساتھ ہی جموں وکشمیر آنے والے برطانوی اَفسروں اور باشندوں کو خاص مراعات بھی حاصل ہوگئیں۔ اِن برطانوی افسروں کا کام مہاراجہ کے کام کاج کی کڑی نگرانی، برٹش سرکار کے مفادات کی نگہداشت، عیسائیت کا پرچار اور چرچ مشنری کا قیام بھی تھا۔ وَقت گزُرنے کے ساتھ کشمیر میں برطانوی باشندوں، فوجی اور سِول افسروں کی کئی کالونیاں معرضِ وجود میں آئیں جہاں اُن کو عیش وآرام کی ممکنہ سہولیات بہم رکھی جاتی تھیں۔ اِن میں سے کئی برطانوی باشندوں نے کشمیر میں جدید مغربی علوم کی داغ بیل بھی ڈالی اور یہاں کے فنون کو باہر کی دُنیا سے بھی متعارف کرایا۔ اس کے ساتھ ہی جانوروں کے علاج اوران کے تحفظ کیلئے Kashmir Animuls Welfare Association کا قیام بھی عمل میں لایا جہاں جانوروں کا مُفت علاج کیا جاتا تھا اوراِس کی بنیادی رُکنیت حاصل کرنے کے لئے پانچ رُوپے کی رقم مقرر کی گئی تھی ۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے کہ جب یہاں کے لوگ جدید میڈیکل سائنس سے ناآشنا تھے اورعوام وخواص حکیموں کے رحم وکرم پر ہوتے ۔ غرض انگریزوں نے کشمیر میں زندگی کے مختلف شعبوں میں اَپنے وجود اور اَثر کو ظاہر کیا۔ خصوصاً سڑکوں کی تعمیر، تجارتی وسائل کے فروغ، جدّید طرزِ تعمیر، دفتری کام کاج میں بہتری اور سیاحت کا فروغ، ان ہی برطانوی باشندوں کی مرہونِ منت ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے یہاں کی تہذیبی وراثت کی علامتوں کو پامال کیا اور بہت سے نادر ونایاب قلمی مخطوطات مورتیاں، مجسمے، کتبہ جات اَپنے ساتھ لے گئے ۔ یوں ہمارے تہذیبی سفر کے لاتعداد سنگِ میل گمنامی کی نذر ہوگئے ۔

غلامی کیا ہے، ذوقِ زیبائی سے محرومی

برٹش سرکار کے مفادات کے تحفظ کے لئے کشمیر دَربار میں برٹش ریذیڈنٹ تعینات کئے گئے۔ اُس کے اختیارات کافی وسیع ہوتے تھے۔ وہ مہاراجہ کی اجازت کے بغیر بھی ریاست کے مختلف علاقوں کے گورنروں، وزیر وزارت اور دیگر اعلیٰ حکام کو جواب دہی کے لئے طلب کرتے اور انہیں مختلف نوعیت کے احکامات بھی دیتے۔ یہ ریذیڈنٹ تفصیلی رپورٹیں گورنر جنرل آف انڈیا کو ارسال کیا کرتے تھے۔ مہاراجہ اور اُس کو اہلکاروں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لے جاسوسی بھی کی جاتی۔ یوں زائد از ۸۰ ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ریاست پر عملاً ریذیڈنٹ کی حکومت ہوتی۔ اِتنے وسیع و عریض ملک میں برطانوی ریذیڈنٹ اپنے فرائض مستعدی سے انجام دیتے۔ Arthur Brickman اپنی کتاب "The wrongs in Kashmir" مطبوعہ لندن، ۱۹۲۷ء میں لکھتے ہیں۔

" A Missionary often has a disagreeable time when preaching in Punjab as any pary of India then in the streets of serinaghar (srinagar).I cannot recollect at this moment even receiving any thank approaching to an insult as even an uncivil world when preaching to Cahmeer.Dr. Elmsile, the medical missionary is perhaps the most popular traveller that even resided in Cashmeer. For men in the last two seasons left their homes and because of christians and are now living for safely in Punjab. Kashmir and its people were sold by us

to Gulab Singh for 750000 Rupees in 1846. The sale was against the wishes of the people who were allowed no choice in the matter. The Rajah of cashmeer is one tributary bound by treaty to acknowledge our entire supermacy and is not an Independant prince but one subject."

" The Story of اپنی کتاب Tyndle Biscoe

Sheikh Bagh" میں رقمطراز ہے۔

" The years rolled on and the Afghan rule gave place to that of Ranjit Singh, the lion of Punjab. The first Bristish agent of East India Company arrived in Kashmir and was housed in the mansion among the chenars here in their name lodged john Nicholson and john lawrence.

Here also in 1857 young lieut, Lismston lying dangerously ill with typhogt, made his bold blupp when entirely on his auothority he threatned the annexation of Kashmir if the widows of Maharajah Gulab Singh were burried to death on his funeral prayre, a threat that was-enough to put an end to the cruel practice of sati in Kashmir from that time onwards.

Latter on the Kashmir State allowed the church mission society to rent a part of sheikh

Bagh."

کشمیر میں برٹش ریذیڈنٹوں میں کئی اعلیٰ پایہ کے انجینئر، ماہر تعمیرات، بجلی اور ریلوے انجینئر وغیرہ ہوتے تھے۔ کشمیر کے لئے ریلوے لائن کی نسبت گورنمنٹ آف انڈیا اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے درمیان ۴ جولائی ۱۸۸۸ء میں ایک اِقرار نامے پر دستخط ہوئے جس پر برٹش سرکار کی طرف سے کشمیر کے ریذیڈنٹ T. Chichele Plowden نے دستخط کئے اور اِس کی عمل آوری کے لئے W.L.Weightman جو محکمہ ریلویز کے انجینئر اِن سپیشل ڈیوٹی تھے، نے ۱۸۹۲ء میں سروے کروا کے Kashmir Railways کے نام سے ایک جامع پروجیکٹ مرتب کیا۔ اس پروجیکٹ کی نسبت Sir M.F.O. Owyer, Prevenue commissioner, North West Frontier نے لکھا ہے کہ

"............The above nots will, I think show that the project of a Railway from Kala Ki Sarai to Abbottabad to Jehlum Vallay road to Kashmir has much to recomnamd it on political military, administrative and commercial grounds from the point of view of Bright Govt............"

برٹش ریذیڈنٹوں نے سرکاری مصروفیات کے علاوہ ذاتی اور مذہبی کام بھی سرانجام دیئے۔ انہوں نے کشمیر کی ثقافت پر بھی تحقیق کی۔ کشمیری زبان، گرائمر، تراجم اُن کی دلچسپی کے خاص شعبے تھے یہ لوگ مہاراجہ کے دربار سے

سرکاری راز چُرانے میں بھی ماہر تھے۔ تاکہ برٹش سرکار کے مفادات کو تقویت پہنچا سکیں۔ سیف الدین روز نامچہ اِس سلسلے میں بہت عرصے تک برطانویوں کا خاص آلہٗ کار تھا۔ سیف الدین مذکور، فارسی زبان میں خفیہ طور مختلف سیاسی سرگرمیوں اور انتظامی اُمور وغیرہ کی نسبت رُوداد تحریر کرکے برطانوی اَفسروں کے حوالے کر دیتا تھا۔

مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ نے اپریل ۱۹۳۷ء میں Britsh Residents کی ایک مکمل ڈائری شائع کروائی جس میں کشمیر میں رہائش پذیر ایسے افسران کی فہرست معہ رہائش کے مرتّب کی گئی تھی۔

سرینگر میں برطانوی افسران سول لائنز، یعنی موجودہ رام منشی باغ، ایمپوریم بلڈنگ، احاطۂ امر سنگھ کلب، ریذیڈنسی روڑ، پولوگراؤنڈ اور دیگر ملحقہ علاقوں میں رہائش پذیر رہتے تھے۔ کیونکہ ان ہی علاقوں میں ان کے اکثر و بیشتر دفاتر بھی تھے۔ گرمیاں شروع ہوتے ہی برطانوی افسروں کی کثیر تعداد، جن میں کشمیر میں تعینات برٹش ریذیڈنٹ بھی شامل ہوتا، گلمرگ کا رُخ اختیار کرتے اور ستمبر کے مہینے تک وہیں قیام پذیر رہتے۔ اِس طرح سے پُورا گلمرگ برٹش کالونی میں تبدیل ہو جاتا۔ ۱۹۰۱ء میں مہاراجہ اَمر سنگھ جو کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا بھائی، وزیر اعظم اور فوج کا کمانڈر انچیف تھا، نے گالف میدان کی تعمیر کے لئے انگریزوں کو گلمرگ میں زمین تحفے کے طور دی جہاں انگریزوں نے ۱۹۰۲ء میں گالف کلب، چرچ اور قبرستان تعمیر کیا۔ وہاں انگریزوں نے Kashmir Animuls Welfare Association کا قیام عمل میں لایا جس کے اعزازی سکریٹری Robert lamb تھے۔

یہاں پر انگریزوں کے گھوڑوں اور کتّوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی خدمت پر مامور گرد و نواح کے علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کے مویشیوں کا علاج و معالجہ کیا جاتا تھا۔

انگریزوں نے گلمرگ کی خوبصورت اور قدرتی حُسن کو محفوظ رکھنے کے لئے وہ برطانیہ کی طرف پر Hut system رائج کیا۔ بازار اور دیگر مراکز بھی قائم کئے گئے۔ کشمیر سکاوُٹس ایسوسی ایشن کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جو علاقے میں رفاعِ عامہ کے علاوہ گالف، کرکٹ اور دیگر کھیلوں کے مقابلے منعقد کرواتے رہتے تھے۔ انُہوں نے اَپنا رِسالہ بھی شائع کیا جس کے ایڈیٹر واسدیو کول اور جی این فوطے دار تھے۔ یہ سکاوُٹس آفات سماوی کے وقت متاثرین کی امداد بھی کیا کرتے۔ اُن کی سرگرمیاں ہندوستان اور برطانیہ کے مختلف اخبارات میں شائع ہوا کرتیں۔

کشمیر آنے والے ہر انگریز کی خواہش ہوتی کہ وہ گلمرگ کی تفصیلی سیر کرے۔ اس سلسلے میں کشمیر میں تعینات برطانوی فوج کے ایک افسر Mayor e Molyneuk اپنی کتاب "Kashmir" اشاعت لندن ۱۹۰۹ء میں کچھ یوں لکھا ہے۔

" Gulmarg What will be one day known as the playground of India and what is known to the Kashmiri as the meadow of flowers is situated 26 miles from srinagar half way up the northward facing slops of the Pir Panjal. There is no other place like Gulmarg,

originally a mere wedow to which the Kashmiri shepherds used to bring their sheep, cattle and ponies for summer Grazing, is now the resort of six or seven hundred Europeon visitors every summer. The Maharaja has a palace there. There is a Residency, an hotel with a theatre and ball room, post office telegraph office, Club and more than a hundred Huts owned by Europeans. There are also two polo grounds, a Criket ground and few tennis courts and There are circular roads running all round it.

Like Kashmir, Generally Gulmarg is also said by those, who know it in the old day, to be now spoilt with the increasing no. of visiters. The main charm of Gulmarg will, however always remain the beauty of its natural scency and the views above the sea level and 80 miles distant acrross the valley.

Except that I know of no other more beautiful road than this along the ridge of Gulmarg.

گلمرگ کی نسبت ایک اور برطانوی فوجی افسر، میجر ٹی-آر-سوِنبورن

اپنی کتاب "A Holiday in the happy

"valley اشاعت لندن، ۱۸۹۰ء میں لکھتے ہیں۔

" Some how one's preconceived ideas of a place are almost always quite wrong and so Gulmarg reemed quite discent from what I had expected of it."

ایک اور برطانوی آفسر اپنی کتاب Sports in Asia and Alsica مطبوعہ لندن، ۱۹۲۱ء میں لکھتا ہے۔

" Entered Kashmir by Banihal pass and marched down the valley to Barmulla and from there I went by Tonga to Rawalpindi . Loral Amptrill, who was acting viceroy at that time, was in Kashmir and we conveyance was available. To avoid any unnecessary waste of time I took the place of the Baba, who was incharge of he viceroy's mail and drone in a Tonga without stopping from Baramulla to Rawadpindi, a journey of 36 hours."

کشمیریوں کی بے کسی اور کسمپرسی کے بارے میں وہ یوں رقمطراز ہے۔

A Kashmir pandit Manmohan Nath, who had began his official career under me when I was settlement officer, informed that he had seen poor Kashmiri sitting round a lump of Punjab Rock salt and eating their sag (vegetables) in its proximity but without

APPENDIX VI

(The Final Receipt for the Purchase of Kashmir.)
Final receipt for the purchase of Kashmir signed by Board of Administration[1].

"The Hon'ble The East India Company having received from His Highness the Maharaja Gulab Singh the sum of Rs. 75,00,000 (seventy-five Lakhs) in payment of the amount guaranteed by the III Article of the Treaty between the Hon'ble Company and His Highness dated Umritsar the 16th March, 1846. The single acknowledgment of the receipt of the whole amount is granted by the Board of Administration for the affairs of the Punjab,a t the request of Dowan Jowalla Sahae, in addition to the receipts already given to His Highness, agents by the receiving officers, for the instalments received by them from time to time between the date of the Treaty and the 14th March, 1850, the day on which the last instalment was paid into the Lahore Treasury."

H.M. Lawrence,
John Lawrence,
C.E.Mansel

Lahore, 29th, March 1850.

---

1. Copy in the Punjab Record Office Museum.

APPENDIX V

The Treaty of Amritsar.

Treaty between the British Govnment and Maharaja Gulab Singh, concluded at Amritsar, on March, 16, 1846.

Treaty between the British Government on the one part, and Maharajah Golab Singh of Jummoo, on the other, concluded, on the part of the British Government, by Frederick Currie, Esq, and Brevet Major Henry Montgomery Lawrence, acting under the orders of Right Honourable Sir Henry Hardinge, G.C.B., one of Her Britannic Majesty's Most Honourable Company to direct and control all their affairs in the East Indies, and by Maharajah Golab Singh in person.

Article 1: The British Government transfers, and makes over, in independent possession, to Maharajah Golab Singh, and the heirs male of his body, all the hilly or mountainous country with its dependencies, situated to the eastward of River Indus, and westward of the River Ravee, including Chamba and excluding Lahoul, being part of the territory ceded to the British Government by the Lahore State according to the provision of Article 4 of the treaty of Lahore dated March 9, 1846.

Article 2: The eastern boundary of the tract transferred by the foregoing Article to Maharajah

Golab Singh shall be laid down by Commissioner appointed by the British Government and Maharajah Golab Singh, respectively, for that purpose, and shall be defined in a separate engagement, after survey.

Article 3: In consideration of the transfer made to him and his geirs, by the provisions of the foregoing Articles, Maharajah Golab Singh will pay to the British Government the sum of seventy five lacs lf rupees (Nanuchshahee), fifty lads to be paid on ratification of this treaty, and twenty five lacs on or before the 1st of October of the current year, A.D. 1846.

Article 4: the limits of the territories of Maharajah Golab Singh shall not be at any time changed, without the concurrence of the British Government.

Article 5:Maharajah Golab Singh will refer to the arbitration of the British Government any dispute of questions that may arise between himself and the Government of Lahore, of any other neighbouring State and will abide by the decision of the British Government.

Article 6: Maharajah Golab Singh engages , for himself and heirs, to join, with the whole of his military force, the British troops, when employed within the hill, or in the terrirtories adjoing his possessions.

Article 7: Maharaja Golab Singh engages never to take , or retain in his service, any British subject , nor the subject of any European or American state,

without the consent of the British Government.

Article 8: Maharaja Golab Singh engages to respect, in regard to the territory transferred to him, the provisions of Articles 5,6,7 of the separate engagement between the British Govt. and the Lahore Durbar dated March 11,1846

Article 9: The British govt. will give its aid to Mahajraja Golab Singh, in protecting his territories from external enemies.

Article 10: Mahajraj Golab Singh acknowledges the supremacy of the British Government, and will, in token of such supremacy, present annually to the British Government, one horse, twelve perfect shawl goats of approved breed (six male and six female), and three pairs of Cashmere shawls.

This treaty, consisting of ten Articles, has been this day settled by Frederick Currrie, Eaq, and Brevet Major Henry Montgomery Lawrence, acting under the directions of the Right Honourable Sir Henry Hardinge, G.C.B., Governor General, on the part of the British Government and by Maharajah Golab Singh in person; and the said Treaty has been this day ratified by the seal of the Right Honourable Sir Henry Hardinge, G.C.B., Government General.

Done at Amritsar, this 16th day of March, in the year of out Lord, 1846, corresponding with the 17th day of Rubbee-ool-awul, 1262, Hijree.

GOLAB SINGH (L.S) H.HARDINGE (L.S)
R.CURRIE.
H.M.LAWRENCE.

APPENDIX III

Selected Articles from the Treaty of Lahore

Selected Articles from the Treaty of Lahore, March 9, 1846.

Article 2: The Maharajah of Lahore renounces for himself, his heirs and successors, all claim to, or connexion with, the territories lying to the south of the River Sutlej, and engages never to have any concern with those territories, of the inhabitants thereof.

Article 3:the Maharajah cedes to the Honourable Company, in perpetual sovereignty, all his forts, territories, and rights, in the Doab, or county, hill and plain, situate between the Rivers Beas and Sutej.

Article 4: The British Government having demanded from the Lahore State, as indemnification, for the expenses of the war, in addition to the cession of territory described in Article 3, payment of one and a half crores of rupees; and the Lahore Government being unable to pay the whole of this sum at this time, or to give security, satisfactory to the British Government, for

its eventual payment; the Maharajah cedes to the Honourable Company, in perpetual sovereignty, as equivalent for one crore of rupees, all his forts, territories, rights and interests, in the hill countries, which are situated between the Rivers Beas and Indus, including the Provinces of Cashmere and Hazarah.

Article 12:in consideration of the services rendered by Rajah Golab Singh of Jummoo, to the Lahore State, towards procuring the restoration of the relations of amity between the Lahore and British Government, the Maharajah hereby agrees to recognize the independent sovereignty of Rajah Golab Singh by separate agreement between himself and the British Government, with the dependencies thereof, which may have been in the Rajah's possession since the time of the late Maharajah Khurrukh Singh; and the British Government; in consideration of the good conduct of Rajah Golab Singh, also agrees to recognize his independence in such territories and to admit him to the privileges of a separate treaty with the British Government.

Article 13: in the event of any dispute or differces arising between the Lahore State and Rajah Golab Singh, the same shall be referred to the arbitration of the British Government; and by its decision the Maharajah engages to abide.

APPENDIX IV

Selected Articles from the Agreement of March 11, 1846.

Some of the Articles of the Agreement conclueded between the British Government and the Lahore Durbar, on the 11th of March, 1846

Article 5: The British Government agrees to respect the bonafide rights of those Jagirdars within the territories ceded by the Article 3 and 4 of the Treaty of Lahore, dated 9th instant, who were attached to the families of the late Maharajah Runjeet Singh, Khurruk Singh, and Shere Singh; and the British Government will maintain the Jagirdars in the bonafide possessions, during their lives.

Article 6: The Lahore Government shall receive the assistance of the British local authorities in recovering the arrears of revenue justly due to the Lahore Government from their Kardars and managers in the territories ceded by the provisions of Article 3 and 4 of the Treaty of Lahore, to the close of the Khurreef harvest of the current year,

viz, 1902 of the Sumbut Bikramajeet.

Article 7: The Lahore Government shall be at liberty to remove from the forts in the territories specified in the foregoing Articles, all treasure and State property, with the exception of guns. Should, however, the British Government desire to retain any part of the said property, they shall be at liberty to do so, paying for the same at a fair valuation; and the British officers shall give their assistance to the Lahore Government, in disposing on the spot wish to remove, and the British officers may not desire to retain.

Article 8: Commissioners shall be immediately appointed by the two Governments to settle and lay down the boundary between the two States, as defined by Article 5 of the Treaty of Lahore, dated March 9, 1846.

LIST

OF

PERMANENT EUROPEAN RESIDENTS

IN

KASHMIR.

CORRECTED UPTO 1ST APRIL 1937.

Issued by the Visitors' Bureau, His Highness' Government, Jammu and Kashmir.

SRINAGAR.

PRINTED AT THE PRATAP PRESS, SRINAGAR, 1937.
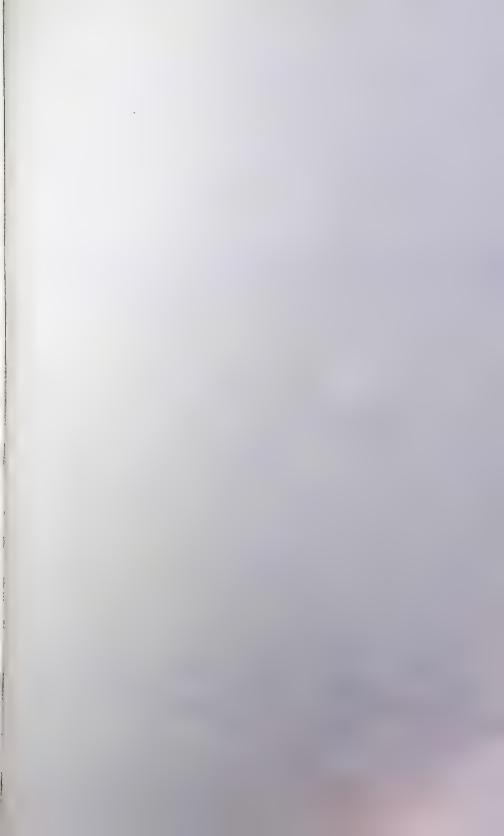
LIST OF PERMANENT EUROPEAN RESIDENTS IN KASHMIR.

CORRECTED UPTO 1st APRIL 1937.

—:-0:—

Amesbury, Mr. and Mrs. and the Miss., R. A., Sericulture Department.

Anderson, Mr. and Mrs. and Misses F. W. H. B., Queen Elizabeth.

Apcar, Mr. F. S., H. B. "Victory".

Archbold, Mr. W. J., I. P., Inspector General of Police.

Atkinson Major, M. P. Agency Surgeon Gilgit.

Bakewell, Capt. and Mrs. W. B. Spedding and Co. Lolab. P. O. Handwara.

Barker, Capt. G. L. C/o. P. M. Srinagar.

Bayley, Mrs. H., H. B. "Hardinge".

Biddulph, Col. and Mrs. F. S., H. B. "Queen of Sheeba".

Berry, Mrs. G. M., H. B. "Spring Flower".

Biscoe, Mr. and Mrs. E. Sheikh Bagh.

Stavrides, Mr. and Mrs. G. P., H. B. 'Menora'.

Stewart, Revd. Father, R. C. Chaplain.

Stewart, Mr. and Mrs. Nedou's Hotel.

Stokoe, Canon Mrs. and Miss. C. G. "The Parsonage".

Stuart, Mrs. H. B. Sonawar Bagh.

Sutherland, Mrs.

Skinner, Lt. Col. and Mrs. G. S., The Island.

Skinner, Major and Mrs. R. H., Manager Cockburns Agency.

Spencer, Mr. and Mrs. F. R. B., Gupkar Road.

Spencer, Mrs. R. D. L. P. Gupkar Road.

Stevenson, Col. and Mrs. E. F. Residency Surgeon.

Stevens, Matron Diamond Jubilee Zenana Hospital.

Stickly, Miss. C/o. P. M. Srinagar.

Simpson, Miss. C/o. Rainawari Zenana Hospital.

Speer, Mr. and Mrs. R. W., Superintendent Post Offices.

Sutcliffe, Mr. and Mrs. T. of Imperial Telegraph Office.

Taylor, Mrs. N., H. B. "White Elephant".

Boermell, Mrs. and Miss, H. B., "Piffer" Ghat No. B/10.

Bromley, Mrs. H., H. B. 818 opposite Munshi Bagh.

Brown, Mr. P., Ghat No. A/14.

Burges, Miss. H. L. E., Sheikh Bagh.

Cabral, Mr. F. B., Imperial Telegraph Office.

Campbell Wright, Miss. Sheikh Bagh.

Capel-Cure, Mrs. H., "The Chinars" Ram Munshi Bagh.

Carmichæl, Lt. Col. and Mrs. J., Padhshahi Bagh

Cavendish, Mrs. K. Gagribal.

Chesney, Miss. B. The Island.

Churchill, Taylor, Miss., Zenana Mission Hospital.

Clutterbuck, Sir Peter and Lady H., Chief Conservator of Forests.

Cobbold, Mrs., H. R., H. B., "Dogstar".

Cockburn, Mr. and Mrs. D. G. "Hopewell" Gupkar Road.

Cockburn, Miss. "Hopewell" Gupkar Road.

Cook, Captain G. H. Assistant Political Agent Gilgit.

Coombes, Mr. and Mrs. T. W. C/o. P. M. Handwara.

Coverdale, Miss. Islamabad.

Critchley Lt. Col. E. H. Dy. Chief of the Military Staff

Currie Mrs. G. M. H. B., "Hiawatha". Ghat No. 16—A.

Currie, Mr. and Mrs. Robert, Ram Bagh.

Davis, Mr. and Mrs. J. J. "May Fair Hall" Boulevard Road.

Davis, Mr. D. E. " "

Douglas, Miss. "Hopewell" Gupkar Road.

Ellvers, Mr. and Mrs. The Residency.

Everett, Dr. L., H. B., 776.

Fleming Col. W. and Mrs. H. B. "Siera Miranda".

Flynn, Miss. C/o. P. M. Srinagar.

Forbes, Major, Col. and Mrs. F., Nedou's Hotel.

Forest Major, and Mrs. G. Secretary Srinagar Club.

Forsyth, Mr. and Mrs. M. C. Imperial Telegraph Office.

Fraser Captain, and Mrs. D. S. O., R. N. The Bund.

Freeman, Mrs. Gupkar Road.

Gardener Brown, Miss. Sheikh Bagh.

Gauntzer, Mr. F, H. B. "Silver Bell", Harisingh Bagh.

Gibb, Mr. and Mrs. J. J., H. B. "Minerva" Harisingh Bagh.

Goodall, Miss. E. Sheikh Bagh.

Goomerny, Miss. Mission Hospital, Islamabad.

Green, Mr. and Mrs. H. Manager Lloyds Bank.

Greenfield, Miss. Bahrar.

Gregory, Mr. J. Lolab Valley, P. O. Handwara.

Hadow, Major and Mrs. K. C. C/o. C. M. Hadow and Co.

Hanson, Mr. and Mrs. A. W., Director of Music.

Hessing, Mrs. and Miss. A., The Bund.

Hickox, Revd. and Mrs. S. E., H. B. "Queen Marry".

Hogg, Mrs. Buchawara.

Houston, Mrs. H. B. 261, Munshi Bagh.

Hughes, Miss. L., C/o. Col. Ward. Gupkar Road.

Jacob, Mr. C. M. S. School. Srinagar.

Jeffrey, Mrs. C/o. Post Office, Srinagar.

Johansen, Mr. Friis B. The Bund, Srinagar. Export Branch Manager, Cockburns Agency

Jones, Mrs. W. Sonwar Bagh.

Jonston, Mrs. A. H., H. B., 112 Munshi Bagh.

Johnson, Miss A. E. Bunglow No. 21. Munshi Bagh.

Johnson, Col. and Mrs. M. E., H. B. "Rashmāni".

Kirkbride Major, G. Political Agent Gilgit.

Knox, K. N, M. A., I. C. S., The Hon'ble Revenue Minister.

LaFrenais, Mr. and Mrs. B. C. A. and L., The Bund.

LaFrenais, Mr. and Mrs. J. L. C/o. W. Lambert, The Bund.

Lambert, Mr. and Mrs. W., The Bund.

Lambert, Mrs. and Miss. Munshi Bagh

~~Lambert, Mrs. and Miss. Munshi Bagh.~~

Miller, Lt. Col. and Mrs. G. M., I. M. S. Director Medical Services.

Moorlane, Major V. W. V. Srinagar.

Mullen, Mr. and Mrs. C/o. C. M. Hadow and Co.

Nedou, Mr. and Mrs. W. Nedou's Hotel.

Neve, Dr. and Mrs. E. F. Munshi Bagh.

New, Miss C/o. Post Master, Badami Bagh.

Newman, Miss E. M., Hospital Road.

Nicolls, Mrs. G. S., C. E. Z., Hospital Rainawari.

Nicholson, Mr. and Mrs. C/o. Pilley and Co., Srinagar.

O'Conner, Miss E., "River View".

Oxley, Lt. Col., J. C. S., I. M. S., (Retd.) Sonawar Bagh.

Pattinson, Mr. and Mrs. Brain Village.

Pain Mrs. and Miss, E. C. C/o. R. Poychaud Esqr. Sericulture Department.

Polin, Miss. Sheikh Bagh.

Poychaud, Mr. R., Director Sericulture.

Phillmore, Col. and Mrs. H. B.

Rawlence, Dr. and Mrs. H. G. Mission Hospital.

Richardson, Mr. C/o. Spedding and Co. P. O. Handwara.

Roberts, Lady Ms., Sonawar Bagh.

Ross, Miss E. The Bund, Srinagar.

Ross, Campbell Mrs. H. B. "Rix".

Rosser, Mr. and Mrs. L. Electrical Engineer, Baramulla.

Rogers, Mrs. H. E. Polo View.

Sevenoaks, Mrs. B. L. C/o. Miss Malcolm Gupkar Road.

Shoubridge, Mrs. M. G. A. Boulevard Road.

Simpson, Miss. G. G. E., C. E. Z. Hospital Rainawari.

Smart, Miss B. A., Kashmir Nursing Sister.

Stapleton, Miss. V. G., C. M. S. Hospital.

Smyth, Dr., B. Marian C. E. Z. Hospital Rainawari.

Stavrides, Mr. and Mrs. G. P., H. B. 'Manora'.

Lamb, Mr. and Mrs. R. "The Armoury" Srinagar.

Lander, Major and Mrs. L. H. Chinar Bagh.

Lang, Lt. Col. and Mrs. L. E, C. I. E., Resident in Kashmir.

Lodge Miss, F. K. The Bund.

Ludlow, Mr. F., Nedou's Hotel.

Macleod Miss, Sonwar Bagh.

Malcolm Miss W., Gupkar Road.

Mallinson, Miss; M. P. Sheikh Bagh.

Margaret Mitchel, C. E. Z. Hospital Rainawari.

Marshall, Lt. Col. and Mrs. F. D. Ram Munshi Bagh.

Minto, Mr. and Mrs. A. H. Extra Assistant Resident.

Mortin, Miss, C/o. Miss. O' Connor.

Murray, Mrs. and Miss. Lido Cafe, Nagin.

Murray, Mr. H. J. Imperial Telegraph Office.

McCrea, General and Mrs. Gupkar Road.

McDonald, Mr. S. M. Kralyar,

Tennant. Mrs. C. Gupkar Road.

Thorp. Mr. and Mrs. G., Dy. Controller. Shikar Khana.

Thresher, Miss. M., C/o. Miss Newman.

Tipping. Miss. G. A. S., C. E. Z.. Hospital Rainawari.

Tizard, Col. and Mrs. H. E., H. B. "Melisande".

Vaughan, Mrs. C/o. Mr. C. N. Hanson.

Vosper, Dr. C. and Mrs. Mission Hospital.

Watt. Mrs. M. C. Sonawar Bagh.

Wallis, Miss. W., H. B. 'Rohini'.

Walton, Mrs. "Hopewell" Gupkar Road.

Ward. Col. and Miss. A. E. Gupkar Road.

Wemyss, Miss, L., Bahrar.

Williams Lt. Col. and Mrs. Severn, Assistant to the Resident and British Joint Commissioner Ladakh.

Worling, Mr. and Mrs. R. D. Manager Imperial Bank, Srinagar.

Wroford, Captain and Mrs. R. G., Director Kashmir Valley Food Control.
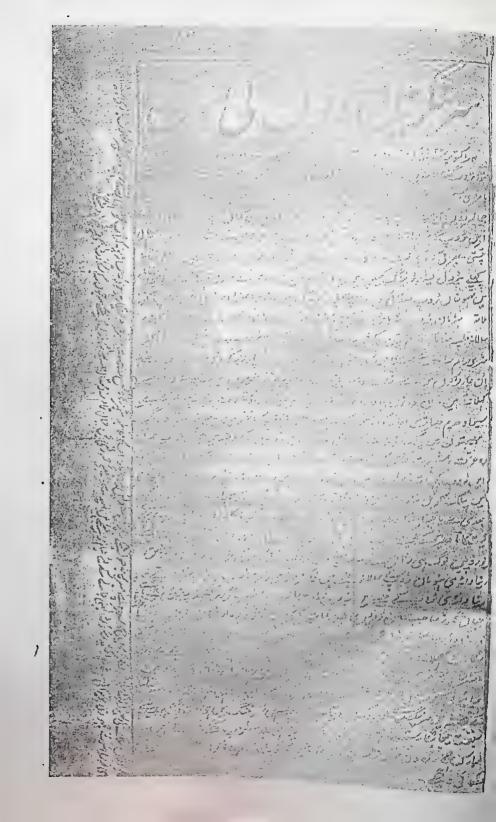
THE BOY SCOUTS ASSOCIATION

IMPERIAL HEADQUARTERS

25, Buckingham Palace Road,

· LONDON ·

S.W.1

TELEPHONES:
VICTORIA 8654.
VICTORIA 8663.
VICTORIA 8656.
VICTORIA 8657.

REPLY PLEASE ADDRESS
THE SECRETARY,
AND QUOTE

521
30-10-33

Seen
File log book

10th October, 1933.

W. Kaul Esq.,
Group Scoutmaster,
1st Rainawari Group of Boy Scouts,
Srinagar,
Kashmir,
India.

Dear Mr. Kaul,

Your letter of the 16th September, addressed to the Chief Scout, has been handed to me for reply, and I write to say that the report of your Group has been read with the greatest interest, and we are very much obliged to you for sending it.

It is always a pleasure to hear from a Group who are really active, and I send you my best wishes for your continued success.

I am,

Yours sincerely,

(Harold Legat)
HEADQUARTERS COMMISSIONER FOR OVERSEA
SCOUTS AND MIGRATION.

HL/JVM.

THE BOY SCOUTS ASSOCIATION

IMPERIAL HEADQUARTERS

25, Buckingham Palace Road,

· LONDON ·

S.W.1

TELEPHONE: VICTORIA 8654, VICTORIA 8655, VICTORIA 8656, VICTORIA 8657.

TELEGRAMS: "SCOUTS LONDON"

REPLY PLEASE ADDRESS THE SECRETARY, AND QUOTE 50022

R 247
13/11/39

Nos 1414
2/12/39

File
Englands

20th October, 193[illegible]

2/12

The Group Scoutmaster,
J. & K. Boy Scouts' First Group,
Rainawari,
Srinagar,
Kashmir,
INDIA.

Dear Sir,

I have to thank you for your letter, Reference [illegible] of the 1st September, which has been passed on to me by the Editor of "The Scouter."

I am sorry to say it is not our practice to reproduc[e] [p]hotographs of Groups in "The Scouter" except on the rarest [o]ccasions, as they are almost invariably not of general interes[t] [t]o readers. I regret, therefore, to have to return the photograph which you were good enough to send, and which was of much interest to the Oversea Department. You evidently have a very fine set of fellows in your Group.

I am,

Yours faithfully,

[signature]

For H. Legat,
HEADQUARTERS COMMISSIONER FOR OVERSEA
SCOUTS AND MIGRATION.

OHB/EVN.

Wien Oct. 1933.

I. WIPPLINGERSTRASSE 8

The Jammu and Kashmir Boy Scouts first Troop
R a i n a w a r i ,Springar,Kashmir INDIA.
The Scoutmaster

Dear Sir and Brother Scout,

you were so kind as to send us the report of your group with all the enclosures. I have studied and found out that I never saw any thing like that. It seems innumerous the work you have done during the last 15 years. Your work and method for your will allways be an exemple for us for good scouting. I thank you once again for your kind remmebering our association and I will let you know in case we want some more of these reports, at the present time we dont.

Wishing you all good progress in your work, I remain on behalf of the

Austrian Boy Scouts Association

yours sincerely

Fritz Toffler
International Commissioner.

Fritz Toffler
International Commissioner
Austrian Boy Scouts Association
Wipplingerstrasse 8
Vienna I., AUSTRIA

The J. and K. First Rainawari Scout Group, Srinagar

Started in 1918, the 1st Rainawari Srinagar Troop has had a continuous service of over 11 years and has earned a well merited reputation for efficiency and a useful career. The report just to hand is a record of steady progress and it is observed that they have taken part in all the activities organised by the Association. Several public services have been rendered, notably at the time of the floods. The indefatigable energy of the group master, Mr. Wasudev Kaul and of the Scout Master Mr. G. N. Fotadar, excellent organisation and discipline of the troop and the active sympathy and support of the local Association and the public seem to have contributed each its share in the well-ordered progress and achievement of which the report speaks of.

by organising Scout Camp
"The Mysore
Appeared in Mysore Scout
for Feb 1930

Copy of an
Extract from letter no. 535 dated 26-2-193
from the scout organiser J&K Boy Scouts Ass
Jammu to H Wasudev Kaul Group Scout master.

Your annual report is really a fine record of the work done by your troop. May God give you more & more increase power to love & serve your country. It is a great credit to you all & I congratulate you on having such a splended group of workers under you. It would be much better if you send the report through the Scout Commissioner for Kashmir who will recommend necessary grant to the group.

True Copy
[signature]

CIVIL VETERINARY DEPARTMENT

KASHMIR

(PRESCRIPTIONS.)

GULMARG BRANCH.

KASHMIR ANIMALS WELFARE ASSOCIATION.

Please help me to carry on the work we do here. For a subscription of Rs. 5/- paid to the Club Office or to me within one week of your arrival, we will attend to your dogs and ponies at the Hospital entirely free except for the cost of medicines, and in the case of inoculations for which a small extra charge is made. We have two Segregation Kennels for suspected cases of Rabies. Without our Hospital your sick animals would have to go to Srinagar.

ROBERT LAMB,
Hon. Secretary Gulmarg Branch.

Press Srinagar

Brigadier R.A. [illegible]

℞

Ol: Picis Rectif ♏ XX

Ungt: Acidi Borici

Ungt: Sulphuris āā ℥ss

Ft. ungt

Sig: As directed.

J. F. L. Taylor
M.R.C.V.S.

6/8/31

actually touching it.

کشمیر سکاوٴٹنگ اور برٹش اشتراک

کشمیر میں اوّلین سکاوٴٹس کی بنیاد رعناواری سرینگر میں بعض پڑھے لکھے کشمیری پنڈت نوجوانوں نے ۱۹۱۸ء میں رکھی جس کے لئے اُنہوں نے باضابطہ آئین مرتب کیا۔ انہوں نے ایک قلمی ماہنامہ بھی نکالا جو
Kashmir Scouts Association, Rainawari
کے نام سے کئی برس تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر پنڈت واسدیو کول اور سرپرست سکاوٴٹ مسٹر جی این فوطیدار تھے۔ اِس قلمی رسالے میں ہر مہینے کی سرگرمیاں شامل کی جاتی تھیں۔ یہ ایسوسی ایشن بلالحاظ مذہب وملت اور بوقتِ ضرورت ہر طرح کے لوگوں کی مدد کیا کرتی تھی اور مختصر ہی وقت میں اس نے کافی شہرت پائی۔ ان کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرکے کشمیر میں مقیم برطانوی افسران کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

☆★☆

بزمِ شیرازہ

قارئین کے خطوط سے اِنتخاب

مکرّمی!

ماہنامہ شیرازہ کے دو شمارے ۴۲ اور ۴۳ موصول ہوئے۔ ''قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں جموں، کشمیر اور لداخ'' جیسے اہم ترین موضوع پر آپ نے اِتنا قیمتی مواد یکجا کر کے مرتب کر دیا ہے کہ حیرت زدہ ہوں۔ یہ کام آسان نہ تھا، بلاشبہہ یہ بڑا کام ہے۔ یہ ایسا ڈوکومنٹ ہے کہ جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اِن دونوں شماروں کو برِصغیر کے ہر اُردو کتب خانے میں ہونا چاہئے، یہ علم کا خزانہ ہے۔ تاریخ کے لمبے سفر، ان تینوں علاقوں کی عمدہ روایات اور اقدار کو جاننے پہنچانے میں بڑی مدد ملتی رہے گی۔ ان دو قیمتی جلدوں کو شائع کر کے اکیڈیمی نے اُردو ادب میں ایک بڑا قیمتی اضافہ کیا ہے۔

مواد نے تحقیقی معیار کو بلند کیا ہے ساتھ ہی تجزیاتی مطالعے کا معیار بھی توجّہ طلب بنا ہے۔ جو مقالے شریک ہیں وہ مستقبل میں تحقیق کی بنیاد بنیں گے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ آپ سب کو ان دونوں شماروں کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ان دونوں شماروں کا ''ڈیلکس ایڈیشن'' بھی شائع ہونا چاہئے جو برِصغیر کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی بھیجے جائیں۔

آپ سب کا اپنا

شکیل الرحمان

سابقہ مرکزی وزیر و ممبر پارلیمنٹ

گوڑگاؤں۔ ہریانہ

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہوں

کل کی ڈاک سے ماہنامہ ''شیرازہ'' اُردو کے دو نہایت خوبصورت، ضخیم، مفید اور دلچسپ رسالے (جلد ۴۲، ۴۳) موصول ہوئے۔ آپ کی اس عنایت و محبت کے لئے بہ صمیم قلب مشکور و ممنون کرم ہوں۔

''شیرازہ'' دیکھ کر مجھے بڑی مسرت اور شادمانی حاصل ہوئی، کیونکہ یہ ایسی خوبصورت جگہ سے آیا ہے، جسے لوگ اِس دُنیا کی جنّت کہتے آئے ہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے۔ رِسالہ دیکھتے ہی کشمیر کی خوبصورتی، دلکشی نیز وہاں کی لطافت ونفاست دل ودماغ پر چھا گئی، کشمیر کا کیا حسین منظر ہوگا؟ آپ واقعی خوش قسمت ہیں کہ اِس اَرضی جنّت کے باشندے ہیں۔

رسالہ یقیناً نہایت وقیع، مفید مطلب اور دلچسپ ہے۔ جو صوری حیثیت میں بھی کشمیر جیسا حسین وپُرکشش ہے۔ یہ میرے لئے بڑے مطلب کا ثابت ہوگا، نہایت سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ زیرِ مطالعہ رہے گا، رسالہ بھیج کر دراصل آپ نے مجھے گھر بیٹھے کشمیر کی سیر کرادی۔ جزاکااللہ خیرا۔ شیرازہ کے توسط سے ہم آپ کے ساتھ بہت دنوں تک رہیں گے۔

والسلام

ڈاکٹر انور حسین خان

بارہ بنکی۔ یو۔ پی

۱۹/اگست ۲۰۰۶ء

☆☆☆

۶ ستمبر ۲۰۰۶ء

محترمی سلام و نیاز

رسالہ ''شیرازہ'' کے دو خصوصی شمارے (جلدِ اوّل و دوم، جو تاریخِ کشمیر (جموں، کشمیر، لداخ) سے متعلق ہیں، موصول ہوئے۔ اِس کرم فرمائی کے لئے بے حد شکریہ۔ دونوں ہی جلدیں نہایت وقیع اور معلومات افزا ہیں ان کو پڑھ کر کشمیر کی شاندار علمی و تہذیبی وراثت کے بارے میں میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ اتنے خوبصورت خصوصی شمارے کی اِشاعت کے لئے مبارکباد قبول فرمائیں۔ ان شماروں کو دیکھ کر بجا طور پر توقع کی جانی چاہئے کہ آئندہ بھی اس طرز کے خصوصی شمارے اشاعت پذیر ہوں گے۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہار سرا

اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خاکسار

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

ہمدرد یونیورسٹی۔ ہمدرد نگر نئی دہلی

☆☆☆

۱۷/اگست ۲۰۰۶ء

مزاج گرامی

پرسوں کی ڈاک اچانک ''شیرازہ'' کے دو شمارے ناچیز کے نام موصول ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی اس یادآوری اور کرم فرمائی۔ آج آپ کو یہ نامہ لکھ رہا ہوں۔ بالکل سرسری طور پر دیکھا چکا ہوں۔ انشاء اللہ وقت نکال کر پڑھونگا اور اپنی رائے سے بھی مطلع کرونگا۔

یہ شمارے دستاویزی حیثیت کے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ حضرات نے تاریخ کے غاروں میں داخل ہوکر بہت سے جواہر پارے نکالے ہیں۔ کشمیر جیسی دُلہن کے رُخ سے پردہ ہٹا کر اِس کے اصل خدوخال کر سامنے لا کر کچھ آسان کام نہیں مگر بات یہی ہونی چاہئے کہ اصل خدوخال ہی ہو۔ اِس سے پوڈر غارہ استعمال کر کے اصل شکل کو ڈھانک دیا ہوا۔

ویسے تو کسی بھی خطۂ زمین سے متعلق گرانقدر معلومات دلچسپی سے خالی نہیں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان حقیقت حال سے واقف ہو جاتا ہے۔

معلوم نہیں آپ کو مجھ ناچیز کا پتہ کس ذریعہ سے ملا۔ میرے ضلع کے اس شہر میں ایک پروفیسر طارق جمیلی بھی ہیں جو اپنے شعبہ کے صدر رہ چکے ہیں ان کی جو سات کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں انہوں نے اپنے خصوصی نمبر کو ایک نظر دیکھا جو بہت متاثر ہوئے۔ ان کا وہی پتہ ہے جو میرا ہے۔

انشاء اللہ پھر تفصیل کے ساتھ کچھ لکھوں گا۔ ابھی بس اتنا ہی۔

فقط والسلام

سحر جلیلی

لائین بازار۔ پورنیہ۔ بہار

شیرازہ کے طلسمی کلیدی نمبر کی اشاعت

نئی دہلی، ۳۰ ستمبر، ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کا وہ منفرد خطہ ہے جس کی پچھلے اڑھائی ہزار سال کی تحریری تاریخ مختلف ممالک سے یہاں آنے والے سیاحوں کے سفر ناموں میں درج ہے۔ اِس رُوداد کے نقوش اور تاثرات ریاست کی حدود ہی تک محدود نہیں بلکہ پورے برِصغیر پر محیط ہیں جہاں کروڑوں لوگ انہیں جاننے کے منتظر ہیں۔ سرایت کن بے توجہی سے یہ سفر نامے اور تذکرے دفتر خانوں اور پرانے کاغذات کے ریکارڈ میں روپوش ہیں۔ ان کی تحریر بھی بادشاہوں کی داستان سے زیادہ انسانی زندگی کے مختلف گوشوں کی آئینہ دار ہیں۔

اربابِ نسبت وکشاد میں عرصہ دراز سے انہیں منظر عام پر لانے کی بات چل رہی تھی۔ اَب آرٹ کلچر اور لسانیات کی جموں کشمیر اکیڈیمی کے شعبہ نظم و عمل نے اکیڈمی کے موقر رسالہ شیرازہ کے ایک خصوصی شمارے میں ان کو مفصل اور باتصویر روداد پیش کردی ہے عنوان ہے جموں کشمیر اور لداخ قدیمی تذکروں اور سفر ناموں کی روشنی میں۔

یہ شمارے جس کی ترتیب واِشاعت میں زائد ایک سال صرف ہوگیا۔ کل ۹۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جو دُو جلدوں میں منقسم ہے۔ مکمل نمبر کے پیر بیک ایڈیشن کی ایک سو روپے اور مجلّد ایڈیشن کی قیمت ۱۲۵ روپے ہے۔ اس نستعلیق مجموعے میں ریاست کے تینوں حصوں کے جغرافیے، اقتدار، مناظر، معاشرہ صنعت وحرفت اور تہذیب وتمدن کے بارے میں نہایت نادر نکات

روشن کئے گئے ۔ ہیں ان کے بیچوں بیچ ریاست کے مختلف سیاسی اَدوار کے جھلکیاں ہیں جو بار بار یہ منظر دکھاتی ہیں کہ ریاست کے مختلف عقیدوں کے باشندوں کا طرزِ حیات اور نظامِ فکر و عمل ہر دَور میں مطمئن اور قانع وہ ایک روحی قوت سے سرفراز ہے اور مختلف مذاہب کے سنتوں اور صوفیوں کی تعلیمات اور محفلوں سے محظوظ و مستفید ہوتے رہے ۔ وہ بنیادی طور پر ثقافتی عظمت اور انسانی شوتک کے کردار رہے ۔ سفرناموں کا یہ سرمایہ یہ زبان و ملک کو قیود سے آزاد ہے اور بنیادی اور اسیسی طور پر ریاست کی تہذیب حقیقت اور یگانگت سے وابستہ ہے ۔

لُطف کی بات یہ ہے کہ مجموعہ کا کوئی سفرنامہ اصلاً اُردو میں نہیں لکھا گیا تھا لیکن معاوٗنین شیرازہ کے ماوٗنین نے ملک ملک کے سیاحوں کے مشاہدات کے اور جتل متن جگہ جگہ کے ذخیروں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ماہر مترجموں اور مقالہ نگاروں کے تعاون سے انہیں مجلّے کے خصوصی شمارے میں یکجا کردیا اور ریاست کے اُردو ادب کو ایک امتیازی اور حوالہ جاتی سرمایے کا مالک بنادیا ۔ بعض سفرناموں کے نکات آج بھی ہوش رہا اور پیش بین ہیں ۔

جی ڈی چندن

وارانسی ۔ یو ۔ پی

از، روزنامہ ”حالاتِ وطن“ وارانسی

☆☆☆

ملک کے نامور
علمی اورادبی اداروں
کے ساتھ ساتھ

کلچرل اکادمی کی مطبوعات

خریدنے کے لئے تشریف لائیں

مولانا آزاد روڈ، سری نگر/ کنال روڈ، جموں (توی)

SHEERAZA (URDU)
JAMMU-KASHMIR-LADAKH
IN ANCIENT TRAVELOGUES (III)
Volume: 44 No: 4-8
J&K ACADEMY OF ART, CULTURE AND LANGUAGES
Published by:
J&K Academy of Art, Culture and Languages
Srinagar/Jammu